بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
جون 2015
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

بانی مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیر منتظم — آذر ریاض

مدیرہ اعزازی — امت الصبور

[illegible] — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10

حمد، منیر نیازی 11

نعت، زہیر کنجاہی 11

بنتی کی باتیں، ادارہ 12

انٹرویو

روبرو، سمیرا حمید 17

بندھن، عظمیٰ بلوچ 24

دستک، شاہین رشید 30

ناول

رقص بسمل، نبیلہ عزیز 34

مکمل ناول

خالی آسمان، سارہ رضا 74

بہار دستک، حیا بخاری 144

تعویذ حب، ایمل رضا 184

ناولٹ

سیاہ حاشیہ، صائمہ اکرم 236

بس اک نگاہ شوق، نگہت عبداللہ 46

افسانے

تحفہ، فرح بخاری 138

عشق کا سکہ، قرۃ العین ہاشمی 67

جھوٹ، نادیہ احمد 180

ہار جاتی ہے، آمنہ بخت 232

نظمیں غزلیں

غزل، حیدر علی آتش 264

غزل، حیدر قریشی 264

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	272
مسکراہٹیں	ادارہ	266
آئینہ خانے میں	واصفہ سہیل	286
بالوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	268
کھلتا کسی پہ	خالدہ جیلانی	271
سیر دو جہاں	آمنہ زرین	280
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	279
رمضان کے پکوان	خالدہ جیلانی	288
خوبصورت نسخے	ادارہ	290

جون 2015

جلد 29 شمارہ 10

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل مطبوعہ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: 91، بی فار، ای، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

مکمل جھیاں

جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

مئی کا مہینہ ایک بار پھر دلوں کو زخم اور آنکھوں کو اشک دے گیا۔

اس شہر ناپرساں کا ہر باسی ہر لمحہ سہم اور خوف کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ ہر نیا دن کسی سانحے کی خبر کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور ہر گزرتا دن ایک خون چکاں داستان رقم کر جاتا ہے۔ ٹی وی اسکرینوں پر چلتے ہولناک مناظر، اشک بار آنکھیں، ایک دوسرے سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر روتے لوگ۔ ایک انسان کتنے رشتوں میں بندھا ہوتا ہے۔ کتنی زندگیاں اس سے وابستہ ہوتی ہیں۔ کسی کا سہاگ، کسی کا لخت جگر بڑھاپے کا سہارا، کسی کے سر کا سائبان اور کسی کے لیے شفقت کا سایہ۔ ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل کہا گیا ہے۔

جون کے مہینہ میں رمضان المبارک کے مقدس مہینے کا آغاز ہو رہا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ۔ جو اس مہینے کو پائیں اور اپنے نامہ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ کریں۔ ہر نیا دن مہلت عمل کو کم کرتا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ مہلت عمل ختم ہو جائے اپنے رب کو راضی کر لیں۔ انسان کے لیے وہی ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رمضان المبارک کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

ایمل رضا کو لکھتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ان کے چند ہی افسانے شائع ہوئے ہیں لیکن ان کی طرز تحریر گہرے مشاہدے اور متنوع موضوعات نے قارئین کو متوجہ کر لیا ہے۔ اس بار ان کا مکمل ناول "تعویذ حب" شامل ہے۔ اسے پڑھ کر اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

- سائرہ رضا کا مکمل ناول۔ خالی آسمان،
- حیا بخاری کا مکمل ناول۔ بہار دستک دے رہی ہے،
- نگہت عبداللہ اور صائمہ اکرم کے ناولٹ،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، فرح بخاری، نادیہ احمد اور آئینہ بچہ کے افسانے،
- عظمیٰ بلوچ اور محمد خورشید کا بندھن،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک۔
- آپ کے سوال اور سمیرا حمید کے جواب۔ روبرو،
- بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا۔ آمنہ زرین کا تبصرہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور مستقل سلسلے شامل ہیں۔

مئی کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں ضرور بتلائیے گا۔ آپ کے خط ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

حمد

شام شہروں میں شمعیں جلا دیتا ہے تو
یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

آرزو دیتا ہے دل کو، موت کی، وقتِ دعا
میری ساری خواہشوں کا یہ صلہ دیتا ہے تو

حد سے بڑھ کر سبز ہو جاتا ہے جب رنگِ زمیں
خاک میں اس نقشِ رنگیں کو ملا دیتا ہے تو

تیز کرتا ہے سفر میں موجِ غم کی یورشیں
بجھتے جاتے شعلۂ دل کو ہوا دیتا ہے تو

دیر تک رکھتا ہے تو ارض و سما کو منتظر
پھر انہی ویرانیوں میں گل کھلا دیتا ہے تو

اے منیر اس بات کے افلاک پر ہونا ترا
اک حقیقت کو فسانہ بنا دیتا ہے تو

منیر نیازی

سوئے طیبہ کبھی تو جاؤں گا
اپنے دل کی انہیں سناؤں گا

مجھ کو طیبہ پہنچ تو لینے دو
میں کبھی لوٹ کر نہ آؤں گا

سامنے ہو گا گنبدِ خضریٰ
دل کے گنبد کو جگمگاؤں گا

جن کا شیدا ہے خالقِ اکبر
میں سدا اُن کا کہلاؤں گا

درد بھر گا مرا انہیں کا نام
اپنی بگڑی کو میں بناؤں گا

بحرِ شفقت ہیں مصطفٰے سب کے
اُن کی اُلفت میں ڈوب جاؤں گا

وہ ہیں قاسم جہاں بھر کے زبیر
جھولیاں بھر کے میں بھی لاؤں گا

زبیر

ادارہ

سحری کھانے کی اور اس میں تاخیر کرنے کی فضیلت' بشرطیکہ طلوع فجر کا اندیشہ نہ ہو

حضرت انس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سحری کھایا کرو' اس لیے کہ سحری کھانے میں یقیناً "برکت" ہے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ سحری کے وقت اٹھ کر سحری کھانا مسنون ہے' چاہے تھوڑا ہی کھائے کیونکہ اس کھانے میں برکت ہے' اس وقت کھانے پینے سے سارا دن اس کی قوت و توانائی برقرار رہے گی۔ اس کے برعکس جو شخص رات ہی کو کھا پی کر سو جائے اور سحری کے لیے اٹھنا نہ پڑے یا سحری بہت جلدی کھالے' اس نے آخری وقت میں نہ کھائے تو اسے جلد ہی بھوک پیاس ستانے لگ جائے گی' کیونکہ ان دونوں صورتوں میں بھوکا پیاسا رہنے کا وقفہ بڑھ جائے گا جس سے یقیناً "روزے دار" کو تکلیف ہوگی۔ سبحان اللہ! اسلام کی تعلیمات میں کس طرح انسان کی ضروریوں کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں مناسب ہدایت دی گئی ہیں۔

وقفہ

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما یوں فرماتے ہیں کہ

"ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی' پھر ہم نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان سے پوچھا گیا۔

"سحری کے کھانے اور نماز کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟"

انہوں نے فرمایا "پچاس آیات (پڑھنے) کی مقدار۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ سحری بالکل آخری وقت میں کھائی جائے۔ یہی سنت طریقہ ہے' تاہم صبح صادق سے پہلے پہلے کھالی جائے اور یہ وقفہ بقدر پچاس آیات اندازاً "دس منٹ" ہو۔

فرق

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان فرق سحری کا کھانا ہے۔" (مسلم)

فائدہ : گویا سحری کھانا امت مسلمہ کی امتیازی خصوصیات میں سے ہے جس سے اللہ نے اس امت کو نوازا ہے۔

افطار میں جلدی کرنے کی فضیلت' اس چیز کا بیان جس پر افطار کیا جائے اور افطار کے بعد کی دعا

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"لوگ برابر بھلائی میں رہیں گے جب تک وہ روزہ کھولنے میں جلدی کریں گے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : بھلائی سے مراد دین و دنیا کی بھلائی ہے۔ روزہ جلدی کھولنے کا مطلب غروب شمس سے پہلے روزہ کھولنا نہیں ہے بلکہ غروب شمس کے بعد بلا تاخیر روزہ کھولنا ہے۔ محض اس بنا پر تاخیر نہ کی جائے کہ روزے میں جو مشقت ہے اس کو مزید بڑھایا جائے'

جیسا کہ بعض تشدد پسند صوفی اور ذاکر قسم کے حضرات کرتے ہیں۔ ان سختیوں میں برکت نہیں ہے، بلکہ اصل برکت اتباع سنت میں ہے۔ اسی لیے جلدی افطار کرنے میں بھی اسی اتباع سنت کی وجہ سے دین و دنیا کی بھلائی مسلمانوں کے حصے میں آئے گی۔

سنت

حضرت ابو عطیہ بیان کرتے ہیں کہ میں اور مسروق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے۔

حضرت مسروق نے ان سے کہا۔

"اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے دو آدمی ہیں جو بھلائی کے کام میں کوتاہی نہیں کرتے : ان میں سے ایک مغرب کی نماز اور روزہ افطار کرنے میں جلدی کرتا ہے۔ اور دوسرا مغرب اور افطار میں دیر کرتا ہے۔"

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا۔

"مغرب کی نماز اور روزہ افطار کرنے میں جلدی کون کرتا ہے؟"

حضرت مسروق نے کہا "حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہا۔"

تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ (مسلم)

محبوب بندے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ عزوجل نے فرمایا ہے۔

"مجھے میرے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہیں جو ان میں سے افطار میں جلدی کرنے والے ہیں۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے۔)

تعین

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جب رات (کا اندھیرا مشرق کی طرف) ادھر سے آجائے اور دن (کا اجالا) ادھر (مغرب کی سمت) سے چلا جائے اور سورج غروب ہو جائے تو یقیناً" روزے دار نے افطار کر لیا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : افطار کر لیا" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ روزہ افطار کرنے کا وقت ہو گیا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ شرعاً "وہ روزہ کھولنے والا ہو گیا" چاہے وہ کچھ نہ کھائے پیے کیونکہ سورج کے غروب ہوتے ہی روزہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔

اس میں روزے کے وقت کا تعین کر دیا گیا ہے کہ وہ صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہے۔ اس میں اپنی طرف سے اضافہ کرنا اللہ کو ناپسند ہے۔

روزہ افطار کرنا

حضرت سلمان بن عامر ضبی رضی اللہ عنہا صحابی سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم میں سے کوئی افطار کرے تو اسے چاہیے کہ چھوارے سے افطار کرے۔ اگر وہ نہ پائے تو پانی سے افطار کرے، اس لیے کہ پانی خوب پاکیزہ ہے۔" (اسے ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں، یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

بہتر

حضرت انس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے قبل چند تازہ کھجوروں سے روزہ کھولتے تھے اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں تو چند چھواروں سے (روزہ افطار کرتے) اور اگر وہ بھی نہ ہوتے تو پانی کے چند گھونٹ بھر لیتے۔

(اسے ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا ہے، یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : روزہ کھولتے وقت اس ترتیب کو سامنے رکھا جائے تو بہتر ہے تاکہ سنت کا ثواب بھی مل جائے

اور طبی طور پر بھی یہی مفید ہے کیونکہ معدہ خالی ہونے کی وجہ سے گرم اور کمزور ہوتا ہے' اس لیے مرغن چیزیں نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ (ارواء الغلیل' حدیث: 922)

روزہ کھلوانے کی فضیلت اور اس روزے دار کی فضیلت جس کے پاس کھایا جائے اور مہمان کا میزبان کے لیے دعا کرنا

حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے کسی روزے دار کا روزہ کھلوایا' اس کے لیے اس روزے دار کی مثل اجر ہے' بغیر اس کے کہ روزے دار کے اجر میں کچھ کمی ہو۔" (اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔) (جامع ترمذی)

روزہ دار کے لیے دعا

حضرت ام عمارہ انصاریہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ان کے گھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم بھی کھاؤ۔"

حضرت ام عمارہ نے کہا: "میں تو روزے دار ہوں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "روزے دار کے پاس جب کھانا کھایا جائے تو ان (کھانا کھانے والوں) کے کھانے سے فارغ ہونے تک فرشتے اس (روزے دار) کے حق میں دعا کرتے رہتے ہیں۔"

اور بعض دفعہ فرمایا: "ان کے سیر ہونے تک (دعا کرتے رہتے ہیں)۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

دعا

حضرت انس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے روٹی اور زیتون کا روغن آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے وہ تناول فرمایا' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"روزے داروں نے تمہارے پاس افطار کیا' نیک لوگوں نے تمہارا کھانا کھایا اور فرشتوں نے تمہارے لیے مغفرت کی دعا کی۔" (اسے امام ابوداود نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ: یہ دعائیہ جملہ ہے اس اعتبار سے اس کا ترجمہ ہوگا۔

"تمہارے پاس روزے دار روزہ کھولیں' نیک لوگ تمہارا کھانا کھائیں اور فرشتے تمہارے حق میں دعائیں کریں۔" یہ گویا میزبان کے لیے اس بات کی دعا ہے کہ تمہیں یہ توفیق ملتی رہے کہ تمہارے پاس روزے دار اور نیک لوگ آئیں اور تمہارے خوان نعمت سے لطف اندوز ہوں اور تم زیادہ سے زیادہ فرشتوں کی دعائے رحمت و مغفرت کے مستحق بنو۔ اس میں حسب توفیق و استطاعت مہمان نوازی کی ترغیب ہے۔

اعتکاف

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر رمضان میں دس دن اعتکاف فرمایا کرتے تھے' مگر جس سال آپ کا انتقال ہوا' آپ نے بیس دن اعتکاف فرمایا۔" (بخاری)

فائدہ: ان روایات سے معلوم ہوا کہ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرنا سنت ہے۔ خواتین بھی اعتکاف میں بیٹھ سکتی ہیں' لیکن اعتکاف کی جگہ مسجد ہے گھر نہیں۔ اس لیے اگر کسی مسجد میں ایسا انتظام ہے کہ وہاں عورتیں' مردوں سے بالکل الگ

تعلق اور پورے تحفظ کے ساتھ اعتکاف بیٹھ سکتی ہیں تو وہاں وہ اعتکاف میں بیٹھ جائیں۔ لیکن جہاں ایسا معقول انتظام نہ ہو تو پھر اپنی عزت کو خطرے میں ڈال کر عورت کا مسجد میں اعتکاف بیٹھنا جائز نہیں۔ اعتکاف نفلی عبادت ہے اور عزت کا تحفظ فرض۔ نفل کے شوق میں فرض سے غفلت صحیح نہیں۔

حضور قلب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص رات کو (عبادت کے لیے) کھڑا ہو اور قرآن کا پڑھنا (غلبہ نیند کی وجہ سے) اس کی زبان پر مشکل ہو رہا ہو اور اس کو کوئی علم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ لیٹ جائے (تھوڑی دیر سو لے)۔" (مسلم)

فائدہ: نماز کے لیے چونکہ حضور قلب اور خشوع و خضوع نہایت ضروری ہے، اس لیے نماز ایسی حالت میں پڑھنی چاہیے جب انسان تازہ دم ہو، اس کے اندر سستی اور تھکاوٹ نہ ہو۔ اسی لیے غلبہ نیند کے وقت نماز پڑھنے سے روک دیا گیا ہے کیونکہ ایسی حالت میں بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز کا صحیح اظہار نہیں ہو سکتا جو نماز کی اصل روح ہے۔ بنا بریں ایسی حالت میں انسان کو سو کر پہلے اپنی نیند پوری کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بعد ہی اسے قرآن پڑھنے، دعا و مناجات اور توبہ و استغفار کرنے اور نماز پڑھنے میں مزا آئے گا۔

قیام رمضان یعنی تراویح کے مستحب ہونے کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کیا (رات کو نماز تراویح پڑھی) اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

تراویح

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے قیام کی رغبت دلاتے تھے، بغیر اس کے کہ آپ اس کے واجب ہونے کا حکم فرماتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔

"جس شخص نے ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے رمضان کا قیام کیا تو اس کے پہلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیام رمضان یقیناً ایک مؤکد اور اجر و ثواب کے لحاظ سے نہایت اہم عبادت ہے، تاہم اس کی حیثیت نفل ہی کی ہے، واجب کی نہیں۔

2۔ رمضان کا یہ قیام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ثابت ہے۔ آپ نے ایک رمضان میں تین راتیں قیام فرمایا، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو باجماعت رات کی نفل نماز پڑھائی اور اس کے بعد چوتھی رات جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہا آپ کی اقتدا میں پڑھنے کے لیے پھر جمع ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ کر دی جائے۔" اس لیے خواہش کے باوجود آپ نے یہ نماز نہیں پڑھائی۔ تین راتوں میں آپ نے کتنی رکعت پڑھائیں؟ وہ صحیح احادیث کی رو سے 8 رکعات اور 3 وتر ہیں۔ اس لیے قیام رمضان کی مسنون تعداد صرف آٹھ رکعات ہیں اور وتر سمیت گیارہ۔

3۔ احادیث میں اس نفلی نماز کو قیام رمضان ہی سے تعبیر کیا گیا ہے، بعد میں اس کا نام تراویح قرار پا گیا۔ تراویح، ترویحہ کی جمع ہے، اس میں صحابہ و تابعین چونکہ سنت نبوی کے مطابق لمبا قیام کرتے تھے، اس لیے ہر دو مرتبہ سلام پھیرنے یعنی چار رکعت کے بعد آرام و راحت کے لیے وقفہ ہوتا تھا، یوں اس کا نام

تراویح پڑھیں۔ کیونکہ چار رکعت کو ترویحہ کہا جاتا تھا۔

4۔ تراویح اصل میں تہجد ہی کی نماز ہے' رمضان المبارک میں لوگوں کی آسانی کے لیے' تاکہ ہر شخص اس کی فضیلت حاصل کر سکے' اسے عشاء کی نماز کے بعد متصل ہی پڑھ لیا جاتا ہے۔ جو تہجد کا اول وقت ہے۔

5۔ اس کا باجماعت پڑھنا تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ آپ نے 23 ویں' 25 ویں اور 27 ویں شب میں تراویح کی نماز پڑھائی۔ تاہم آپ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہا نے اپنے دور خلافت میں اسے دوبارہ باجماعت پڑھنے کو رائج کیا اور اس کے لیے حضرت ابی بن کعب اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کو گیارہ رکعت تراویح (مع الوتر) پڑھایا کریں۔ (الموطا امام مالک' الصلاۃ فی رمضان' حدیث: 256) جب سے یہ سلسلہ قائم اور جاری ہے۔

6۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ باجماعت تراویح ادا کرنا بدعت ہے کیونکہ اس کا رواج حضرت عمر رضی اللہ عنہا کے عہد میں شروع ہوا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے باجماعت پڑھانا ثابت ہے۔ پھر یہ عمل بدعت کیوں کر قرار پا سکتا ہے۔ درمیان میں مختلف وقفے سے تو یہ عمل بدعت نہیں ہو جائے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف فرضیت کے اندیشے سے اس کو جاری نہیں رکھا' ورنہ آپ کی تو خواہش تھی کہ اسے پڑھا جائے۔ پھر جب فرضیت کا اندیشہ ختم ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہا نے اسے اجتماعیت کا رنگ دے کر یقیناً" نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خواہش کو پورا کیا ہے اور آپ ہی کے عمل کو آگے بڑھایا ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص آخر شب میں انفرادی طور پر اس کے پڑھنے کا اہتمام کرتا ہے تو یہ بھی جائز ہے۔ لیکن عام لوگوں کے لیے چونکہ ایسا کرنا ممکن نہیں ہے اور وہ شب کے آخر میں اپنے اپنے طور پر اسے ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تو ایسے حالات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہا کا اقدام بالکل صحیح اور جائز ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو چند افراد کے سوا عام مسلمان قیام اللیل کے اجر و ثواب سے محروم رہیں گے۔ جو ایک بہت بڑی محرومی ہے۔

تراویح' یعنی قیام رمضان میں لمبا قیام مسنون ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید ترتیل و تجوید کے ساتھ پڑھا جائے۔ بہت سے قاری اتنا تیز قرآن پڑھتے ہیں کہ یعلمون' تعلمون کے علاوہ کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس طرح قرآن پڑھنا ثواب کی بجائے عذاب کا باعث ہے۔

شب قدر کی فضیلت اور اس بات کا بیان کہ ان راتوں میں کون سی رات زیادہ امید والی ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "یقیناً" ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا۔" تا آخر سورت۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "یقیناً" ہم نے اس قرآن کو بابرکت رات میں اتارا۔"

فوائد و مسائل : شب قدر اور بابرکت رات' دونوں سے ایک ہی رات مراد ہے یعنی قدر کی رات جو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہوتی ہے۔ اسی شب قدر میں قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہوا یا لوح محفوظ سے بیت العزت میں اتار دیا گیا جو پہلے آسمان پر ہے اور پھر وہاں سے وقتاً" فوقتاً" حسب ضرورت و مشیت الٰہی نازل ہوتا رہا۔ اس نزول قرآن کی وجہ سے اس رات کی فضیلت و عظمت واضح ہے۔ اب احادیث ملاحظہ ہوں۔

عبادت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ جب رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو بیدار رہتے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے اور خوب محنت کرتے اور کمر کس لیتے۔ (بخاری و مسلم)

رُوبَرو

سمیرا حمید

"ساڑھے ستی" اور "مرگ سیاہ" کی خالق ایمل رضا نے پوچھا ہے کہ کسی کردار کی تخلیق کے پیچھے لکھاری کی اپنی خواہش یا ذات کا عنصر غالب رہتا ہے۔ سائی کے کردار کے پیچھے کیا تحریک کارفرما تھی۔ کیا آپ اپنے اندر کوئی سائی رکھتی ہیں یا آپ کی خواہش ہے کہ دنیا میں سائی جیسے لوگ ہوں؟"

"سائی کے کردار کا محرک کہانی میں اس کے کردار کی نمایاں خصوصیت اس کا بہترین "سامع" ہونا تھا۔ ایک ایسی خوبی کا حامل کردار جس کے پاس ہر کردار جا سکے اور وہ کہہ دے جو وہ کسی اور سے نہیں کہہ سکتے۔ میں مکمل سائی نہیں ہوں، لیکن چند ایک قریبی دوستوں کے لیے ضرور ہوں۔ میرے خیال سے سب سچے دوست ایک دوسرے کے لیے سائی ہیں۔ میری یہ خواہش ہے کہ دنیا میں سائی جیسے لوگ ہوں کیونکہ میرا خیال ہے زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر ہمیں ایک سائی کی ضرورت پڑتی ہے جو ہمارے دکھ کو ویسا ہی محسوس کرے جیسا وہ ہم پر گزر رہا ہوتا ہے اور ہمیں ہر چیز سے بالاتر ہو کر سنے۔"

ایمل رضا کا دوسرا سوال ہے کہ "آپ کے نزدیک پاپولر فکشن اور ادب میں کیا فرق ہے؟"

"میں اس فرق کی جامع اور مستند تعریف تو نہیں کر سکتی، لیکن اپنی سوچ اور مشاہدے کی بنیاد پر اتنا کہہ سکتی ہوں کہ پاپولر فکشن میں عالمگیریت کا فقدان ہوتا ہے۔ پاپولر فکشن مخصوص خطے، مخصوص لوگوں اور مخصوص وقت تک محدود رہ جاتا ہے، جب کہ ادب اپنے اندر گہرائی سموئے وقت، خطے اور اقوام کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تاریخ کا دوسرا نام بھی "ادب" ہے۔ جو چیزیں تاریخ سے کھو جاتی ہیں وہ ادب اپنے اندر سمو کر آگے لے جاتا ہے اور انہیں اس سے بہتر انداز میں بیان کرتا ہے جس سے تاریخ چوک جاتی ہے۔"

اسلام آباد سے مائرہ عباس کا کہنا ہے کہ شارلٹ کی شادی میں عالیان اور کارل کے پرانک کو انہوں نے شغل صورت میں پریکٹس کر کے اپنے گھر والوں کو کر کے دکھایا ہے۔ جس میں وہ کارل بنی تھیں اور ان کی بھابھی پاگل ڈاکٹر عالیان۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ کیا میں نے کبھی کوئی پرانک کیا ہے؟"

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ نے پرانک میں گولی کا نشانہ کسے بنایا تھا۔ جی میں نے پرانک کیے ہیں۔"

جلالپور پیر والا سے رضا ملک نے پوچھا ہے کہ ویسے تو عالیان، ویرا وغیرہ بہت کفایت شعار تھے مگر ان کے پاس اتنے مہنگے آئی فونز کیوں تھے۔ وہ سمپل فون بھی استعمال کر سکتے تھے۔ اینڈ میں آپ نے سب ٹھیک کیوں نہیں کیا۔ عالیان کو ولید البشر سے ملوایا نا امرحہ کو اس کے پاپا سے؟"

"میں نے ناول میں کہیں بھی آئی فون یا موبائلز پر کچھ نہیں لکھا کہ وہ مہنگے تھے یا کسی مخصوص کمپنی کے تھے یا بہت جدید تھے۔ موبائل یا آئی فون ہر اسٹوڈنٹ کی ملکیت ہوتے ہیں جیسے لیپ ٹاپ۔ اس کا تعلق کفایت سے نہیں بے ضرورت سے ہے۔ اختتام میں سب ٹھیک ہو جانا ضروری نہیں ہوتا۔ ولید البشر کا عالیان کے ساتھ باپ جیسا تعلق ہوتا تو دونوں مل سکتے تھے، لیکن ولید نے کبھی عالیان کو بیٹا سمجھا نہ مارگریٹ کو بیوی، اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اینڈ میں ٹھیک ہو جاتا۔ ولید کا کردار اپنی فطرت کے خلاف نہیں جا سکتا تھا۔ امرحہ اور اس کے والد کے درمیان جو خاموشی

حاصل رہی وہ وقت کے ساتھ ماند ہو جاتی۔

گوجرانوالہ سے شبانہ عندلیب کے سوالات ہیں کہ کارل اور عاسیان کی شرارتیں آپ نے کیسے لکھی ہیں۔ امرحہ ایسی کیوٹ بد دعائیں کہاں سے سیکھتی تھی۔ برطانوی معاشرے کے متعلق آپ کو کہاں سے معلومات ملیں اور آپ نے کون سی ایسی کتابیں پڑھی ہیں۔ سائی جیسے لوگ کیا ہمارے معاشرے میں بھی ہیں۔ ماما مہر جیسے لوگ کہاں پائے جاتے ہیں؟"

"لڑکے خاص کر کالج' یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس اسی طرح کی حرکتیں اور شرارتیں کرتے ہیں۔ بلکہ میں نے کچھ کم لکھا ہے۔ امرحہ کی بد دعاؤں کی خطوط میں اتنی تعریف کی گئی ہے کہ مجھے لگنے لگا ہے کہ انہیں آپ نے بد دعائیں نہیں سمجھا دعائیں سمجھا ہے۔ امرحہ کو یہ بد دعائیں میں نے ہی سکھائی تھیں۔ وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی تو بد دعا دے دیتی تھی۔ مجھے دوسری اقوام' ان کے رسم و رواج' لوگوں کے بارے میں جاننے کا کافی شوق ہے۔ جو تھوڑی سی معلومات میرے پاس ہیں وہ اسی شوق کی وجہ سے ہیں۔ ہم سب کے پاس کوئی نہ کوئی سائی موجود ہے۔ بہن' بھائی' دوست والی ایک ضرور۔ ماما مہر جیسی ایک زندہ مثال تو بلقیس ایدھی ہیں جو نہ جانے کتنے بچوں کو ماں بن کر پال رہی ہیں اور بھی یقیناً" بہت ہوں گی۔"

پنڈی سے ماریہ کا پوچھنا ہے کہ امرحہ کو جو اسکالرشپ ملا کیا وہ حقیقت میں ہوا یا خیالی میں؟"

"امرحہ کو اسکالرشپ نہیں ملا' دائم وغیرہ فنڈز اکٹھے کر کے اسٹوڈنٹس کو بلواتے ہیں۔ پاکستانی اسٹوڈنٹس کی طرف سے دیے جانے والے فنڈ کو وہ اسکالرشپ کہتے ہیں۔ ایسا اس لیے ممکن ہے کہ ایسی یونیورسٹیوں میں مختلف ملکوں کی سوسائٹیاں اپنے ہم وطنوں اور قابل طلباء کے لیے بہت کچھ کرتی ہیں۔"

"کن الفاظ میں ناول کی تعریف کریں گی۔ ناول کی مقبولیت کی وجہ بتا سکتی ہیں؟" ارسہ بلوچ حیدر آباد۔

"وہ جس دریا میں بہتا ہے میں اس دریا پر پل بنا کر گزر جاتا ہوں۔" یہ ہے کارل۔ ناول کی مقبولیت کی وجہ اللہ کی مجھ پر رحمت ہے۔

وفا ادریس جرأت سے پوچھتی ہیں کہ اپنی اسکولنگ کے بارے میں بتائیں کیسی اسٹوڈنٹ تھیں آپ؟ کیا پڑھنا پسند تھا یا ناپسند ہے؟

"پانچویں تک میں پوزیشن لیتی رہی تھی یعنی میں تھوڑی سی اچھی تھی پڑھنے میں۔ پانچویں کے بعد میں ایک بالکل ایوریج طالبہ رہی تھی اور اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ میں شعوری طور پر زیادہ بیدار ہو گئی تھی اور مجھے پڑھنے سے زیادہ دوسرے کاموں میں دلچسپی تھی اور میں ان کاموں کے بارے میں سوچنے میں زیادہ وقت لگاتی تھی۔ مجھے آسمان' ستارے' کائنات یہ سب بہت زیادہ متوجہ کرتے تھے اور ہیں۔ مجھے عملی طور پر وہ مضمون بہت پسند تھے جن میں کچھ بن کر یا تحقیق ہو کر سامنے آئے۔ یعنی مجھے اس میں زیادہ دلچسپی تھی کہ اگر زمین کو کھودا جائے تو اس میں سے کیا نکلے گا۔ یا اگر وقت چند صدیاں پیچھے چلا جائے تو کہاں کہاں کیا کیا تھا اور کیسا کیسا تھا وغیرہ وغیرہ۔ مجھے پرندے بہت زیادہ پسند ہیں اور میں گھنٹوں ان کا مشاہدہ کرتی رہتی ہوں۔ جانوروں کے ماہرین کچھ بھی کہیں لیکن پرندوں پر میرے اپنے مشاہدات ہیں۔ پرندے اپنے اندر روحانی صفات رکھتے ہیں اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب پرندے میرے سر کے اوپر سے گزرتے ہیں۔ جانوروں میں گھوڑا میری پہلی محبت ہے۔ پسند ناپسند کا کچھ اندازہ آپ میری کہانیوں سے بھی لگا سکتے ہیں۔"

دریا خان' بھکر سے ثوبیہ جبین گل نے کہا ہے کہ "تو ماہ میں ڈگری مکمل ہو گئی لیکن ہم وہیں رہ گئے ہمیں کون لائے گا۔ دعا ہے کہ یارم پر بالی وڈ میں فلم بن جائے۔ بنت حمید کو وقت زندہ رکھے۔ پوچھا ہے کہ آپ نے امرحہ کے والد کا رویہ راز میں رہنے دیا' اسے آشکار نہیں کیا۔"

"ثوبیہ! میرے لیے آپ نے جو نظم لکھی ہے وہ بے حد خوب صورت ہے۔ آپ کا خط بار بار پڑھی جانے والی تحریر ہے۔ دعا کے لیے شکریہ۔ امرحہ کے والد کا رویہ میں نے پوری طرح سے آشکار کر دیا ہے کہ

وہ کسی صورت عالیان کو قبول نہیں کر رہے۔ یہ رویہ ایک روایتی باپ کا تھا اور وہ اپنی جگہ پر درست تھے۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ غلط ہیں نہ عالیان۔ جو روایات چلتی آ رہی ہیں اس سے انحراف اتنی جلدی ممکن نہیں تھا۔ چونکہ وقت بہت سے مسائل کو خود ہی سلجھا دیتا ہے اسی لیے امرحہ کے والد کے لیے میں نے تحریر کیا کہ "رات کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو سورج طلوع ہونے میں وقت لیتا ہے۔"

آمنہ کاشف نے پوچھا ہے کہ "آپ کتنا پڑھی ہوئی ہیں۔ کارل کا پتا دے دیجیے۔"

"آپ کے پُر تاثر انداز نے مجھے متاثر کیا ہے بور نہیں۔ آپ کے خط سے آپ کی محبت عیاں ہے۔ میں ریجوئیٹ ہوں۔ کارل کا پتا "یارم" ہے۔ کمال کیا وہ اگلی بار لے کر آئے گا۔"

گوجرانوالہ سے رابعہ سمرو نے پوچھا ہے کہ کارل نے ایما کو اتنا تنگ کیوں کیا۔ امرحہ نے ولید البشر کو عالیان کے بارے میں کیوں بتایا۔ کیا امرحہ کو گولی لگے بغیر عالیان اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا؟"

"دعاؤں کے لیے شکریہ۔ ایما نے انگوٹھی کارل کے منہ پر ماری تھی اس لیے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ امرحہ نے بھی ستائیس اس کے سر پر ماری تھیں پھر کارل نے امرحہ کو بھی کافی تنگ کیا تھا اور اس لیے تنگ کیا کیونکہ وہ اپنی فطرت کے زیرِ اثر تھا۔ اسے یہی سب کرنا تھا۔ خاندان کے نام پر عالیان کے پاس کوئی تو ہو گا جس سے وہ دادا سے ملوا سکے یہی سوچ کر امرحہ ولید البشر کو عالیان کے بارے میں بتاتی ہے۔ موت زندگی کی سردار ہے اور زندگی موت کی وفادار۔ اپنے کسی پیارے کی موت کی آمد کی چاپ پر ایک انسان جن احساسات کا شکار ہوتا ہے وہ خود اسے موت کی وفاداری کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بہت سے فیصلے دائمی جدائی کے ہاتھوں ہی طے پاتے ہیں۔ اس سے پہلے خبر ہوتی ہے نہ احساس۔ یہ دائمی جدائی جب عالیان نے محسوس کی تو فیصلہ ہو گیا کہ وہ اس کی ظاہری کوشش تھی کہ وہ امرحہ سے دور تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ عالیان کو اس دائمی جدائی کے احساس تک لے جانا ضروری تھا ورنہ یہ بھی طے کرنا کہ زندہ رہنے کے لیے بہت ضرورتیں درپیش ہوں گی لیکن جینے کے لیے صرف "ایک"۔

حافظ آباد سے طوبیٰ فرقان کا سوال ہے کہ "کیا آپ خوش ہیں کہ آپ نے اتنی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ یارم کے علاوہ کوئی ایسی کامیابی جس پر آپ بہت خوش اور مطمئن ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ اصل کامیابی کے لیے ابھی مجھے کام کرنا ہے۔

اس سال میری کہانی "بوند بوند تماشا" کا ہندی میں ترجمہ ہوا ہے۔ یہ افسانہ انڈیا میں دوسرے افسانوں کے ساتھ کتاب میں شائع ہوا ہے۔ اسی طرح انگلش اور چند دوسری زبانوں میں تراجم کا کام جاری ہے جو میرے لیے بہت اہم ہے اور جس پر میں خوش ہوں اور شکر گزار ہوں کامیابیاں عطا کرنے والے کی۔"

ام دعا میرپور آزاد کشمیر سے پوچھتی ہیں "بے شمار رنگوں سے سجے یارم کے لیے بہت سے لوگ یہ چاہیں گے کہ اس کا سیکوئیل لکھا جائے تو آپ کا فیصلہ کیا ہو گا؟"

"اتنی دور سے خط لکھنے کے لیے شکریہ۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ وہ اس منزل پر تھی جہاں محبوب کی محبت اہم ہو جاتی ہے۔ یارم کے سیکوئیل کے لیے مجھ سے ابھی سے اصرار کیا جا رہا ہے لیکن اسے مزید لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنی کہانی بیان کی جانی تھی وہ یارم میں کی جا چکی ہے۔ اس کا سیکوئیل کبھی نہیں لکھا جائے گا۔"

ثوبیہ نور بہاولنگر سے پوچھتی ہیں کہ "آپ نے جتنے بھی افسانے لکھے، سب افسانوں میں ایک چیز مشترک ہے وہ ہے شدت۔ آپ کے افسانوں میں ہر جذبہ شدید ہوتا ہے تو کیا آپ بھی اپنے جذبوں میں، احساسات میں شدت پسند ہیں۔ آپ کے مشاغل کیا کیا ہیں؟"

"لاہور کی سڑکوں پر میں نے سائیکل چلائی ہے اور میری کھوئے والی قلفی کئی بار گری ہے۔ اسی لیے میں

نے اپنا یہ غم ناول میں لکھا ہے۔ فٹ بال، فٹ بالرز اور شائقین اور ان سے متعلق جنون یہ سب مجھے بہت پسند ہے۔ کچھ کہانیاں اور کردار در اصل اسی وقت وجود میں آتے ہیں جب وہ کسی بھی عمل یا ردعمل کی شدت کے عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔ جیسے او سرکی کی "مہر ثبت کا صدری اور دائم الحبس کا جمال۔ ان تینوں کہانیوں کا تعلق معاشرے سے تھا۔ ان کا انجام بھی معاشرے کے ہاتھ میں ہی تھا۔ تو معاشرہ جب اپنی ضد، ہٹ دھرمی، لالچ، خود غرضی کے جذبات میں شدید ہو گیا تو یہ کردار وجود میں آکر فنا ہو گئے۔

میرے مشاغل کئی ایک ہیں۔ اب میں باقاعدہ لکھنے لگی ہوں تو زیادہ تر لکھنے سے متعلق مشاغل ہیں ورنہ پہلے کافی مختلف قسم کے تھے۔ جو شاید آپ کو عجیب لگیں اس لیے میں کم ہی ان کے بارے میں کسی سے بھی بات کرتی ہوں۔

میرے بہت سے پلانز ہیں جن پر میں کام کرتی رہتی ہوں۔ جیسے ایک بار میں نے مری کا پورا پلان تیار کیا تھا کہ مری اور آس پاس کے علاقوں میں ایسا کیا کیا جا سکتا ہے کہ وہاں سیاحت کو فروغ ملے۔ یہی پلان میں نے دریائے نیلم کا بھی تیار کیا تھا۔ کہاں کہاں کیا کیا ہو گا، کہاں سے سڑک نکلے گی، کہاں فلاں طرز کا پارک ہو گا۔ کہاں دوسری مختلف چیزیں ہوں گی، کہاں کتنا ٹیکس ہو گا، وغیرہ وغیرہ۔

مری میں اور آس پاس کے علاقے میں صرف چند بنیادی اصلاحات نافذ کرنے کی وجہ سے یہ علاقہ سیاحت سے اتنے پیسے تو کما ہی لے گا کہ پسماندہ شمالی علاقوں میں سڑکوں کا جال بچھ جائے گا اور لوگوں کو روزگار مل سکے گا۔ یہ سب آپ کو عجیب لگ سکتا ہے لیکن بس یہ میرا شوق ہے۔ ہو سکتا ہے آپ یہ بھی سوچیں کہ میں یہ سب کیوں کرتی ہوں جبکہ میں ان پر عملی طور پر عمل نہیں کر سکتی تو میں اس پر اتنا ہی جواب دوں گی کہ میں کوئی بھی کام کروں، نفع اور نقصان کے بارے میں نہیں سوچتی۔ میرا کوئی مشغلہ ہو یا عملی کام میں یہ یقین رکھتی ہوں کہ زندگی میں آپ کو خود کو تیار کرتے رہنا چاہیے۔ زندگی آپ کو کبھی بھی کوئی بھی موقع دے سکتی ہے کسی بھی کام کے لیے۔ اس لیے ہوم ورک پہلے سے ہی مکمل ہونا چاہیے۔

میں کسی نئی جگہ جاؤں تو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے خیالات جاننے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ کیا سوچتے ہیں کیسے رہتے ہیں کیا کھاتے ہیں، یہ سب بھی میرا ایک معمول کا مشغلہ ہے۔"

ماہم حمید، کلثوم حمید میرپور خاص کا کہنا ہے "کہ آپ ناول کو اور آگے بڑھا سکتی تھیں۔ کیا یہ کہانی حقیقی ہے۔ اگلا ناول کب لکھ رہی ہیں۔ ان کی امی کا سوال ہے کہ عالیان کے والد کا اینڈ صحیح ہے کیوں نہیں ہے۔ امرحہ کے والد کی اجازت کے بغیر شادی کیسے ہو گئی یہ تو ایک طرح سے بغاوت ہوئی۔"

"اگر یارم کو اور بڑھا دیا جاتا تو یہ کچھ بھی ہوتی ایک کہانی نہ رہتی اور اپنا خالص پن کھو دیتی۔ یہ کہانی حقیقی نہیں ہے۔ اگلے ناول کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی کب تک لکھوں گی ابھی خود بھی نہیں جانتی۔

آپ کی امی امرحہ سے ناراض ہیں جب کہ ناول کے آغاز سے ہی یہ واضح تھا کہ دادا ہی اس کے سب کچھ ہیں۔ امرحہ کے لیے ہر فیصلہ دادا ہی کرتے ہیں۔ امرحہ اگر بغاوت کرنا چاہتی تو وہ مانچسٹر میں کر لیتی۔ پھر اسے عالیان کو انکار کرنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ بالغ تھی اور فیصلہ کر سکتی تھی۔ دادا واجد صاحب کے والد ہیں پھر ایک طرح سے واجد صاحب نے بھی اپنے والد کے فیصلے کے خلاف بغاوت کی۔ والد کی بات تو انہیں بھی ماننی چاہیے تھی۔ امرحہ نے اپنے سرپرست دادا کی رضامندی سے نکاح کیا۔ عالیان کے والد کا اختتام ان کی عالیان سے ملاقات پر ہی ہو چکا تھا۔"

اقرا ملک بہاولپور سے پوچھتی ہیں کہ اس ناول کو پڑھتے ہوئے ہم بے شمار بار ہنسے اور اداس ہوئے۔ آپ کے کیا کیا احساسات تھے۔ آپ نے نوریا اور کارل کو کپل کیوں نہیں بنایا؟"

"اقرا اگر آپ کارل بننا چاہتی ہیں تو بن جائیں لیکن کارل بننے کے لیے پہلے ڈھیٹ بننا پڑتا ہے، فیصلہ آپ

کے ہاتھ میں ہے۔

ناول لکھتے ہوئے مزاح پر تو میں ویسے ہی ہنسی جیسے کوئی بھی قاری ہنس سکتا ہے۔ اور اس میں صرف اس کا اختتام لکھتے ہوئے لکھی۔ ویرا اور کارل کی آپس میں کوئی مطابقت نہیں تھی۔ وہ تو اچھے دوست بھی نہیں تھے ان کا کپل ہونا کہانی کا حصہ نہیں تھا۔"

ملالہ اسلم خانیوال سے پوچھ رہی ہیں کہ "آپ اتنے درد بھرے الفاظ کیسے لکھ لیتی ہیں؟ مجھے پڑھتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ آپ کو لکھتے وقت تکلیف نہیں ہوتی۔ آپ لکھنا تو نہیں چھوڑیں گی۔ آپ اپنی کامیابیوں کا کریڈٹ کسے دیتی ہیں۔ میرے لیے کوئی ایک جملہ جو میں اپنی ڈائری میں لکھ لوں۔"

"کرداروں کے درد اور تکلیف کو الفاظ کے ذریعے ہی دکھایا جا سکتا ہے اور ایسا کرنا ہی تخلیق کی تکمیل ہے۔ اگر آپ کو تکلیف ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے الفاظ کو گہرائی میں جا کر محسوس کیا۔ نہیں مجھے لکھتے ہوئے تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ مجھے صرف یہ فکر رہتی تھی کہ میں نے کرداروں کے احساسات کی ترجمانی ٹھیک سے کی ہے یا نہیں۔ ملالہ میں نے لکھنا اپنی مرضی سے شروع نہیں کیا۔ میں اس بات کا ذکر کر چکی ہوں کہ میں فارغ اوقات میں لکھتی رہتی تھی بلکہ میرا ارادہ باقاعدہ لکھنے کا نہیں تھا، لیکن اب میں باقاعدہ لکھ رہی ہوں۔ تو یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے۔ لکھنا اللہ کی مرضی سے ہوا ہے تو نہ لکھنا بھی اسی کی مرضی سے ہوگا اور اگر اللہ کی مرضی میرے لکھنے میں رہی تو میں مکمل ارتکاز سے لکھتی رہوں گی۔ ناول کے اختتام میں میں نے وضاحت سے لکھ دیا ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جو ہر تخلیق کی تکمیل پر قادر ہے تو کریڈٹ بھی اسی ذات کو جاتا ہے۔ آپ کی ڈائری کے لیے یہ جملہ ہے "ہر وہ انسان عظیم ہے جو کسی بھی دوسرے انسان کا برا نہیں چاہتا۔"

رانیہ وجدان کا کہنا ہے کہ "آپ کو ویرا اور کارل کو بھی ملانا چاہیے تھا۔" کراچی سے ایمان عبداللہ کا کہنا ہے کہ میری خواہش ہے کہ آپ بلوچوں پر بھی لکھیں تو کیا آپ لکھیں گی؟

"رانیہ ویرا نائین کو پسند کرتی تھی۔ اس صورت میں عالیان کے دوست ٹرل کے ساتھ اس کا جوڑ مناسب تھا نہ ہی ضروری۔ ویسے بھی ویرا کارل کو پسند نہیں کرتی تھی۔ ایمان آپ کی فرمائش کا میں احترام کرتی ہوں اگر یہ ممکن ہو سکا تو کیوں نہیں، ضرور لکھوں گی۔"

زارا حیات چکوال سے پوچھتی ہیں کہ "آپ کو کسی ملک کی سیاحت کا موقع دیا جائے تو پہلے کہاں جانا پسند کریں گی؟"

"میں سان مارینو جانا پسند کروں گی۔ بچپن میں میں نے سان مرینو کے بارے میں ایک آرٹیکل پڑھا تھا جس میں کہا گیا تھا یہ وہی ملک ہے جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور جہاں سب ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں یا جاننے والے ہیں۔ سان مرینو کے لوگ بے حد خوش اخلاق ہیں۔ اسی لیے مجھے اس ملک کو دیکھنے کا نہیں اس ملک کے لوگوں سے ملنے کا شوق ہے۔"

کراچی سے ارم ناز کا سوال ہے "لاسٹ قسط میں پیچیدہ ڈائیلاگ کیوں تھے؟"

"میں یہ پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ کوئی ایک بھی جملہ ایسی زبان میں نہیں تھا جو اجنبی تھی یا پیچیدہ۔ اگر آپ کا اشارہ بیانیہ کی طرف ہے تو وہ کہانی کی تخلیق کاری تھی اور کہانی کے لیے ایسے ہی ضروری تھی جیسے کردار نگاری اور مرکزی خیال۔"

ریما اسد خان، احتشام شاہ، لاہور سے مسز عائشہ نے یارم کے لیے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مسز رامین اسد نے فیصل آباد سے کہا ہے کہ "میں ٹی وی کے لیے بھی لکھوں لیکن ڈائجسٹ کے لیے لکھنا نہ چھوڑوں۔"

ریما، احتشام، مسز عائشہ آپ سب کا شکریہ۔ مسز رامین میں ٹی وی کے لیے کام کر رہی ہوں بلکہ ادب لکھنا ہر حال میں میری اولین ترجیح ہے۔"

ماہم زبیر ماہم گوجرانوالہ سے پوچھتی ہیں کہ "کارل

لی ڑک والی بک کہاں سے ملے گی؟"

"میرے ذہن سے یا شاید کارل ہی آپ کو اپنے ناول میں آکر بتادے کہ کہاں سے ملے گی۔"

یمنیٰ خالد نے پوچھا ہے کہ "اگر دوبارہ یارم کو لکھوں تو اس میں کیا تبدیلی کرنا چاہوں گی؟"

"قدرتی عمل ہے کہ تخلیق کار کو اپنی چیزوں میں خامیاں نظر آیا ہی کرتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تو زیادہ ہی آتی ہیں۔ تو اس قدرتی رجحان سے تو چھٹکارا ممکن نہیں ہے لیکن فی الحال یارم میں کوئی تبدیلی نہیں کروں گی۔"

ملتان سے انس قیصر کا سوال ہے "آپ نے برازیل شہر کا انتخاب ہی کیوں کیا؟ اگر فٹ بال کا ہنگامہ برازیل شہر میں نہ ہوتا تو کہاں ہوتا؟"

برازیلا کا انتخاب عوامی ردعمل اور برازیلیوں کے شخصی رجحان پر کیا گیا۔ (برازیلین سے معذرت کے ساتھ)۔ اگر یہ ہنگامہ برازیلا میں نہ ہوتا تو یونان یا اٹلی میں ہوتا۔ لیکن میرا پہلا انتخاب بہرحال برازیل ہی تھا کیونکہ وہاں کے سیاسی حالات اس ہنگامے کے لیے سازگار تھے۔"

"حفصہ ظہیر کا سوال ہے کہ کارل کا ناول کب آرہا ہے؟"

"کم سے کم درمیان میں تین ناولز لکھنے کے بعد۔"

زینب منظور علی خان کراچی سے پوچھ رہی ہیں کہ "آپ نے رائٹنگ کا کورس کیا ہے یا پھر لکھنے کی صلاحیت ہے۔ نئے لکھنے والوں کے لیے کوئی نصیحت ہے؟"

"میں نے کوئی کورس نہیں کیا۔ لیکن اسکرین اور اسکرپٹ رائٹنگ کے لیے میرا کورس کرنے کا ارادہ ہے۔ نئے لکھنے والوں کو یہ مشورہ دے سکتی ہوں کہ پہلے وہ کرداروں پر کہانیاں (افسانے) لکھیں۔ کہانیوں میں کردار نہ بنائیں۔ یہ ان کے لیے نسبتاً "بہتر اور آسان ہوگا۔ میں کوئی نصیحت نہیں کرسکتی کیونکہ میں خود لکھنے میں نو آموز ہوں۔ ابھی مجھے خود بہت کچھ سیکھنا ہے۔ البتہ اب تک جو میں نے سیکھا ہے اس کی بنیاد پر یہ ہی کہہ سکتی ہوں کہ لکھنے میں وسیع مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، گہرائی، خیالات کی عمدگی، پختگی، توجہ اور ارتکاز بہت اہم ہیں۔ فن کوئی بھی ہو، تخلیق کوئی بھی درکار ہو مشق اور موضوع پر دسترس خاصے اہم ہوتے ہیں۔ میں اس پر پختہ یقین رکھتی ہوں کہ اگر آپ ایک سچے تخلیق کار بننا چاہتے ہیں تو آپ کو ہر طرف سے بے نیاز ہونا ہوگا۔ شہرت، دولت، خودنمائی، پذیرائی کی چاہ اور مختلف طبقہ ہائے فکر کی آرا کے خوف سے بھی۔ عوامی، شخصی ردعمل سے بے نیازی برتنی ہوگی۔ غرض آپ کو ہر مادی نفع نقصان سے بالاتر ہونا ہوگا۔"

ندا وقار نے فن لینڈ سے پوچھا ہے کہ "آپ نے مانچسٹر یونیورسٹی کے بارے میں اتنی منفرد معلومات کہاں سے لیں۔"

"جگہیں، ماحول، لوگ اپنی کہانیاں اپنے اندر ہی رکھتے ہیں۔ غور کیا جائے یا کچھ وقت ان کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ سب بتا دیتے ہیں۔ جیسے اگر آپ قیام پاکستان کے وقت کی ہجرت کی تصاویر دیکھیں اور لوگوں کے چہروں اور ان کی آنکھوں میں جھانکیں تو بہت کچھ، بہت سی کہانیاں، داستانیں خود بخود آپ پر عیاں ہو جائیں گی۔ کسی بھی مقام کی روح کو پانے کے لیے اکثر میرے لیے چند تصورات ہی کافی ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے تھوڑا بہت ممکن ہو سکا مانچسٹر یونیورسٹی کے بارے میں لکھنا۔"

"مونا فرحان نے لاہور سے پوچھا ہے کہ کیا آخری قسط میں قارئین کے پریشر میں آکر تبدیلی کی۔ میری پسندیدہ شخصیت کون ہے۔"

"اس سوال کو بارہا کیا گیا ہے اس لیے میں بتانا چاہتی ہوں کہ میں اپنی کہانی کے معاملے میں بے حد ضدی ہوں اور خود غرض بھی۔ میں کہانی میں خود اپنے جذبات بھی نہیں دیکھتی۔ کہانی وہی لکھی جائے گی جو طے ہے جو لکھا جاتا ہے۔ ناول سودا میں مجھے کہا گیا کہ میں نے بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔ اگر میں اس بے رحمی کا مظاہرہ نہ کرتی تو کہانی ملاوٹ زدہ ہوتی۔ کہانی کار کو ہر طرح کے

بیرونی عوامل سے کہانی کو ہر صورت دور رکھنا ہی ہوتا ہے اور خود کو بھی۔ جملوں اور بیانیہ میں، میں درستی اور بہتری کے پیشِ نظر تبدیلی کر سکتی ہوں لیکن کہانی میں ہرگز نہیں۔"

پاک پتن سے طارق سبحانی کا سوال ہے کہ "کیا آپ نے چمن کے ساتھ دوستی نبھائی ہے جو ڈریگن پریڈ کو اتنی نمایاں جگہ دی ناول میں؟"

"ڈریگن پریڈ مجھے ذاتی طور پر پسند ہے۔ چمن سے دوستی اپنی جگہ بہت خاص اور اہم سہی، لیکن یہ پریڈ اپنے رنگوں، جشن اور بہار کی وجہ سے قابلِ توجہ رہی اور ناول کا حصہ بنی۔"

طیبہ مستالہ گوجر خان سے پوچھ رہی ہیں کہ "امرحہ کے والد کا کچھ خاص نہیں بتایا۔ اتنا اختلاف کیا انہوں نے اور نکاح کے ٹائم کوئی ردعمل نہیں؟"

"امرحہ کے والد کے نقطۂ نظر کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا کہ وہ کسی صورت عالیان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ اس کی ماں غیر مسلم تھی اور اس کے باپ کا اتا پتا نہیں تھا۔ دادا کے ہر طرح سے منانے کے باوجود وہ اپنی رائے بدلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ امرحہ کے نکاح پر ان کا خاموش ہو جانا دراصل اس بات کی دلیل تھی کہ وہ خود کو اپنے والد کے فیصلے سے الگ رکھ رہے تھے کیونکہ وہ اس جملے کے زیرِ اثر آ چکے تھے جو دادا ان سے کہتے ہیں کہ "تمہاری بیٹی نے ایک بار خودکشی کی تھی اور وہ مری نہیں تھی، اس بار وہ خودکشی نہیں کرے گی پھر بھی مر جائے گی، پھر تم اپنی ضد کی قبر پر بیٹھ کر آنسو بہاتے رہنا۔" دادا اپنے بیٹے کی خاموشی کا احترام کرتے ہیں اور وہ امرحہ سے بھی کہتے ہیں کہ اپنے باپ کی خاموشی کا احترام کرو۔ یہ خاموشی ہی دراصل نیم رضامندی کی طرف اشارہ تھی۔"

"صائقہ نور شیخوپورہ سے پوچھتی ہیں کہ "آپ اپنی باتیں کس سے شیئر کرتی ہیں۔ جب آپ غصے میں ہوں تو کیا ری ایکشن ہوتا ہے اور کن باتوں پر غصہ آتا ہے؟"

"میں بہت کم اپنی باتیں شیئر کرنے کی عادی ہوں۔ عام معمول کی باتیں اپنے بھائی اور دوستوں سے۔ اسے میری بڑی خامی کہہ لیں یا خرابی، مجھے غصہ بہت بری طرح آتا ہے۔ ردعمل میں بہت سی چیزیں ٹوٹتی رہی ہیں، لیکن اب کچھ صورت حال بہتر کر لی ہے میں نے۔ لیکن میں نے کبھی گھر والوں کے علاوہ کسی پر اپنا غصہ ظاہر نہیں کیا۔ پہلے جن باتوں پر غصہ آتا تھا وہ ذاتی باتیں تھیں۔ آج کل کچھ لوگوں کی اصلیت سامنے آنے پر آتا ہے۔ کچھ ان غلط بیانیوں پر آتا ہے جو خود کو خاص ظاہر کرتے، لیکن بے کار لوگ اپنی بے کاری میں کشید کرتے ہیں اور زیادہ غصہ اپنے شعبے کے ان منافقوں پر آتا ہے جو اپنے دلوں اور ذہنوں میں خنجر رکھتے ہیں اور رویوں میں وار۔"

پارس فضل اور عروج مغل نے جہلم سے پوچھا ہے کہ "امرحہ کو گولی لگی تو عالیان بھی کھڑا نہ رہ سکا۔ تو پھر وہ کیونکر سلامت رہا؟"

"اگر آپ نے عالیان کی حالت پر غور کیا ہو تو آپ کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ وہ سلامت نہیں رہا تھا، جب تک کہ اسے یہ معلوم نہیں ہو گیا تھا کہ امرحہ زندہ ہے۔ اس کی پچھلی کیفیات زندگی سے بغاوت کی ہی تھیں۔"

ثروت علی اسلام آباد سے پوچھتی ہیں کہ "میں نے انٹرنیٹ پر سینئرز کے ٹریبوٹ کو بہت سرچ کیا، لیکن نہیں ملا؟ کیا یہ آپ کی تخلیق ہے؟"

"میرا ذاتی طور پر ماننا ہے کہ درسگاہوں کو خراجِ تحسین پیش کیا جانا چاہیے۔ اسی لیے میں نے یارم میں سینئرز سے ٹریبوٹ دلوایا۔ ٹریبوٹ کا یہ سین خالصتاً "میری تخلیق ہے، جہاں تک میں جانتی ہوں ایسے ٹریبوٹ نہیں دیا جاتا۔ یہ سین میرے پسندیدہ ترین سینوں میں سے ایک ہے۔"

یارم کو پڑھتے ہوئے آپ نے یہ جان ہی لیا ہو گا کہ کیسے میں نے ان سب کو موجودہ وقت میں شامل کیا، کیونکہ میں انہیں یارم کا حصہ بنانا چاہتی تھی۔

☆

ایف ایم 101 کی آر جے

عظمیٰ بلوچ ہمراہ محمد خورشید

شاہین رشید

جو لڑکیاں پڑھ لکھ کر جاب کر رہی ہوتی ہیں، ان کا یہ مسئلہ نہیں خیال کہ انہیں اپنی شادی کی فکر ہوتی ہوگی۔ کیونکہ وہ خود اتنی اسٹرونگ ہوتی ہیں کہ اپنی لائف کو زندگی کے تمام تقاضوں کے مطابق گزار سکتی ہیں۔ شادی کرنا ہر لڑکی کا ارمان ہوتا ہے، مگر کسی کے انتظار میں گھر بیٹھ جانا اور ڈپریشن کا شکار ہونا عقلمندی نہیں ہے۔ میرا تو یہ ایمان ہے کہ اگر آپ کا جوڑ آسمان پہ لکھا جاچکا ہے تو جلد یا بدیر اس سے آپ کی ملاقات ضرور ہو جائے گی۔ بس ذرا سا انتظار چاہیے۔

FM 101 کی آر جے عظمیٰ بلوچ تو مگن تھیں اپنی جاب میں اور مزے کی زندگی گزار رہی تھیں کہ آسمانوں پہ بنا جوڑا اچانک نمودار ہوا اور عظمیٰ کو بیاہ کر اپنے گھر لے گیا۔ اللہ تعالیٰ کو ایک نئی روح بھی دنیا میں لانے کی جلدی تھی اور یوں عظمیٰ ایک سال میں ماں کے رتبے کو بھی پہنچ گئیں۔ 1979 میں جنم لینے والی عظمیٰ بلوچ، عظمیٰ خورشید کیسے بنیں، آیئے ان سے ملاقات کر کے معلوم کرتے ہیں۔

"کیسی ہیں عظمیٰ۔ اور آپ کو شادی کی اور اب بیٹی کی پیدائش مبارک ہو، کیونکہ ہمیں تو علم ہی ابھی ہوا ہے۔"

"اچھا۔ بہت شکریہ۔"

"کیا مصروفیات ہیں آج کل گھرداری کے علاوہ؟"

"آج کل تو صرف گھرداری کی ہی مصروفیات ہیں۔ ایف ایم 101 سے اس لیے بریک لیا ہوا ہے کہ میں نے زندگی کا اہم ترین کام ایک سال پہلے کیا یعنی شادی کی۔ اور اب ایک اور اہم ترین کام یہ کیا ہے کہ ایک بچی کی ماں بن گئی ہوں اور یہ دنیا کا عظیم ترین کام ہے۔ اور جب ایک عورت ماں بن جاتی ہے تو اس کی ساری ترجیحات بدل جاتی ہیں تو اس فریضے سے پہلے میں نہ صرف ایف ایم 101 کر رہی تھی بلکہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام بھی کر رہی تھی۔ اور اب ان شاء اللہ بہت جلد ایڈورٹائزنگ ایجنسی تو جوائن کر رہی ہوں گی۔ اور ایف ایم 101 بھی جون کے آخر میں جوائن کروں گی۔"

"اپنی شادی کے بارے میں تھوڑی تفصیل بتائیں۔"

"میرے میاں کا نام محمد خورشید ہے اور سیلولر کمپنی اور ایک اور پرائیویٹ ادارے سے منسلک ہیں۔ ہماری شادی 20 فروری 2014 کو ہوئی۔ اور ماشاء اللہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ ہماری ایک بیٹی

بھی ہے۔ جس کا نام عائشہ ایمن ہے۔"

"خورشید صاحب سے ملاقات کب اور کہاں اور کیسے ہوئی؟"

"ہم ایک دوسرے کی فیملی کو تقریباً" تیرہ چودہ سال سے جانتے ہیں۔ کیونکہ ہم آپس میں پڑوسی ہیں۔ اور میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری شادی ان کے ساتھ ہوگی۔ اس لیے میں ان کو خورشید بھائی بولتی تھی اور ہمارا ایک دوسرے کے یہاں بہت آنا جانا رہتا تھا۔ اور ویسے بھی میری منگنی ہو چکی تھی اور میرے منگیتر "عراق" میں رہتے تھے۔ اور میرے ابا بہت پریشان رہتے تھے کہ میری بیٹی عظمیٰ اتنی دور عراق چلی جائے گی۔ اور پھر جب وہ شادی کی ڈیٹ لینے کے لیے آئے تو ابا بیمار ہو گئے اور ابا کو بیمار دیکھ کر میں جذباتی ہو گئی کہ نہیں مجھے شادی نہیں کرنی' زندگی میں بہت سی لڑکیاں شادی نہیں کرتیں' میں بھی نہیں کروں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تو اپنے امی ابو کے ساتھ رہوں گی' بڑا جذباتی سا سین ہو گیا تھا اور یوں ہم نے منگنی توڑ دی۔ اتفاق سے خورشید کی امی ہمارے گھر آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے میری امی سے کہا کہ "باجی ہم ایک دوسرے کو اتنے عرصے سے جانتے ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ آپ اپنی بیٹی ہمیں دے دیں۔ اور یوں بیٹھے بٹھائے رشتہ پکا ہو گیا الحمد اللہ اور دو ہفتے کے اندر اندر میری شادی ارینج ہو گئی۔ جبکہ کہا یہ گیا تھا کہ ایک سال بعد کریں گے۔"

"اچھا! تو پھر یہ سب کچھ کیسا لگا۔ بھائی بھائی کرتے سرکا سائیں بن گیا؟"

"ہاں بہت عجیب سا لگا۔ میں ان لڑکیوں میں سے ہوں جو خود اپنی برائیں بتاتی ہیں اور میں ان لڑکیوں میں سے ہوں جن کو "سوئی" پکڑنا بھی نہیں آتی۔ روٹی پکانا بہت مشکل کام لگتا ہے مجھے۔ اور سب میرے بارے میں جانتے تھے تو سسرال میں آکر سسرال کی جو پرابلمز لڑکیاں فیس کرتی ہیں وہ مجھے نہیں کرنا پڑیں اور ہماری امی ساس کو پتا تھا کہ عظمیٰ نے لڑکوں کی طرح باہر

نکلی ہے۔ ہمیشہ مہندی سے چولہا باندی کچھ نہیں کیا تو انہوں نے مجھ سے کچھ توقعات بھی نہیں رکھیں۔ بلکہ انہوں نے ہی مجھے کھانا پکانا سکھایا اور بڑے پیار کے ساتھ۔"

"یہ تو ضرور کہا ہوگا کہ کچھ سیکھ کر ہی آجاتیں۔ کتنی پھوہڑ ہو۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہوگا؟"

بے ساختہ ہنستے ہوئے۔ "ہوا یہ کہ ہماری فیملی میں یہ مشہور تھا کہ عظمیٰ کو بریانی بڑی اچھی پکانی آتی ہے۔ تو ایک دن میری ساس نے کہا کہ بیٹا آج بریانی ہی پکا کے کھلا دو۔ اور جب میں نے بریانی بنائی تو وہ تو "دھنت" بن گئی۔ اور وہ پھر لڈو بریانی جب سب نے کھائی تو خوب شرمندگی ہوئی۔ مگر اس کا ذائقہ اچھا تھا۔ اور دیب پہلی بار کھیر میں ہاتھ ڈالا تھا تو وہ بہت اچھی بنی تھی۔ کیونکہ الحمد اللہ جو ڈبے آج کل دستیاب ہیں انہوں نے کام آسان کر دیا ہے' لیکن میری اپنی امی اور خورشید کی امی کہتی ہیں کہ اصل ذائقہ تو انسان کے ہاتھ کا ہوتا ہے۔ خلوص و محبت کا ہوتا ہے۔"

"سسرال میں کتنے لوگ ہیں؟ اور کہاں سے تعلق ہے ان کا۔ عمر کا کتنا فرق ہے آپ دونوں میں؟"

"میری دو نندیں ہیں۔ ایک دیور ہے۔ جو کہ دبئی

میں رہتا ہے۔ سسر حیات نہیں ہیں۔ ساس کو اللہ
میاں لمبی عمر دے۔ بس چھوٹی سی فیملی ہے ہمیں گھر کی
بڑی بہو ہوں۔ ان کا تعلق کراچی سے ہی ہے۔ ان کی
پیدائش پرورش سب کراچی کی ہے اور عمر کا کوئی فرق
نہیں ہے بلکہ مجھے جب پتا چلا کہ یہ ایک سال مجھ سے
چھوٹے ہیں تو میں بہت ہنسی کہ ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ
یہ تو دس سال بڑے لگتے ہیں اور دنیا کیا کہے گی۔ یہ
27 جولائی 1980 کو پیدا ہوئے اور میری
1979 ہے اور دیکھو کتنی عجیب بات ہے کہ

عورتیں اپنی عمر چھپاتی ہیں مگر میں سب کو بتا دیتی ہوں۔
اور انہوں نے ایم بی اے کیا ہوا ہے۔ اور ہو سکتا ہے
کہ ہم بھی دبئی ہی شفٹ ہو جائیں۔ ویسے میرا دل
نہیں ہے کیونکہ پاکستان نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے
ہمیں یہاں پہ ہی رہنا چاہیے۔"

"اللہ نے جلدی اولاد کی خوشخبری سنا دی تو ہنی
مون پہ تو نہیں جا سکی ہوں گی؟"

"جی ہاں۔ نہیں جا سکے۔ اور اللہ کا بڑا احسان
ہے کہ اس نے مجھ پر "فوراً" اپنا کرم کر دیا۔ ورنہ تو
ہمارے خاندان میں یہ بڑا پرابلم ہے کہ جب کسی لڑکی
کی شادی بڑی عمر میں ہو تو کہتے ہیں۔ "ہائے ہائے اتنی
بڑی عمر میں شادی ہوئی ہے۔ پتا نہیں اس کے بچے بھی
ہوں گے یا نہیں۔" اور جو ہماری ڈاکٹرز ہیں ان کے
پاس جاؤ تو کہتے ہیں "تو اتنی بڑی عمر میں شادی ہوئی
آپ کی' آپ کا کیس تو بڑا پیچیدہ ہو گا۔" عورت ویسے
ہی ڈر جاتی ہے کہ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا
ہے۔ اور مجھے یاد ہے کہ شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد
ہمارے میاں صاحب "حج" پہ گئے۔ اور انہوں نے
مجھے کال کی کہ "آج میں دعا مانگ کے آیا ہوں کہ اللہ
تعالیٰ ہمیں ہماری پہلی اولاد "بیٹی" دے اور ماشاء اللہ
اللہ نے دعا قبول کی اور ہماری پہلی اولاد بیٹی ہی ہوئی۔
اور میں بہت خوش قسمت ہوں کہ ہم جوائنٹ فیملی
رہتے ہیں۔ گھر میں بزرگوں اور دیگر لوگوں کا ہونا بہت
ضروری ہے۔"

"بہ حیثیت پڑوسی کے تو آپ ایک دوسرے کو
جانتے ہی تھے۔ شادی کے بعد آپ نے خورشید
صاحب کو کیسا پایا؟"

"بہت اچھا پایا۔ ایک سال گزر گیا ہے مگر مجھے ابھی
تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کو کس طرح کے کس
رنگ کے کپڑے پسند ہیں۔ میں ان کو کس رنگ کے
کپڑوں میں اچھی لگتی ہوں یا ان کے دوست کتنے
ہیں۔ اور ایمان داری کی بات ہے کہ میں انہیں بہت
لاابالی سا انسان سمجھتی تھی اور یہ سمجھتی تھی کہ ان کو
کسی کی پروا نہیں ہے۔ مگر الحمد للہ جتنی نرم خو اور پیار
کرنے والی میری ساس ہیں ان سے کہیں زیادہ محبت
اور خلوص اور نرم خو خورشید ہیں۔ بہت شکر گزار ہوں
اپنے رب کی کہ اس نے مجھے خورشید صاحب جیسا
شوہر دیا۔ اور ہم سفر اچھا ہو تو پھر ہر سفر آسان ہو جاتا
ہے۔"

"لڑائی جھگڑا ہوا کبھی گھر میں کام کرنے کی باری
پہ؟ اور خورشید صاحب مزاج کے کیسے ہیں؟"

"ایک دو بار وہ بھی اس طرح کہ مجھے بھنڈی پسند
نہیں ہے اور مجھے بھنڈی کھانے کے لیے کہا گیا۔ اور
کبھی کسی بات پہ نہیں ہوئی۔ اور ان کے گھر میں
"میرا" "تیرا" نہیں ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ
کوئی میرے بارے میں کچھ کہے تو مجھ سے وضاحت
کر لینا' بجائے اس کے کہ بدگمانی پیدا کرو۔ اور کوئی
باری واری نہیں ہے۔ جس کو جو کام ملتا ہے وہ کر لیتی
ہے اگر برتن پڑے ہیں تو اگر میں کچن میں گئی تو میں دھو دیتی
ہوں اور اگر کوئی نند گئی تو اس نے کر لیا۔ باریوں کا بڑا
پتہ ہوتا ہے۔ گھر میں مہمان آجائیں تو ہم ای کو کام
نہیں کرنے دیتے بلکہ ہم تینوں مل کر لیتی ہیں۔ یہ سین
نہیں ہے کہ آج تمہاری باری ہے تو کل میری باری
ہے بلکہ "تینوں" ڈیسائیڈ ہیں کہ آج یہ پتا ہے تو کل
یہ پتا ہے۔ اور جہاں تک مزاج کی بات ہے تو نہ سمجھ
میں آنے والے بندے ہیں' اچھے ہیں تو بہت ہی اچھے
ہیں۔ غصہ میں نے ان میں نہیں دیکھا' معاملہ فہم ہیں

لیکن جب کبھی بگڑتے ہیں کسی بات پر تو منہ سے ایک لفظ نہیں بولیں گے خاموش ہو جائیں گے اور یہ چپ والی مار بہت بری ہوتی ہے۔ اور میں ٹینشن میں آجاتی ہوں کہ اس بندے کی چپ کو کس طرح توڑا جائے۔ اور میں تو اگر غصے میں ہوتی ہوں تو رو رو کر بتا رہی ہوتی ہوں، چیخ چیخ کر بتا رہی ہوتی ہوں کہ میں غصے میں ہوں۔

"کھانے میں نخرے ہیں؟ کہتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں سے پکاؤ؟"

"میں نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے کھانا پکانا نہیں آتا اور آپ کی امی مجھے زیادہ بہتر طریقے سے جانتی ہیں۔ اور اگر آپ کو کچھ پسند ہے تو مجھے بتائیں۔ میں سیکھ لوں گی۔ تو انہوں نے بتایا کہ انہیں چکن شاشلک بہت پسند ہے اور چکن جلفریزی اور یہ دونوں چیزیں میں نے ایک سال میں ابھی تک نہیں سیکھیں اور اس لیے نہیں سیکھیں کہ میری ساس مجھے کچن میں جانے نہیں دیتیں۔ کہ کام تو ہو رہا ہے پھر کیا ضرورت ہے، مگر میں ان شاء اللہ چکن شاشلک ضرور سیکھوں گی۔ کیونکہ زندگی میں اتنے کام کیے ہیں تو یہ بھی بھلا کوئی کام ہے۔"

"کچھ زیادہ تعریفیں ہو گئیں خورشید صاحب کی۔ یہ بھی سوچ لیں کہ ہمارے مذہب میں چار شادیوں کی اجازت ہے؟؟"

"قہقہہ" "یہ تو نصیب کی بات ہے، اگر ان کے نصیب میں دوسری ہے تو کون روک سکتا ہے بھلا اور ابھی میری زندگی اچھی گزر رہی ہے۔ کیا پتا بعد میں اور اچھی گزرے۔ کیا پتا بہت بری گزرے، آنے والے دنوں کے بارے میں تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

"رومینٹک ہیں"

"کوئی خاص نہیں، کبھی کبھار کہہ دیتے ہیں کہ آج اچھی لگ رہی ہو، ویسے اپنی فیملی میں اور ہماری فیملی میں ان کو سب کی سالگرہ میں یاد رہتی ہیں۔ اور شرکت بھی کرتے ہیں۔ ویسے ان کو میں بہت گھریلو ٹائپ کی سادگی میں اچھی لگتی ہوں۔ مگر کہیں دعوت ہے یا ہمارے گھر میں دعوت ہے جو کہ اکثر ہوتی رہتی ہیں تو اس میں ان کا دل چاہتا ہے کہ میں ٹھیک ٹھاک تیار ہوا کروں اور یہ خود بھی اپنے لباس کا بہت خیال رکھتے۔"

"گھر کے کاموں میں یا بچی کی تربیت میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟ خیال رکھتے ہیں۔"

"بہت ہاتھ بٹاتے ہیں اور جب میں امید سے تھی، تب انہوں نے میرا بہت خیال رکھا کیونکہ دوران پریگنینسی میرے تین بار ایکسیڈنٹ ہوئے۔ ایک بار رکشہ الٹ گیا تھا جب میں آفس سے آ رہی تھی۔ دوسری بار میں اپنے گھر کے پاس سے روڈ کراس کر رہی تھی تو بائیک سے ٹکر ہوئی اور بائیک کے ساتھ گھسیٹتی چلی گئی۔ اسی طرح ایک اور ایکسیڈنٹ ہوا جب میرا نواں مہینہ چل رہا تھا۔ تو انہوں نے ہمیشہ میرا خیال رکھا اور اب بھی رکھتے ہیں۔ رات کو اگر بیٹی کے لیے اٹھتی ہوں تو یہ بھی میرے ساتھ ہی اٹھتے ہیں۔"

"رسم و رواج میں آپ دونوں میں فرق ہو گا۔ تو سب ہوئیں رسمیں!"

"جی ہم دونوں فیملیز کی رسموں میں کافی فرق ہے۔ ہم سندھیوں کی تو کافی رسمیں ہوتی ہیں۔ ہم نے تو ساری کیں اور ہم سب نے انجوائے کیا۔ اور عروسی جوڑا سسرال کی طرف سے تھا۔ اور ولیمہ کا جوڑا بھی سسرال کی طرف سے تھا اور میرے سسرال والوں نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کمرے کا فرنیچر ہم خود لیں گے آپ نے اپنی بچی کو جو کچھ دینا ہے دے دیں۔ بارات کا کھانا بھی ان ہی لوگوں نے دیا۔"

"رخصتی کے وقت، نکاح کے وقت کیا تاثرات تھے؟"

"رخصتی کے وقت تو میں بے ہوش ہو گئی تھی اور نکاح کے وقت جب میں دستخط کر رہی تھی تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میری شادی ہو رہی ہے اور میں اپنے نکاح نامے پر دستخط کر رہی ہوں۔ رو رو کر میرا برا

حال تھا ہماری۔ جو ڈھولکی ہوئی تھی اس میں ریڈیو کی تمام اہم شخصیات نے شرکت کی تھی اور ماشاء اللہ بہت شاندار ڈھولکی ہوئی تھی۔ ریڈیو والوں نے پروفیشنل سنگرز بلائے ہوئے تھے۔ اور میں نے ماہیوں سے جو رونا شروع کیا تو وہ رخصتی تک جاری رہا جب تک کہ میں بے ہوش نہیں ہو گئی، کیونکہ میں اپنے اماں ابا کی بہت لاڈلی تھی۔ اور ہم سات بہنیں ہیں اور میرا نمبر چوتھا ہے سب کی شادیاں کروادیں۔ اب ایک بھائی اور دو بہنیں رہ گئی ہیں۔"

"کبھی خیال آیا کہ شادی جلدی ہو جاتی تو اچھا تھا؟"

"نہیں نہیں۔ ایسا کچھ خیال نہیں آیا، بلکہ میں تو ابھی بھی کہتی ہوں کہ شادی ابھی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ کچھ دن اور گزرنے چاہیے، لیکن شکر ہے کہ جو ہوا اچھا ہوا۔ اچھا لائف پارٹنر مل گیا اور خوب صورت بچی کی ماں بن گئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ اتنی فکریں ماں باپ کو نہیں ہوتیں جتنی فکریں رشتے داروں کو ہوتی ہیں کہ "ہائے" ابھی تک شادی نہیں ہوئی، ہاں بھئی کما رہی ہے نا۔ گھر جو چلاتا ہے اس نے۔ میرے میاں صاحب کہتے ہیں کہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اللہ نے ہمیں جلدی اولاد دے دی، ورنہ یہ رشتے دار نہ تمہیں چھوڑتے نہ مجھے۔ اور سچ بات تو یہ بھی ہے کہ گھر توڑنے میں بھی یہی رشتے دار ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ اپنے گھر کی بات اپنے گھر والوں کو بھی نہ بتائیں۔ اور والدین کو بھی حوصلہ ہو جانا چاہیے۔ بس شادی کروی بچی کی تو کر دی۔ اب اسے خود نبھانے دیں۔ نہ لڑکی گھر جا کر کچھ بتائے اور نہ ہی گھر والوں کو چاہیے کہ وہ بیٹی کو کریدیں کہ گھر میں کیسے رہتی ہو۔ شروع کا ایک سال سسرال والوں کے مزاج کے مطابق چلیں۔ پھر دیکھیں کہ آپ کس قدر پسندیدہ ہو جائیں گی اپنے سسرال والوں کی۔"

"کیونکہ لڑکی کو ہی چیلنج ہوتا ہوتا ہے۔"

"بالکل جی۔ مجھ سے کسی نے پوچھا کہ ساس، ساس ہی کیوں رہتی ہے۔ ساس ماں کیوں نہیں بنتی، تو میں نے کہا کہ پہلے تو وہ ماں اپنے بیٹے کی ہے، جس کے توسط سے وہ بہو لے کر آتی ہے۔ تو بہو اپنے آپ کو بہو نہ سمجھے بلکہ بیٹی سمجھے تو پھر ساس نظر نہیں آئے گی، پھر وہ ماں نظر آئے گی۔ کیا بیٹوں کی خامیوں پر ماں نہیں ڈانٹتی؟ کیا ماں نہیں روک ٹوک کرتی تھی؟ اگر ساس ایسا کرتی ہے تو بہوئیں کیوں محسوس کرتی ہیں، ان کو محسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

"چلیں جی۔ اب آخر میں یہ بتائیں کہ جب خورشید صاحب کمرے میں آئے تو پہلا جملہ کیا بولا خورشید صاحب نے؟"

"انہوں نے کہا السلام علیکم پھر انہوں نے شکرانے کے نفل پڑھے۔ اور ایک بات جو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی کہ "غلطی پیسے کو کبھی رشتے پر اہمیت مت دینا۔ رشتہ زیادہ اہم ہے، پیسے کی وجہ سے نہ رشتے گنوانا اور نہ ہی کسی سے لڑنا۔ پیسہ تو بس آنی جانی چیز ہے۔ رشتے بہت اہم ہوتے ہیں۔"

"اور کوئی خاص بات جو آپ کہنا چاہیں۔"

"ہاں ضرور۔ ہمارے والدین نے ہمیں اعتماد دیا کہ جس کی وجہ سے میں باہر نکلی کمانے کے لیے۔ میں نے زندگی میں برا وقت بھی دیکھا، آج اللہ کا شکر ہے کہ والدین بھی خوش حال ہیں اور میں تو بہت زیادہ خوش حال ہوں۔ ہاں نکاح سے پہلے میں نے اپنے سسرال والوں کو کہہ دیا تھا کہ میں اگر جاب کروں گی تو اپنے والدین کو سپورٹ کرنے کے لیے تو الحمد للہ اس بات پر میرے سسرال والوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ ہی میرے شوہر کو۔"

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- تانیہ
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا

پھر یوں سمجھیں کہ راستے ہموار ہونے شروع ہوئے۔"

"اچھا۔ کس طرح۔؟"

"پھر جناب 1996ء میں آل پاکستان مقابلہ نعت خوانی میں، میں نے سندھ کی نمائندگی کی۔ پھر 1998ء کے آل پاکستان مقابلہ نعت خوانی میں حصہ لیا اور اس کے بعد 1999ء میں بھی حصہ لیا۔"

"صرف حصہ لیا یا کوئی انعام بھی ملا؟"

"بس اسی کا تو افسوس ہے۔ 1996ء میں جب مجھے کوئی ایوارڈ نہیں ملا تو مجھے یاد ہے کہ منظور الکونین صاحب نے جیوری سے کہا کہ اس بچی نے اتنی اچھی نعت پڑھی ہے۔ ون، تھرڈ نہ سہی مگر خصوصی ایوارڈ تو ملنا چاہیے تھا۔ خیر پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ مجھے 1999ء پہلا انعام ملا۔ آل پاکستان مقابلہ نعت خوانی میں۔"

"کبھی خیال آیا کہ گانے وغیرہ بھی گانے چاہئیں؟"

"بالکل خیال بھی آیا اور آفرز بھی آئیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں ساتویں کلاس کی طالبہ تھی تو پی ٹی وی والوں نے مجھے بلایا کہ آپ بچوں کے پروگرام کے لیے گانے بھی گائیں اور پیروڈیز بھی کریں تو میرے ماموں نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کوئی فلمی گانے تو ہیں نہیں کہ کوئی اعتراض کرے گا۔ اس پروگرام کو دیکھ کر ایس ٹی این نے اپنے پروگرام "میوزک چیلنج" کے لیے بلایا۔ میں نے آڈیشن دیا اور کامیاب بھی ہوگئی، مگر والد صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری، تو پھر میوزک کی فیلڈ کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ ورنہ آپ یقین کریں کہ مجھے غزلوں کی آفرز بھی آئیں اور اداکاری کی آفرز بھی۔۔۔ مگر بس میں نے سوچ لیا کہ

اگر نام بنانا ہے تو پھر نعت خوانی میں ہی بنانا ہے اور شکر الحمد للہ کہ اللہ نے اس خواہش کو پورا کیا اور اب تو یہ ہی میرا لائحہ عمل ہے۔"

"کبھی مذہبی پروگرام ہوسٹ کرنے کا موقع ملا؟"

"جی جی بالکل ملا اور کافی پروگرام ہوسٹ کر چکی ہوں۔ کیو ٹی وی سے کرتی ہوں۔ "زم زم" چینل سے میزبانی کی' نیٹ چینل سے رمضان المبارک کے پروگرام کیے۔"

"لائیو ہوتے ہیں یا ریکارڈنگ چلتی ہے؟"

"کچھ لائیو، کچھ ریکارڈنگ' ویسے مجھے لائیو پروگرام کرنے میں زیادہ مزا آتا ہے اور پتا نہیں کیوں آسان بھی لگتا ہے۔ ریکارڈنگ میں بہت ٹائم لگ جاتا ہے۔"

"گھر کی دیکھ بھال کے لیے ٹائم مل جاتا ہے؟"

"جی اللہ کا شکر ہے' مل جاتا ہے' سب کچھ پکا لیتی ہوں۔ مجھے کوکنگ کا شوق بھی ہے۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ گھریلو ذمہ داریاں بھی اٹھا لیتی ہوں۔ یعنی اپنے شوہر' بچوں اور گھر والوں کو پورا وقت دیتی ہوں۔ کسی کو شکایت کا موقع نہ دوں یہ میری کوشش ہوتی ہے۔"

لے کر اپنے آپ کو باؤنڈ نہیں کرتی اتنا ہی کام لیتی ہوں۔ جتنا آسانی سے کرسکوں۔ اور باہر جانے کے لیے بھی ٹائم نکال سکوں۔"

"ڈراموں میں چینج آیا ہے۔ آپ کے خیال میں اچھا آیا ہے یا برا؟"

"کوئی خاص اچھا چینج نہیں آیا ہے۔ اب تو ہر ڈرامے میں 'شادیاں گانے۔ یہ سب کچھ ہمارے وقتوں میں نہیں ہوتا تھا۔ ایک اچھی کاسٹ ہوتی تھی۔ اس طرح ایکٹر بھرے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ اب جو نئے ڈائریکٹرز ہیں انہوں نے سوچ لیا ہے کہ اب پہلے شادیاں ہوں گی۔ شادیوں میں مہندی ہوگی' پھر کہانی آگے بڑھے گی۔ تو بلاوجہ کی کہانیاں لمبی ہوتی ہیں کھینچ تان کر پرائم ٹائم کے ڈراموں کو 20 سے

دستک دستک دستک

شاہین رشید

ہما نواب

"کیا حال ہیں؟ کہاں غائب ہو جاتی ہیں؟ کبھی تو اتر کے ساتھ نظر آتی ہیں اور کبھی ایک دم غائب؟"

ہنستے ہوئے۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ امریکا میں رہتی ہوں۔ وہاں جاب بھی کرتی ہوں۔ تو بس آنا جانا لگا رہتا ہے اور جاب کے بارے میں تو آپ کو بتایا ہی تھا کہ ایک بارڈویئر اسٹور میں کام کرتی ہوں اور یہ جاب بالکل میری پسند کی جاب ہے۔"

"آپ تو لوگوں کی پسندیدہ فنکارہ ہیں اور مجھے یاد ہے کہ جب آپ پاکستان آئیں تو سب نے کہا کہ یہ تو ماضی کی حسین ترین فنکارہ ہیں تو آپ ان سے انٹرویو کریں۔"

"بہت شکریہ کہ لوگ ابھی تک پسند کرتے ہیں۔ اور چونکہ آنا جانا لگا رہتا ہے تو اس لیے بہت زیادہ کام

30 اقساط تک لے جایا جاتا ہے۔ اور "سوپ" تو ماشاءاللہ ہوتے ہی 100 سے زیادہ اقساط کا ہے۔"

"پاکستان آئیں تو پرانے آرٹسٹوں سے ملاقات ہوئی؟"

"جی جی بالکل ہوئی۔ بہت اچھا لگا سب سے مل کر اور ہم انٹرمل کر بیٹھتے ہیں اور جب کاسٹ ہو رہی ہوتی ہے کسی ڈرامے کی تو اس سے بھی کئی پرانے لوگ سامنے آجاتے ہیں اور بڑا اچھا لگتا ہے کہ اچھا یہ بھی کام کر رہی ہیں یہ بھی کام کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اب کام میں بہت فرق آگیا ہے۔ نہ ریہرسل ہوتی ہیں نہ ہی کسی کے فیڈ بیک کا انتظار ہوتا ہے۔ اب تو سب کچھ تیار کر کے آن ایئر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے فلم تیار کر کے نمائش کے لیے پیش کردی جاتی ہے۔ تو بہت فرق پڑا ہے۔"

"فلموں میں بھی کام کرنے کا شوق ہے؟"

"فلمیں دیکھتی شوق سے ہوں، مگر اس معاملے میں کریزی نہیں ہوئی ہوں کہ کام بھی کروں۔ میں کب یہاں رہتی ہوں۔ میں تو ایک دو ماہ کے لیے آئی تھی۔"

"اور لوگوں کی محبت نے آپ کو قید کر دیا؟"

"ہاں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ محبت تو مجھے بہت ملی ہے اور رائٹرز سے گزارش ہے کہ اچھا لکھیں اپنی سوچ کے مطابق لکھیں۔ یہ نہیں کہ فلاں نے اس ٹاپک پہ لکھا وہ ہٹ ہو گیا تو میں بھی ہٹ ہو جاؤں گا یا ہو جاؤں گی کہ ایک نے شادیاں دکھائیں اور موت دکھائی تو میں بھی دکھاؤں لوگوں کی ہمدردیاں لینے کے لیے تین سیریلز تو میں نے ایسے کیے ہیں کہ جن کی اسٹارٹ میں ہی اسپتال کا سین ہے' اور موت کا سین ہے۔ تو اسپتال کوئی اچھی جگہ نہیں ہے' خدا نہ کسی کو لے جائے۔ خدا کا کچھ خوف کریں۔ ہماری ایک آرٹسٹ ہیں ان کے لیے ایک سین تھا کہ ان کے بیٹے کا جنازہ پڑا ہے اور وہ رو رہی ہیں تو ان آرٹسٹ نے تو صاف انکار کر دیا کہ میں تو ایسے سین کروں گی ہی نہیں۔ باہر کے ملکوں میں ایسے سین ہوتے ہیں تو لکھا ہوا آجاتا ہے کہ کمزور دل کے لوگ اس سین کو نہ دیکھیں، مگر ہمارے یہاں تو ان باتوں کا (Concept) کانسیپٹ ہی نہیں ہے۔ ایسی سوچ کے لیے بہت لمبا ٹائم چاہیے ہمارے لوگوں کو۔"

"2015ء کیسا گزر رہا ہے آپ کا؟"

"اچھا گزر رہا ہے۔ شکر الحمدللہ' صبح اپنے ہاتھوں پیروں کے ساتھ اپنی سانسوں کے ساتھ اٹھتی ہوں تو رب کا شکر ادا کرتی ہوں اور دیکھا جائے تو 2014ء بھی بہت اچھا گزرا' پاکستان آئی' لوگوں نے محبت دی' ڈیم کہ کام ملا۔ اسکرین پہ دوبارہ آئی۔ ناظرین نے پسند کیا تو اچھا لگا۔ بس انسان کو زندگی میں کیا چاہیے ہوتا ہے عزت اور پیار۔"

"اتنے برسوں کے بعد آئیں پاکستان' کیا محسوس کیا آپ نے؟"

"غربت دیکھ رہی ہوں۔ آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ جو امیر ہے' بہت امیر ہے' گھر میں پانچ پانچ گاڑیاں کھڑی ہیں اور کسی کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ دھوپ میں لوگ محنت مزدوری کرتے ہیں اور انہیں اچھا معاوضہ نہیں ملتا۔"

"جی یہ تو ہے۔ اچھا یہ بتائیں کہ کھانے پینے سے اور کھانا پکانے سے لگاؤ ہے یا نہیں۔"

"کھانے پینے سے بھی بہت لگاؤ ہے اور پکانے سے بھی۔ آپ مجھے فوڈ لور کہہ سکتی ہیں۔ اور کوئی خاص ڈش پسند نہیں ہے۔ موڈ پر منحصر ہوتا ہے کہ کیا کھانا ہے اور جو موڈ فرمائش کرے وہی ڈش پسندیدہ ہو جاتی ہے۔ چاہے پالک گوشت ہو یا دال چاول جس وقت جس کی طلب ہو وہ ہی پسندیدہ ہو جاتی ہے۔ موڈ اچھا ہوا موسم اچھا ہو اور بھوک ہو تو پھر سب کچھ اچھا لگ رہا ہوتا ہے۔"

"آج کل کے رائٹرز کے لیے آپ کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"ہمارے جو نئے رائٹرز ہیں ان کے لیے یہی کہوں گی کہ پلیز آپ اپنے فارمیٹ کو تھوڑا تبدیل کریں۔ عورتوں کو اسٹرونگ دکھائیں کہ اب خواتین اتنی کمزور نہیں رہیں کہ ہر ظلم سہتی رہیں اور اپنے حق کے لیے کچھ نہ بولیں اور یہ بھی دکھائیں کہ لڑکیاں صرف بنتی سنورتی نہیں ہیں۔ بلکہ اچھی جاب بھی کرتی ہیں۔"

"اب تو ڈراموں میں گھر کی نوکرانیاں بھی حد سے زیادہ ہی سنوری ہوئی ہوتی ہیں۔"

"ہاں جی۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو ریٹنگ کیسے آئے گی اب تو ہمارے ڈرامے فلموں کی طرح ہو گئے ہیں اور اب ویسے اچھی فلمیں بننا شروع ہو گئی ہیں اور یہ بہت اچھی بات ہے۔ اور میڈیا اس چیز کو اجاگر کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ہماری اپنی فلموں کو دیکھیں۔"

"آپ نے کیا ہے فلم میں کام؟"

"میں نے کیا ہے ایک فلم میں کام "تارے نی" جو انجم

شہزاد کی ڈائریکشن ہے' اختر صہبائی نے اسے تحریر کیا ہے۔ اور سچ بتاؤں تو میں کراچی میں فلم ہی کرنے آگئی تھی۔ ابھی "آن ایئر" نہیں ہوئی' تو اگر اچھی فلمیں ملتی ہیں تو ضرور کروں گی۔"

"ان شاء اللہ پھر بات کریں گے جب آپ کا نیا سیریل آن ایئر ہو گا۔"

☼ ☼ ☼

حوریہ فہیم۔ (نعت خواں)

"جی حوریہ کیسی ہیں۔ آج کل تو بہت مصروفیات ہوں گی؟"

"جی الحمد اللہ اچھی ہوں۔ بالکل ٹھیک کہا آپ نے کہ آج کل مصروفیات بہت پسند ہیں۔ یوں تو ماشاء اللہ سے سارا سال ہی مصروف رہتی ہوں۔ مگر ربیع الاوّل' شعبان اور رمضان تو مصروف ترین مہینے ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ کہوں کہ مصروفیات کا آغاز "رجب" کے مہینے سے شروع ہو جاتا ہے تو غلط نہ ہو گا۔"

"زیادہ مصروفیات چینلز پہ ہوتی ہیں یا گھر میں؟"

"ربیع الاوّل کے مہینے میں تو زیادہ تر مصروفیات گھروں میں اور محفلوں میں ہوتی ہیں جبکہ شعبان اور رمضان میں زیادہ تر مصروفیات چینلز پہ ہوتی ہیں۔ اور سچ بتاؤں کہ ہمارے گھروں میں تو پورے سال ہی میلاد کی محفلیں ہوتی ہیں اور جن مبارک مہینوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں تو لوگ منت سماجت کی حد کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کہیں تو کوئی سفارش لے آئیں آپ کے لیے۔"

"اچھا گڈ۔ اتنی ڈیمانڈ ہوتی ہے؟"

"جی الحمد اللہ! اتنی ہی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔"

"اور دوسری والی ڈیمانڈ آپ کی ہوتی ہو گی؟"

"ارے نہیں۔ میں تو سچ پوچھئے نہیں مانگتی۔ کوئی اپنی خوشی سے دے دے تو انکار بھی نہیں کرتی کہ وقت تو بہر حال ہم دیتے ہی ہیں۔ باقی یہ دیکھا گیا ہے کہ لوگوں نے اس کو کمائی کا ذریعہ بنایا ہوا ہے تو یہ اپنی اپنی سوچ اور ضرورت کی بات ہے۔"

"ٹائم کی بات کی تو مخصوص ٹائم ہوتا ہے یا یہ کہ آپ آگئے ہیں تو جب چاہیں چھوڑ دیں؟"

"نہیں نہیں ایسا نہیں ہوتا۔ ٹائم کے لیے ہم پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ کتنا ہو گا۔ ایک یا آدھا گھنٹہ سے زیادہ میں ٹائم نہیں دیتی۔ اور ایسا نہ کروں تو پھر دوسرے بے چارے تو انتظار ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔"

"کتنے سال کی عمر سے حمد و نعت پڑھ رہی ہیں؟"

"شاید آپ یقین بھی نہ کریں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں بہت کم سنی سے حمد و نعت پڑھ رہی ہوں اور مجھے تو یاد بھی نہیں' لیکن میرے بڑے مجھے بتاتے ہیں کہ جب میں تین' تین سال کی تھی تو میں نے نعتیں پڑھنا شروع کیں اور پھر مجھے یاد ہے کہ جب چاروں طرف سے میری تعریفیں ہوتی تھیں تو پھر میں نے سوچ لیا تھا کہ اپنے اس شوق کو آگے تک لے جاؤں گی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے مواقع دیے اور میں آگے سے آگے بڑھتی چلی گئی۔"

"ماشاء اللہ۔ اس آگے سے آگے بڑھنے میں کچھ رکاوٹیں بھی آئیں؟ یا سب کام آسانی سے ہو گئے؟"

"نہیں جی! سب کام آسانی سے کہاں ہوتے ہیں' جگہ بنانے کے لیے محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ جس زمانے میں' میں نے نعتیں پڑھنی شروع کیں' اس زمانے میں صرف پی ٹی وی ہی ہوتا تھا اور پی ٹی وی کے ہمیشہ سے اپنے نخرے رہے ہیں۔ میں جب بھی آڈیشن کے لیے جاتی تو یہ ہی کہا جاتا تھا کہ ہم بچوں کی نعتیں ریکارڈ نہیں کرتے' ویسے بھی ہم سینئر اور معروف لوگوں کی نعتیں ریکارڈ کرتے ہیں۔ تو ایسا جواب سن کر بہت مایوسی ہوتی تھی۔ پھر جب "ایس ٹی این" آیا تو میں "ایس ٹی این" گئی جہاں شعیب صدیقی صاحب نے میری ایک نعت ریکارڈ کی اور یہ بات ہے 1995ء کی جب میں تقریباً گیارہ سال کی تھی' پھر اس چینل میں کچھ عرصے کے بعد ایک محفل میلاد کا انعقاد کیا گیا اور اس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔

نبیلہ عزیز

مادرا مرتضیٰ عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ مادرا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔

منزہ ثمینہ اور نیو کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بہترین فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیو کے بیٹے سے فارہ کی بہن منسوب ہوگی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی آفاق سے حد درجہ خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ رضا حیدر تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں مادرا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔

اکیسویں قسط

"ٹھہرو۔!" اس کی آواز پہ نیمل پہ ٹوکریاں رکھتے ملازم اور ڈرائیور یک دم ٹھٹک کر رک گئے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ اندر داخل ہوتے قیام مرزا' مونس مرزا اور رضا حیدر کے قدم بھی اپنی جگہ پہ جم کے رہ گئے تھے۔

"یہ چیزیں یہاں رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگ یہ سب اٹھا کر واپس گاڑی میں لے جاؤ۔" تیمور کے دوٹوک اور تحمل آمیز انداز پہ ان سب کے دماغ چکرا گئے تھے۔

"تیمور۔!" رضا حیدر کی آواز انتہائی بلند اور سخت تھی۔

تیمور نے گردن موڑ کر رضا حیدر کی طرف دیکھا تھا۔ رضا حیدر کے چہرے کا رنگ لال ہو رہا تھا اور آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے؟" وہ بڑے ضبط سے دانت پیس کر بولے تھے۔

"کیسی بے ہودگی؟ میں آپ کے مہمانوں کو گھر سے نہیں نکال رہا بلکہ ان کے لائے ہوئے لوازمات واپس بھیج رہا ہوں۔ کیونکہ ان کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔" تیمور نے بڑے لاپروا مگر سنجیدہ سے جواب سے نوازا تھا۔ اور اس کے اس جواب پہ قیام مرزا اور مونس مرزا کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔

"کیوں ضرورت نہیں ہے؟ یہ عزت کی انگیجمنٹ کا پہلا شگن ہے ان کی طرف سے۔" رضا حیدر بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"جب انگیجمنٹ ہی نہیں ہوگی تو پھر شگن کیسا؟" تیمور نے کندھے اچکائے۔

"انگیجمنٹ کیوں نہیں ہوگی؟ جب بات طے ہو چکی ہے تو انگیجمنٹ بھی ہوگی۔ رضا حیدر زبان دے چکا ہے۔" قیام مرزا کی بات پہ تیمور کے بجائے رضا حیدر نے تڑپ کر دیکھا تھا جیسے ان کے وجود پہ کسی نے کوڑا دے مارا ہو۔

"رضا حیدر خود مختار ہیں۔ اپنا فیصلہ بدل بھی سکتے ہیں۔" تیمور نے جیسے قیام مرزا کو مطلع کرنا چاہا تھا۔

"فیصلہ بدلنا۔ دوسرے لفظوں میں زبان بدلنا ہی ہوتا ہے برخوردار۔!" قیام مرزا تیمور کے سامنے آگئے تھے۔

"آپ کے لفظوں میں جو بھی ہوتا ہے یہ مجھے نہیں پتا۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ عزت کی انگیجمنٹ عزت کی پسند کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے۔"

تیمور بھی اپنے فیصلے پہ ڈٹ چکا تھا اور اس کا اس نے قیام مرزا اور مونس مرزا کے سامنے بھی واضح اعلان کر دیا تھا۔

"تو گویا عزت کی پسند کوئی اور ہے؟" قیام مرزا نے بڑے کام کا نکتہ اٹھایا تھا اور نکتہ بھی ایسا جو رضا حیدر کو آگ لگا کر بھسم کر دینے کے لیے بہت تھا۔

"بالکل۔ عزت کی پسند کوئی اور ہے اور ماشاء اللہ بہت اچھی پسند ہے اس کی۔"

تیمور کا سکون اور اطمینان قابلِ دید تھا' رضا حیدر تو جیسے خاک ہو چکے تھے ان کے لاڈلے چہیتے بیٹے نے ان کے دوست کے سامنے ان کی عزت اور ان کی زبان کا بھرم دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا۔

"مونس مرزا میں کوئی کمی ہے کیا؟"

"بس ڈیڈ۔ بس۔ بہت سن لیا۔ اب اس سے زیادہ نہیں۔ مجھ میں کیا کمی ہے اور کیا خوبی' یہ میں خود بتاؤں گا۔ عزت حیدر کو بھی۔ اور تیمور حیدر کو بھی۔"

کب سے خاموش کھڑا مونس مرزا اپنی ذات کی کمی اور خوبی کے ذکر پہ یک دم بھڑک اٹھا تھا۔

"تم انکل قیام مرزا کے بیٹے ہو اس لحاظ سے میں تمہارا بہت لحاظ کرتا ہوں لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ

پلیز عزت کے حوالے سے کوئی ایک لفظ بھی برداشت نہیں کروں گا۔ اپنی خوبیاں بتانی ہیں تو مجھے بتاؤ۔ عزت کو تمہاری خوبیوں سے یا کسی کمی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

تیمور نے اس کی زبان سے نکلنے والا عزت حیدر کا نام وہیں پہ روک دینا چاہا تھا۔

"اسے فرق نہیں پڑتا لیکن اس کی پسند کوئی اور ہونے پہ مجھے فرق ضرور پڑتا ہے اور اس فرق کا نتیجہ میں تمہیں بہت جلد دکھاؤں گا۔ انتظار کرنا۔" موس مرزا نے اسے سرعام دھمکی سے نوازا تھا۔

"ضرور...!" تیمور نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے۔

"چلیں ڈیڈ...!" موئس مرزا نے قیام مرزا کا بازو کھینچا۔

"تمہو...!" قیام مرزا نے بازو چھڑا لیا تھا۔ "مجھے ایک بار اس کی پسند تو پوچھ لینے دو۔" انہوں نے بڑے استہزائیہ انداز سے تیمور کو دیکھا۔

"ولید رحمان..." رضا حیدر کی آواز۔ ان تینوں نے بیک وقت ان کی طرف دیکھا تھا۔

"اچھا...!" قیام مرزا نے اچھا کو کافی لمبا کھینچا تھا اور رضا حیدر کو سرتاپا چبھتی ہوئی نظروں سے ٹٹولا تھا۔

"تو پھر تمہاری غیرت اور مردانگی کہاں گئی۔" قیام مرزا نے رضا حیدر پہ چوٹ کرنے میں ذرا دیر نہیں کی تھی اور رضا حیدر کے چہرے کی رنگت مزید لال ہو گئی تھی۔

"بتاؤں گا تمہیں... ضرور بتاؤں گا۔ فی الحال تم اپنے گھر جاؤ۔" رضا حیدر نے جیسے زہر کا پیالہ پیتے ہوئے قیام مرزا کو اس موقع پہ گھر جانے کا کہا تھا اور ان کے اس کہنے پہ رابعہ بیگم اور مسز مرزا بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

"جا رہا ہوں... گھر ہی جا رہا ہوں، مگر افسوس کہ تمہارے گھر سے بے عزت ہو کر جا رہا ہوں اور اس بات کا زہر ہمیشہ میرے دل میں رہے گا۔ یہ یاد رکھنا۔"

قیام مرزا وہاں سے پلٹتے ہوئے اک ڈھکی چھپی سی دھمکی دے کر نکلے تھے اور کچھ فاصلے پہ کھڑے تیمور حیدر کو غضب ناک نظروں سے دیکھتے مسز مرزا کا بازو پکڑ کر وہاں سے نکل گئے تھے۔

"ٹھیک ہے دوست... پھر ملاقات ہوگی۔" موئس مرزا نے تیمور کے سامنے آ کر اس سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

"ان شاء اللہ... بہت جلد۔" تیمور نے بڑے پُرسکون اور تحمل بھرے انداز سے کہتے ہوئے بڑے بھرپور طریقے سے اس سے ہاتھ ملایا تھا اور پھر موئس مرزا ایک دم پلٹ کر باہر چلا گیا تھا۔

"یہ کیا کیا ہے تم نے...؟" رابعہ بیگم نے بھی لب کشائی کی تھی۔ انہیں بھی تیمور کا طریقہ کار غلط لگا تھا۔

"میں نے جو بھی کیا ہے غلط کیا ہے لیکن یہ بابا جان بھی جانتے ہیں کہ میں نے بہت مجبور ہو کر کیا ہے۔ ورنہ میں صبح ہی ان کو بتا چکا تھا کہ آپ ان لوگوں کو آنے سے منع کر دیں۔ عزت کو یہ پرپوزل پسند نہیں ہے مگر..." تیمور کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ رضا حیدر یک دم بم کی طرح پھٹ پڑے تھے۔

"عزت...!" انہوں نے صوفے کے سامنے پڑا کرسٹل ٹیبل اک جھٹکے سے ٹھوکر مار کر الٹ دیا تھا اور ٹیبل ٹوٹنے کی اور ان کے دھاڑنے کی آواز دور دور تک گئی تھی۔

"عزت... عزت... عزت... وہ کون ہوتی ہے پرپوزل پسند یا ناپسند کرنے والی؟ یہ سارا کیا دھرا تمہارا ہے۔ تم کروا رہے ہو یہ سب..." وہ تیمور پر برس پڑے تھے۔

"زہے نصیب...! اگر یہ اعزاز آپ مجھے دے رہے ہیں تو میرے لیے بہت بڑی خوشی کی بات ہے کیونکہ میں خود چاہتا ہوں کہ عزت کا نام نہ آئے مگر آپ کو سمجھانے کے لیے مجبوراً اس کا نام لینا پڑتا ہے۔" تیمور عزت والا

الزام خود لینے پہ تیار تھا۔

"اس کا نام کہاں آتا ہے اور کہاں نہیں اس کا فیصلہ کرنے کے لیے میں خود موجود ہوں، تمہیں اس معاملے میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے تیمور کو اس معاملے سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی اور تیمور ان کی اس کوشش پہ ہنسنے سے مسکرا دیا تھا۔

"غصے کی شدت کی وجہ سے آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں مداخلت نہیں کر رہا بلکہ کر چکا ہوں۔ عزت کی شادی ولید رحمان سے ہی ہوگی۔ اور بہت جلد ہوگی۔" تیمور کا مطمئن اور پُرسکون لہجہ رضا حیدر کو گھائل کرنے کے لیے کافی تھا اور سونے پہ سہاگہ کہ وہ بات کہہ کر وہاں رکا نہیں تھا بلکہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

اور پیچھے رضا حیدر نے پورا ڈرائنگ روم چکنا چور کر دیا تھا۔ رابعہ بیگم بری طرح سہم گئی تھیں انہیں رضا حیدر کی سفاکی سے خوف آنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تیمور بھائی! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟" عزت بیڈ پہ بیٹھی تھی، لیکن تیمور کی بات سننے کے بعد یک دم بیڈ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔" تیمور بے حد سنجیدگی سے اور آہستگی سے بولا تھا۔

"کیوں۔۔۔ اس کے علاوہ اور کوئی حل کیوں نہیں ہے؟ بابا میری شادی نہیں کر سکتے کیا؟" عزت شاک اور دکھ کی ملی جلی کیفیت میں تھی۔

"بابا ہمارا قتل کر سکتے ہیں، لیکن شادی نہیں۔۔۔" تیمور کو اندازہ ہو چکا تھا کہ رضا حیدر یہ سرکشی کبھی برداشت نہیں کریں گے اور نہ ہی کبھی معاف کریں گے۔

"لیکن بھائی۔۔۔!" عزت نے بڑے دکھ سے کچھ کہنا چاہا تھا اس کی آنکھیں اور لہجہ بیک وقت بھرا گئے تھے۔

"عزت۔۔۔ تمہارے سامنے دو آپشن ہیں۔۔۔ ولید رحمان۔۔۔ یا۔۔۔ مونس مرزا۔۔۔؟ ولید رحمان والا حل میں تمہیں بتا چکا ہوں اور مونس مرزا والا تم خود سوچ سکتی ہو۔" تیمور نے فیصلہ اس پہ چھوڑ دیا تھا۔

اور عزت چند سیکنڈز کے لیے خاموش ہو گئی تھی وہ تیمور سے کہتی بھی تو کیا۔۔۔؟

"ولید رحمان سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا تیمور بھائی۔۔۔" ان دونوں کی گفتگو میں ساشا نے بھی مداخلت کر ڈالی تھی۔

"لیکن میں اس طرح نہیں چاہتی۔" عزت کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"ہوں۔۔۔! تو پھر یہ حل نکالتے ہیں کہ ابھی فی الحال نکاح کر دیتے ہیں۔ رخصتی بابا جان سے صلح صفائی کے بعد رکھ لیں گے۔ نکاح کا بابا جان کو علم بھی نہیں ہوگا۔" عزت کی خوشی کی خاطر تیمور مختلف آئیڈیاز سامنے لا رہا تھا۔

"یہ بہتر رہے گا۔۔۔ اور اتنے عرصے میں ہو سکتا ہے کہ حیدر ماموں بھی ولید رحمان کے لیے مان جائیں۔" ساشا نے خوش فہمی کا دامن پکڑا۔

"لیکن میں یہ کام چوری سے نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ میں کسی کے سامنے نظریں نہیں جھکانا چاہتی۔۔۔ میں چاہتی ہوں، جو بھی ہو سب کے سامنے ہو۔۔۔ سر بلند کر کے۔۔۔ نظر سے نظر ملا کر ہو۔"

عزت ورسٹ میچ والی ذہن پہ ہی نہیں آ رہی تھی اور تیمور اس کی بات پہ مسکرا کر رہ گیا۔

"کون کہتا ہے کہ تم یہ کام چوری سے کرو گی؟ کیا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں؟ تمہارے سر پہ ہاتھ رکھنے والا؟ تمہارا سرپرست؟ کون ہے، جس سے تم میرے ہوتے ہوئے بھی نظر نہیں ملا سکو گی؟" تیمور نے اسے قریب بٹھا لیا

تھا۔

"ولید رحمان۔" ساشا نے وہ نام بھی اگل دیا تھا جو عزت کے دل و دماغ پر کلبلا رہا تھا۔

"واٹ۔۔؟" تیمور کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔

"ولید سے۔؟" اس نے جیسے دہرا کے تصدیق کرنا چاہی تھی۔

"ہاں۔! تیمور بھائی کبھی کبھی ایسے موقع بھی آجاتے ہیں کہ انسان دل سے قریب تر لوگوں سے بھی نظر ملانے سے کتراتا ہے اور میں کترانا نہیں چاہتی کہ مجھے میرے باپ نے رخصت نہیں کیا۔۔ میں نے خود سری اختیار کی ہے۔"

عزت کی بے حد سنجیدہ بات پہ چند ثانیے کے لیے تیمور بھی چپ ہو گیا تھا مگر چپ ہونے کا موقع نہیں تھا۔

"مگر عزت! وقت اور حالات کچھ ایسے ہو چکے ہیں کہ مجھے تمہارے حوالے سے ہر طرف سے خدشہ ہے۔ بابا جان کی طرف سے بھی اور مونس مرزا کی طرف سے بھی۔۔ کیونکہ جس نکاح کے بارے میں میں سوچ رہا ہوں، اس نکاح کے بارے میں وہ بھی سوچ سکتے ہیں۔ تم پہ تشدد کر کے یا کسی بھی زور و زبردستی کے بل بوتے پر وہ نکاح پڑھوا سکتے ہیں اس لیے اگر تمہاری کورٹ میرج پہلے سے ہو چکی ہوگی تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔۔ نہ تشدد۔۔ نہ زور و زبردستی۔۔ نہ ہی نکاح۔"

تیمور نے اسے اپنے خدشات سے بھی آگاہ کر دیا تھا اور اب کی بار عزت نے ذرا چونک کر اسے دیکھا تھا کیونکہ تیمور کے خدشات بے جا نہیں تھے۔ ان میں اچھا خاصا وزن تھا۔

"یعنی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔۔؟ او مائی گاڈ۔!" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کے رہ گئی تھی۔

"ہاں۔۔! کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اس معاملے کے حوالے سے کسی پہ کوئی اعتبار نہیں ہے۔"

تیمور کو اب قیام مرزا، مونس مرزا اور رضا حیدر پہ کوئی بھروسا نہیں تھا اور اس چیز کا اس نے اظہار بھی کر دیا تھا، جسے سن کر عزت مزید کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

اور اس نے گہری سانس کھینچتے ہوئے بے بسی سے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

☼ ☼ ☼
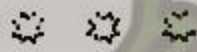
مونس مرزا! پورے گھر میں غصے سے بھرا ہوا پھر رہا تھا۔

اس کے پیروں کے تلوے غیظ و غضب کے مارے زمین پہ ہی نہیں ٹک رہے تھے اس کے اندر کی آگ بھڑک بھڑک کر اسے جھلسائے دے رہی تھی۔ وہ عزت کی طرف سے ایسی عزت افزائی پہ پاگل ہو رہا تھا اور قیام مرزا کو آثار نظر آرہے تھے کہ کوئی سنگین طوفان امڈنے والا ہے۔

"ایک جگہ پہ ٹک کر بیٹھ جاؤ اور بیٹھ کر فیصلہ کرو کہ اب کیا کرنا ہے؟" قیام مرزا نے سیڑھیوں سے اترتے مونس کو ٹوکا تھا۔

"فیصلہ۔۔؟ کیسا فیصلہ۔۔؟" مونس مرزا نے بے حد لاپروائی سے کہا تھا۔

"تم جانتے ہو۔۔ میں کس فیصلے کی بات کر رہا ہوں۔۔؟" قیام مرزا نے کچھ نہ کہہ کر بھی سب کہہ دیا تھا اور مونس مرزا نے کچھ نہ سن کر بھی سب سمجھ لیا تھا۔

"فیصلہ ہو چکا ہے ڈیڈ۔۔!" مونس مرزا کا لہجہ بے حد دو ٹوک ہو رہا تھا۔

"یا مطلب۔۔؟" قیام مرزا کچھ نہیں سمجھے تھے۔

"مطلب ولید رحمان کا قتل۔۔" رضا حیدر کی آواز ان کے عقب سے سنائی دی تھی اور قیام مرزا نے یک دم

پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا تھا۔

"رضا حیدر۔۔۔؟" قیام مرزا زیر لب بڑبڑا کے رہ گئے تھے۔

"ہاں۔۔۔! اس کے علاوہ اب اور کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔" رضا حیدر کے لہجے میں بے پناہ سفاکی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟" قیام مرزا' رضا حیدر اور مونس مرزا کو دیکھ کر رہ گئے تھے کیونکہ ان دونوں کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ ان میں کچھ طے ہو چکا ہے۔

"میں جو کہہ رہا ہوں' ٹھیک کہہ رہا ہوں اور فیصلہ ہو چکا ہے۔" رضا حیدر کی سنجیدگی اور سفاکی اپنی انتہا پہ تھی اور قیام مرزا ساری پلاننگ سمجھ گئے تھے کہ اب کیا کرنا ہے۔؟

"میرا اپنا کوئی دوست مجھ سے نہیں جیت سکتا تو میرے بیٹے کا دوست مجھ سے کیسے جیت سکتا ہے۔۔۔؟"

رضا حیدر نے چبا کر فخریہ کہا تھا اور قیام مرزا نے بے اختیار قہقہہ لگاتے ہوئے رضا حیدر کو گلے سے لگا لیا تھا۔

"خوش کیتا ای یار۔۔۔" انہوں نے رضا حیدر کی پشت پہ تھپکی دی تھی اور پھر تینوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

فارہ ناشتا کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ ٹیبل پہ رکھا اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔

"ہیلو۔۔۔!" تیمور کا نمبر دیکھ کر اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی۔

"کیسی ہو فارہ۔۔۔؟" تیمور نے بڑے تحمل سے حال احوال پوچھا۔

"فائن۔۔۔ آپ سنائیں۔۔۔ خیریت۔۔۔؟" وہ صبح صبح تیمور کا فون دیکھ کر اندر سے کچھ متفکر بھی ہوئی تھی۔

"ہاں خیریت۔۔۔! آفاق کہاں ہے۔۔۔؟" تیمور نے چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔

"آفاق۔۔۔؟ وہ تو اپنے آفس گئے ہیں۔۔۔ کیوں سب ٹھیک تو ہے نا۔۔۔؟" اس کی تشویش میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

"اور ثمینہ آنٹی اور انکل۔۔۔؟" وہ پوری انکوائری کر رہا تھا۔

"وہ فیصل آباد گئے ہیں۔" فارہ حیرانگی سے بتاتی جا رہی تھی۔

"کب۔۔۔؟" اس کے سوالات کا سلسلہ جاری تھا۔

"بس آدھا گھنٹہ پہلے۔۔۔" اسے اندر ہی اندر تعجب ہو رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔ یعنی تم گھر پہ اکیلی ہو۔۔۔؟" تیمور نے ذرا لمبی "ہوں" کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔۔۔!" فارہ کی حیرانگی بڑھتی جا رہی تھی۔

"اوکے۔۔۔ کچھ دیر میں میں اور عزت تمہارے گھر آ رہے ہیں' لیکن گھر کے کسی فرد کو ہمارے آنے کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔۔۔ نہ آج۔۔۔ نہ بعد میں۔۔۔ اوکے۔۔۔؟" تیمور کی اس مشکوک سی بات پہ فارہ کے ذہن میں اور بھی کھدبدی سی لگ گئی تھی۔

"مگر تیمور بھائی۔۔۔ کچھ بتائیں تو سہی۔۔۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟ آپ ایسی خفیہ سی۔۔۔"

"فارہ۔۔۔ فارہ پلیز۔۔۔ کچھ دیر صبر کرو۔۔۔ تمہارے گھر آ کر سب بتا دوں گا۔۔۔ یو ڈونٹ وری۔" اس نے فارہ کی بات درمیان سے کاٹتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"اوکے۔۔۔!" فارہ نے منہ بسور کر اوکے کہہ دیا تھا۔

اور پھر بڑے پُرسوچ انداز سے دوبارہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے آخر۔۔۔؟" اس کا دماغ بری طرح الجھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے۔ عزت اور ولید کا نکاح ہے آج۔" تیمور نے اس کے سر پہ بم بڑے سکون سے پھوڑا تھا اور ماورا ایک دم سر اٹھا کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"نکاح۔۔۔؟ آج۔۔۔؟" اس نے بمشکل اپنے تاثرات کنٹرول کیے تھے۔

"ہاں آج۔۔۔" تیمور نے دھیمے سے کہتے ہوئے سر ہلایا۔

"کیسے۔۔۔؟" ماورا کا سوال اسے اتنی پریشانی میں بھی مسکرانے پہ مجبور کر گیا تھا۔

"جیسے نکاح ہوتا ہے۔" تیمور کا لہجہ متبسم سا ہو رہا تھا۔

اور اس کے جواب پہ ماورا نہ چاہتے ہوئے بھی جھینپ گئی تھی۔

"کیا آپ کو نہیں پتا کہ نکاح کیسے ہوتا ہے؟" تیمور نے جان بوجھ کر بات کو اور ہی کچھ رنگ دے دیا تھا۔

"پلیز۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے کیا پوچھا ہے؟" اس نے تیمور کی بات کا اثر زائل کرنا چاہا تھا۔

"کیا پوچھا ہے۔۔۔؟" تیمور نے دہرا کے پوچھا۔

"پلیز تیمور آپ۔۔۔" ماورا بے ساختگی اور بے اختیاری میں اس کا نام لے گئی تھی اور تیمور کا دل ایک دم سے جیسے سکڑ کر پھولا تھا اور دھڑکن میں روانی آگئی تھی۔

"ونس اگین پلیز۔۔۔" تیمور نے اپنے مزاج اور اپنی حدود سے باہر نکلتے ہوئے فرمائش کی تھی۔

"میرا خیال ہے آپ کو دیر ہو رہی ہے۔" ماورا نے اسے اٹھنے کا سگنل دیا تھا۔

"اور میرا خیال ہے کہ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔" اس نے لفظ "ہمیں" پہ زور دیا تھا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ میرا جانا ضروری نہیں ہے۔ آپ خود ہی کافی ہیں۔" ماورا اس نکاح میں شامل ہونے سے کترا رہی تھی۔

"جبکہ میرا خیال ہے کہ ہمارا جانا بہت ضروری ہے۔ آخر آج ہم کسی کے نکاح کے گواہ بنیں گے تو کوئی ہمارے نکاح کا گواہ بنے گا نا۔۔۔؟" تیمور نے بہت دور کی سوچی تھی اور ماورا ایک بار پھر چپ ہونے پہ مجبور ہو گئی تھی اور تیمور کو ایک بار پھر شرارت سوجھی تھی۔

"تو پھر کیا خیال ہے اب۔۔۔؟" اس نے ذومعنی انداز سے پوچھا تھا۔

"کس بارے میں۔۔۔؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"نکاح کے بارے میں۔۔۔" وہ بھی جواباً برجستہ بولا۔

"کیا۔۔۔؟" اس نے سر اٹھا کر تیمور کی طرف دیکھا۔

"گواہ بنیں گی۔۔۔؟"

"لیکن گواہ تو شاید مرد ہوتے ہیں؟" ماورا نے اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ہاہاہا۔۔۔!" تیمور بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تو یہ بھی علم ہے آپ کو۔۔۔؟" اس نے جیسے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"بس۔۔۔ تھوڑا بہت تو ہے۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"تو پھر چلیں۔۔۔؟" تیمور جان بوجھ کر اس سے بار بار استفسار کر رہا تھا۔

"کہاں۔۔۔؟"

"آپ کے تجربے میں اضافہ کرنے۔۔۔ کم از کم آپ کو یہ تو پتا چلے کہ نکاح کیسے ہوتا ہے اور گواہ کیسے ہوتے ہیں؟" تیمور اٹھ کھڑا ہوا تھا اور مجبوراً ماورا کو بھی اپنی جگہ سے اٹھنا پڑا تھا۔

✿ ✿ ✿

ولید کے کمرے میں بے حد گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

اور زبیدہ خاتون کے دل و دماغ میں اک عجیب سی پریشانی اور بے چینی ہلکورے لے رہی تھی کہ نجانے ایسی کون سی بات ہے کہ ولید بات کرنے سے پہلے دوبار جھجک کر چپ ہو گیا تھا اور وہ سننے کے لیے ہمہ تن گوش بیٹھی تھیں۔

"ولید۔۔۔! سب خیریت تو ہے نا؟ اب کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے نا؟" ان کی پریشانی کسی اور نوعیت کی تھی۔

"نہیں امی۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل بات کچھ اور ہے۔" اس نے تمہید باندھی۔

"بات کچھ اور ہے یا نہیں ہے، مگر مجھے بتاؤ تو سہی کہ بات کیا ہے؟ میرا دل ہول رہا ہے۔" زبیدہ خاتون نے بے ساختہ اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا۔

"امی۔۔۔! وہ ان فیکٹ میں۔۔۔ عزت حیدر کو پسند کرتا ہوں۔" اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچتے ہوئے جھجکتے ہوئے بالآخر مدعا کہہ ہی دیا تھا۔

"عزت حیدر۔۔۔؟ تیمور حیدر کی بہن۔۔۔ ہے نا۔۔۔؟" انہوں نے تصدیق کروانی چاہی۔

"جی۔۔۔!" اس نے جیسے بے حد شرمندگی سے ہامی بھری تھی۔

"دوست کی بہن پہ بری نظر ڈالتے ہوئے شرم نہیں آئی۔۔۔"

"امی پلیز۔۔۔! میں نے اس پہ کوئی بری نظر نہیں ڈالی۔ صرف اسے پسند کیا ہے۔ محبت کی ہے۔ عقیدت اور عزت والی محبت۔" ولید نے انہیں فوراً صفائی پیش کی تھی۔

"محبت کرنے سے پہلے اپنی اور اس کی اوقات دیکھی ہے؟ فرق دیکھا ہے دونوں میں۔۔۔؟" زبیدہ خاتون کو بیٹے کی کم عقلی پہ افسوس ہوا تھا۔

"امی۔۔۔ آپ کی قسم میں دیکھتا ہوں۔۔۔ مگر وہ نہیں دیکھتی۔۔۔" ولید برجستہ بولا تھا۔

"وہ۔۔۔؟" زبیدہ خاتون بری طرح چونکی تھیں اور یک دم ولید کو آنکھیں پھیلا کر دیکھا تھا۔

"ہاں وہ۔۔۔! میں اس سے عقیدت اور عزت والی محبت کرتا ہوں تو وہ مجھ سے شدت اور جنون والی محبت کرتی ہے۔۔۔ میں اس محبت کو دل میں دبا بھی سکتا تھا مگر اس نے اس محبت کو باہر نکال کر دم لیا ہے، میں اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔ اگر گھٹنے نہ ٹیکتا تو وہ اپنی شدت اور اپنے جنون میں کہیں سے کہیں نکل سکتی تھی۔ وہ بھی غلط راستوں پہ۔۔۔ اور میں یہ گوارا نہیں کر سکا۔" ولید نے اپنی ہر تم نمائی ماں کے گوش گزار کرنے کی ہمت کر ہی لی تھی۔

"اگر تیمور کو اس بات کا پتا چلا تو۔۔۔؟" اب ان کا خیال تیمور کی طرف گیا تھا۔

"تیمور کو اس بات کا پتا چلا تو وہ ہمارا نکاح کروا دے گا۔" ولید کہتے ہوئے اندر ہی اندر محظوظ ہوا تھا۔

"نکاح کروا دے گا۔۔۔؟ مگر کیوں۔۔۔؟" انہیں حیرت ہوئی تھی۔

"کیونکہ دوسری طرف تیمور کے فادر رضا حیدر کے دوست کے بیٹے کا پرپوزل بھی آیا ہوا ہے اور عزت اور تیمور وہ پرپوزل ریجیکٹ کر چکے ہیں۔" ولید رفتہ رفتہ انہیں ساری سچویشن بتاتا جا رہا تھا۔

"تیمور کے فادر کیا چاہتے ہیں؟" زبیدہ خاتون کو اب ان کا خیال آیا۔

"وہ زور زبردستی کے قائل ہوتے۔ عزت کا نکاح اپنے دوست کے بیٹے سے کروانا چاہتے ہیں، لیکن تیمور چاہتا ہے کہ میرا اور عزت کا نکاح ہو جائے تاکہ ان لوگوں کو موقع نہ ملے۔" وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگا۔

"پھر۔۔۔؟" وہ مختصراً بولی تھیں۔

"پھر یہ کہ مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔ تیمور چاہتا ہے کہ نکاح آج ہی ہو جائے۔" اس نے اپنے

سامنے بیٹھی زبیدہ خاتون کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔
"اگر عزت جیسی پیاری لڑکی میری بہو بن سکتی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا۔؟ تمہیں سو بار اجازت ہے،لیکن بیٹا! کوئی خطرے والا کام نہیں کرنا۔ میں اب نہیں سہ سکوں گی۔" انہوں نے اجازت دیتے ہوئے تاکید بھی کی تھی۔
"ان شاء اللہ۔ آپ کی دعا ہوئی تو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" ولید کے چہرے پہ نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔
"تو پھر نکاح کب ہوگا۔؟"
"آج ہی ہوگا۔ آپ میرے ساتھ چلنے کی تیاری کریں۔ میں تیمور کو فون کر کے بتاتا ہوں۔" ولید کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"لیکن اس طرح نہیں۔ جانے سے پہلے اس کے لیے ایک سرخ جوڑا خرید لو۔ سرخ جوڑا نکاح کی سہاگ کی علامت ہوتا ہے۔ یہ سہاگن کی نشانی ہوتا ہے۔" ولید تیمور کا نمبر ڈائل کرتے کرتے رک گیا تھا اور پلٹ کر دوبارہ زبیدہ خاتون کی طرف دیکھا تھا۔
"امی۔! آج رخصتی نہیں ہوگی۔ آج صرف نکاح ہوگا۔" اس نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی "جیسا آپ سوچ رہی ہیں ویسا نہیں ہوگا۔"
"مجھے بھی پتا ہے کہ آج صرف نکاح ہوگا۔ پھر بھی میں اپنی بہو کو سرخ جوڑے میں ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔" زبیدہ خاتون کی خواہش تھی کہ وہ ولید کی دلہن کو سرخ جوڑے میں دیکھیں۔ اس لیے ولید ان کی خواہش دبا نہیں سکا تھا۔
"ٹھیک ہے۔ یہاں سے مارکیٹ چلتے ہیں۔ آپ نے جو کچھ بھی لینا ہے اپنی پسند سے لے لیجیے گا۔"
ولید نے کہہ کر تیمور کا نمبر ڈائل کیا اور اسے بتا دیا کہ وہ امی کے ساتھ کچھ دیر میں پہنچ جائے گا۔

☼ ☼ ☼
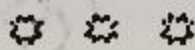
فارہ پہلے تو ساری صورت حال جان کر بہت حیران اور پریشان ہوئی تھی، لیکن پھر سب سمجھنے کے بعد مطمئن ہوگئی تھی۔ تیمور نے آفاق کو بھی آفس سے گھر بلا لیا تھا اور ٹھیک دو بجے ولید اور زبیدہ خاتون بھی پہنچ گئے تھے۔
تو گھنٹے میں عزت تیار ہوئی اور تیمور مولوی صاحب اور وکیل صاحب کو لے کر آگیا تھا اور آتے ہی انہوں نے عزت کو پیغام بھیج دیا تھا۔
"ساشا۔! مجھے اس طرح اچھا نہیں لگ رہا۔" عزت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سے ہٹتے ہوئے عجیب بے دلی سے بولی تھی۔
"پاگل ہوئی ہو۔؟ نکاح ہو رہا ہے تمہارا۔ اور تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔؟" ساشا نے اسے جھڑک دیا تھا۔
"آپ کو تو جناب خوش ہونا چاہیے۔" فارہ نے اسے چھیڑا تھا اور عزت کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ ابھی مسکرا دی تھی اور پھر چاروں نیچے آگئی تھیں۔
وہاں موجود تمام افراد انہیں دیکھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔
"آؤ بیٹا۔ ادھر آجاؤ۔" تیمور نے بڑے پیار سے آگے بڑھ کے اسے کندھوں سے تھام لیا تھا اور اس کے اس انداز پہ وہ بے اختیار تیمور کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہوگئی تھی۔ تیمور کی عزت کے لیے محبت اس کی اک اک حرکت سے جھلک رہی تھی۔ اس کا خلوص اور اس کا کھرا پن اس کے چہرے سے ہی نظر آرہا تھا۔
یہ شخص ہر رشتے کے معاملے میں کتنا شفاف اور کتنا کیئرنگ ہے۔

تیمور حیدر کے حوالے سے اک اچھا خیال تھا جو اس کے ذہن کو چھو کے گزر گیا تھا۔

"ماورا۔۔۔!" قارہ نے اسے ٹہوکا دیا۔

"ہوں۔۔۔؟" اس نے چونک کر دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ۔۔۔!" قارہ مسکرا رہی تھی اور عزت کے قریب بیٹھنے کا اشارہ بھی کر رہی تھی۔

"ولید صاحب پلیز۔۔۔ آپ کی جگہ یہ ہے۔" ماورا نے یکدم توپوں کا رخ ولید کی سمت موڑ دیا تھا۔

"کوئی جگہ دے گا تو بیٹھوں گا نا۔۔۔" عزت کے ساتھ ساشا بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا اشارہ ساشا کی طرف تھا۔

"یہ جگہ نیگ دینے کے بعد ملتی ہے۔" ساشا نے بھی اسے اپنی ڈیمانڈ بتا دی تھی۔

"نیگ تب ملتے ہیں جب رخصتی ہو رہی ہو۔ جبکہ یہاں تو چکر ہی کوئی اور ہے۔" ولید بھلا کب باز آسکتا تھا۔

"او کے۔۔۔ تو پھر یہ جگہ بھی تب ہی ملے گی جب رخصتی ہوگی۔۔۔ فی الحال جہاں بیٹھے ہیں وہاں ہی ٹھیک ہیں۔"

ساشا نے ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔

"دو ہزار چلے گا۔۔۔؟" ولید نے رائے پوچھی۔

"نہیں۔۔۔ پانچ ہزار۔۔۔" ساشا نے رسم کے حساب سے ہی نیگ مانگا تھا۔

"سوری۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔۔۔ میرے پاس تو دو ہزار بھی نہیں ہیں۔" ولید نے بال کھجائے اور قارہ، ماورا، آفاق اور تیمور کے ساتھ ساتھ عزت بھی ہنسنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"عزت تم بھی۔۔۔؟" ساشا نے ناراضی سے منہ بنا لیا تھا۔

"میں منع تو نہیں کر رہی نا؟" عزت مسکراہٹ دباتے ہوئے سر جھکا گئی اور ولید کن اکھیوں سے اس مسکراہٹ کو محظوظ بھی کر رہا تھا۔

"آیئے مولوی صاحب۔۔۔!" تیمور اور آفاق انہیں اندر لے آئے تھے اور پھر سب کی دعاؤں اور مسکراہٹ کے درمیان عزت حیدر ولید رحمان کے نام ہو گئی تھی۔

اور زبیدہ خاتون نے عزت کا ماتھا چومتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

اور اسی وقت تیمور حیدر کے نمبر پہ رضا حیدر کا فون آیا تھا۔۔۔!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ادھر اس نے میٹرک کیا' ادھر اس کی امی نگینہ نے اس کی فوراً" شادی کرنے کا اعلان کر دیا۔ جس پر حیات ولا کے مکینوں کو جتنا تعجب ہوتا کم تھا۔ دادی نے تو باقاعدہ امی کی کلاس لے ڈالی۔ جبکہ تائی امی اور منجھلی چچی نے سمجھانا فرض سمجھا' لیکن امی کی ایک ہی رٹ تھی۔

"بن باپ کی بچی جتنی جلدی اپنے گھر کی ہو جائے اچھا ہے۔ میں بھی سکھ کا سانس لوں گی۔"

"بن باپ کی۔!"

ناولٹ

"تایا ابو اور منجھلے چچا تڑپ گئے کیونکہ انہوں نے کبھی اپنی اولاد میں اور اس میں فرق نہیں کیا تھا۔ پھر بھی نگینہ بضد تھیں کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی بیٹی کی خوشی دیکھنا چاہتی ہیں۔ جانے کیا وہم ہو گیا تھا انہیں۔ رو' رو کر تایا ابو اور منجھلے چچا کی منتیں کرتیں کہ ان کی زندگی میں ثمن کی شادی ہو جائے۔"

اس وقت حرا کا کوئی لڑکا اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ سب سے بڑے ہمایوں ایم بی اے کے لیے باہر جا رہے تھے اور ان کی نظروں میں تو ثمن کی شادی سراسر حماقت تھی' لیکن وہی بات کہ وہم کا کوئی علاج نہیں۔ امی کی منتوں اور گریہ وزاریوں سے مجبور ہو کر تایا ابو نے ان کی بات مان لی اور پہلے گھر کے لڑکوں پر ہی نظر ڈالی تھی' لیکن کوئی بھی فوری شادی پر آمادہ نہیں ہوا اور ظاہر ہے نگینہ کی بے جا ضد پر کسی کو زبردستی قربان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یوں حیات ولا کی لڑکیوں کے لیے باہر سے آنے والے رشتوں پر باقاعدہ غور ہونے لگا۔

اور پھر تایا ابو نے اپنے طور پر تو بہت دیکھ بھال کر کے اس کا رشتہ طے کیا تھا۔ ظاہر ہے یتیم بھتیجی سے انہیں کیا پرخاش ہو سکتی تھی' آگے اس کی قسمت۔

☼ ☼ ☼

کچھ لوگوں کو نصیب بھی ورثے میں ملتے ہیں۔ امی اور اس کے نصیب میں فرق صرف اتنا تھا کہ امی جب اس کی عمر کی تھیں تو ان کے نصیب نے انہیں بیوگی کی

چادر اوڑھادی تھی۔ اس وقت وہ صرف سال بھر کی تھی۔ ابھی باپ کی شفیق آغوش میں ہمکنا سیکھ رہی تھی کہ اچانک روڈ ایکسیڈنٹ میں ابو کا انتقال ہو گیا۔

امی کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اتنا چاہنے والا شوہر یوں اچانک داغ مفارقت دے گیا کہ وہ مہینوں اس سانحے سے سنبھل نہیں سکی تھیں۔ اس وقت دادا حیات تھے۔

پھر عدت کے دن تمام ہونے پر جب امی کے والدین انہیں لینے آئے تو دادا کے لیے یہ ایک اور آزمائش تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے کی نشانی ان سے دور ہو' لیکن حقیقت پسند انسان تھے۔ امی کی عمر کو دیکھتے ہوئے انہوں نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت اگر ان کا اپنا کوئی بیٹا غیر شادی شدہ ہوتا تو وہ اس کے ساتھ امی کا عقد ثانی کر دیتے' لیکن کوئی نہیں تھا اور وہ جانتے تھے کہ ان کے والدین انہیں زیادہ عرصہ بٹھائے نہیں رکھیں گے۔ اس لیے اس وقت انہوں نے ان سے درخواست کی تھی کہ کوئی دوسرا شخص اگر خوشی سے ثمن کو قبول کرے تو ٹھیک ورنہ بچی کو انہیں دے دیا جائے۔

پھر امی تقریباً" ایک سال اپنے میکے میں رہیں۔ اس دوران ان کے والدین نے ان پر دوسری شادی کے لیے بہت زور دیا۔ مجبور کیا اور جب زبردستی کرنے لگے تو امی ثمن کو لے کر دادا کے پاس آگئیں۔ اپنی مرضی سے آئی تھیں اور یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا کہ وہ ساری زندگی اس گھر کی نوکری کریں گی' لیکن دوسری شادی نہیں کریں گی اور نوکری کیوں کرتیں۔

دادا نے بیٹے سے وفاداری نبھانے پر نہ صرف بہو اور پوتی کو اپنی پناہوں میں لیا' بلکہ جو تھوڑی بہت جائیداد بنائی تھی۔ اسے تقسیم کر کے مرحوم بیٹے کا حصہ اسی وقت بہو کے نام کر دیا' تاکہ وہ کسی کی محتاج نہ رہے۔

گو کہ اس وقت امی کی عمر زیادہ نہیں تھی' نہ ہی وہ سمجھ بوجھ رکھنے والی خاتون تھیں۔ بہرا بعض اوقات انسان کم عمری اور ناسمجھی میں بھی بڑے فیصلے کر لیتا ہے اور پھر باقی ساری زندگی اپنے فیصلے پر قائم رہنے کی کوشش میں گزر جاتی ہے۔ اگر اگلے تین' چار سالوں میں یا دادا کے بعد امی کو احساس ہوا بھی تو انہوں نے خود کو مجبور اور بے بس پایا تھا۔

بہرحال دادا کے بعد جیٹھوں نے اپنے طور پر ان کا کافی خیال رکھا اور جیٹھانیوں کو انہوں نے خود بھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ان کی کل کائنات ثمن تھی۔ اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دی۔ باقی نہ کسی کے لینے میں' نہ دینے میں۔ البتہ سر پر سائبان نہ ہونے کی وجہ سے خود کو بہت کمزور محسوس کرتی تھیں اور اندر سے ڈری ہوئی بھی رہتی تھیں۔ ہر وقت یہ خیال کہ ان کی کوئی بات کسی کو بری نہ لگے۔ اگر جیٹھانیوں میں سے کوئی اپنے ہی کسی بچے پر خفا ہو رہی ہوتی تو یہ اپنی جگہ سہم کر ثمن کو آغوش میں چھپا لیتیں اور چھوٹی سی بچی کو بھی انہوں نے سمجھا کر رکھ دیا تھا۔ "یہ نہ کرو' وہ نہ کرو۔"

دوسرے بچے ذرا سی زیادتی پر حلق پھاڑ کر چیختے اور ثمن کی آواز کو وہ اسے اپنے سینے میں بھینچ کر روک دیتیں۔ نتیجتاً" وہ ان سے بھی زیادہ بزدل نکلی۔ اس کے مقابلے میں حرا' سیما' لیلیٰ وغیرہ کافی تیز تھیں۔ حالانکہ تایا ابو اور منجھلے چچا خصوصاً" لڑکوں کے معاملے میں کافی سخت تھے' لیکن ان کی ماؤں نے کچھ توازن رکھا ہوا تھا۔ بچوں کی شرارتوں اور بدتمیزیوں پر بجائے پردہ ڈالنے کے بڑے آرام سے کہہ دیتیں کہ

"کیا ہوا بچے ہی تو ہیں۔" جبکہ ثمن کی ہر بات امی اپنے سر لے لیتیں اور یہ اس پر ظلم تھا کہ پھر اسے ہر بات پر امی کی طرف دیکھنے کی عادت ہو گئی تھی۔

اور اب زندگی کے اس موڑ پر جب امی ساتھ نہیں تھیں۔ وہ اچانک کتنی تنہا ہو گئی تھی اور جانے یہ اس کی قسمت تھی کہ سسرال آتے ہی اسے لگا جیسے پندرہ سولہ سال اپنی نرم گرم آغوش میں دبائے رکھنے کے بعد اب ایک دم سے امی نے اسے تپتی دھوپ میں دھکیل دیا ہو۔ مزید اس سے میکے کا مان بھی چھین لیا۔

یعنی اس کی شادی کرتے ہی امی پھر اپنے ماں' باپ کے پاس چلی گئیں اور دوسرے مہینے بخوشی عقد ثانی بھی کرلیا تھا۔ جس سے نہ سمجھنے والے بھی سمجھ گئے کہ امی نے اس کی شادی کی جلدی مچائی ہی اس لیے تھی کہ وہ خود۔

بہرحال اسے کیونکہ احتجاج کرنا سکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ اس لیے سسرال میں چھوٹے بڑے سب اس پر حاوی ہوگئے۔ شوہر مٹی کا مادھو' زن مریدی کے طعنے سے بچنے کے لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

☼ ☼ ☼

ایک سال تک سارے ظلم و ستم اس نے بہت خاموشی سے سہے پھر اسے خود ہی احساس ہوا کہ اس طرح زندگی نہیں گزرے گی۔ کچھ اپنے اندر ہمت پیدا کی اور بچی کی پیدائش پر اس نے سوچا کہ اب واقعی وہ مضبوط ہوگئی ہے۔ لیکن جو لوگ اپنے ہر حکم پر اس کا سر جھکا ہوا دیکھنے کے عادی تھے۔ ان سے اس کا نظریں اٹھا کر بات کرنا برداشت نہیں ہوا۔

بیٹی کی پیدائش پر جہاں اسے اپنی مضبوطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے اسے جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا۔ پہلے بے اولادی کے طعنے تھے۔ پھر بیٹی پیدا کرنے کے جرم میں نکال باہر کیا۔

بابو ابو تو پہلے ہی اس کی شادی کے حق میں نہیں تھے۔ پھر بھی انہوں نے مصالحت کی کوشش کی۔ لیکن ان کی ایک شرط تھی کہ وہ اب سسرال میں نہیں رہے گی۔ میاں اسے الگ گھر لے کردے اور یہ کوئی ایسا ناجائز مطالبہ بھی نہیں تھا' لیکن اس مطالبے کے جواب میں ادھر سے طلاق نامہ بھیج کر قصہ کا تمام کردیا گیا۔ اگر واقعی قسمت خراب تھی' تب بھی اس نے الزام امی کو دیا تھا۔

"نہیں اجڑ گئی۔ اللہ کرے آپ کا گھر سلامت رہے۔"

اس نے فون پر امی سے بس اس قدر کہا تھا۔ اس کے بعد دادی کی گود میں منہ چھپا کر بہت روئی تھی۔ پھر کبھی نہ رونے کے لیے۔

اور پھر وہ پہلے والی تمن نہیں رہی تھی۔ ماںتا کی آغوش سے نکل کر وہ صرف دو سال حالات کی بھٹی میں جھلسی تھی اور ان دو سالوں نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے سانحے کا اسے دکھ تو تھا' لیکن زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ سب کچھ بہت جلدی اس پر بیت گیا تھا۔

اس کے ساتھ پی ٹی راب تھرڈ ایئر میں تھی' جبکہ لیلیٰ اور سیما بی اے فائنل کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھیں۔ کیسی بے فکری کی زندگی تھی ان کی۔ انہیں دیکھ کر اس کا یہ احساس شدید ہوجاتا کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ اپنی زندگی تو وہ جی ہی نہیں پائی اور اس کی زندگی بس اتنی ہی تھی' اب تو اسے پنکی کے لیے جینا تھا اور پنکی کے لیے نہ تو وہ امی جیسی بنے گی اور نہ اسے اپنے جیسا بننے دے گی۔

اس سوچ کے ساتھ کبھی کبھی وہ اس ننھی جان پر بڑی زیادتی کرجاتی تھی۔ جس پر حرا نے اسے ظالم ماں کا خطاب دے رکھا تھا۔ سیما کا کہنا تھا کہ وہ شوہر کی بے وفائی اور سسرال والوں کی زیادتیوں کا بدلہ اس سے لے رہی ہے اور لیلیٰ تو سرے سے پنکی کو اس کی بچی ماننے سے ہی انکاری تھی۔ جبکہ لڑکے ابھی تک اس کی ذات میں الجھے ہوئے تھے۔ بلکہ باقاعدہ ریسرچ کررہے تھے کہ وہ ایک دم سے کیسے بدل گئی ہے۔ کہاں تو ذرا ذرا سی بات پر چونکتی اور سہم جاتی تھی اور اب یہ عالم کہ کسی کا کوئی لحاظ ہی نہیں۔ یہاں تک کہ جس روز نبیل ایم بی اے کرکے لوٹے تو سب کے درمیان اس نے انہیں بھی نہیں بخشا تھا۔

"ارے۔ آپ تو چھڑے چھانٹ واپس آگئے' لگتا ہے کسی میم نے لفٹ ہی نہیں کرائی۔" اور ان کے بری طرح گھورنے پر بھی باز نہیں آئی تھی۔

"دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے' یہاں بہت لفٹ ملے گی۔"

اور نبیل کو کزنز کے فون کالز کے ذریعے اس کے حالات سے آگاہی تو تھی' لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ

حالات اس پر کس طرح اثر انداز ہوں گے۔ بلکہ ان کا خیال تھا کہ وہ جو پہلے ہی کمزور اور بزدل قسم کی لڑکی تھی۔ اب تو ایک دم ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہوگی۔

حقیقتاً "دیار غیر" میں جب بھی انہیں اس کا خیال آتا تو پھر وہ کتنی دیر تک اس کے لیے کڑھتے رہتے کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ یہ اس کی بے فکری کے دن تھے اور وہ اتنی فکروں میں گھر گئی ہوگی۔ انہیں اس سے ہمدردی محسوس ہوتی اور یہاں آکر ساری ہمدردی غصے میں بدل گئی تھی۔ خصوصاً "جب وہ انہیں نام لے کر پکارتی تو ان کا دماغ گھوم جاتا۔ کیونکہ گھر میں سب سے بڑے ہونے کے باعث انہیں شروع ہی سے ایک مقام حاصل تھا اور ترتیب کے حساب سے وہ سب سے آخری نمبر پر تھی۔ یعنی سب سے چھوٹی اور جب ہمایوں نے عمروں کا فرق جتا کر ٹوکا تو وہ دھڑلے سے بولی تھی۔

"عمروں کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں ایک بچی کی ماں ہوں اور آپ کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"تو ماں ہونے کا زعم ہے تمہیں؟" انہوں نے سر تاپا اسے دیکھنا۔ ویسی ہی دبلی پتلی اسمارٹ سی۔

"کیوں نہ ہو' ہر ایک کے حصے میں تھوڑی آتا ہے یہ زعم۔" اس نے گردن اکڑائی تھی۔

"وقت آنے پر سب کے حصے میں آتا ہے' لیکن تمہاری طرح کوئی آپے سے باہر نہیں ہو جاتا۔"

"وقت آنے پر نا' مجھے وقت سے پہلے حاصل ہو گیا ہے اس لیے۔"

"شٹ اپ!" وہ اس کے برابر سے جواب دینے پر سختی سے ٹوک کر بولے تھے میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بس اتنا سن لو کہ آئندہ مجھ سے بات کرتے وقت کسی زعم کے بجائے میری اور اپنی عمر کے فرق کو ذہن میں رکھنا۔

"مشکل ہے۔" وہ کہہ کر فوراً" ان کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ پھر ہمایوں نے خود ہی اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ شاید اپنی بڑائی اور عزت قائم رکھنے کا یہی طریقہ ان کی سمجھ میں آیا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں نظر انداز کیا جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو اور اسے ہرگز پروا نہیں تھی۔ لیکن کسی کسی وقت محض انہیں چھیڑنے کی خاطر کوئی ایسی بات کہہ جاتی جس سے وہ تلملا جاتے تھے اور وہ اندر ہی اندر محظوظ ہوتی تھی۔

☆ ☆ ☆

حیات ولا کے مکینوں کے لیے پنکی ایک جیتا جاگتا کھلونا تھی۔ دو سالہ بچی سب کی توجہ کھینچے ہوئے تھی۔ اسے پتا ہی نہیں ہوتا تھا' پنکی کہاں' کس کے پاس ہے۔ ادھر تیمور لیے جا رہا ہے' ادھر سے سیما آکر جھپٹ لیتی ہے۔ تائی امی اور مجھلی چچی کو بھی اس کے بنا چین نہیں ملتا تھا۔

اس وقت وہ پنکی کو برآمدے میں چھوڑ کر پانی لینے کے ارادے سے کچن کی طرف بڑھی تھی کہ پنکی برآمدے کی سیڑھی اترتے ہوئے لڑھک کر نیچے جا گری۔ اس کی چیخ سن کر وہ فوراً" پلٹی ضرور' لیکن بڑھ کر اسے اٹھایا نہیں بلکہ وہیں سے کہنے لگی۔

"اٹھو جاؤ بیٹا! شاباش۔ اٹھو پنکی۔" روتی ہوئی پنکی نے اس کی طرف بازو پھیلا دیے۔ پھر بھی وہ آگے نہیں بڑھی' تب ہی ہمایوں کمرے سے نکل کر آئے تو پہلے انہوں نے بے اختیار بچی کو اٹھایا' پھر اسے دیکھ کر ناگواری سے بولے تھے۔

"حرا تمہیں ظالم ماں ٹھیک کہتی ہے۔" وہ احتجاج کے بجائے لاپروائی سے کندھے اچکا کر پوچھنے لگی۔

"اور آپ کیا کہتے ہیں؟" ہمایوں بچی کو چپ کرانے میں لگے ہوئے تھے۔ یوں بھی اب وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ ابھی بھی ان سنی کر گئے۔ تب وہ ان کے پاس جا کر ایک طرح سے اپنا حق جتا کر بولی۔

"لائیے۔ میری بیٹی کو مجھے دیں۔"

"تمہاری بچی۔" وہ کڑی نظروں سے اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ "بائی دی وے' سمجھو اگر یہ تمہارے پاس آگئی تو مان لو کہ یہ صرف تمہاری بچی ہے۔"

"وہ چیلنج کر رہے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔!" انہوں نے اپنے کندھے سے لگی پنکی کا چہرہ اس کی طرف موڑا تو وہ فوراً" اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولی۔

"آؤ پنکی۔۔۔ میرے پاس آؤ۔ میری گڑیا۔ میری بیٹی۔" وہ جتنا اسے پکار رہی تھی۔ پنکی اسی قدر ہمایوں کے گلے میں بازو ڈال کر جیسے ان میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دوبار ہمایوں نے بھی بچی سے اس کے پاس جانے کو کہا، لیکن وہ ان سے الگ ہونے کو تیار ہی نہیں ہوئی، جبکہ وہ لہجے میں زمانے بھر کی مٹھاس اور پیار سمو کر بلا رہی تھی، پھر دھیرے دھیرے اس پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی اس کے بعد غصہ، پنکی کو آنکھیں دکھا کر بولی۔

"میرے پاس آؤ ورنہ۔۔۔"

"بس۔" ہمایوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا اور مزید کچھ جتائے بغیر پنکی کو لیے ہوئے باہر نکل گئے تو کچھ دیر وہ ان کے پیچھے نظریں جمائے کھڑی رہی، پھر دانت پیستے ہوئے اپنے کمرے میں آئی تو اسی وقت اس کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ اسکرین پر اپنی امی کا نام دیکھتے ہی اس کا تنفر عروج پر پہنچ گیا تھا۔

"کیوں فون کرتی ہیں، آپ مجھے۔۔۔ میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی۔"

"وشمن! کیا ہو گیا ہے بیٹا۔ کیوں اتنا غصہ کرنے لگی ہو؟" امی نے نرمی سے ٹوکا تو وہ اور چڑ کر بولی۔

"آپ کی وجہ سے۔ تماشا بنا دیا ہے آپ نے مجھے۔ آپ کو شادی کرنی تھی تو اس وقت کرتیں جب میں سال بھر کی تھی۔"

"ہاں، یہ میری غلطی ہے۔ اس وقت تمہارے نانا، نانی نے بہت چاہا، لیکن میں نہیں سمجھ پائی، میرا خیال تھا۔ میرے جینے کو تم کافی ہو، بہرحال میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میری شادی اگر تمہارے لیے طعنہ بن گئی ہے تو تم یہاں آجاؤ۔ میرا مطلب ہے اپنے نانا، نانی کے پاس۔" امی نے ہنوز نرمی سے کہتے ہوئے اسے نئی راہ سجھائی۔ وہ بری طرح سلگ گئی۔

"آپ سمجھتی ہیں، مجھے طعنے ملتے ہوں گے، کون دے گا طعنہ۔ زندگی گزاری ہے آپ نے یہاں۔ کیا کوئی ایسا ہے؟"

"ہے تو نہیں۔"

"پھر آپ نے ایسا سوچا کیسے۔ یہاں کچھ نہیں بدلا اب۔ بس مجھے حالات نے بدل دیا ہے۔ پہلے میں پریشان ہوتی تھی، اب میں پریشان کرتی ہوں۔ پھر بھی مجھے چین نہیں آتا۔ میرا دل چاہتا ہے، سب کچھ تہس نہس کر دوں۔ تایا ابو، تائی امی، دادی سب مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ میرا کچھ نہیں بگڑا۔ میں اب بھی ویسی ہوں۔ ان کے کہنے سے حقیقت بدل جائے گی کیا؟ میرے ماتھے پہ لگا طلاق کا لیبل مٹ جائے گا کیا؟ کبھی نہیں۔"

وہ تنفر سے بولتے ہوئے ایک دم رو پڑی۔ امی اسے پکارتی رہ گئیں، لیکن اس نے سیل آف کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اچانک سیما کی شادی طے پا گئی تو گھر میں خوشگوار سی ہلچل مچ گئی تھی۔ تائی امی تو چاہتی تھیں کہ ساتھ ہمایوں کی شادی بھی ہو جاتی، لیکن وہ اپنا بزنس سیٹ کرنے میں لگے ہوئے تھے اور اس سے پہلے شادی کا نام بھی نہیں سننا چاہتے تھے۔ بہرحال حرا اور لیلیٰ تو منجھلی چچی کے ساتھ بازاروں کے چکروں میں گھن چکر بن گئیں اور اس نے کچن سنبھال لیا تھا۔ وہ پہلی سسرال میں وہ اور کچھ نہیں تو گھرداری تو سیکھ ہی گئی تھی۔ جب ہی پوری شادی میں کچن کا نظام اس نے بہت احسن طریقے سے سنبھالے رکھا۔ وقت بے وقت مہمانوں کی آمد پر چائے، کھانا، کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

اس وقت وہ دوپہر کا کھانا بنانے کھڑی ہوئی تھی کہ ادھر پنکی نے رونا شروع کر دیا۔ کچھ دیر پہلے لیلیٰ، حرا منجھلی چچی کے ساتھ بازار گئی تھیں۔ اس نے وہیں سے سیما کو پکار کر پنکی کو چپ کرانے کا کہہ دیا، لیکن وہ مسلسل رونے جا رہی تھی۔ وہیں کبھی اس کے آس

پاس کوئی موجود نہیں ہے۔ جلدی سے ہاتھ دھو کر کچن سے نکل کر آئی تو سیما اسے گود میں لیے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"یہ مجھ سے چپ نہیں ہو رہی۔ شاید اسے بھوک لگی ہے۔"

"ابھی تو فیڈ دی تھی۔" اس نے جیسے ہی بچی کو گود میں لیا وہ چپ ہو گئی۔ جس پر سیما نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ارے یہ تمہاری گود میں جاتے ہی چپ کیسے ہو گئی؟"

"میری دہشت ہے۔" وہ بچی کو لیے ہوئے ہنستی ہوئی دوبارہ کچن میں آئی تو گوشت میں پانی خشک ہو گیا تھا۔ اس نے چولہا دھیما کر کے گھی ڈالا۔ پھر اسی طرح ایک بازو میں بچی کو دبائے دوسرے ہاتھ سے سالن بھون رہی تھی کہ ہمایوں آ گئے۔

"چائے۔!" وہ غالباً "چائے" کا کہنے آئے تھے' لیکن اس کے پاس بچی کو دیکھ کر رہ ہی سے بولے۔ "یہ بچی یہاں کیا کر رہی ہے؟"

"سیکھ رہی ہے۔" وہ پتیلی ڈھک کر انہیں دیکھتے ہوئے پھر بولی۔ "میرا مطلب ہے' کھانا پکانا سیکھ رہی ہے۔"

"تم نے سیکھ لیا؟" وہ چڑ کر بولے تھے۔

"ایسا ویسا۔۔۔ اگر میری جگہ۔ آپ ہوتے تو آپ بھی سب سیکھ جاتے۔" اس کا اشارہ سسرال کی طرف تھا۔ ہمایوں سمجھ کر قصداً "انجان" بن گئے۔

"چلو۔ بچی کو اندر لے چلو۔"

"یہ کسی کے پاس نہیں جا رہی۔ آپ بلا کر دیکھیں۔" وہ کہتے ہوئے ان کے قریب آئی' پھر بچی کو ان کی طرف متوجہ کر کے بولی۔ "جاؤ بیٹا! ماموں کے پاس۔"

"یہ کبھی مجھے ماموں نہیں کہے گی۔" انہوں نے جانے کچھ سوچ کر کہا تھا یا یوں ہی کہ اس نے فوراً پوچھا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ اس کی ماں میرا نام لیتی ہے' مجھے اوروں کی طرح ہومی بھائی نہیں کہتی۔" ہمایوں سیدھے سادے انداز میں کہتے ہوئے اس کی گود سے بچی کو لے کر چلے گئے تو وہ سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

پھر سیما کے رخصت ہوتے ہی جیسے وقت ہی تھم گیا تھا۔ لمبے دن ڈھلنے میں ہی نہیں آتے تھے اور اس کے لیے تو چاندنی راتوں میں بھی کوئی کشش نہیں تھی۔ پھر' تایا ابو کو جانے اچانک کیا احساس ہوا کہ اسے لیلیٰ کے کالج میں ایڈمیشن دلا دیا۔ حالانکہ اب اس کا پڑھنے کو بالکل دل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن تایا ابو کی کسی بات سے انکار کی مجال نہیں تھی۔ بہرحال لیلیٰ کے ساتھ کالج جانے لگی تو ایک بار پھر اسے افسوس ہونے لگا کہ اگر ابی اس کی شادی کے لیے ضد نہ کرتیں تو آج وہ لیلیٰ کے ساتھ بی اے میں ہوتی۔ ابھی بھی کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ زندگی کے کن نشیب و فراز سے گزر کر آئی ہے۔

ابتدا میں تو وہ جیسے بہت مجبوری کے عالم میں بہت بے دلی سے کالج جاتی تھی' اگر تایا ابو کی طرف سے ذرا سی ڈھیل مل جاتی تو وہ پرائیویٹ امتحان دینے کا کہہ کر اطمینان سے گھر بیٹھ جاتی' لیکن تایا ابو نے ذرا بھی رعایت نہیں کی۔ یوں وہ پابند ہو گئی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے اسے اچھا لگنے لگا۔

کالج اور دوستوں کے درمیان کچھ وقت کے لیے وہ بالکل بھول جاتی کہ اس کی زندگی میں کوئی طوفان آ کر جا چکا ہے۔ اس کے برعکس جیسے ابھی اسکول سے نکل کر کالج میں آئی ہو۔ وہی روٹین شروع ہو چکی تھی۔ کالج سے آ کر کھانا کھاتے ہی سو جاتی۔ شام کا کچھ وقت کزنز کے ساتھ باتوں اور چھیڑ چھاڑ میں گزرتا' پھر رات کا کھانا وہ حرا اور لیلیٰ مل کر پکاتی تھیں۔ کھانے کے بعد ٹی وی دیکھنا بھی ضروری تھا' کیونکہ کالج میں لڑکیاں ڈراموں پر تبصرہ کرتی تھیں' تو وہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔

ان سارے کاموں کے دوران پنکی سب کے درمیان موجود رہتی تھی۔ اس لیے اس نے الگ سے بچی کے لیے کوئی وقت طے نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے بچی سے محبت نہیں تھی۔ ظاہر ہے ماں تھی اور اس کے لیے وہی جذبات رکھتی تھی لیکن اپنی زندگی کے تلخ تجربے کے باعث اپنے جذبات کا اظہار کم ہی کرتی تھی۔ دوسرے پنکی اس سے زیادہ دادی سے مانوس تھی۔ اب تو سوتی بھی ان ہی کے ساتھ تھی۔ جب ہی اس کی طرف سے اطمینان سے ہونے کے ساتھ یہ کچھ لاپروا بھی ہوگئی تھی۔ البتہ دادی کو اس پر حد درجہ محبت لٹاتے دیکھ کر ٹوکتی ضرور تھی۔

"جیسا میرے ساتھ کیا اس کے ساتھ نہ کریں دادی! ہمیں سے اسے سختی جھیلنے کی عادت ڈالیں۔ کون جانے آگے راستے کتنے دشوار ہوں۔" یہ یقیناً اس کے لاشعور میں چھپا خوف تھا۔ دادی اسے بہت سمجھاتیں، لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ شاید اس لیے کہ جو کچھ اس پر بیتا تھا اس کے نقوش گہرے تھے۔ بھلانا چاہتی بھی تو نہیں بھول سکتی تھی۔ پھر اس کے دماغ میں یہ بات بھی بیٹھ گئی تھی کہ امی نے اسے کچھ نہیں سکھایا تھا۔ اگر زمانے کی اونچ نیچ سکھائی ہوتی، کچھ سختیاں جھیلنے کی عادت ڈالی ہوتی تو وہ حالات سے لڑ سکتی تھی۔ سسرال والے یوں اسے نکال باہر نہ کرتے اور اپنی اس سوچ کے باعث کسی کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔

اس کے خیال میں اتنا لاڈ پیار بچی کے لیے نقصان دہ تھا۔ لیکن کرتی بھی کیا اس گھر میں ایک وہی چھوٹی بچی تھی۔ اس لیے سب کی توجہ کا مرکز وہی تھی۔ جس وقت جو فارغ ہوتا، پنکی پنکی پکارتا چلا آتا، یہاں تک کہ تایا ابو اور مجھلے چچا بھی گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے پنکی کو پکارتے تھے اور وہ کس کس کو منع کرتی۔

اس وقت وہ کالج سے لوٹی تھی۔ کھانے کے بعد جب سونے لگی تو پنکی کو زبردستی اپنے ساتھ لٹا کر تھپک تھپک کر سلانے لگی۔ دادی نے دیکھا تو ٹوکتے ہوئے بولیں۔

"کیوں زبردستی سلا رہی ہو۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو سو کر اٹھی ہے کھاؤ مجھے دے دو۔"

"نہیں۔ سو جائے گی۔" وہ پنکی کو اور زور سے تھپکتے ہوئے کہنے لگی۔ "آئندہ اسے بے وقت مت سلایئے گا۔ میرے ساتھ سوئے گی، میرے ساتھ اٹھے گی۔"

"بچوں کے سونے جاگنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔" دادی نے پنکی کو اٹھالیا اور جاتے ہوئے بولی تھیں۔ "تم سوؤ آرام سے۔"

"ہونہہ، آرام سے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

پھر شام میں سو کر اٹھی تو پتا چلا سیما اپنے شوہر ابرار کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ جانے کب سے آئی ہوئی تھی۔ ابھی ڈرائنگ روم میں سب کزنز اس کے جوڑے کو گھیرے بیٹھے تھے۔ اس نے لیلیٰ کو چائے لے جاتے دیکھا تو اس کے ساتھ چل پڑی اور سیما سے مل کر بیٹھی تھی کہ ابرار جو غالباً اس کی آمد سے پہلے کوئی بات کر رہا تھا۔ وہیں سے بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"پسند کی شادی پر کسی کو اعتراض نہیں ہے۔ بس میرا بھائی غلط جگہ پھنس گیا ہے۔ ورنہ میرے ساتھ اس کی بھی شادی ہو جاتی تو سیما کو دیورانی کی کمپنی مل جاتی۔ ابھی یہ اکیلی بہت بور ہوتی ہے۔"

"تو سیما! تم جلدی سے اپنے دیور کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ لو نا۔" حرا نے چائے کا کپ سیما کو تھماتے ہوئے کہا۔

"وہ مانے تب نا، اس کا کہنا ہے شادی ہوگی تو ردا سے ورنہ نہیں۔" سیما نے ہنس کر اپنے دیور کی نقل اتاری تو ابرار سر جھٹک کر بولا۔

"پاگل ہے۔"

"ویسے ردا میں کیا برائی ہے؟" کہیں کوئی تجسس نہیں تھا، نہ شاید کسی کو اس بات سے دلچسپی تھی، لیکن حیات وند کے پہلے اور نئے نئے داماد کی کسی بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جب ہی اس نے پوچھ لیا۔

"طلاق یافتہ ہے۔" عام سی بات تھی۔ کہیں بھونچال آگیا۔ کہیں سانسیں رک گئیں۔ بے اختیاریوں پر بند باندھتے بھی ہمایوں کی نظریں اس کی طرف اٹھی تھیں۔ اس کے چہرے پر زردیاں کھنڈ گئی تھیں۔

"بندہ بے شک بیوہ سے شادی کرلے، لیکن طلاق یافتہ تو قابل اعتبار شرتی ہی نہیں۔"

ابرار احمد مزید اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے تو ایسے میں تیمور کے دماغ نے ہی کچھ کام کیا کہ وہ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ گرا کر منہ سے عجیب سی آواز نکالتے ہوئے یوں کھڑا ہوا جیسے گرم چائے نے اس کا پیر جلا دیا ہو۔

"ارے۔" سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تو لیلیٰ، ہمایوں کے اشارے پر ثمن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼
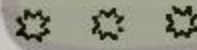
"طلاق یافتہ تو قابل اعتبار شرتی ہی نہیں۔"

اس کے کانوں میں مسلسل ابرار احمد کی آواز گونج رہی تھی۔ جب ہی اور کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ پنکی کب سے اس کے قریب کھڑی روئے جا رہی تھی۔ وہ اس سے بھی غافل تھی۔ پھر ہمایوں نے آکر اسے جھنجوڑا تھا۔

"کیسی ظالم ماں ہو تم۔ بچی کب سے رو رہی ہے۔ چپ کرانے کی توفیق نہیں ہوئی تمہیں۔"

"چپ۔" اس نے ہمایوں سے کچھ کہنے کے بجائے پنکی کے پھول سے گال پر تھپڑ جڑ دیا۔

"ثمن۔!" ہمایوں ایک لحظہ کو سناٹے میں آئے تھے۔ اگلے پل اسے دھکیل کر پنکی کو اٹھا لیا تو وہ بھڑ گئی۔

"چھوڑیں اسے۔ مجھے دیں میری بچی کو۔"

"جو سلوک تم اس کے ساتھ کر رہی ہو اس سے یہ کبھی تمہیں ماں نہیں سمجھے گی۔" انہوں نے اپنے رومال سے پنکی کا منہ اور ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے نہ سمجھنے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔"

"آخر تم اس سے کس بات کا بدلہ لے رہی ہو؟"

"میں اس سے بدلہ نہیں لے رہی۔ غلط سمجھتے ہیں آپ۔" وہ پھٹ پڑی۔ "میں اس کی ماں ہوں، مجھ سے زیادہ کون پیار کر سکتا ہے اس سے۔ مجھے پتا ہے، اس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ کیا نہیں، آپ لوگ براہ مہربانی میری بچی کو بگاڑنے کی کوشش نہ کریں۔" آخر میں اس نے زور سے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے تھے۔

"تمہیں سمجھانا بہت مشکل ہے۔" ہمایوں، پنکی کو لیے ہوئے چلے گئے تو وہ تلملا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اب گھر میں ہمایوں کی شادی کے تذکرے ہونے لگے تھے۔ تائی امی ان کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں اور ایک دو تو انہیں پسند بھی بہت آئی تھیں، لیکن ہمایوں کسی کے لیے ہامی نہیں بھر رہے تھے اور صاف منع بھی نہیں کرتے تھے۔ اس وقت تائی امی کے پوچھنے پر کہنے لگے۔

"جلدی کیا ہے، ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ جب میری شادی کا وقت ہوگا ہو جائے گی۔ ابھی تو آپ لیلیٰ کی شادی کا سوچیں۔"

"لیلیٰ کی شادی کا کیا سوچنا ہے۔ تیمور اپنے پیروں پر کھڑا ہو تو ہو جائے گی لیلیٰ کی شادی، تم اپنی بات کرو، گھر میں سب سے بڑے ہو اور اس حساب سے سب سے پہلے تمہاری شادی ہونی چاہیے تھی۔" تائی امی نے انہیں بڑے ہونے کا احساس دلایا، جس پر وہ بڑے آرام سے تائید کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"ٹھیک کہا آپ نے، لیکن آپ ہی لوگوں نے الٹا چکر چلایا۔ یعنی جو سب سے چھوٹی تھی، پہلے اس کی شادی کرا دی تو اب اسی ترتیب سے چلیں اور اس حساب سے میری باری سب سے آخر میں آئے گی۔"

"کیا فضول بات کر رہے ہو۔ ہم میں سے کوئی بھی ثمن کی شادی کے حق میں نہیں تھا۔ بچی کی عمر ہی کیا تھی، لیکن اس کی ماں۔"

"کچھ بھی تھا' شادی تو ہوئی نا اس کی۔" وہ ٹوک کر بولے تو تائی امی زچ ہو گئیں۔

"خوامخواہ میں مجھے مت الجھاؤ ہمایوں! میں نے تمہیں زینب اور ثانیہ کا بتا دیا ہے۔ مجھے یہ دونوں لڑکیاں پسند آئی ہیں اور اب میں تمہیں تین دن کا ٹائم دے رہی ہوں۔ کسی ایک کو منتخب کر لو' ورنہ میں تم سے پوچھوں گی بھی نہیں۔" تائی امی نے فیصلہ سنا دیا تو وہ خاموش ہو رہے تھے۔

پھر تین دن بعد جس نے بھی سنا' کچھ دیر کو تو اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔ خود ثمن سنانے میں آ گئی تھی۔ حالانکہ اب وہ کسی بات پر حیران نہیں ہوتی تھی۔ خصوصاً "امی کی دوسری شادی کے بعد اس نے سوچا تھا یہاں سب ممکن ہے۔ اور اب اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

"ناممکن...!"

"کیا ناممکن ہے...؟" اندر آتے ہوئے ہمایوں نے اس کا "ناممکن" سن کر یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ حرا اور لیلیٰ نے سٹ پٹا کر ایک دوسری کو دیکھا' جبکہ وہ ایک دم ان کی طرف گھوم کر پوچھنے لگی۔

"پہلے یہ بتائیں' مجھ سے شادی کا فیصلہ آپ نے دل سے کیا ہے یا دماغ سے؟" ہمایوں واقعی چکرا گئے۔ ہرگز امید نہیں تھی کہ سب کی موجودگی میں وہ براہ راست ایسا کوئی سوال کرے گی۔

"جواب دیں۔" اس کی جواب طلبی پر ان کا دماغ گھوم گیا۔ اسے کلائی سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئے اور دھکا دے کر صوفے پر گرا کر چبا چبا کر بولے۔

"تم میں شرم' حیا' لحاظ' مروت کی اگر کمی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم علی الاعلان اس کا اظہار بھی کر دو یا تم خود کو بہت اسمارٹ سمجھتی ہو۔"

"میں خود کو کچھ بھی سمجھوں یا کچھ بھی کروں۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے ٹوکنے والے۔" وہ تنک کر بولی تھی۔

"میں بھی تو میں صرف تمہارا عم زاد ہوں اور اس ناتے بھی تمہیں ٹوکنے کا حق رکھتا ہوں' سمجھیں۔"

"جی نہیں... ایسا کوئی حق نہیں ہے آپ کو' اگر رعب جمانے کا اتنا ہی شوق ہے تو لیلیٰ' حرا وغیرہ موجود ہیں۔ ان پر اپنا شوق پورا کریں۔ میں کسی کے رعب میں آنے والی نہیں۔" وہ برابر سے جواب دے کر انہیں طیش دلا رہی تھی' لیکن وہ بہت ضبط سے بولے تھے۔

"جانتا ہوں۔"

"جانتے ہیں تو مجھے یہاں لے کر کیوں آئے ہیں؟"

"تمہاری بات کا جواب دینے کہ تم سے شادی کا فیصلہ میرے دل اور دماغ کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" انہوں نے جواب کے ساتھ سوال اٹھایا۔

"ہاں...!" اس نے یقیناً "ہاں" کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ وہ فوراً روک کر بولے۔

"ایک منٹ! ابھی نہیں' اچھی طرح سوچ کر جواب دینا' اب تم جا سکتی ہو۔" وہ فوراً دروازے کی طرف بڑھی' پھر ایک دم پلٹی تھی۔

"مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اچھی طرح سن لیں۔ میں ہرگز ہرگز آپ سے' بلکہ کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی' یہ میرا فیصلہ ہے۔"

وہ اپنی بات ختم کرتے ہی تیزی سے ان کے کمرے سے نکل آئی۔ سخت غصے میں تھی۔ دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لے۔ اپنے کمرے میں آ کر بہت بڑبڑانے کے ساتھ خوامخواہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھی کہ لیلیٰ دروازے سے جھانک کر بولی۔

"ثمن! تمہاری امی کا فون ہے۔" وہ اپنے سیل فون کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی۔

"شاید تمہارا سیل آف ہے' آنٹی لینڈ نمبر پر ہیں۔" لیلیٰ کہہ کر وہیں سے پلٹ گئی' تو وہ اپنی تلاش ترک کر کے لاؤنج میں آ گئی اور ریسیور اٹھاتے ہی بولی تھی۔

"امی! میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔"

"اچھا...!" امی اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئیں تو وہ جھنجلا کر بولی۔

"بتائیں نا میں کیا کروں؟"

"کیا کرنا چاہتی ہو تم؟" امی نے اس سے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ چڑ گئی۔

"شاید تم ہمایوں کے پروپوزل سے پریشان ہو گئی ہو۔" امی نے کہا تو وہ اچھل پڑی۔

"آپ کو کس نے بتایا؟"

"تمہاری نانی امی کا فون آیا تھا میرے پاس' انہوں نے تمہارے رشتے کی بات کی اور بیٹا' مجھے تو کوئی اعتراض نہیں' بلکہ تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔ سب تمہارے اپنے ہیں' پیار کرتے ہیں تم سے' تمہاری بچی سے اور کیا چاہیے۔"

امی کے اتنے پیار سے سمجھانے کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆
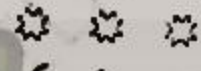
وہ سب سے ناراض ہو گئی۔ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ دادی سمجھانے کی کوشش کرتیں تو منہ سر لپیٹ کر سو جاتی۔ البتہ روٹین کے جو کام اس کے ذمے تھے۔ وہ اسی طرح کرتی تھی۔ اس وقت وہ اپنا رات کا آخری کام کچن سمیٹ کر نکلنے لگی تھی کہ ہمایوں ایک دم دروازے میں آن کھڑے ہوئے۔

"کچھ چاہیے؟" اس نے نکلنے کا راستہ نہ پا کر پوچھ لیا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" انہوں نے کہا تو وہ رخ موڑ کر بولی۔

"میں شادی سے متعلق کوئی بات نہیں سنوں گی۔"

"کیوں۔ پہلی شادی کی ناکامی سے خوف زدہ ہو یا۔"

"میں کسی بات سے خوف زدہ نہیں ہوں۔" وہ فوراً" بول پڑی۔ "بس مجھے نہیں کرنی شادی۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کیوں' دیکھو' جب تک تم ٹھوس وجہ نہیں بتاؤ گی تمہاری کوئی بات نہیں سنی جائے گی۔" انہوں نے نرم لہجہ اختیار کر کے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔

"اچھی زبردستی ہے۔"

"زبردستی کی کیا بات ہے ثمن! تم سمجھنے کی کوشش کرو' چچی جان تمہاری ہی عمر میں بیوہ ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ان کا دوسرا شادی نہ کرنے کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط یہ میں نہیں جانتا' لیکن یہ یقین سے کہوں گا کہ تم ان کی طرح زندگی نہیں گزار سکتیں۔"

"کیوں۔؟" وہ پیشانی پر شکنیں ڈال کر بولی۔

"اس لیے کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ محبتیں' رواداریاں سب وقت اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا ہے۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے جب چچی جان تمہاری انگلی تھام کر دوبارہ اس گھر میں داخل ہوئی تھیں' تو انہیں یقین تھا کہ یہاں تمہیں باپ نہیں تو باپ جیسی شفقت ضرور ملے گی اور یہ تم جانتی ہو کہ ان کے یقین کو ٹھیس نہیں پہنچی۔ کیا تمہارے پاس ایسا کوئی یقین ہے۔" انہوں نے اچانک اسے پنکی کا احساس دلایا اور ابھی وہ جواب نہیں دے پائی تھی کہ کہنے لگے۔

"میں پنکی کے ددھیال کی نہیں یہاں کی بات کر رہا ہوں۔ یہاں بھی کوئی نہیں ہے۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ پھر تم پنکی کی زندگی کے اس خلا کو کیسے پر کرو گی؟"

"پنکی کا باپ زندہ ہے ہمایوں! اور جیتے جی باپ نے اسے جس شفقت سے محروم کر دیا۔ وہ کوئی دوسرا بھی اسے نہیں دے سکتا۔" اس کے ناگواری سے کہنے پر وہ رک کر بولے تھے۔

"میں جو دینا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے لے لیں' آپ پنکی کو لیکن مجھ سے شادی کا خیال چھوڑ دیں۔"

ہمایوں اس کی منطق پر ابھی حیران ہو رہے تھے کہ وہ ان کے قریب سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ دادی روز زانہ کی طرح اس کے انتظار میں سوتی جاگتی کیفیت میں تھیں۔ وہ ان کی ٹانگیں دبانے لگی' پھر ان کے خراٹوں کی آواز سن کر اپنی جگہ پر آ لیٹی اور الٹ پلٹ سوچتے ہوئے سو گئی تھی۔

اگلے دن چھٹی کے باعث ناشتا اور پھر دوپہر کا کھانا بہت دیر سے کھایا گیا۔ شام میں سیما کی آمد متوقع تھی۔ اس لیے تائی امی کو ابھی سے رات کے کھانے کی فکر ہو گئی اور اس سے پہلے کہ وہ خاص ڈشز کی تیاری کا ابھی سے آرڈر جاری کرتیں، وہ فوراً وہاں سے کھسک آئی اور کل کے لیے کپڑے پریس کرنے کھڑی ہوئی تھی کہ ایک دم پنکی کا خیال آیا۔ اس نے بہت دیر سے پنکی کو نہیں دیکھا تھا۔ دادی سے پوچھا ان کے لاعلمی ظاہر کرنے پر وہ استری کا پلگ نکال کر کمرے سے نکل کر آئی تو برآمدے میں لیلیٰ مل گئی۔

"پنکی کہاں ہے؟" اس نے پوچھا تو لیلیٰ ہنستے ہوئے بولی۔

"پنکی اس وقت اپنے پاپا کے پاس ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ چیخ پڑی۔ "کون لے کر گیا ہے؟ کس کی اجازت سے؟"

"ارے رے۔۔!" لیلیٰ سٹپٹا گئی۔ "میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔"

"پھر کیا مطلب ہے تمہارا؟ بتاؤ پنکی کہاں ہے۔"

"ابھی ہومی بھائی اوپر۔۔۔" بات ابھی لیلیٰ کے ہونٹوں میں تھی کہ اس نے زینے کی طرف دوڑ لگا دی اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اوپر آئی۔ اصل میں وہ لیلیٰ کی پہلی بات سے پریشان ہو گئی تھی کہ پنکی اپنے پاپا کے پاس ہے۔ پتا نہیں اس نے ایسا مذاق کیوں کیا تھا۔ اس کی بہرحال جان پر بن آئی تھی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہمایوں کے کمرے میں داخل ہوئی اور پنکی کو ان کی گود سے جھپٹ کر اپنے سینے میں زور سے بھینچتے ہوئے گویا اس کے ہونے کا یقین کرنے لگی۔ جبکہ بچی اس کے بازوؤں کے تنگ حلقے میں رونے لگی تھی۔ جب اس نے خود کو یقین دلا کر آنکھیں کھولیں تب ہمایوں پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے، اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟" وہ ابھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ روتی ہوئی پنکی ہمایوں کی طرف بازو پھیلا کر بولی۔

"پاپا۔۔۔!"

"پاپا۔۔۔!" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اس نے پنکی پھر ہمایوں کو دیکھا اور لیلیٰ کی بات سمجھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"اسے پاپا کہنا کس نے سکھایا؟"

"میں نے۔۔؟" ہمایوں کی مسکراہٹ بڑی دل فریب تھی۔ پتا نہیں ہمیشہ سے ایسی تھی یا اب اچانک۔۔۔ اس کے دل کی زمین پر موسم کی پہلی بارش برس گئی۔ ہر طرف سوندھی سوندھی خوشبو پھیلنے لگی تو وہ جبراً کر بولی۔

"لیکن آپ اس کے پاپا نہیں بن سکتے۔" اس کے ساتھ ہی جانے لگی کہ وہ پکار کر بولے۔

"سنو! حقائق سے نظریں چرانا بزدلی ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ تم اس بچی پر بھی ظلم کر رہی ہو۔"

خلاف توقع وہ کچھ نہیں بولی۔ فوراً کمرے سے نکل گئی تو کچھ دیر ہمایوں اس کی خاموشی کو سوچتے رہے، لیکن کوئی معنی نہیں پہنا سکے۔ کیونکہ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ ابھی اگر خاموش ہو گئی تھی تو کچھ دیر بعد باقاعدہ ان کے خلاف محاذ کھول کر کھڑی ہو سکتی تھی۔

کسی وقت ان کا دل چاہتا تھا۔ اس کے منہ پر زوردار تھپڑ دے ماریں کہ وہ پہلے جیسی ہو جائے، جیسی شادی سے پہلے ہوا کرتی تھی، لیکن پھر وہ خود کو ٹوک کر سمجھتے کہ ٹھیک تو ہے۔ اس کمزور لڑکی نے کیا پایا۔ اب کم از کم اپنے لیے لڑ تو سکتی ہے اور ہو سکتا ہے۔ کبھی اپنے لیے مثبت انداز سے سوچنا شروع کر دے۔ ابھی تو پتا نہیں کیا سوچ رہے ہوئے تھی۔ بہرحال یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے پنکی کو پاپا کہنے سے منع نہیں کیا تھا۔

✲ ✲ ✲

رات کے اس پہر سب ہی بے خبر سو رہے تھے اور کوشش تو اس نے بھی بہت کی تھی، لیکن نیند کسی طرح مہربان ہو کے نہیں دی۔ پہلے کروٹ پر کروٹ بدلتی رہی، جب بدن دکھنے لگا تو تکیے کے سہارے بیٹھ گئی اور پھر دونوں گھٹنے سے وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ ذہن

خالی بھی نہیں تھا اور کسی سوچ پر گرفت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"میں کیا کروں۔" اس نے بے بسی سے سر بینک پر ٹکایا۔ "میرے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔" میرے اندر ایسی ہلچل کبھی نہیں مچی تھی۔ ان کی گہری شفاف آنکھوں میں مجھے اپنا وجود ڈوبتا ہوا لگا۔

"اف نہیں۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو... میں ثمن' پنکی کی ماں۔" اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا' پھر لیٹ کر تکیے میں منہ چھپا لیا۔ وہ خائف ہو گئی تھی۔

اور اگلے کئی دن وہ اپنے آپ میں پریشان ہمایوں سے چھپتی پھری۔ جانے اس کے اندر کیسا خوف تھا جو اسے خود چل کر آتی منزل کی طرف بڑھنے سے روک رہا تھا اور وہ بجائے خود کو آمادہ کرنے کے ہمایوں سے صاف بات کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگی۔ عجیب بات تھی۔ اب تک ہر بات بے دھڑک کہتی آ رہی تھی۔ اب ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ دل جو باغی ہو گیا تھا۔ یہ دہری پریشانی تھی کہ اب دل کو بھی سمجھانا پڑ رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے آپ میں الجھ رہی تھی' جب ہمایوں نے ادھر سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا اور اس کا الجھنا نوٹس کرکے اس کے پاس آ گئے تھے۔

"کیا بات ہے' کچھ پریشان ہو۔" سیدھا سادا انداز تھا۔ وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"جی اور میری پریشانی کا سبب آپ ہیں۔"

"میں...؟" انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"جی... آپ مجھ سے شادی کی ضد کیوں کر رہے ہیں؟" وہ ناراضی سے پوچھ رہی تھی۔ انہوں نے ذرا سے کندھے اچکائے' پھر ہنسے تھے۔

"سیدھی سی بات ہے' لیکن تم نہیں سمجھو گی' حالانکہ خود کو بہت عقل مند سمجھنے لگی ہو اور خود پر کتنے بھی خول چڑھاؤ' اندر سے وہی سہمی ہوئی بزدل سی لڑکی ہو۔"

"میں کیا ہوں اور خود کو کیا سمجھتی ہوں' یہ تو آپ رہنے ہی دیں بس مجھے میری بات کا جواب چاہیے۔"

"کون سی بات کا؟" وہ قصداً" انجان بن کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ زچ ہو کر بولی۔

"یہی کہ مجھ سے شادی کی کیا ضد ہے؟"

"دیکھو... میں کوئی نوعمر' جذباتی لڑکا نہیں ہوں ثمن! جو یہ کہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یا تم ایسی ہی کوئی بات سننا چاہتی ہو؟" آخر میں اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ اچھل پڑی۔

"جی نہیں!"

"بہرحال! ایسی کوئی خواہش ہے بھی تو انہونی نہیں ہے' اور جہاں تک شادی کا سوال ہے تو میں نے جذبات میں نہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے اور مجھے تم سے زیادہ پنکی کا خیال ہے۔ پتا نہیں تم کس بنا پر اس بچی کو محروم رکھنا چاہتی ہو۔ حالانکہ میں تمہیں اس وقت سے بھی آگاہ کر چکا ہوں' جب سب اپنے اپنے بال بچوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ پھر بھی تم مجھنے کی کوشش نہیں کر رہیں۔ یا قصداً" نظریں چرا رہی ہو۔ کچھ بھی ہے تمہاری ضد نہ صرف پنکی بلکہ خود تمہارے حق میں بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

قدرے رک کر پھر کہنے لگے۔

"تم ابھی کم عمر اور نادان ہو ثمن! میں نہیں چاہتا کہ چند سال بعد احساس ہونے پر تمہارے پاس سوائے پچھتاؤں کے اور کچھ نہ ہو۔ ابھی وقت تمہاری دسترس میں ہے۔ پنکی کو باپ کی اور تمہیں سائبان کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت سے انکار کرکے اس وقت کو مت گنواؤ۔"

"پنکی کو باپ کی اور مجھے سائبان کی ضرورت ہے۔" وہ ہیں دور سے بولی تھی اور انھیں اثبات میں سر ہلاتے دیکھ کر یک دم چیخ پڑی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔ آپ کی پنکی کا باپ زندہ ہے۔ جب بھی وہ اس کی ضرورت محسوس کرے گی' میں اسے اس کے پاس بھیج دوں گی' سمجھے آپ۔"

وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے سخت توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ یعنی ہمایوں مسلسل

اس کی ضرورت کو جتا کر ایک طرح سے اس کی جھولی میں خیرات ڈالنا چاہتے تھے۔ اب ایسی بھی ضرورت مند نہیں تھی وہ۔

زندگی بھر کا بندھن اگر صرف ضرورت کی بنیاد پر نبھایا جا سکتا تو وہ عارف (سابقہ شوہر) کے پاؤں پڑ کر اس کی منتیں کر لیتی کہ وہ اسے اپنے در پر پڑا رہنے دے۔ کاش ہمایوں کوئی اور تعلق ظاہر کرتے۔ کچھ نہ سہی تھوڑی سی وابستگی تب شاید وہ اپنے دل میں اٹھتی امنگوں کو بے لگام چھوڑ دیتی' لیکن انہوں نے تو اس کا اپنی ذات پر سے مان بھی چھین لیا تھا' اسے ضرورت مند کہہ کر۔

اس رات اس نے بہت خاموشی سے آنسو بہائے تھے۔

اور اگلے روز عین اس وقت جب پنکی' پاپا' پاپا پکارتے ہوئے ہمایوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے درمیان میں آکر بچی کے پھول سے رخسار پر زوردار تھپڑ دے مارا اور دانت پیس کر بولی تھی۔

"یہ تمہارے پاپا نہیں ہیں۔" پنکی اس کے تھپڑ سے دور جا گری اور بلبلا کر رو رہی تھی۔ جبکہ ہمایوں بس ایک پل کو سناٹے میں آئے' پھر اس پر برس پڑے۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟ اتنی سی بچی کو مارتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ آئندہ اسے ہاتھ لگایا تو میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے پنکی کو اٹھانا چاہا' لیکن اس سے پہلے ہی اس نے بچی کو کلائی سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ جس سے وہ اور زیادہ رونے لگی۔

"کیا بات ہے؟؟" ادھر سے تائی امی' منجھلی چچی اور باری باری سب نکل کر آگئے تو اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"میری بچی ہے' میں اسے ماروں یا پیار کروں۔ کوئی نہیں روک سکتا ہے اور تائی امی! آپ پوچھیں' ہمایوں سے' یہ کون ہوتے ہیں میرے ہاتھ توڑنے والے۔"

"بالکل' میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔ اگر آئندہ اس نے پنکی کو مارا تو۔" وہ بھی غصے میں بولے تھے۔

"ماروں گی' ماروں گی۔"

"شمن!" تائی امی نے تنبیہی لہجے میں اسے ٹوکا۔

"کیوں ماروگی۔ اتنی سی بچی مار کھانے کے لائق ہے۔"

"آپ کو نہیں پتا تائی امی' یہ بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔"

"تو بیٹا پیار سے سمجھاؤ۔ مارنے سے تو ڈھیٹ ہو جائے گی۔ پھر ابھی اسے سمجھ ہی کتنی ہے۔"

"مجھے تو سمجھ ہے۔" وہ فوراً بول پڑی۔ "اور آپ کو بھی سمجھنا چاہیے' ابھی تو یہ نا سمجھی میں ہمایوں کو پاپا کہہ رہی ہے اور جب اسے معلوم ہوگا کہ یہ اس کے پاپا نہیں ہیں تو اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی۔"

"نان سینس!" ہمایوں اس کی بدلحاظی پر تلملاتے ہوئے باہر نکل گئے تو منجھلی چچی اس کے قریب آکر بولیں۔

"بیٹا! اسی لیے تو ہم تمہیں شادی پر زور دے رہے ہیں۔"

"اف! یہ ہر بات کی تان میری شادی پر کیوں ٹوٹتی ہے۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔"

وہ چڑ کر روتی اور پنکی کو لیے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تو تائی امی نے منجھلی چچی کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں بس اب بات ختم ہو گئی۔

❊ ❊ ❊

اور پھر واقعی اگلے چند دنوں میں تائی امی نے ہمایوں کی میرج اور بات طے کر دی۔ اس نے سنا تو کچھ دیر کو اپنی زندگی کی راہوں پر دور' دور پھیل جانے والی تاریکی و شدت سے محسوس کیا۔ پھر سر جھٹک کر امتحانوں کی تیاری میں لگ گئی۔ پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک لمحہ ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے یکسوئی سے پڑھنے میں لگ گئی۔ یہاں تک کہ امتحانوں تک اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔

پھر جس دن وہ آخری پیپر دے کر لوٹی' تب گھر میں خاموشی کے ساتھ کچھ شدید گی محسوس کر کے وہ ٹھٹکی

تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں ہمایوں کی شادی کی تیاریوں کے باعث خاصی ہلچل مچی ہوگی' لیکن ایسا کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور کسی سے پوچھنے کا مطلب تھا اس کی ذات ضرور نشانہ بنتی۔ اس لیے اس نے دادی سے بھی نہیں پوچھا کہ گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے اور اپنے لیے جو وہ سوچ چکی تھی' اس پر بات کرنے کے لیے اس رات وہ تایا ابو کے پاس چلی آئی۔

"کیا بات ہے؟" تایا ابو کو یقین تھا کہ وہ کسی کام سے ہی آئی ہوگی' پوچھنے کے ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ سر جھکا کر بولی۔

"وہ تایا ابو! مجھے آپ سے ایک بات کہنی تھی۔"

"ہاں کہو۔" ان کا لہجہ ہمیشہ نرم ہوتا تھا۔ اس کے باوجود جانے کیسا رعب تھا کہ ہونٹوں تک آئی بات بھول جاتی تھی اور یہ صرف اس کے ساتھ نہیں تھا۔ گھر کا ہر فرد ان کے سامنے آکر اسی طرح پزل ہو جاتا تھا اور وہ بہت سوچ کر آئی تھی' پھر بھی کہنے میں بہت وقت لگا۔

"میں۔۔۔ میں تایا ابو اپنے نانا جی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔"

"امتحان ختم ہو گئے تمہارے؟"

"جی۔۔۔ آج آخری پیپر تھا۔" اس نے بتایا تو تایا ابو پرسوچ انداز میں بولے تھے۔

"تو چھٹیاں اپنے نانا جی کے پاس گزارنا چاہتی ہو۔" وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گئی' کیونکہ اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"اچھی بات ہے' اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں رد نہیں کر سکتا۔" انہوں نے کہا تو وہ جیسے ہلکی پھلکی ہو گئی۔

"شکریہ تایا ابو!"

"تم تیاری کرلو' میں کل کسی سے کہوں گا تمہیں چھوڑ آئے گا اور ہاں۔۔۔" تایا ابو نے رک کر دراز کھولی اور کچھ نوٹ لفافے میں ڈال کر لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ پیسے رکھ لو اور ضرورت پڑے تو فون کر دینا۔"

"جی۔۔۔" وہ ان کے کمرے سے نکلنے تک بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھ سکی۔ اس کے بعد بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی تھی اور بڑا سوٹ کیس گھسیٹ کر بولی۔

"دادی! میں یہاں سے جارہی ہوں۔"

"ہائیں۔۔۔ کہاں جارہی ہو؟" دادی نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"ساہیوال۔۔۔ اپنے نانا جی کے پاس۔۔۔" اس نے الماری کھول لی تھی۔ کیونکہ واپسی کا خیال نہیں تھا۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا لے جائے' کیا چھوڑے۔"

"واپس کب آؤ گی؟" دادی کو ابھی سے فکر ہو گئی۔

"کیا کروں گی واپس آکر دادی۔ یہاں سب مجھ سے تنگ ہیں۔ آپ کو بھی تو تنگ کرتی ہوں۔" اس نے اپنی مصروفیت ترک نہیں کی تھی۔

"کوئی تنگ نہیں' تم سے۔۔۔ بس جلدی واپس آنا۔ میرا دل نہیں لگے گا تمہارے بغیر۔۔۔" دادی نے کہا تو وہ خود سے بولی تھی۔

"دل تو میرا بھی نہیں لگے گا۔" پھر الماری میں سے کپڑے نکال نکال کر سوٹ کیس میں سیٹ کر رہی تھی کہ لیلیٰ اور حرا تیزی سے اندر آکر پوچھنے لگیں۔

"ثمن! تم ساہیوال جارہی ہو؟"

"ہوں۔۔۔!" وہ مصروف تو تھی ظاہر بھی کیا۔

"کیوں۔۔۔ میرا مطلب ہے ابھی کیوں جارہی ہو۔ شادی میں چند دن رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد چلی جانا۔" حرا نے آگے آتے ہوئے کہا۔ پھر اس کا اتنا بڑا سوٹ کیس دیکھ کر اچھل پڑی۔ "اف اتنا کچھ لے جارہی ہو۔ کیا سال بھر وہاں رہنے کا پروگرام ہے۔"

"تمہیں کیا پریشانی ہے۔ میں سال بھر رہوں یا سالہا سال۔۔۔" وہ کہہ کر پنچی کے کھلونے بیگ میں بھرنے لگی۔

"تمہارا مطلب ہے' تمہارے جانے سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" لیلیٰ نے شاکی ہو کر کہا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گئی ہے۔

"میرا ایسا کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم دونوں اگر فضول سوال جواب کے بجائے میرا ہاتھ بٹا دو گی تو گھس نہیں جاؤ گی۔" اس نے اپنی خفت مٹانے کی خاطر دوسری بات کہی تھی۔

"اچھا۔ تو تم ابھی کیوں جا رہی ہو؟" لیلیٰ کو جیسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے اس کی شادی کے بعد چلی جانا۔" حرا نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ ایک دم لیلیٰ کو دیکھنے لگی۔

"لیلیٰ کی بھی شادی ہو رہی ہے؟"

"ظاہر ہے۔ تمہاری وجہ سے اس کی شادی تو التوا میں نہیں ڈالی جا سکتی۔" حرا ترنگ میں تھی، وہ سمجھی نہیں۔

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب چھوڑ۔ یہ بتاؤ تم شادی تک تو واپس آ جاؤ گی نا۔ اس جمعہ کو باقاعدہ تاریخ رکھی جائے گی۔ وہ بھی اسی مہینے کی۔ سمجھ رہی ہو نا۔" حرا نے اس کا بازو ہلا کر اسے گم صم حالت سے نکالا۔ تو وہ یوں ہی اثبات میں سر ہلانے لگی، پھر سوٹ کیس بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو۔ اب مجھے سونے دو، صبح سفر پر جانا ہے۔"

"کوئی اتنا لمبا سفر نہیں ہے۔ تین گھنٹے کی مسافت پر ساہیوال ہے۔ بہرحال تین دن میں واپس آ جانا ورنہ۔" حرا نے دھمکی کے انداز میں انگلی اٹھائی، پھر لیلیٰ کے ساتھ نکل گئی تو اس نے جلدی سے بڑھ کر لائٹ بند کر دی۔

صبح ناشتے کے بعد تیمور نے اس کا سامان گاڑی میں رکھ دیا تو سب سے ملتے ہوئے اس کا دل بھر آ رہا تھا، لیکن اس نے بہت ضبط کیا، پھر بھی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ اس نے ایک آخری نظر حیات ولا پر ڈالنی چاہی، لیکن گاڑی یوں اسپیڈ سے آگے بڑھی کہ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ غصے سے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ہمایوں کو دیکھ کر دانت پیس کر رہ گئی۔ پھر جب ذرا حواس بحال ہوئے تو کن انکھیوں سے دیکھا۔ ہمایوں یکسر اجنبی بنے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر بھی نہیں تھا، جس سے پتا چلتا کہ وہ خود پر ضبط کر رہے ہیں یا اسے چھوڑ آنے کی ڈیوٹی انہیں گراں گزر رہی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ معمول کے سفر پر ہوں۔ تب وہ بھی بے نیازی کے ساتھ مصروف ہو کر خود کو لاتعلق ظاہر کرنے لگی۔ لیکن جلد ہی اکتا گئی تو بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔

"ہم کتنے بجے پہنچیں گے؟"

"بارہ بجے۔" بنا اس کی طرف دیکھے جواب آیا تھا۔ اسے پھر کوئی بات نہیں سوجھی تو کہنے لگی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ کے ساتھ ساتھ لیلیٰ اور تیمور کی شادی بھی ہو رہی ہے۔ وہ تو رات حرا نے بتایا تو مجھے حیرت ہوئی۔"

"کس پر۔" انہوں نے اس کی بے خبری جتائی تھی اور وہ سمجھ کر ہی بولی تھی۔

"ظاہر ہے اپنے آپ پر۔ گھر میں دو دو بلکہ تین شادیاں ایک ساتھ طے پا رہی ہیں اور مجھے پتا ہی نہیں۔" پھر صفائی پیش کرنے لگی۔ "اصل میں امتحانوں کی وجہ سے مجھے اور کسی بات کا ہوش ہی نہیں تھا۔"

"تمہیں ابھی بھی ہوش نہیں ہے۔" انہوں نے یوں ہونٹ بھینچے جیسے بلا ارادہ بات ہونٹوں سے پھسل گئی ہو۔

"کیا مطلب۔" وہ انہیں دیکھنے لگی۔ جواب ندارد، تب کچھ سوچ کر بولی۔

"آپ پوچھیں گے نہیں۔ میں نانا، نانی کے پاس کیوں جا رہی ہوں؟"

"تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔" وہ مسلسل ایک ہی ٹون میں بات کر رہے تھے۔

"اچھی بات ہے نا اب مجھے اپنی مرضی کرنی آ گئی ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے وہ بھی سراہیں گے، لیکن ادھر ہنوز سرد مہری۔

تب اندر ہی اندر خود کو سرزنش کر کے وہ بھی یوں

خاموش ہوئی کہ بقیہ تمام راستہ اسی خاموشی میں کٹ گیا اور جب وہ اترنے لگی تب وہ پکار کر بولے تھے۔

"سنو۔ اپنی امی کی تاریخ دوبارہ تم مت دہرانا۔ گو کہ حیات ولا کے دروازے تم پر بند نہیں ہوئے نہ کبھی ہو سکتے ہیں، پھر بھی میں نہیں چاہتا کہ کسی دن بچی کی انگلی تھامے تم حیات ولا کے گیٹ پر کھڑی نظر آؤ۔ ہاں اگر وہاں سے کوئی تمہیں لینے آئے تو انکار مت کرنا۔"

اس نے بہت خاموشی سے ان کی پوری بات سنی اور پھر پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، کیونکہ وہ پتھر کی نہیں ہونا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼
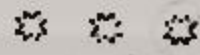
اس نے رات ہی امی کو فون کر کے اپنی آمد کا بتا دیا تھا۔ جب ہی وہ اس سے پہلے ہی نانا، نانی کے پاس موجود تھیں۔ گو کہ اسے امی سے بہت سی شکایتیں تھیں، لیکن ان سے مل کر ساری رنجشیں دور ہو گئیں۔ نانا، نانی سے وہ تقریباً" پانچ سال بعد مل رہی تھی۔ پانچ سال پہلے جب اس کے ماموں زاد بھائی شاہ نواز کی شادی تھی، تب وہ امی کے ساتھ آئی تھی۔

نانا کا گھر اب بھی ویسا ہی تھا۔ کشادہ صحن، برآمدہ، دو طرف لائن سے بنے کمرے، ایک طرف کچن اور باتھ روم وغیرہ اور گھر کے افراد بھی وہی تھے۔ کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ یعنی نانا، نانی، ماموں، مامی، شاہ نواز بھائی اور ان کی بیوی عارفہ، جس کی گود ابھی تک سونی تھی۔ جب ہی اس سے ملتے ہی اس نے بچی کو اس کی گود سے لے لیا تھا اور اس کے رونے پر اسے بہلاتی پھر رہی تھی۔ پھر بار بار یہ بھی ضرور کہتی اسے مجھے دے دو۔

"اچھا کیا تو ادھر آ گئی۔ رونق ہو گئی ہے۔" دسترخوان پر نانا جی نے کہا تو سب نے ان کی تائید کی، لیکن امی جانے کیوں خاموش تھیں۔ اس نے خاص طور سے امی کی خاموشی محسوس کی، اور جب ان کے لیے مخصوص کمرے میں آرام کی غرض سے ان کے ساتھ آ کر لیٹی تو پوچھے بغیر رہ نہیں سکی۔

"آپ کو میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی امی۔"

"تم اپنے ساتھ ظلم کرو گی تو میں کیسے خوش ہو سکتی ہوں۔" امی نے کہا تو وہ چیخ کر بولی۔

"کیا ظلم کیا ہے میں نے اپنے ساتھ۔"

"اس سے بڑا ظلم اور کیا ہے کہ خوش نصیبی تمہارے دروازے پر دستک دے رہی ہے اور تم دروازہ نہیں کھول رہیں۔ ایسا مت کرو بیٹا، ہیوں پورے خلوص سے۔"

"نہیں چاہیے مجھے کسی کا خلوص۔ آخر آپ کی سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آتی۔ مجھے شادی ہی نہیں کرنی، ہیوں سے نہ کسی اور سے۔ آپ بار بار میرے منہ سے انکار کیوں سننا چاہتی ہیں۔"

"انکار ہی تو نہیں سننا چاہتی۔ آخر ساری زندگی ایسے کیسے گزارو گی؟" امی کے عاجزی سے کہنے پر وہ فوراً" بولی تھی۔

"جیسے آپ نے گزاری۔ اب یہ مت کہہ دیجیے گا کہ آپ کی بات اور تھی۔ یہ ہی حالات آپ کے بھی تھے اور میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔"

"میری بیٹی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم میرے ہی راستے پر چلو۔ بڑا کٹھن راستہ ہے۔" امی کے لہجے میں دکھ جانے گئے دنوں کا تھا یا اب۔

"جانتی ہوں، لیکن یہ نہیں جانتی کہ جب کٹھن راستہ طے ہو گیا تب آپ کو شادی کا خیال کیوں آیا۔ یا آپ نے پہلے ہی سے سوچ لیا تھا؟" اس کے اندر ہمیشہ سے یہ سوال اٹھتا تھا اور یہ طے تھا کہ وہ امی سے پوچھے گی بھی ضرور۔

"نہیں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔ بس یہاں آئی تو تمہارے نانا جی نے۔" امی نے یوں سر جھٹکا جیسے بس اس بات کو چھوڑ دو، لیکن وہ تلخی سے بولی تھی۔

"نانا جی نے کہا اور آپ مجبور ہو گئیں۔"

"نہیں۔ مجبور میں نہیں تمہارے نانا جی تھے۔ اپنے بھتیجے کی محبت میں، جو ایکسیڈنٹ میں معذور ہو گیا تھا۔ اس کی بیوی اسے اس حال میں چھوڑ کر چلی

گئی۔ بچے بھی ساتھ لے گئی تھی۔ پھر میری تائی کے انتقال کے بعد اس معذور کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ تمہارے نانا جی اسے یہاں اس گھر میں لانا چاہتے تھے' لیکن تمہاری مامی جی نے اعتراض کیا' پھر جب میں یہاں آئی تو۔۔۔"

امی خاموش ہو گئیں اور وہ سناٹے میں آئی انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے یہاں آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ حرا کے فون پر فون آ رہے تھے کہ وہ یہاں مر گئی ہے۔ اس وقت حرا بری طرح جھنجلائی ہوئی تھی۔ پہلے اسے گالیاں دیں' پھر منتیں کرنے لگی۔

"خدا کے لیے ثمن آجاؤ۔ مجھ اکیلی جان پر رحم کرو۔ میں اتنے کام نہیں کر سکتی۔ شادی میں تھوڑے دن رہ گئے ہیں اور میرے کپڑے بھی نہیں سلے۔"

"ریڈی میڈ لے لینا۔" اس نے بڑے آرام سے مشورہ دے ڈالا۔

"چلو یہ مسئلہ تم نے حل کر دیا' تمہارا بہت بہت شکریہ۔" حرا تلملا گئی تھی۔

"اور کیا مسئلہ ہے؟" اس نے مزا لے کر پوچھا۔

"کچن۔۔۔ مہمان داریاں۔۔۔ یہ سب میں نہیں کر سکتی۔ تم آجاؤ پلیز۔" حرا نے پھر منت کی۔ تو اسے سیما کی شادی یاد آئی کہ وہ کیسے گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ حرا منتوں کے بعد پھر اسے گالیاں دے رہی تھی' لیکن وہ حیات ولا میں اتری رونقوں کو سوچتے ہوئے جانے کہاں کھو گئی تھی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ یہاں مہمان بن کر نہیں آئی تھی۔ اس لیے اس نے بہت جلد اپنی وہی روٹین بنالی تھی' جو حیات ولا میں تھی۔ وہاں دادی تھیں اور یہاں نانا' نانی۔ گھر داری میں وہ عارفہ بھابھی کا ہاتھ بٹاتی' جبکہ نانا' نانی کے سارے کام اس نے اپنے ذمے لے لیے تھے۔ بظاہر سب ٹھیک لگ رہا تھا' لیکن کسی کسی وقت اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوتا' لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ماحول میں اچانک کشیدگی کیوں محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ ایک ایک کی شکل دیکھتی' پھر اس کی نظریں پنکی پر ٹھہر جاتیں جو یہاں بھی سب کی آنکھ کا تارا بنی ہوئی تھی۔ ماموں جی اور شاہ نواز بھائی بھی گھر میں داخل ہوتے ہی پنکی کو پکارتے تھے۔

اس وقت وہ ہینڈ پمپ کے نیچے پنکی کو نہلا رہی تھی۔ جب اس کے بدن پر صابن ملنے لگی تو شاہ نواز بھائی آکر ہینڈ پمپ چلانے لگے۔ پنکی پانی کے نیچے کھلکھلا رہی تھی۔ شاہ نواز بھائی ہینڈ پمپ کے منہ پر اپنی ہتھیلی جماتے پھر موٹی دھار اس پر چھوڑ دیتے۔ وہ پنکی کے ساتھ خوش ہو رہے تھے کہ عارفہ بھابھی آکر ان سے بولیں۔

"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"دیکھ نہیں رہیں۔" انہوں نے کہا تو عارفہ بھابھی جھنجھلے لہجے میں بولی تھیں۔

"دیکھ ہی تو رہی ہوں۔" شاہ نواز بھائی پنکی میں مگن تھے اور وہ، جو عارفہ کی طرف متوجہ ہوئی تھی اس کے چبھتے طنز پر سناٹے میں آ گئی۔

"آؤ تمہیں بھی نہلا دوں۔" شاہ نواز بھائی نے شرارت سے عارفہ پر پانی اچھالا تو وہ جلدی سے پنکی کو اٹھا کر کمرے میں آ گئی۔ اسے محسوس ہوا اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ کیونکہ یہ صورت حال اس کے لیے بالکل نئی اور انتہائی تکلیف دہ تھی۔ دل چاہا پنکی کو لے کر اسی وقت یہاں سے نکل جائے اور وہ ایسا کر سکتی تھی' لیکن۔۔۔

"سنو۔۔۔ اپنی امی کی تاریخ دوبارہ تم مت دہرانا۔"

اس کی آنکھوں میں چبھن اتر آئی تھی اور اس کی سمجھ میں آیا کہ امی نے ہمیشہ اسے اپنی آغوش میں کیوں چھپائے رکھا۔ اسے کبھی تایا ابو اور منجھلے چچا کی طرف لپک کر کیوں نہیں جانے دیا۔ یقیناً" ان کے اندر یہ خوف تھا کہ ایسا نہ ہو' تایا ابو اور منجھلے چچا یتیم بھتیجی پر کچھ وقت کو ہی سہی کچھ زیادہ عنایتیں کر بیٹھیں اور یہ بات تائی امی اور منجھلی چچی کو ناگوار گزرے۔ بظاہر سیدھی سادی امی۔۔۔ وہ انہیں سمجھنے میں کتنی غلطی

کر گئی تھی۔

اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ زمانہ نہیں بدلا' نہ ہی وقت' اپنے ساتھ محبتیں اور رواداریاں بہا لے گیا ہے۔ البتہ محبتوں کو سمجھنے' برتنے اور سنبھال رکھنے کا ڈھنگ نہیں رہا۔ بہرحال اب اس موڑ پر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کوشش کر رہی تھی کہ جب شاہ نواز بھائی گھر پر ہوتے وہ کمرے تک محدود رہتی اور بچی کو اپنے ساتھ لگائے رکھتی۔ لیکن بچی ناسمجھ تھی' جہاں موقع ملتا کمرے سے نکل جاتی' کبھی شاہ نواز بھائی خود آ کر اسے لے جاتے۔

اس وقت تائی امی کے سر میں تیل کی مالش کرتے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔ شاہ نواز بھائی بچی کو اٹھائے باہر جا رہے تھے۔ پھر تائی اماں کی باتوں میں اس کا دھیان بٹ گیا۔ جب عارفہ نے آ کر اس سے شاہ نواز کی بابت پوچھا کہ وہ کہاں ہیں تو وہ پہلے حیران ہوئی' پھر مسکرا کر بولی تھی۔

"آپ کے میاں ہیں آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔"

"وہ صرف میرے میاں نہیں ہیں۔ یہاں اور بہت لوگ ان پر حق رکھتے ہیں۔" عارفہ کے طنز سے جتانے پر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

"تم نے بتایا نہیں شاہ نواز کہاں گئے ہیں۔" عارفہ نے پھر پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم' ابھی کچھ دیر پہلے میں نے انہیں یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا ضرور تھا' لیکن یہ نہیں پتا کہاں گئے ہیں۔" کتنا مشکل تھا خود پر ضبط کرنا۔

"کیوں۔۔۔ اپنی بیٹی کو ان کے ساتھ کرتے ہوئے تم نے پوچھا نہیں کہ وہ اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔"

وہ اس الزام تراشی پر تلملا گئی' لیکن یہ حیات ولا نہیں تھا جہاں اس کی بات سنی اور مانی بھی جاتی تھی۔ یہاں تو الٹا اسے خاموش کرا دیا جاتا' اور اب وہ گھٹ گھٹ کر نہیں جی سکتی تھیں۔ عارفہ سے تو اس نے کچھ نہیں کہا۔ اسی وقت امی کو فون کر کے اپنے جانے کا بتایا' پھر بیگ میں اپنے اور بچی کے کپڑے ٹھونس رہی تھی کہ امی آ گئیں۔

"کسی نے کچھ کہا ہے۔" امی نے اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر پوچھا' اس نے جواب نہیں دیا تو پوچھنے لگیں۔

"کیسے جاؤ گی۔"

"مجھے نہیں پتا۔" وہ غصہ دبا نہیں پا رہی تھی۔

"اپنے تایا ابو کو فون کر دو۔ وہ کسی کو بھیج دیں گے۔" امی نے کہا تو وہ تڑخ کر بولی۔

"میں حیات ولا نہیں جا رہی۔"

"پھر۔۔۔ کہاں جا رہی ہو؟" امی ایک دم پریشان ہو گئیں۔

"نہیں بھی' بس آپ مجھے ٹرین میں یا بس میں بٹھا دیں۔" وہ ٹھنستے ہوئے بیگ کی زپ کھینچتے ہوئے مزید جھنجلا رہی تھی۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو ثمن! تم نے دنیا نہیں دیکھی۔" امی کے غصے پر اس نے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا بس۔"

"تو بیٹا! میں تمہیں جانے سے تو منع نہیں کر رہی۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ تم اپنے گھر میں رہو۔" امی نے اسے گلے لگاتے ہوئے پچکار کر کہا تو وہ سسک کر بولی۔

"میرا کوئی گھر نہیں۔"

"کیوں نہیں' حیات ولا کے جس حصے میں تمہاری رہائش ہے وہ تمہاری ملکیت ہے۔ تمہارے دادا ابو نے تمہارے ابو کے بعد وہ تمہارے نام کر دیا تھا۔ پھر بیٹا وہاں سب تمہارا خیال ہی نہیں فکر بھی کرتے ہیں۔ کیونکہ تم اسی گھر کی بیٹی ہو۔ وہ سب تمہاری بھلائی سوچتے ہیں۔" امی نے پیار سے سمجھایا تو وہ روٹھے انداز میں بولی تھی۔

"تو میں کب کسی کا برا سوچتی ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ تم بہت پیاری بیٹی ہو' برا سوچ ہی نہیں سکتیں۔" امی نے اسے پیار کیا' پھر پرس میں سے سیل فون نکالتے ہوئے بولیں۔ "میں تمہارے تایا ابو کو فون کرتی ہوں۔"

"نہیں۔" اس نے ایک دم ان کے ہاتھ سے سیل فون لے لیا۔ آپ کسی کو فون نہیں کریں گی۔

"چلو تم خود کرلو۔"

"کرلوں گی' راستے میں کرلوں گی۔ آپ چلیں' مجھے ٹرین یا بس میں بٹھا آئیں۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو امی اسے دیکھنے لگیں۔

"میں چلی جاؤں گی امی! وہاں اب کوئی فارغ نہیں ہے جو مجھے لینے آئے گا۔ میں جاسکتی ہوں' چلیں اٹھیں۔" اس نے امی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھادیا۔

"یہاں سب سے کیا کہا ہے تم نے۔ میرا مطلب ہے اپنے جانے کا کیا بتایا ہے۔" امی نے پوچھا۔

"جو کہنا ہو' آپ کہہ دیں' مجھے کچھ نہیں کہنا۔"

اور پھر جانے امی نے سب سے کیا کہا کہ کسی نے اسے روکنے کی سعی نہیں کی' البتہ پھر آنے کو ضرور کہتے رہے تھے اور وہ نہ چاہتی' تب بھی اسے امی کے لیے تو آتے رہنا تھا۔ پھر ابھی تو اسے خود پتا نہیں تھا کہ اس کا ٹھکانا کہاں ہے۔ امی نے اسے ڈائیوو پر بٹھادیا تھا۔ بہت ساری نصیحتوں کے ساتھ اور ان سے تو اس نے یہ ہی کہا تھا کہ وہ سیدھی حیات ولا جائے گی' لیکن اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ امی کی تاریخ دوبارہ نہیں دہرانا چاہتی تھی' بلکہ وہ حیات ولا کے مکینوں کے لیے آزمائش نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس کے خیال میں جیسے عارفہ بھابھی کو اس کا وجود کھلنے لگا تھا۔ ویسے حیات ولا میں ہمایوں کی بیوی ہوگی۔ اور یہ تو اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ پنکی کو اپنی طرح نہیں بننے دے گی۔ جیسے شادی سے پہلے وہ ہر بات کے لیے امی کی طرف دیکھتی تھی اور ابھی اس کی شخصیت بن نہیں پائی تھی کہ سسرال کی بھٹی میں جھونک دی گئی۔ جس سے وہ اندر تک جھلس گئی تھی اور جھلسی ہوئی لڑکی کے سارے وصف ضد' ہٹ دھرمی' بدلحاظی اس میں آن سمائے تھے۔

اسے یاد آیا جب وہ مسلسل ہمایوں کی نفی کر رہی تھی تو ایک بار حرا نے اسے جھنجوڑ کر پوچھا تھا۔

"آخر تم چاہتی کیا ہو۔"

اور اس رات اس نے خود سوچا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے تب اس پر ادراک ہوا تھا کہ زندگی کی تپتی راہوں میں اسے محبت کی چھایا کی آرزو ہے۔ وہ ضرورتاً کسی کا ہاتھ نہیں تھام سکتی تھی کیونکہ کسی بھی شے کی ضرورت ہر وقت محسوس نہیں ہوتی اور پھر وہ تو دھوپ اور بارش میں چلنے کی عادی ہو گئی تھی۔ البتہ تنہا چلتے ہوئے کہیں کہیں اس کا دل چاہتا کوئی اسے محبت سے پکارے۔ وہ رک کر مڑ کر دیکھے۔ پھر اپنی طرف بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر چلے تو صرف محبت کا احساس ہو۔

"ہمایوں بس۔!" ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی بھر گیا تو اس نے ٹود میں سوئی پنکی کے سر پیشانی ٹکا کر سارا پانی بہادیا۔

لاہور آنے کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ اس نے ٹشو پیپر نکال کر اپنا چہرہ' آنکھیں صاف کیں' پھر اپنی دوست سدرہ کو فون کرنے کی غرض سے سیل فون نکال کر آن کیا تو امی کی بے شمار مس کالز تھیں پھر میسج۔

"شمن! تم ٹھیک تو ہو بیٹا۔" وہ میسج پڑھ رہی تھی کہ ڈائیوو ٹرن لے کر اپنے پلیٹ فارم پر رک گئی اور وہ کیونکہ دروازے کے قریب بیٹھی تھی۔ اس لیے دروازہ کھلتے ہی فوراً اتر گئی' پھر اپنا بیگ لیتے ہی کنارے آکر سدرہ کا نمبر ملانے ہی لگی تھی کہ عقب سے کسی نے اس کے کندھے پر دستک کے انداز میں اپنی انگلی بجائی تو وہ اچھل کر پلٹی اور ہمایوں کو دیکھ کر سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" انہوں نے پوچھا تو وہ چہرہ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"ادھر کیا دیکھ رہی ہو۔ میری بات کا جواب دو۔ میں نے تمہیں یہاں آنے سے منع کیا تھا۔" انہوں نے ٹوک کر کہا تو وہ آس پاس لوگوں کا خیال کر کے خود پر قابو پا کر بولی۔

"آپ نے حیات ولا آنے سے منع کیا تھا۔ میں وہاں نہیں جارہی۔"

"پھر کہاں جارہی ہو؟" فوراً سوال اٹھا۔

"آپ کو بتانا ضروری نہیں ہے۔" وہ کہہ کر زمین پر رکھا اپنا بیگ اٹھانے لگی کہ اس سے پہلے ہمایوں نے اٹھا لیا۔

"چلو۔"

"مجھے حیات ولا نہیں جانا۔" وہ دانت پیس کر بولی۔ ہمایوں نے ایک نظر اطراف پر ڈالی' پھر اس کی گود سے بچی کو لے کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

"ہمایوں!" وہ لاچار پیچھے آئی تھی۔ "آپ کو زبردستی کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

"بیٹھو فوراً۔" انہوں نے تحکم سے کہا ہی نہیں اسے بازو سے کھینچ کر گاڑی میں دھکیل دیا۔ پھر بچی کو اس کی گود میں ڈال کر ڈرائیونگ پر آبیٹھے اور جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا کر غصے سے بولے۔

"تم بدتمیز اور بدلحاظ تو تھیں ہی خود سر بھی ہو گئی ہو' حیات ولا سے نکل کر کیا سمجھتی ہو تم جو چاہے کرتی پھرو گی۔ جان سے ماردوں گا آئندہ کبھی اس طرح اکیلی گھر سے نکلیں تو۔" اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کھلے ضرور' لیکن آواز حلق میں ہی اٹک گئی تھی۔ طویل مدت بعد وہ پھر ان سے خائف ہو رہی تھی۔

"وہ تو اچھا ہوا چچی جان نے فون کرکے تمہاری آمد کا بتادیا۔ ورنہ تمہیں ڈھونڈنے میں جو خواری ہوتی اس کا کھاتہ مجھے الگ سے کھولنا پڑتا۔" ان کا غصہ ہنوز تھا اور وہ جو امی کی اس عنایت پر اندر ہی اندر تلملانے لگی تھی' ان کی دوسری بات سمجھی ہی نہیں۔

"کیا سمجھیں۔" انہوں نے اسے دیکھا' پھر کہنے لگے۔ "چچی جان نے تمہارے سارے اختیارات مجھے سونپ دیے ہیں کہ میں جو چاہے تمہارے ساتھ سلوک روا رکھوں اور تم ہرگز اچھے سلوک کی مستحق نہیں ہو۔ میں۔ میں تم سے چکی پسواؤں گا۔"

"مجھ سے کیوں۔ اپنی بیوی سے پسوائیں۔" وہ اچانک چیخی تھی۔

"بیوی۔" انہوں نے گاڑی کو بریک لگا دیے۔ "یہ بیوی کہاں سے آگئی۔"

"کیوں۔ شادی آپ نے کی ہے' آپ کو پتا ہوگا کہاں سے آئی۔" اس کے تیکھے جارحانہ انداز پر انہوں نے ہونٹ سکوڑے۔

"اف۔ تو تمہیں غصہ میری شادی پر ہے۔"

"جی نہیں۔ میں شادی پر کیوں غصہ کروں گی۔ کون سا میں آپ کے انتظار میں بیٹھی تھی۔" وہ کہہ کر پچھتائی' پھر بات گھمانا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑے۔

"میں تو تمہارے انتظار میں تھا۔"

"آپ۔" وہ اسی قدر کہہ سکی۔

"ہوں۔ امی مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے منگنی کیوں توڑی۔ کیا کرتا' دل ہی نہیں مانتا۔" پھر شہادت کی انگلی اس کی پیشانی پر مار کر بولے۔ "ایک سر پھری لڑکی جو دل میں آن سمائی تھی۔ وہ کسی اور کو اندر گھسنے ہی نہیں دیتی۔ بہرحال اب تک تم اپنی مرضی چلاتی آئی ہو' لیکن اب نہیں' سن رہی ہو' میں امی سے کہہ آیا ہوں وہ شادی کی تیاری کریں' میں اس سر پھری لڑکی کو کان سے پکڑ کر لا رہا ہوں۔"

اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے کان پر چلا گیا تو وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

"اسٹوپڈ۔" بریک سے پاؤں ہٹاتے ہی انہوں نے گاڑی کو اسپیڈ دی اور جب رکے تو اس کی نظروں کے سامنے حیات ولا جگمگا رہا تھا۔ وہ سراسیمہ سی بیٹھی رہ گئی۔

ہمایوں نے اتر کر اس کی طرف کا دروازہ کھولا اور اس کی گود سے بچی کو اٹھایا' تب وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں سوال تھا۔

"آج حرا کی منگنی ہے۔ اسی تقریب میں' میں چاہتا ہوں۔"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ قدرے ہچکچائی' پھر ان کا ہاتھ تھام کر حیات ولا کا گیٹ پار کیا تو سارے احساسات پر صرف محبت کا احساس غالب آگیا تھا۔

قرۃ العین خرم ہاشمی

"تمہاری محبت کی گہرائی کیا ہے؟" میں نے جو ریس کورس میں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے' جشن بہاراں کے رنگوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے سوال پہ بدمزا ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ جو بہت آرام سے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑی سٹہ کھا رہی تھی۔ بلیو جینز اور لانگ شرٹ میں ملبوس پیروں میں جھولتے دوپٹے اور بالوں کو پونی میں جکڑے وہ اپنی ازلی لاپروائی اور بے نیازی سے ایسے اوکھے اوکھے سوال کر جاتی تھی کہ سامنے والا دانت پیستا رہ جائے اور مجبوراً "تفصیلاً" جواب بھی دے۔ اس پہ وہ مصرعہ فٹ آتا تھا کہ

کرتے ہیں قتل اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

میں چونکہ تین سال پہلے تک کافی ہوش مند اور سمجھ دار ملا تا تھا۔ اس لیے شاعری جیسی سحر زدہ کر دینے والی چیز سے یکسر انجان تھا۔ کاروباری بندہ' دو جمع دو چار کرنے والا' نہ جانے کیسے کیوپڈ کے تیر کا شکار ہو گیا۔ پھر کیا تھا' خیام کی رباعی سے لے کر غالب کی مشکل پسند شاعری تک سے محبت ہو گئی کہ محبوب بستا ہی ان لفظوں کی دھنک میں ہے۔ جو بات سادہ لفظوں میں کتنا مشکل ہوتی ہے' وہ شاعری میں گھما پھرا کر بہت آرام سے کہی جا سکتی ہے۔

"یہ تم محبت کی گہرائی ناپنے چلے گئے ہو؟" تجاہل عارفانہ سے پوچھا گیا' ایک اور سوال میں گہری سانس لیتا اپنے خیالوں سے باہر آیا۔

"نہیں۔ تمہیں دل ڈوبنے کو کون چاہ رہا ہے۔ محبت کی گہرائی کیا ہے۔" میں نے تپ کر کہا تو وہ ناسمجھی میں مجھے دیکھتی رہ گئی اور اس کی اسی سادگی پہ تو میں مرتا تھا۔

"کبھی سمندر میں ڈوبے ہوئے سے پوچھا ہے کہ کتنی گہرائی میں جا کر تم ڈوبے ہو؟ کیا تم بتا سکتی ہو کہ سمندر میں ڈوبنے کے لیے کیا پیمانہ ہے کہ انسان ڈوب جائے؟"

میں نے اسے لاجواب کرنا چاہا' مگر اہمل ہاشم کا لاجواب ہونا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

"ڈیئر یہ تو کوئی ڈوبنے والا ہی بتا سکتا ہے۔ ساحل پہ کھڑے لوگ۔ تو یہ ہی پوچھیں گے ناکہ گہرائی کتنی ہے؟" وہ اپنے سوال پہ قائم تھی۔ میں نے گہری سانس لے کر خود کو نارمل کیا اور خود کو اس کی محبت کے سمندر میں اترتے ہوئے دیکھا اور اسی کیفیت میں بولنا شروع کیا۔

"ڈوبنے والا ڈوبنے سے پہلے تو بتا سکتا ہے کہ پاؤں کے نیچے گہرائی ہے۔ یوں کہ جب تک وہ پانی سے اوپر ہے' وہ ڈوبا نہیں اور جب پانی سر سے گزر جائے تو سمجھ لو کہ وہ ڈوب گیا' اور جہاں تک میں فیل (محسوس) کر سکتا ہوں۔ اپنے آپ کی نفی کرنا محبت ہے۔ جیسے

میں نے کہا تھا۔ میرا سرکل، میرا لائف اسٹائل سب کہیں گم ہو کر رہ گیا ہے اور آج میں وہ بن چکا ہوں جس کا تصور بھی کبھی نہیں کیا تھا۔ محبت کی گہرائی جاننا ہے تو میرا ہاتھ تھام لو اور میرے ساتھ محبت کے سمندر میں اتر کر دیکھو کہ یہ کہاں پہ ہمیں خود میں مکمل طور پہ ڈبو کے فنا کرے گی۔ ہے اتنی ہمت؟"

میں نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ گم صم سی کھڑی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ پھیلانے پہ چونکی اور خالی مٹھ میری ہتھیلی پہ رکھ دی۔

"یہ کیا ہے۔" میں ہنس کر بولا تھا۔

"فی الحال جو تھا وہ دے دیا۔ باقی کے لیے انتظار فرمائیے۔" ایمل ہاشم نے اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا تھا۔

"انتظار۔۔۔ وہ تو میں ایک مدت سے کر رہا ہوں اور آگے بھی کر سکتا ہوں۔ مگر۔۔۔" میں نے فقرہ ادھورا چھوڑا تھا۔

"مگر کیا؟" اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

"مگر میری فیملی، خاص کر مما مزید تاخیر برداشت نہیں کر سکتیں میری شادی میں۔ وہ اگلے مہینے یو ایس سے صرف میری شادی فائنل کرنے کے لیے آرہی ہیں اور میں انہیں مزید نہیں ٹال سکتا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔" اسے سمجھاتے سمجھاتے میں جھنجلانے لگا تھا۔

"چلیں۔" اس نے سکون سے پوچھا تھا اور میں گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میرے بڑے کہہ گئے تھے کہ عورت کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔ اس کی اپنی منطق اور سوچ ہوتی ہے اور سمجھ دار مرد اس بات پہ کڑھنے اور الجھنے کے بجائے اسے بنا رد کیے ہی قبول کر لیتے ہیں اور اگر ایک بار عورت کا اعتماد جیت لیا جائے تو پھر وہ اپنی سوچ تک رسائی خود ہی دے دیتی ہے اور مجھے بھی اس وقت کا انتظار تھا۔

٭ ٭ ٭

"آپ کی پینٹنگ "منت" نے سارا شو چرا لیا ہے۔" کانوں میں پڑے ان الفاظ نے مجھے مڑ کر دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ جہاں مہمان خصوصی دیوار پہ لگی پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھیں۔ پاس ہی کچھ لڑکیوں کا گروپ کھڑا ہوا تھا۔

الحمرا میں نوجوان مصوروں کے کام کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ اس نمائش میں پنجاب بھر سے نئے مصور شریک ہوئے تھے اور میرا دوست احسن علوی آرگنائزر میں شامل تھا۔ اسی لیے وہ میرے جیسے خشک مزاج اور آرٹ سے نابلد شخص کو کھینچ کھانچ کر فروری کی اس ڈھلتی شام زبردستی اپنے ساتھ لے آیا تھا اور میں فریش اور تخلیقی ذہنوں کے درمیان اتنے یقین اور اعتماد سے پھر رہا تھا جیسے مجھ سے زیادہ آرٹ کا قدردان کوئی بھی نہیں ہے۔ مگر درحقیقت رنگوں اور پنسل ورک سے بنی ہر تصویر ہی مجھے بہترین لگ رہی تھی۔ نہ جانے یہ نقاد کیسے باریک باریک نکتے اعتراض کرنے کے لیے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اب جس تصویر کو "بہترین پینٹنگ" کا خطاب ملا، اسے دوبارہ اور غور سے نہ دیکھنا بے وقوفی تھی اور اتنا تو آپ لوگوں کو اندازہ ہو گا ہی کہ "مرد" بے وقوف نہیں ہوتا ہے، ہاں بن جائے تو الگ بات ہے۔"

"ویل ڈن ایمل ہاشم! آپ نے ہمارے ادارے کا نام روشن کر دیا ہے۔ ہمیں فخر ہے آپ پہ۔"

مہمان خصوصی کے آگے بڑھ جانے کے بعد ایک درمیانی عمر کی خاتون (جو یقیناً "ٹیچر" تھی۔) نے آگے بڑھ کر ایک لڑکی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شاباشی دی۔ بلیو جینز پہ کالے رنگ کی لانگ شرٹ جس کے گلے پہ فیبرک پینٹ سے مور کے پر کا ڈیزائن بنا ہوا تھا اور دوپٹہ بھی ہرے اور نیلے رنگوں کو ملا کر رنگا ہوا تھا، جو بہت منفرد اور خوب صورت لگ رہا تھا۔

"پاگل۔۔۔" لڑکی کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد بے ساختہ میرے منہ سے نکلا تھا۔ اب میں کتنا بھی رنگوں

سے' آرٹ سے نابلد ہی سہی مگر ایک لڑکی کی اچھی ڈریسنگ سینس اور پروقار انداز کو تو ضرور جج کر سکتا ہوں۔ یہ میرا فروری کی اس خوش گوار اور ٹھنڈی شام میں پہلا تعارف تھا ابہل ہاشم سے۔

"ہوں۔۔۔ منت۔۔۔" اس پینٹنگ کے سامنے سے رش کم ہوا تو میں نے آگے بڑھ کر غور سے اس کا جائزہ لیا۔ پینٹنگ کا کیپشن 'منت' تھا۔ ایک لڑکی۔ جس کا چہرہ سر سے نیچے آئے دوپٹے میں اس طرح چھپا ہوا تھا کہ اس کی تیکھی ناک اور ٹھوڑی نظر آرہی تھی۔ مگر یہ سائیڈ پوز تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے سامنے جالی کی طرح کا دروازہ تھا۔ جس پہ مختلف رنگ کے دھاگے بنے ہوئے تھے۔ جیسے لوگ اپنی منتوں کے لیے باندھتے ہیں۔

پینٹنگ اچھی تھی' مگر میں نے پہلے ہی کہا کہ میرے لیے تو سب ایک برابر تھیں۔ چاہے کوئی دو یا تین رنگوں کو ملا کر بھی اسے آرٹ کا شاہکار کہے گا تو میں مان لوں گا۔ مجھے پینٹنگ سے زیادہ پینٹنگ بنانے والی نے متاثر کیا تھا۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ وہ بہت خوب صورت نہ تھی۔ اس سے زیادہ خوب صورت اور طرح دار لڑکیاں میرے سرکل میں' میرے اردگرد پائی جاتی تھیں۔ جن سے کئی بار ملنے کے باوجود دل اس طرح بے قرار نہیں ہوا تھا جیسے اس پُراعتماد اور بے نیاز سی لڑکی سے بات کرنے کے لیے۔ دراصل اس دن سمجھ میں آیا کہ صرف ایک لمحہ' ایک پل ہوتا ہے جو میرے جیسے لائق فائق' ذہین انسان کی مت مار دیتا ہے اور بے نیاز محبوب کے آگے ڈھیر کر دیتا ہے۔

"ایکسکیوزمی مس! یہ پینٹنگ آپ نے بنائی ہے؟" میں نے بہت سوچ سمجھ کر سوال کیا (مگر چونکہ محبت کا چکر شروع ہو چکا تھا اور میری سمجھ بھی نا سمجھی میں بدل چکی تھی۔ اس لیے پہلا سوال ہی بے وقوفانہ سا تھا۔)

"جی۔۔۔ کوئی شک ہے؟" حسب توقع سامنے والی کی تیوری پہ بل آچکے تھے۔ اپنی کالی آنکھوں کو مجھ پہ مرکوز کرتے ہوئے وہ بولی تھی اور میں اس کی آنکھوں کی بدلیوں میں ہوا بن کر جھومنے لگا تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں میرا مطلب تھا کہ آپ نے ہاتھوں سے بنائی ہے۔" میں نے گھبرا کر دوسرا الٹا سوال کیا۔ وہ گہری سانس لیتی پیچھے کو مڑی' جیسے میرے فضول سوالوں کا جواب اس کے پاس نہ ہو۔

"ایکسکیوزمی مس ابہل! میں آپ کی دونوں پینٹنگز خریدنا چاہتا ہوں۔"

اب کی بار میں نے سنبھل کر اور سنجیدگی سے کہا تھا۔ اس نے پلٹ کر حیران نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ اسی وقت اس کی سادہ نظریں میری فرط شوق میں ڈوبی' جذبے لٹاتی آنکھوں سے ملی تھیں اور بے ساختہ اس نے نظریں چرائی تھیں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا' اس تک پہنچنے کا ایک راستہ تو مل گیا تھا۔ باقی طریقے محبت خود ہی سکھا دیتی ہے۔ مگر یہاں آکر بھی ایک مسئلہ تھا' جس محبت نے مجھے سب طریقے سکھا دیے تھے۔ اس محبت نے تین سال گزرنے کے باوجود اسے کچھ بھی نہیں سمجھایا تھا۔ میرا سمجھا پڑھا اس پہ نہیں چلتا تھا اور اس کا ہر انداز' ہر ادا مجھے پوری شدت سے اس کے اور قریب کرتا تھا۔ محبت ایک تھی اور انداز الگ الگ۔۔۔

☆ ☆ ☆

"میں ابہل ہاشم! عبداللہ ہاشم کی اکلوتی بیٹی' جو چمچ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئی۔ جس نے زندگی کی ہر آسائش' ہر سکھ دیکھا' سوائے گھر کے'

آسائشوں اور سہولتوں سے مکان گھر نہیں بنتے محبت' سکون اور اعتماد کی فضا کو سے بھرے مکانوں کو زندہ و جاوید گھروں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ میرے والدین' کزن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے بہترین دوست بھی تھے۔ دوستی محبت میں بدلی اور محبت کی شادی جو آٹھ سال بعد ایک دوسرے سے اکتاہٹ اور نفرت پہ ختم ہو گئی۔ مگر ان آٹھ سالوں کی یادگار کے طور پر میں رہ گئی۔ جیسے کھنڈر ہوتے ہیں' بتاتے ہیں کہ یہاں کبھی تہذیب بستی تھی۔ اسی طرح میرے

جیسے بروکن فیملی کے بچے بھی اندر سے کھنڈروں کا منظر ہی پیش کرتے ہیں۔ پاپا نے کچھ عرصے بعد دوسری شادی کرلی اور ان سے انہیں دو ذہین لائق فائق بیٹے تحفے میں ملے۔ میرے باپ کی زندگی مکمل ہوگئی۔ ماں نے بھی دبئی کے ایک بزنس مین سے شادی کرکے اپنی نئی دنیا بسالی اور میں پنڈولم کی طرح دونوں کے درمیان جھولتی بڑی ہوگئی۔

میری اپنی دلچسپیاں، اپنے شوق، جن سے کسی کو کوئی غرض نہیں تھی، دونوں اپنی اپنی زندگی اور بچوں میں خوش باش تھے۔ میرے نزدیک محبت وغیرہ سب وقتی جذبے اور ابال کا نام تھا اور ایک مدت ایسا ہی سوچنے اور ماننے کے بعد نہ جانے کب اور کیسے مجتبیٰ علی میری اجاڑ اور بے رونق زندگی میں دھنک کے بے شمار رنگوں میں ڈھل کر میری سوچ کے آسمان پر چھا گیا۔ میں جو لڑکوں سے دوستی کی کبھی قائل نہیں رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے دوست مان لیا۔

مگر ہر گزرتے دن نے احساس دلایا کہ یہ رشتہ دوستی سے کچھ اوپر ہے، مگر کیا؟ اسے سمجھنے اور ماننے میں مجھے کافی وقت لگنا تھا۔

اس کے ساتھ لاہور کی سڑکوں، پارکوں میں گھومتے، سڑک کنارے لگے کتابوں کے اسٹالز سے پرانی کتابوں کو کھنگالنے میں وقت کتنی تیزی سے گزرتا، اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ لاہور میں جب بھی بک فیئر لگتا یا آرٹ سے متعلق کوئی پروگرام یا سیمینار منعقد ہوتا، میں اسے زبردستی اپنے ساتھ گھسیٹ لیتی اور وہ منع کرتا، منہ بناتا، لاکھ باتیں سناتا، پھر بھی میرے ساتھ چل پڑتا تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ کہتا تھا کہ ”تمہاری وجہ سے مجھے بزنس میں نقصان ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے، نہ ڈھنگ سے کام کرنے دیتی ہو اور نہ میٹنگ اٹینڈ کرنے دیتی ہو۔“ وہ ہر بار آفس سے جھنجلاتا ہوا اٹھتا اور آتے ہی مجھ پہ برس پڑتا تھا۔

”ہاں تو مت آیا کرو، کیوں آتے ہو؟“ میں بھی چڑ کر جواب دیتی۔

”اس لیے کہ محبت ہارنے سے بزدلی اور اندیشہ کوئی نہیں ہوتا ہے۔ جس دن اس بات کو سمجھو گی، میرے پرپوزل پہ بھی ہاں کردو گی۔“

مجتبیٰ علی سچا اور کھرا انسان تھا۔ اس نے شروع کی چند ملاقاتوں کے بعد ہی مجھے پرپوز کردیا تھا۔ مگر میں تب بھی اپنے خوف سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس لیے صاف منع کردیا تھا۔ مگر اس کا ایک ہی اصرار اور یقین۔

”میں انتظار کروں گا، تمہاری ہاں کا۔“

اور پچھلے تین سال سے وہ میری ہاں سننے کے انتظار میں کتنی منزلیں طے کر گیا تھا۔ وہ ہر بار پوچھتا اور میں ہر بار بہت آرام سے کہہ دیتی۔

”میری مرضی!“ اور وہ میری بات پہ تلملا کر رہ جاتا تھا۔

”اور جس دن ”مرضی“ میری ہوگی نا، اس دن پھر بس تمہاری خیر نہیں۔ اس لیے کہ جہاں تمہاری مرضی ختم ہوگی، وہاں سے میری مرضی شروع ہوگی۔“ میں اس کی بات کو چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی۔

☼ ☼ ☼

”واؤ! اتنا خوب صورت کلر کمبینیشن ہے۔ آئی لو بلیو کلر۔“ بوتیک میں کپڑے پسند کرتی وہ بے ساختہ بول اٹھی۔

”جی، وش، آئی ڈیر بلیو کلر، کم از کم تمہیں مجھ سے بہت شرما تو ہو نا۔“

میں نے گہری سانس لے کر کہا تھا۔ اس کے چہرے پہ یک دم حیا کی لالی پھیلی تھی۔ مگر فوراً ہی اس نے خود کو کمپوز کیا اور اپنے لاپروا انداز میں بولی تھی۔

”اونہہ۔ سب شادی سے پہلے کی باتیں ہیں، بعد میں یہ محبت ہی جی کا جنجال بن جاتی ہے۔ کسی کے ساتھ رہنے اور برداشت کرنے میں بہت فرق ہے۔“

اس کے لہجے میں اپنے بچپن کی تلخی تھی۔ کاؤنٹر پے منٹ کرکے وہ پیکٹ پکڑے تیزی سے باہر نکلی تھی۔ میں نے اس کے نقش قدم کی پیروی کی کہ میری محبت کا

یہ ہی تقاضا تھا۔

"کسی نے کیا خوب کہا ہے۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے، مگر سامنے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے رک کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔

"کہ انسان جب تک کسی کے ساتھ رہ نہ لے تو اس کے بارے میں کوئی بھی رائے حتمی نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن اس نے بات ادھوری چھوڑ دی کہ کچھ کے ساتھ آپ کی شناسائی اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ آپ کو اس کے ساتھ رہنے کی حاجت نہیں رہتی۔"

"محبت ایسی حاجتوں کی محتاج نہیں ہے امل ہاشم! اور ایک بات انسان کسی سے انسپائر ہو کر تو اسے شاید بھول سکتا ہے، لیکن affected ہونے کے بعد کبھی نہیں بھولتا اور محبت میں نہ بھولنا ہی سب سے بڑی تکلیف اور اذیت ہوتی ہے۔ میں صرف اس تکلیف کے آنے سے ڈرتا ہوں۔" میرے لہجے کی سنجیدگی نے اسے چونکا دیا تھا۔

"کیا بات ہے تمہارے انداز میں محبت کی جدائی کا خدشہ بول رہا ہے؟"

اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا تھا۔ میں چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

"محبت کو تسلیم نہیں کرتی ہو اور اس کی جدائی کے خدشے پہ کانپ جاتی ہو۔ عجیب پہیلی جیسی لڑکی ہو۔ جسے شاید میں کبھی نہیں سمجھ سکوں گا۔"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔ پھر پارکنگ ایریا میں کھڑی اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، جو گم صم سی میرے حکم کی تکمیل کر رہی تھی۔ اس کے گھر تک مکمل خاموشی رہی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ نہ وہ اوٹ پٹانگ سوال کر رہی تھی اور نہ آج میرے پاس کچھ تھا اسے یقین دلانے کے لیے۔

"میں کچھ زیادہ تو نہیں کہوں گا اپنے جذبوں کے اظہار کے لیے... مگر..." میں نے اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا تھا۔ گاڑی کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھتی وہ ایک دم رک سی گئی تھی۔

"تم جانتی ہو، لاکھ کوششوں کے باوجود بھی میں تمہیں سوچنے سے خود کو روک نہیں پاتا۔ اور تو اور میں تمہیں کھو دوں ایسا سوچنے کی بھی جرات یا ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" میں نے اس کی بھیگی آنکھوں سے نظریں چراتے ہوئے سامنے دیکھا تھا۔

"مما پاکستان آچکی ہیں اور وہ اپنی بھانجی سے میری بات فائنل کر دیں گی اگر میں نے ایک ہفتے میں جواب نہیں دیا اور میرا جواب تو... خیر جو بھی ہو گا مگر تمہارے اطمینان کے لیے صرف اتنا کہوں گا۔

"تم میرے دل میں بستی آج بھی ہو اور ہمیشہ رہو گی۔"

کار کا دروازہ بند ہوتے ہی میں نے بغیر اس کی طرف دیکھے گاڑی چلا دی تھی۔ مگر بیک مرر میں نظر آتے اس کے عکس میں وہ ساری وجاہت کھڑی نظر آئی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے میرے لبوں کا احاطہ کر لیا تھا۔ "میں بازی جیت چکا تھا، مگر کیسے...؟"

☆ ☆ ☆

"آپ کی بہو بہت ٹیلنٹڈ اور ہر فن مولا ہے۔ مسز ہاشم آپ بہت خوش قسمت رہی ہیں اس معاملے میں۔" ہماری شادی کی تیسری سالگرہ پہ مما کی بہت قریبی دوست مسز اویس نے کہا تھا۔ حسب معمول ماما کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا اور انہوں نے فخریہ نظروں سے بلیک ساڑھی میں ملبوس اپنی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہو اور میری بیوی امل مجتبیٰ کی طرف دیکھا تھا۔

بالکل ٹھیک سوچتے ہیں آپ! امل ہاشم سے امل مجتبیٰ کا سفر کتنی تیزی سے ہوا میں بتاتا ہوں۔ مما اپنے تین بڑے بچوں (دو بیٹے اور ایک بیٹی) کے فرض سے کئی سال پہلے سبکدوش ہو کر فراغت کے مزے اٹھا رہی تھیں اور پاپا کے ساتھ امریکا میں رہائش پذیر تھیں۔ مگر میں اپنے بزنس کی وجہ سے کئی سالوں سے

اکیلا پاکستان میں تھا۔ سب نے زور دیا تھا کہ میں بھی ان کے پاس امریکا ہی شفٹ ہو جاؤں، مگر نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا تھا اور یہ دل کیوں نہیں مانتا تھا۔ اس بات کا اندازہ ایمل ہاشم سے ملنے کے بعد ہوا تھا۔ مگر اس بار مما نے سختی سے الٹی میٹم دے دیا تھا۔ ایمل سے وہ ایک دو بار مل چکی تھیں اور سچ پوچھیں تو اپنے لاڈلے اور لائق فائق بیٹے کے لیے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے والی یہ لڑکی کچھ خاص پسند نہیں آئی تھی۔ مگر میرے جنون کو دیکھ کر چپ ہو جاتی تھیں۔

"یہ کن فیملی کی ہے۔ یہ لڑکی کبھی بھی اچھی بیوی اور ماں ثابت نہیں ہو سکے گی۔ ساری زندگی یہ اپنے خلا کو پر کرنے میں ہی مگن رہے گی۔ تمہیں کبھی سچی محبت نہیں دے سکے گی۔ آگے تمہاری مرضی۔"

مما نے آخری بار سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ میری مما بہت روشن خیال اور دوستانہ مزاج رکھتی تھیں۔ اس لیے زور زبردستی کے بجائے معاملہ فہمی سے چلتی تھیں۔

میں اپنے فیصلے پہ قائم تھا۔ مگر ایمل کے مسلسل انکار اور مما کی باتوں سے ہرٹ ضرور ہوا تھا۔ اسی لیے اس شام میں نے آخری داؤ کھیلا تھا۔ وہ جو کسی بات، کسی چیز، کسی یقین، وہاں کو نہیں مانتی تھی۔ اس دن میرے لہجے میں جھانکتے جدائی کے قدموں کی آہٹ پا گئی تھی۔ میں جو اسے ایک ہفتے کا وقت دے کر آیا تھا اسی رات ایمل کا فون آیا تھا اور اس نے رشتے کے لیے ہاں کر دی تھی۔

بعد کے سارے مرحلے بہت تیزی سے طے ہوئے۔ اس نے جتنی تیزی اور سمجھ داری سے مجھے اور میرے گھر کو سنبھالا تھا، وہ میرے ساتھ ساتھ مما سمیت کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ لاپروا، حلیے میں، بکھری لٹوں کے ساتھ پھرنے والی لڑکی بہت نفیس اور ٹک سک سے تیار گھر میں نظر آتی۔

وہ نہ صرف ایک اچھی بیوی تھی۔ اپنے دو جڑواں بچوں کی بہت اچھی اور کیئرنگ ماں بھی تھی۔ اس کا ورک بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ شوہر اور بچوں کو نظرانداز نہیں کرتی تھی۔

میں جو سوچا کرتا تھا کہ جس دن میری مرضی ہوگی۔ ایمل سے گن گن کر بدلے لوں گا، مگر اس نے ان تین سالوں میں ایسا کوئی موقع ہی نہیں آنے دیا تھا کہ ہم میں ایسی نوبت آتی۔ شادی کے بعد وہ میری بیوی اور میں اس کا محبوب شوہر بن گیا تھا۔

میری مما کے لگائے سب اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ اب وہ اسے میری زندگی کا سب سے بہترین فیصلہ کہتی تھیں۔

اور میں یعنی مجتبیٰ علی! جس نے اس کی محبت میں سچ میں سڑکوں کی خاک چھانی تھی۔ اس کی ہاں سننے کے لیے ہر لمحہ انتظار کیا تھا۔ اسے پا کر اس سے غافل نہیں ہوا تھا۔ بیوی بن کر وہ اور زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔

دراصل میں آج ایک اعتراف اور کرنا چاہتا ہوں کہ بظاہر لاپروا سے حلیے میں ملبوس نظر آنے والی سادہ اور بے نیاز سی یہ لڑکی اپنی ذات میں بہت کشش رکھتی ہے اور اسی وجہ سے میں شادی کے بعد بھی اس کا اسیر رہا ہوں۔ اس کو کھوجنے، تلاش کرنے کی جستجو مجھے اس کے اور قریب کرتی جا رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ مرد کا مطمئن ہونا محبت کی موت ہے۔ اس نے اپنے والدین کی محبت اور جدائی سے ایک کامیاب زندگی گزارنے کا گر ضرور سیکھ لیا تھا اور اسی پہ عمل پیرا ہو کر اس نے اپنی ذات کو بھول بھلیوں کی طرح بنا دیا تھا۔ جس کا ہر رنگ میرا دیکھا بھالا ہو کر بھی، مختلف تھا۔ وہ ذات ہر بار نئی تہوں میں چھپی ہوئی تھی۔

اور اس کی ذات کی پرتیں کھولتا، اسے ڈھونڈتا میں محبت کے سمندر کی تہ میں اتر رہا تھا۔ جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی اور یہ ہی اس سادہ سی، بے نیاز لڑکی کا ہنر تھا۔ جس نے مجھے اس سے باندھ دیا تھا۔ مجھ سے محبت کے سبق سننے والی محبت کی استاد نکلی تھی۔ جس کی مٹھی میں بند عشق کا سکہ تھا۔ پھر محبت کے شہر میں اس کی ہار کیسے ممکن تھی۔

سائرہ رضا

خالی آسمان

ڈیرہ شاہو کے آسمان سے دھوپ قہرین کر دھرتی پر برس رہی تھی۔ ہر سانس لینے والا جیسے منہ چھپائے سائے تلے جا چکا تھا۔ جرنیلی سڑک سے صابن دانی نزک جیسا منہ پیچھے سے بس) میں سفر کر کے آتی معصومہ کی حالت غیر تھی۔ حالانکہ وہ کھڑکی سے آدھا منہ باہر نکالے بیٹھی تھی۔ مگر بس کے اندر کھچا کھچ انسان بھرے تھے۔ سانس لیتا وہ بھرے۔

معصومہ نے گاڑی سے اتر کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اب صرف گرمی کا سامنا کرنا تھا۔ کھیت کھلیانوں سے اٹھتی ہریالی کی مہک نے طبیعت پر چھائی ساری کثافت دور کر دی۔ اس گاؤں کے اندر جانے والی سڑک کے کنارے بنی کوکا کولا کے اشتہاری سرخ و سفید رنگ سے سجی دکان کو دیکھ کر طارق کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا۔

"تم آہستہ آہستہ جاؤ۔ میں بوتل لے کر آتا ہوں۔"

معصومہ فخر سے مسکرا دی۔ ازدواجی زندگی میں بڑے اتار چڑھاؤ آئے اور ایک کمی نے کچھ کھچاؤ بھی پیدا کر دیا تھا مگر طارق آج بھی اس کے دل کی بات بنا کہے مان لیتا تھا۔

معصومہ نے سر ہلا دیا۔ وہ امرود کے باغ کی تین فٹی

کچی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ امرود کے باہر کو جھکے درختوں کا سایہ۔

وہ سوچوں میں گم قدم بڑھاتی چلی گئی۔ حالانکہ اسی دیوار سے مڑ جو کر ٹھنڈی بوتل بیچی تھی۔ یہاں تک باغ کی کچی دیوار ختم ہوئی اور وہ اپنے گھر کی چوڑی گلی میں داخل ہوگئی۔ چند قدم بڑھائے ہی تھے کہ چونک کر نجانے کہاں سے پلٹی۔ سائے سے نکلے آسمان تلے آئی تھی۔ سورج کی تپش نے چونکا دیا، وہ اپنے خیالات سے بھی چونکی تھی جیسے حاضر ہوگئی ہو۔

مٹی کا گرم آب اکتا بے رحم سرد مہر سورج، معصومہ کی آنکھوں سے برسنے لگا۔

وہ ساکت و جامد کھڑی سامنے بیٹھے نفوس کو دیکھ رہی تھی۔ اور ایک کے بعد ایک خواہش، قلم ریل کی طرح چلنے لگی۔

اس کے دونوں ہاتھوں میں ننگی تلواریں ہوں اور وہ گول گول گھومتے ہوئے تلوار بازی کرے اور یہ چاروں نفوس کٹ کٹ کر گرنے لگیں۔

یا۔ وہ لشکر جرار کی سپہ سالار ہو۔۔۔ اور "یلغار" کہہ کر حملہ آور ہو جائے اور ان چاروں سے گزر جائے۔ سب نیست و نابود۔ صفا چٹ ہاتھ جھاڑے اور جیت کے جشن کا اعلان کر دے۔۔۔

پھر کوئی مورخ تانے جوڑے۔ "آثار بتاتے ہیں کیکر کی اس چھاؤں کے نیچے لگتا ہے کچھ لوگ بیٹھے تھے۔" "ہاں لگتا تو ہے، مگر وہ کون تھے یہ پتا نہ لگے۔"

"ایسے کیوں رک گئی ہو دھوپ میں؟" معصومہ بری طرح چونکی۔ اس نے طارق کو دیکھا۔ (ذرا فکر مند اور حیران سا۔ ہاتھ میں ٹھنڈی بوتل)

اور طارق نے اس کے متوحش چہرے اور پھر یک بیک بھری آنکھوں کو دیکھا۔

شکوہ، غم، تکلیف، شکایت اور بے بسی۔۔۔ معصومہ نے ہونٹ کچلے اور سامنے دیکھا تب طارق نے اس کے دیکھے کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کے دیکھتا ہی چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

اسٹیل کی چمچماتی پرات میں چنے کی دال والے لمبے باسمتی چاول بھرے تھے۔ ہاتھ کی بنی رنگین چنگیروں میں نئے نزت دستر خوانوں میں تندور سے اتری تازہ گرم روٹیاں لپٹی تھیں۔ اسٹیل ہی کے ڈونگے میں دیسی مرغ دیسی گھی میں پکا تر بتر سالن تھا۔ اسٹیل کی کٹوریاں۔۔۔ اور جگ گلاس۔۔۔ اور یہ وہ برتن تھے جو بے جی کے کمرے کی پرچھتی پر سجے رہتے اور کسی بڑے ہی خاص موقع پر اتارے جاتے۔

ساتھ ہی بے جی کے ہاتھ میں رنگین شیشے والی پکھی (ہاتھ کا پنکھا) تھی۔ جسے وہ بھی مکھیاں اڑانے کے لیے سالن پر جھلتیں۔ ورنہ معزز مہمانوں کے لیے "رب شالا تتی واہ نہ لگے" کی آرزو سے جھلی ہی جاتی تھیں۔

کیکر کے ان پچھلے درختوں کے سائے میں چارپائیاں بچھی تھیں۔ مگر بے جی کے مہمان بچھی ہوئی زمین پر چسکڑا مارے بیٹھے تھے۔ اور بے جی چوکی پر ان کے قریب بیٹھی پکھیاں جھلتی تھیں۔ میلی گیلی بے بس بے قرار آنکھیں۔۔۔ اور بار بار ایک جلا سا تن جاتا تو وہ ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھ کر پھر تر و تازہ ہو کر مہمانوں پر نثار ہونے لگ جاتیں۔

اور مہمان اس سب سے بے نیاز بس کھاتے تھے۔ بے جی خود سے نکال کر دے رہی تھیں۔ مگر وہ اپنی من مانی بھی کر لیتے کہ ڈونگے کے اندر انگلیاں گھسائیں اور بوٹی ہاتھ میں پکڑ کر منہ کے اندر۔۔۔ انگلیوں کی درزوں سے دیسی گھی رستا، بے جی نے گلاس رکھے تھے مگر ایک نے جگ ہی کو منہ لگا لیا۔ پھر بھی مرچیں لگیں شاید۔۔۔ تو بیٹھے چاولوں کے بڑے بڑے بڑے (نوالے) منہ میں بھرنے لگا۔ کچھ منہ کے اندر۔۔۔ کچھ ہاتھوں پر... کچھ کپڑوں کے اوپر گرتے۔

عجیب بات تھی۔ مہمان اس بدتمیزی پر ذرا نہ شرماتے اور میزبان کی خوشی کا عالم ہی کیا۔۔۔ مہمانوں کے پیٹ بھر جانے کے خیال سے جو خوشی اور طمانیت

ان بوڑھی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ اب اس میں سالوں کا وقفہ آنے لگا تھا۔ مگر بے جی آج خوش تھیں... بہت خوش...

※ ※ ※

"جب تک یہ تینوں منحوس ادھر سے نہیں جائیں گے۔ میں نے گلی میں قدم نہیں رکھنا بلکہ اس راستے سے بھی ہیں اور چلو۔"

"اچھا اچھا تم یہ بوتل تو پیو... ذرا سکھ کا سانس تو لو۔"

"نہیں... کوئی سکھ نہیں ہے۔ بس تم ادھر سے نکلو فورا" ... "وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔ طارق نے دونوں بوتلیں ایک ہاتھ میں پکڑیں اور دوبارہ واپسی کے راستے پر چلنے لگا۔ ساتھ چلتی معصومہ آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ الٹے ہاتھ پر تاحد نگاہ کھیت تھے اور سیدھے پر امرودوں کا باغ... طارق باغ ہی میں گھسا۔ ذرا آگے جا کر رانجھے کی چارپائی پڑی تھی۔ طارق نے بوتلیں چارپائی کی بنائی کے خلا میں پھنسائیں۔ پھر معصومہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے بٹھایا۔

"اچھا رونا تو بند کرو ناں..."

"نہیں ہوتا۔" وہ کھل کر رونے لگی۔ تب طارق نے کھڑے کھڑے ہی معصومہ کا سر خود سے لگالیا اور تھپکی دینے لگا۔

"بے جی ایسے ہی کرتی ہیں۔ دنوں مجھ سے بات نہیں کرتیں۔ میں اکیلی سارا سارا دن گزار دیتی ہوں۔ اپنے آپ سے بلاؤں تو اشارے سے جواب دیں گی۔ مجھ سے زیادہ باتیں تو اپنی بھوری کالی گڑیوں سے کرتی ہیں کالی (بھینس) سے ایسے حال احوال پوچھتی ہیں۔ جیسے کوئی بیاہی بیٹی کے گوڈے سے لگ کر دکھ سکھ کرتا ہے۔ بس اک میری نمانی ذات ہے۔ جس سے بات کرنے سے ان کا وضو ٹوٹتا ہے۔ ہائے میں کدھر جاؤں۔"

"وہ بڑی ہیں بزرگ ہیں اور سب سے بڑھ کر دکھی ہیں۔" طارق کی تسلی کے جھنے رٹے رٹائے تھے ہر بار یہی والے... معصومہ تڑپ اٹھی۔ بھری ہوئی شکوہ کناں نگاہیں اٹھائیں۔

"ہاں تو میں چھوٹی ہوں۔ ان کی اولاد برابر ہوں۔ بہو... اور اتنے خود غرض نہ بنیں۔ میرا دکھ بڑا ہے یا ان کا۔ میں بھی دکھی ہوں... زیادہ دکھی ہوں۔"

وہ بات مکمل کرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ طارق اسے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر چارپائی پر آڑا لیٹ گیا۔ بازو پیچھے کر کے ان کا تکیہ بنایا اب اسے معصومہ کو خاموشی سے سننا تھا۔ جب تک کہ وہ ساری بھڑاس نہ نکال لیتی (اور جب تک بے جی کے مہمان رخصت نہ ہو جاتے...)

"میں کھانا پانی رکھ دوں۔ کھائیں گی۔ کپڑے دھوؤں۔ پہن لیں گی۔ پھر میں نے سوچا۔ ایک دن کوئی بھی کام نہ کروں۔ تو جی۔ اس سے ماں جی کو کیا فرق پڑا۔ خود سے انہیں تندور تپایا اور روٹیاں لگائیں گو پر

رکھا مکھن کھانی کے برتن دھو فارغ۔ کپڑے نہانے جاتی ہیں تو ساتھ دھو کر آتی ہیں۔ محلے سے کوئی بھی آجائے دنیا جہان کے دکھ پھولتی ہیں۔ اپنی کہتی ہیں دوسروں کی سنتی ہیں۔ ایک بس میں ہی۔۔۔"

طارق خاموش تھا۔ یہ ہزار بار کا سنا قصہ تھا۔ آج پانچواں سال لگ گیا تھا۔ گھوم پھر کے یہی الفاظ۔۔۔ چونکہ بے جی کلام ہی نہیں کرتی تھیں معصومہ سے۔۔ اس لیے بات بڑھتی نہیں تھی۔

طارق کو معصومہ سے بڑی محبت تھی۔ دل کی ملکہ تھی۔ پہلے محبوبہ پھر بیوی اور ایسی بیوی جو سات دن کی دوری پر ہو تو سات گناہ معاف ہوتے ہیں۔ طارق کے لیے دھلی دھلائی 'بے عیب۔

مگر دوسری جانب ماں تھیں۔ ان کا رویہ غلط تھا یا نہیں۔۔۔ مگر غصے کا 'غم کا۔۔ صبر کا اظہار اب کیا۔ ایسے بھی نہ کرتیں۔ وہ چپ ہو گئی تھیں تو معصومہ کی شکایتیں ساری ساری رات چلتیں' خط لکھتی تو سلام کے بعد عرض ہے۔۔۔ سے شروع ہوتیں اور "آپ کی معصومہ پر" آکر ختم ہوتیں۔ (خط بھلے سے پانچ صفحات کا ہو یا دس کا۔۔۔) طارق شکر کرتا کہ ماں جی خاموش رہ کر احتجاج کرتی ہیں۔

طارق کے آنے پر۔۔۔ یا اس جانب توجہ دلانے پر اک گہری نگاہ ڈالتیں' بات بدل دیتیں۔ مگر ایک بار طارق کے پُرزور اصرار پر۔

"کیا بولوں طارق۔۔۔ چپ رہتی ہوں۔ کہ بولی تو میرے منہ سے زہر ہی نکلتا ہے اس کی تکلیف پھر زیادہ ہوتی ہے۔"

"بے جی! آپ کہہ لیا کریں۔ کہنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ گلے شکوے مٹ جاتے ہیں۔ آپ دونوں جی گھر میں رہتے ہیں۔ وہ بھی ایک دوسرے سے ایسے کٹے کٹے کہ۔۔۔"

"ہاں ہلکا ہو جاتا ہے۔ مگر جس نے بوجھ لادا ہے اس سے کیسے کہوں۔ غم خواری کرنے والا کندھا۔۔۔"

بے جی خلاؤں میں کھو گئیں' پھر آنکھیں بھرنے لگیں۔ طارق کا شانہ تھپتھپایا' بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

اونچی لمبا جوان چھوٹا بیٹا چارپائی پر بیٹھے بیٹھے زمین کی طرف جھکیں اور انگلی کی پور پر مٹی لگائی اور وہ مٹی طارق کے ماتھے پر لگا دی۔ نظر نہ لگ جائے۔

طارق ماں کی محبت کے انداز پر سرشار ہو گیا۔ اس نے ان کا ہاتھ چوم لیا مگر سوال اب بھی موجود تھا۔ بے جی نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"اک چپ تے سو سکھ کا محاورہ تو نے سنا نہیں۔"

"سنا ہے بے جی۔۔۔ میں تے بس یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ اس سے کوزیوں نہ ڈالیں (پسند نہ کریں) مگر روز مرہ کی باتیں' وہ تو کیا کریں ناں دو تو جی ہیں آپ گھر میں۔۔۔"

بے جی سر جھکا کر رہ گئیں۔ اب کیا جواب دیں۔ مگر طارق ہنوز منتظر تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے طارق۔۔۔ کوئی بھیڑا بول نہ بول دوں' میرا مسئلہ یہ ہے اسے بددعا دے دی تو برباد تو نے ہو جانا ہے۔"

طارق ششدر رہ گیا۔ وہ ماں کے منہ سے کچھ بھی سننے کو تیار تھا مگر وہ یہ بولیں گی۔۔۔؟ اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ طارق معصومہ سے کتنی محبت کرتا ہے۔ ہاں واقعی اگر معصومہ کو کچھ ہوتا ہے تو وہ زندہ ہی نہ رہے شاید۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب ماں سے کیا کہے۔ جو منہ پر دوپٹا ڈال کر سسکنے لگی تھیں۔ دبلا پتلا جھریوں سے بھرا وجود۔ سفید بال۔۔۔ نیلی آنکھیں اور اس پر اگر آنکھ میں غم بھی آکر ٹھہر جائے۔

اور غم کی وجہ جانے انجانے میں وہ بھی تو تھا۔ معصومہ اور وہ۔

"اسے بددعا دی تو تنگ تجھے جانی ہے" ہاں تو ماں اس بے تحاشا محبت سے واقف ہے جو اسے معصومہ سے ہے۔ مگر پھر۔ اور غلطی کس کی تھی پھر۔۔۔؟

معصومہ کی سسکی پر اپنے خیالوں میں گم طارق چونکا۔ وہ اس وقت سے بول رہی تھی۔ "کہتی ہیں اس لیے نہیں بولتی کہ کہیں بھیڑا بول نہ نکل جائے۔"

"میں کہتی ہوں وہ بھیڑا بول بول چکی ہیں' جب ہی تو۔۔۔"

معصومہ ادھوری بات کہہ کر پھپھک کر

روری۔ طارق ایک طویل ٹھنڈی سانس کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔

"چپ کر جاؤ معصومہ۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ طارق بیوی کو رلا رہا تھا۔" اس کا انداز ہلکا پھلکا لاڈ بھرا تھا۔

"کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سب جانتے ہیں، بے جی مجھے جب کی ماریں مار رہی ہیں۔ سارے پنڈ میں کس نوں دے جھگڑے اٹھتے ہیں۔ نوں زبان چلاتی ہیں تو سس گال بھی کڈ دیتی ہیں۔ مائی سداں تو تھپڑ پکڑ کے تھما دیتی ہے۔ گندم دھو کے سوکھنے ڈالی تھی زرینہ نے۔ خود نہانے چلی گئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ بکری آ گئی۔ ماسی نے زرینہ کو کپڑے دھونے والے تھاپے سے مارا۔ دلو، بے چاری پتھر سیک کے ٹکور کرتی رہی۔ تم میں پھر بھی کہتی ہوں۔ میری سس جو ظلم چپ کر کے ڈھاتی ہے۔ وہ تکلیف نہ گت کھینچنے سے ہوتی ہے نہ تھاپے سے پٹنے میں۔"

طارق معصومہ کے مسئلے کی گہرائی سے پریشان تھا۔ مگر زرینہ کی ساس نے اسے تھاپے سے مارا۔ یہ نئی خبر تھی۔ اونچی لمبی جہازی عورت ماسی اور دبلی پتلی سی زرینہ۔ جو کہ بھتیجی بھی تھی ساس کی ساس نے اسے مارا۔

"تم نے تو مجھے بتایا ہی نہیں کہ ماسی نے زرینہ کو..."

طارق کو موضوع بدلنے کا موقع مل گیا۔ مگر معصومہ شدید دکھ کا شکار تھی اور کوئی موقع ہوتا تو فائٹ شروع ہو جاتی مگر۔۔۔

وہ یک دم چونکی ہوئی۔ طارق بھی چونکا۔

یہ بڑے ڈنڈے سے بندھے گھنگھروؤں کی آواز تھی۔ ڈنڈا زور سے زمین پر بجتا تھا۔ چھن کی کرخت آواز۔۔۔ اور ساتھ ہی حق اللہ پھر چھن۔۔۔ پھر حق۔۔۔ چھن۔۔۔ حق اللہ۔

دونوں نے ایک ساتھ امرود کی دیوار کے پار دور دیکھا۔

بے جی کے تینوں مہمان سیری کے بعد جا رہے تھے۔

ایک لمبی داڑھی اور لمبے جٹوں والا بوڑھا۔ مگر مضبوط جسم کا مالک خاکی۔ میلی شلوار قمیص۔۔۔ سبز کرن لگا دوپٹا۔۔۔ گردن سے دونوں جانب پڑا تھا۔

وہ ڈنڈے کو مار کے حق کہتا تھا۔ اس کے پیچھے دو سبز چوغہ پوش گنجے۔۔۔ ایک بھاری جثے کا مالک تھا دوسرا پتلا سا۔۔۔ ہاں مگر دونوں کے سر ان کے کل وجود سے، بہت چھوٹے تھے۔ جیسے جوان کڑیل کے شانوں پر دو چار برس کے بچے کا سر رکھ دیا جائے۔ جب وہ چلتے تھے۔ سروں ہلتے تھے جیسے شیشے کی بوتل پر انڈے کا خالی خول جھولتا ہے۔ دائیں بائیں بے خود۔۔۔ بے قرار۔۔۔

معصومہ نے خوف زدگی کے عالم میں طارق کا بازو دبوچ لیا۔ طارق نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تشفی کرائی۔ وہ کہیں کھو گیا تھا۔

یہی وجود اور ایسا ہی ڈونا سر۔۔۔ خود میں مست۔۔۔ مست ملنگ۔ طارق کی نگاہوں نے دور تک ان تینوں کا پیچھا کیا اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تب بے جی سے بہت ساری شکایتوں کے باوجود دل کسی بوجھ سے بند ہونے لگا جیسے۔۔۔ معصومہ کے چہرے پر ایک سکون اترا تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ اب گھر جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ بے جی کے مہمان جا چکے تھے۔ ایسے مہمان جنہیں عرف عام میں شاہ دولہ کے چوہے کہا جاتا تھا۔

معصومہ جانتی تھی۔۔۔ بے جی نے اب کئی دن تک سرشار رہنا ہے۔ اور کبھی رونا ہے۔ کبھی ہنسنا ہے۔

☆ ☆ ☆

"وہ ڈرتی ہے بے جی۔۔۔ آپ کو تو پتا ہے۔" طارق نے بڑا سوچ سمجھ کر جملہ بنایا تھا۔ بے جی چارپائی کی بنائی میں لمبی ٹانگیں پھنسا کر بیٹھی تھیں۔ طارق کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ معصومہ سلام کہہ کر نہانے گھس گئی تھی۔۔۔ بے جی اون کا گولا تیار کر رہی تھیں۔ پیر کے انگوٹھے میں اون پھنسا کر کہنی موڑ کے پورے انہماک سے لگی ہوئی تھیں۔

"تھوڑی وہ بھی تو ہو ہی چکی ہے۔ آپ اس کے دل کی حالت تو سمجھتی ہیں۔"

"کھانا نہیں کھانا تم لوگوں نے۔ کھا کر آئے ہو؟"
بے جی نے الگ ہی سوال کیا۔

"میں کھانے کی بات نہیں کر رہا بے جی۔ اس طرح سے یہ گزارا ہو گا۔ جب آپ جانتی ہیں کہ اس کے دل میں ایک خوف بیٹھ چکا ہے تو۔ ڈاکٹرز نے کہا ہے اسے خوش رکھیں۔ کوئی غم، فکر، پریشانی نہ دیں اور آپ۔"

"اچھا۔!" بے جی کا گولا تیار ہو گیا تھا۔ وہ ٹانگ سمیٹ کر پوری طرح طارق کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"خوش رکھنے کا کہا ہے۔ تے فیر میں کیا کروں؟ ایک بات بتاؤں، تیری زنانی کو سب سے بڑی خوشی میرے مرنے سے ملنی ہے۔ مر جاؤں؟"

"بے جی۔!" طارق ششدر رہ گیا۔ "یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔"

"دیکھ طارق! آج مجھے نہ چھیڑ۔ میرا دل سڑا پڑا ہے۔ کلیجے سے آگ نکلتی ہے۔ کچھ نہ بول۔"

"وہ کہتی ہے، آپ نے بددعا دی ہے۔ جب ہی وہ اب تک اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔"

"کاش دے سکتی طارق۔!" بے جی یکدم نڈھال ہو گئیں۔ "میں تو بس یہ چاہتی ہوں، یہ سچ بول دے۔"

"آپ نے آج تک یقین نہیں کیا بے جی۔!" طارق کا انداز خفا سا ہو گیا۔

"نہیں۔" بے جی قطعیت سے بھرپور لہجے میں بولیں۔

"آپ کا دل نہیں کرتا بے جی۔ آپ میری اولاد کو اپنی گود میں کھلائیں۔" طارق دکھی ہو گیا۔ بے جی نے بے ساختہ نگاہیں طارق کے چہرے پر جمادیں۔

"کیوں نہیں کرتا۔ میں نے تو اس کا نام تک سوچ رکھا ہے۔"

بے جی کی آنکھیں دمکنے لگیں۔ طارق کی آنکھوں میں حیرانگی امڈ آئی۔

ماں بیٹے کی گفتگو سے بے نیاز سی بنی معصومہ بھی بری طرح چونکی۔ وہ لاپروا سی بنی کھانا نکالنے آئی تھی۔

"اچھا۔ کیا؟" طارق اشتیاق کا مارا کرسی پر ذرا آگے سرک آیا۔

"محمد طاہر پرویز۔" بے جی کے لہجے میں سرشاری سی آ گئی۔

طارق نے اک نظر ماں کی طمانیت دیکھی۔ پھر مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے ہی لگا تھا کہ تبھی معصومہ پر نگاہ ٹھہر گئی۔

اس کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت تھی۔ پھر رنگ بھی اڑ گیا۔

صدمہ، سکتہ، بے قراری اور۔۔۔ اور اشتعال کی شدید لہر۔ اس کے ضبط کا خاتمہ ہوا۔ وہ جنونی کیفیت میں کھڑی ہوئی۔ ہانپنے لگی۔ بے جی اپنی بات کہہ کر مطمئن ہو گئی تھیں۔ بلکہ جیسے ہاتھوں میں نومولود محمد طاہر پرویز کو اٹھائے بیٹھی تھیں۔ ایک طرف بے جی۔۔۔ ایک طرف معصومہ۔ اصل مشکل طارق پر پڑی تھی اور کوئی وقت ہوتا تو وہ ہاں میں ہاں ملاتا مگر سامنے معصومہ بھی۔

"بے جی! کوئی اور نام۔۔۔ میرا مطلب کیا نام بھی تو ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔۔۔ مگر مجھے اختیار دیا تو میں نے یہی رکھنا ہے۔ میں نے تو منت ہی یہی مانگی ہے کہ اگر بیٹا ہوا تو طاہر، بیٹی ہوئی تو طاہرہ۔" بے جی کے لہجے میں شیرینی سی گھلی تھی اور سچائی بھی چھلکتی تھی۔ وہ یہی سوچے بیٹھی تھیں۔

طارق نے سوچا، وہ بیوی کو آنکھ کے اشارے سے پرسکون رہنے کا کہے گا۔ اور بے جی کی تائید کرے گا۔ تو اس مشکل صورت حال سے نکلنے کا راستہ بنے گا۔ اس کی ملتجی نگاہیں متوحش معصومہ کی جانب اٹھی تھیں کہ اس نے بے جی کو اپنی طرف جھکتا دیکھا۔ وہ رازدارانہ، پراسرار انداز میں کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔

طارق، معصومہ سے نظریں پھیر کے بے جی کے نزدیک ہو گیا۔

"میں نے بڑی گڑگڑا کر دعا مانگی ہے اس بار۔۔۔ مگر اس سے بول، پہلے سچ بولے۔"

"آپ کو آج تک یقین نہیں کہ وہ سچ تھا۔" طارق

نے خود کو کسی شکنجے میں جکڑا محسوس کیا۔

"اور اگر آپ مجرم ہی سمجھتی ہیں تو اصل مجرم تو میں ہوں بے جی۔۔۔ معصومہ کا کیا قصور۔۔۔ آپ مجھے کوسیں۔۔۔ مجھے ماریں۔ مگر اسے تو نہ کہیں۔ اور ٹھیک ہے "آپ کو لگتا ہے ہم غلط ہیں تو ٹوکے کی مشین میں میرا سر دے دیں۔ خدا کی قسم اف نہیں کروں گا۔ لیکن اس طرح۔۔۔ ڈاکٹر کہتا ہے اسے خوش رکھیں۔ کوئی فکر پریشانی نہ دیں مگر آپ کی ایسی باتیں۔۔۔ پانچ سال میں پانچویں مرتبہ امید سے ہے۔ مگر۔۔۔ آپ دونوں مائیں ہیں۔ آپ اپنی اولاد کے لیے روتی ہیں تو یہ بھی تو اولاد ہی کا غم پالے بیٹھی ہے۔"

طارق کا لہجہ غم سے چور ہو گیا۔ بے جی بغور لفظ لفظ سن رہی تھیں۔ چہرے پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ طارق اور معصومہ بری طرح چونکے۔ یہ مسکرانے کی باتیں تھیں کیا؟

"ہو آئی نہیں ہے اس اولاد کے لیے اتنی تڑپ طارق۔۔۔ میری تو ہو گئی ہے اور تم چاہتے ہو میں غم بھی نہ مناؤں؟"

"غم کی بھی میعاد ہوتی ہے بے جی۔۔۔ تیجے کے بعد اپنا چولہا بالنا پڑتا ہے سب سے بڑا سوگ عدت۔۔۔ وہ بھی چار مہینے بعد کٹ جاتا ہے۔ پانچواں سال چڑھ گیا اور آپ۔۔۔" طارق کی آواز بھرا گئی۔

"جانتی ہوں طارق (بے جی طارق کو زیر کے ساتھ بولتی تھیں طارِق)

"تو پڑھا لکھا ہے۔ مگر یہ کیوں بھول گیا۔ تیجے اور دسویں، چالیسے اور عدتیں۔۔۔ مُردوں کے لیے ہوتی ہیں۔ میرا تو گم گیا ہے۔ تو ابھی باپ بنا نہیں ہے ورنہ جانتا ہوتا، مری اولاد کا دکھ کچھ بھی نہیں گمی اولاد کے سامنے۔۔۔ کتنا بے رحم ہو گیا ہے تو۔۔۔ میرے کلیجے پر ہاتھ ڈالتا ہے۔"

بے جی رونے لگیں۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور جھریوں کی رکاوٹیں پار کرتے ٹھوڑی سے ٹپکنے لگے۔

"تیجے کے بعد چولہا بالنے کی بات کرتا ہے۔ جنی تو کہتا ہے میرا پتر مر گیا ہے۔ تیری زبان نہ کانپی۔۔۔ طارق۔۔۔ تیرا دل نہ لرزا۔"

"میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا بے جی!"

طارق کو یکدم احساس ہوا وہ بے خیالی میں ماں کا دل نوچ چکا ہے۔ آگے بڑھ کر ماں کو خود سے لگانا چاہا۔ پچکارنا چاہا۔ مگر بے جی نے کرنٹ کھائے انداز میں اسے جھٹک دیا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے پیچھے ہو گئیں۔

"اک گل یاد رکھنا تم دونوں۔۔۔ ماؤں کے منہ سے بد دعا نہیں نکلتی لیکن اگر میں دعا مانگوں۔۔۔ یا دوں تو یہی ہو گی کہ اللہ تمہیں پتر دے اور نام ہو اس کا محمد طاہر پرویز۔۔۔ لیکن شرط میری وہی پرانی ہے۔ اس کو کوئی بچ بولے۔"

طارق سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ بے جی پیروں میں جوتی پھنسانے لگیں۔ وہ منہ دھونے جانا چاہ رہی تھیں۔ معصومہ اب تک جہاں کی تہاں کھڑی تھی۔ طارق نہ ہوتا تو وہ کرارا سا جواب دیتی مگر اس نے خود کو طارق کے سامنے ہمیشہ اچھا مظلوم اور معصوم بنا کر پیش کیا تھا۔ جوش میں تھی اس وقت۔۔۔ مگر ہوش برقرار تھے۔

بے جی آنسوؤں سے دھلے چہرے کو پانی سے دھونے کے بعد دوپٹے سے پونچھتی آ رہی تھیں۔ انہوں نے اون کے گولے کو اٹھایا۔ طارق نے نظریں اٹھا کر بے جی کو دیکھا۔ ان کا چہرہ رونے کی چغلی کھا رہا تھا مگر پرسکون تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک گولا نیچے گر گیا۔ طارق نے تیزی سے جھک کر اٹھایا اور ماں کی سمت بڑھایا۔ بے جی نے گولا لیتے ہوئے دونوں کو دیکھا۔ ایک گہری نگاہ معصومہ پر۔۔۔ وہ تو اسے دیکھتی ہی نہیں تھیں۔

"اگر میں زندہ رہی تیری اولاد دیکھنے کو۔۔۔ تو نام تو طاہر ہی ہو گا۔ خاہر۔۔۔ تارے۔۔۔ تاکہ اسے زندگی بھر یاد رہے۔" معصومہ کی طرف انگلی کر کے اشارہ کیا۔

"پتر ماؤں کی عزتوں پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔"

طارق کی پوری ہستی ہل گئی۔ اس نے بے ساختہ معصومہ کو دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ تب معصومہ

نے ایک جنون کے عالم میں ہاتھ مارا تو باورچی خانے کے نام پر بنائی گئی چھوٹی سی دیوار پر رکھے چاولوں کی ٹرے زمین بوس ہو گئی۔ اڑتے چاول طارق کے بالوں تک میں جا کر اٹک گئے۔ وہ حواس باختگی سے کھڑا ہوا، تب تک معصومہ ہانڈی کو پھر سے ٹھوکر مار چکی تھی نسی گھی والا سِکی کنگڑ ہانڈی سے باہر آکر گرا۔

معصومہ اپنے کمرے کی جانب بھاگی۔ طارق شدید پریشانی میں کھڑا تھا۔ بے جی اپنے گولے گن رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼
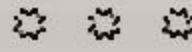
تو محمد طاہر پرویز ہے بے جی کا تارے... بے جی کی پہلوٹھی کی اولاد تھا۔ منتوں مرادوں سے ملنے والا بچہ۔ صبر سے انتظار... پھر شکر کا اہتمام مگر شکر سے پہلے استغفار نکلی زبان سے... کہ بچے کا سر جسم کی نسبت چھوٹا تھا۔ دائی نے تسلی دی۔ وہ رومال اور ٹوپی کس دے گی۔ چاول یا باجرے سے بھرے تکیے میں جب سر رکھ دیا جائے گا تو خود بخود بیٹھ جائے گا۔

دائی تجربہ کار تھی۔ اور سارا گاؤں اسی کے ہاتھوں کا جنا تھا۔ سو ان کے دعوے پر کسی کو حیرت نہ ہوئی مگر بے جی نے سوچا۔ اتنا بڑا پورا مکمل انسان بنانے کے بعد اللہ ایک سر کیا بندے کے بنانے کے لیے چھوڑ دے گا۔

پر وہ چپ رہیں۔ دائی حضوراں روز صبح دس بجے آتی۔ سرسوں کا خالص نکلا تیل دھوپ میں رکھتی۔ ننھے طاہر کو اپنے سامنے ڈال لیتی اور سخت ہاتھوں سے ورزش شروع کر دیتی۔

مگر عجیب بات تھی، دائی کی تمام تر مشاقی کے باوجود سر کا کچھ غیر فطری سا لگنا اور واضح ہونے لگا۔

اور وضاحت لوگوں کی نظروں سے چھلکنے لگی۔ پھر زبان سے اگل پڑی بے جی کے گھر پیدا ہونے والا بچہ زبان عام میں دولے شاہ کا چوہا تھا۔

وہ گورا تھا۔ صحت مند بھی... بالکل چپ نہیں تھا۔ اپنی پسند کے چند لفظ اور جملے بولتا تھا۔ اور انہیں مہینوں دہراتا تھا۔ جو بھی پوچھ لو وہی یاد شدہ لفظ دہراتا۔

کہتے ہیں گونگے کی رمزیں... گونگے کی ماں جانے تو ہوا یہ کہ بے جی اس ایک لفظ یا جملے یا پھر فقط حرکات و سکنات سے معنی سمجھ لیتیں۔ باتیں کرنے لگیں۔ ماں بیٹا ایک دوسرے کے لیے رہ گئے۔ بیٹے کی تو چلو مجبوری تھی کہ کدھر جائے، بے جی نے سب کو خود ہی چھوڑ دیا۔ خود کو تارے سے جوڑ لیا۔

دراصل جب ہم بے بس ہو جاتے ہیں تو صبر کرتے ہیں۔ مگر بے جی نے صبر کے ساتھ شکر کیا تھا۔ جو صبر کا سب سے اعلا درجہ ہے۔

اپنے مجبول ننھے سے بیٹے کو نہلا دھلا کر تیار کرتیں۔ انڈے جیسی شکل کے سر پر تیل لگاتیں۔ آنکھوں میں سرمے کے ڈورے... ستھرے کپڑے پاؤڈر کا چھڑکاؤ اور اس سب سنگھار کے بعد جگر کا ٹکڑا اتنا پیارا لگتا کہ اسے گدگدا گدگدا کر بے حال ہو جاتیں۔ چوم چوم کر نڈھال ہو تیں۔ پھر یکدم وہم سا گھیر لیتا تو ماتھے پر سرمے کا ٹیکا لگا دیتیں۔ کہیں لاڈلے کو کسی کی نظر نہ لگے۔

دنیا حیران ہوتی۔ کچھ تاسف سے دیکھتے "بے چاری" کچھ ہنسی اڑاتے "جھلی ہو گئی" کہتے لیکن بے جی ان سب چیزوں سے قصداً انجان بنی رہتیں۔ جو وہ سوچتی تھیں وہ شاید کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ سات برس کی بے اولادی کاٹی تھی۔ خالی گود کا دکھ وہ بڑے فخر، مان اور لاڈ سے تارے کو سب کے بیچ لیے بیٹھی رہتیں۔

کہیں سے کوئی ترحم یا طنز حیرانگی آتی تب بے جی تارے کو پکار کر چوم کر ستانے سے لگاتیں اور شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر آنکھوں میں تشکر محبت اور عاجزی بھر کے کہتیں۔

"رب سوہنے نے بنایا ہے۔ اب اس کے بنائے میں کیا عیب نکالوں کہ تھوڑا ایسا تھوڑا ویسا کیوں نہیں۔ جب خالی گود بیٹھی تھی۔ دنیا تب بھی باتیں کرتی تھی۔ اب ماشاء اللہ سے بچے والی ہو گئی دنیا پھر بھی چپ نہیں کرتی۔ تو مجھے پتا لگا کہ دنیا کا کام ہی باتیں

بناتا ہے۔ تو پھر بناتی رہے۔

میرا کام تو شکر کرنا ہے۔ میں نے سات سال اللہ سے اولاد مانگی۔ اللہ نے دے دی۔ اب کیا سجدے میں گر کے شکایتیں کروں کہ ایسی کیوں دی؟ اللہ سے مانگتے میں شرم نہیں مگر شکایت کیوں لگاؤں... شکوے کیوں کروں... یہ کیوں نہ کہوں کہ رب سوہنے تو نے ہی اسے ایسا بنایا ہے تو ہی اسے ٹھیک کردے۔"

اور تارے نے ٹھیک کیا ہوتا تھا۔ رب سوہنے نے صبر اور شکر کا انعام بنا کر محمد طالب کو بھیج دیا۔ ایک بالکل ایسا بچہ جیسا وہ چاہتی تھی۔

بے جی کا ویڑہ سج گیا۔ کہاں خالی ڈھنڈار ویڑہ اور کہاں دو دو بچے۔

محمد طالب سیدھا سادا شریف بچہ... محمد طاہر پھڈے باز... بے جی کی گود میں نکے کو برداشت ہی نہ کرتا۔ محمد طالب کو دودھ تک پلانے کے لیے بے جی کو تارے کے اِدھر اُدھر ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔

تارے بارہ برس کا تھا اور محمد طالب سات برس کا جب محمد طارق دنیا میں آیا۔ محمد طالب سے تارے نے بیر باندھا تھا مگر محمد طارق پر نثار ہو گیا۔ بے جی دودھ پلانے لگتیں تو تحمل سے انتظار کرتا کہ وہ دودھ پی لے تو وہ اس ننھے سے کھلونے کو لے کر کھیلے۔

محمد طالب کو کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ محمد طارق کی طرف پیار سے بڑھتا تھا۔ مگر بے جی محتاط رہتیں۔ مزاج کب بگڑ جائے اور بچے کو اٹھا کر یوں پھینک دے جیسے وہ غصے میں آکر چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکتا تھا۔

عجب کیفیت میں زندگی گزرتی تھی تارے کی... اگر چپ ہے تو ہفتوں چپ... اور بولنے پر آئے تو ساری ساری رات کسی ایک لفظ کی گردان کرتا ہی جائے۔

محمد طالب کی کتابوں اور تختی سے خاصی دلچسپی تھی۔ بس ایک بار ہاتھ آ جائیں۔ وہ بے چارہ چھپ چھپ کر پڑھتا۔ تارے کے انڈے جیسے سر میں دماغ نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی تو عقل کہاں سے آتی۔ مگر خالب کن کن ممکنہ جگہوں پر مل سکتا ہے اور اس کے پڑھنے کا وقت کون سا ہے۔

یہ تارے کو پتا لگ جاتا۔ وہ اس کا پیچھا کرتا اور جا لیتا... دماغی طور پر صفر تھا تو جسمانی لحاظ سے تنومند۔ کتنی ہی کاپیاں کتابیں پھاڑیں۔ ایک بار تو تختی سے مار مار کے سر لہولہان کر دیا۔ بے جی کس کے پاس شکایت لے کر جاتیں۔ روتی جاتیں اور زخم پونچھتی جاتیں۔ ٹکور کرتی جاتیں۔ رات کو جب ابا جی نے بیٹے کو اس حال میں دیکھا تو حق دق رہ گئے۔

"نہ تو مجھے بتا تو سہی تارے کی ماں... کس نے اسے اس حال میں پہنچایا۔"

"کس نے پہنچانا ہے۔ بچے کھیلتے کھیلتے آپس میں لڑ ہی پڑتے ہیں۔"

"محمد طالب لڑاکا ہے ہی نہیں۔" وہ انکاری تھے۔

"تو بول طالب۔ کس نے تیرا یہ حشر کیا ہے۔" بیوی سے مایوس ہو کر وہ بیٹے سے پوچھنے لگے۔ مگر بیٹا پہلے ہی ماں کی ہدایتوں کا پڑھا ہوا تھا۔ چپ رہا۔ ابا جی تو بس نگاہوں سے دیکھتے رہے۔

"تو تم دونوں نے طے کر لیا ہے کہ مجھے کچھ نہیں بتانا... تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی باہر جا کر پتا کرتا ہوں۔ کہیں ناں کہیں سے پتا لگ ہی جانا ہے۔" وہ کھڑے ہو گئے۔

بے جی اور طالب نے ایک دوسرے کو ہراساں نظروں سے دیکھا۔ بے جی تیزی سے سامنے آئیں۔

"رہنے دیں جی... بچے لڑتے ہی ہیں۔ کوئی بات نہیں۔"

ابا جی نے دونوں ماں بیٹے کو بغور دیکھا پھر دوبارہ بیٹھ گئے۔ "مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔" وہ نتیجے پر پہنچ گئے۔ "یہ تارے کا کام ہے... ہے ناں؟"

دونوں بری طرح چونکے اور ہم آواز ہو کر انکار کر دیا۔ "نہیں تو۔"

ابا جی نے کچھ بھی نہ سننے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ "بلاؤ تارے کو۔"

"رہنے دیں جی۔ بچہ ہے۔" بے جی حواس باختہ ہو گئیں۔ ان کے لیے تینوں بچے برابر تھے۔ بلکہ تارے

کی جانب زیادہ لگاؤ اور جھکاؤ تھا۔ مگر اباجی کو جو انس اور محبت طالب سے تھی۔ وہ طارق کے حصے میں بھی نہیں آئی تھی۔

سیدھا' نیک' ذمہ دار' ذہین' سمجھ دار بیٹا... پڑھائی میں بہترین' پانچوں وقت نماز پڑھنے جاتا۔ ایک ایسا بچہ جس کی سب ہی تمنا کریں۔ اولاد سے محبت فطری چیز ہے اور پھر اولاد اگر قابل فخر بھی ہو تو محبت دوگنی ہو جاتی ہے۔

بے جی نے طوعاً و کرہاً تارے کو پیش کر دیا۔

"تم نے چھوٹے بھائی کو کیوں مارا؟" تارے نے اباجی کو یوں دیکھا جیسے وہ کوئی اجنبی زبان بول رہے ہوں۔ بے جی شوہر کا غصہ اور صبر کی حد بھی دیکھ رہی تھیں اور تارے کو بھی۔

اور تارے اباجی کو دیکھنے کے بجائے چھت کے کونے کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں ایک چھپکلی تھی۔ اباجی اپنا سوال تھوڑی تھوڑی دیر بعد دہراتے تھے۔ پھر تارے کی نظروں کے تعاقب میں چھپکلی کو دیکھا۔ اباجی طیش کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔ مگر تارے کے دماغ میں کچھ اور ہی چل رہا تھا اور دھیان صرف کونے پر...

اس سے پہلے کہ اباجی سر پر پہنچ کر اپنا سوال دہراتے' تارے نے زمین پر پڑی جوتی اٹھا کر پوری طاقت سے کونے کی جانب پھینک دی۔ نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔ مگر ایک ساتھ دو چیزیں ظہور پذیر ہوئیں۔ چھپکلی بھی نیچے اور جوتا بھی نیچے۔ اباجی کے سر کے اوپر۔

اور سونے پر سہاگا' تارے نے تالیاں بجا کر اچھلنا شروع کر دیا۔ پھر بھنگڑے کے انداز میں گھومنے ہی لگا۔ دیوار گیر پر چھتی سے دو تین کپ ساسر بھی گر کے چکنا چور ہوئے تھے۔

اباجی شدید اشتعال میں گھر کے آگے بڑھے اور اگلے پل تارے اباجی کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہا تھا۔

بے جی اور طالب کو بس چند پل لگے تھے صورت حال سمجھنے کو۔ دونوں بیچ بچاؤ کرانے کے لیے کود پڑے۔ بے جی نے تارے کو اپنے پیچھے کر لیا اور طالب اباجی سے لپٹ گیا۔ ابھی تارے کو صحیح والی پڑی نہیں تھیں۔ مگر حواس باختہ ضرور ہو گیا تھا کہ ایسی صورت حال کا سامنا پہلی بار کرنا پڑا تھا کہ کوئی تارے کو بھی مار سکتا ہے (تارے بھلے کسی کو بھی مارے مگر...)

ادھر تارے کی سوچوں سے پرے بے جی پر آسمان گرا تھا جیسے... شوہر نامدار نے تارے کو مارا۔

"آپ نے تارے کو مارا... میرا بے زبان بچہ..."

"بے زبان بچے کے کام دیکھے ہیں۔ ذرا عقل تمیز نہیں اس کو۔" اباجی چارپائی پر بیٹھ کر تارے کو گھورتے ہوئے ابھی تک اپنی سانسوں پر قابو نہ پا سکے تھے۔

"آپ کو اچھی طرح پتا ہے اس کی عقل موٹی ہے۔"

"تو اس کا مطلب ہے اسے ہر چیز کی چھوٹ دے دی جائے۔" اباجی کچھ سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

"میں نے کبھی اپنے پتر کو پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا اور آپ نے..." بے جی کے حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹکا۔ اباجی کو بھی یکدم احساس ہوا وہ چپ سے ہو گئے۔ بے جی چارپائی پر ذرا سا رخ موڑ کے منہ پر دوپٹا رکھ کے بیٹھ گئیں۔

"کسی اور نے یہ سب کیا ہوتا ناں تو اس کے اگلے پچھلوں کو..."

آگے بے جی نے جملہ روک دیا۔ وہ شوہر کی چچازاد تھیں۔ دونوں کے اگلے پچھلے ایک تھے۔ طالب الگ شرمندہ سا بیٹھا تھا۔ اور ان سب سے الگ تارے نے روتی بے جی کو دیکھا۔ اباجی بھی خیالات میں ڈوبے نظر آئے۔

"اب چپ کر جا بھلیے لوکے... باپ کی مار اولاد کے لیے ایسے ہی جیسے پودے کے لیے کھاد..."

"رہن دو ہمیں نہ ڈانئی ایسی کھاد۔ اب مجھے خوامخواہ کی صفائیاں نہ دیں۔ میں نے..."

بے جی کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اگلا لمحہ تھا ہی ایسا ناقابل یقین... تارے کسی بھینسے کی طرح پورے ناپ تول سے آگے بڑھا تھا اور اس نے اپنا انڈا سر اباجی

کے سینے میں یوں مارا جیسے فلم فائٹنگ کے رنگ میں بھینسے ٹکراتے ہیں۔ اباجی سر کے بل چارپائی پر گرے
اوے اللہ توبہ۔۔۔
تارے اباجی پر چڑھا ان کے سینے، منہ اور سر پر کسی پہلوان کے سے جنون سے مکے مار رہا تھا اور ایسا جنونی تھا کہ اباجی سے جنبش بھی محال تھی۔ اباجی کے سامنے اپنے بڑے ڈیل ڈول کے باوجود وہ بچہ ہی تھا۔ مگر ابھی یوں تھا کہ موقع اسے ملا تھا۔ مگر آخر کب تک۔۔۔؟
بے جی اسے پیچھے سے کھینچ رہی تھیں۔ طالب حواس باختہ سا سہما کھڑا تھا تب ہی اباجی نے ایک زور کا جھٹکا مارا اور اب تارے نیچے تھا اور اباجی اوپر۔۔۔ بے جی کے بیچ بچاؤ کرتے اور اباجی کو دور کرتے کرتے بھی تارے بری طرح پٹ چکا تھا۔
"آج باپ کے ہتھے چڑھ گیا ہے تیرا تارا۔۔۔ اب اور کون سا دن دیکھنا رہ گیا ہے۔"
وہ بولتے جاتے تھے اور ٹھکائی لگائے جاتے تھے۔
بے جی تارے پر یوں چھا گئیں جیسے سورج کو بادل ڈھانپ لیں۔ بارش کو چھتری روک لے۔ اباجی کو رکنا ہی پڑا۔ بیوی کو تو کبھی اونچی آواز سے پکارا نہیں تھا کجا کہ مارتے۔۔۔ وہ تو ابھی بس یونہی لگ گئی۔۔۔ بے جی تارے کو ٹٹول رہی تھیں، طالب الگ مجرم بنا کھڑا تھا۔ ابا کے کرتے کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔
"مجھے دوسرا کر تا دے دو۔ اذان ہونے والی ہے۔"
مگر بے جی کب سن رہی تھیں، روتی جاتی تھیں اور تارے کو چپ کرواتی تھیں۔ جو رو تا تھا اور روتا۔
"ابا بھیڑا۔۔۔ ابا کھوتا۔۔۔ تارے مارا، ابا کھوتا۔"
بے جی تو کچھ سن نہیں رہی تھیں، اباجی کے کان کھڑے ہو گئے۔ کوئی تین ماہ تک اب اسے یہی گردان کرنی تھی۔ طالب نظریں چرائے بیٹھا تھا کوئی اپنے ابے کو کھوتا کہتا ہے مگر۔۔۔ تارے کہہ سکتا تھا، وہ کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔
اباجی نے بے جی کی مصروفیت کو دیکھ کر خود سے ہی کرتا نکالا اور مسجد جانے کو نکلے تب عجیب منظر دیکھا۔ بے جی اپنا برقعہ سر پر جمائے چھوٹی سی لوہے کی صندوقچی پکڑے تارے کا بازو دبوچے گھر سے نکلنے ہی والی تھیں۔
"اوئے کدھر۔۔۔؟" اباجی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
بے جی یوں ہو گئیں جیسے کسی نامحرم نے پکار لیا ہو۔ آگے ہی بڑھتی جا رہی تھیں وہ تو شکر تھا، دیڑھ بڑا تھا ورنہ اب تک نکل چکی ہوتیں۔ اباجی راستے میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ بے جی نے منہ پھیر لیا۔
"کیا ہوا کدھر کی تیاری ہے؟" بے جی چپ اور جب بولیں تو اباجی کو قوت سماعت پہ شک ہوا "ہیں کیا کہا؟ کیا مطلب۔۔۔؟"
"یہی کہا ہے تارے کے اباجی۔۔۔ بس یہیں تک کا ساتھ تھا۔ آج سے میرا کوئی رشتہ نہیں نہ آپ سے نہ آپ کے گھر سے۔۔۔"
"او پر جانا کدھر ہے؟"
"اتنی بڑی زمین ہے اللہ کی۔۔۔ کہیں نہ کہیں جگہ مل ہی جائے گی۔"
"او کہیں نہ کہیں کیا مطلب۔۔۔؟" اباجی نے اپنا بازو پھیلا کر سامنے گھر کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ ہے نا ساری جگہ تیری۔"
"تھی۔۔۔" بے جی نے ترنت کہا "تب تک جب تک۔۔۔" بے جی کے حلق میں گلو تو پھنسا اباجی یکدم جیسے سمجھ گئے۔ ان کا مارا ہاتھ بے جی کو بڑے زور سے لگا تھا۔
"او غلطی سے لگ گیا تارے کی ماں۔۔۔ میں نے کبھی تجھ سے اونچی آواز میں بات تک نہیں کی وہ تو آج۔۔۔"
"میں اپنی بات نہیں کر رہی۔۔۔ آپ نے تارے کو مارا۔۔۔ دیکھیں اس کا حال۔ یہ مارے جانے کے لیے مانگا تھا میں نے اللہ سے۔۔۔ بس مجھے نہیں رہنا اس گھر میں بس کمک گئی آپ کی اور میری۔۔۔ یہیں تک کا ساتھ تھا۔ کہا سنا معاف کریں۔ "السلام علیکم۔۔۔" وہ تو اجنبی ہو گئیں۔ اباجی کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ تیزی سے پیچھے بھاگے۔ پھر ہاتھ پھیلا کر راستہ روکا۔
"بھلیے لوکے میری بات تو سن۔" بے جی رک

گئیں، مگر مجبوری ہر عضو سے عیاں تھی۔

"بس، جو کہنا ہے، جلدی کہہ نہیں۔" ان کی تو گندی جیسے نکلنے کو تھی۔

اباجی نے سر پر رکھا پگڑا تارا۔ چھوٹے چھوٹے گومڑ سے ابھرے تھے اور ٹھوڑی کے پاس کی سوجن نمایاں ہونے لگی تھی۔ جبڑے کی دکھن البتہ دکھائی نہیں جا سکتی تھی۔

"ابھی باہر نماز کے لیے جاؤں گا تو کیا کہوں گا، پتر سے پٹ کر آیا ہوں؟"

"یہ بھی کہنا تارے کے ابا!" بے جی کی آواز تھی۔

"پتر کو مار کے آیا ہوں۔"

"او کبھی بیٹے باپ پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ عقل کر، قیامت کی نشانی ہے یہ تو۔"

"نہیں اٹھاتے مگر تارے کی جگہ یہ طالب یا طارق ہوتا ناں تو خدا کی قسم ہتھ وڈ کے ادھر دور پھینک دیتی اور پلٹ کر دیکھتی ناں۔۔۔ مگر تارے تو۔" بے جی نے اپنے پیچھے چھپتے تارے کو خود سے لگا لیا۔ جو سہم گیا تھا اور اب رو رہا تھا۔

"دیکھیں اسے۔" بے جی نے ذرا بے رحمی سے تارے کو اباجی کے سامنے کیا "یہ ہے اس قابل کہ اسے مارا جائے۔" تارے نے شکوہ کناں نگاہوں سے باپ کو دیکھا اور منہ بسور کر ذرا خوف زدگی سے ماں سے پٹ گیا۔ اباجی کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ بے جی جیسی محبت کا اظہار نہیں کرتے تھے مگر تھا تو وہ ان کا بھی لخت جگر۔

"میرا منگ پتر۔۔۔ میرا سائیں۔۔۔ میری عرضی۔"

(بے جی اسے لاڈ میں آ کر میری عرضی کہا کرتی تھیں۔ کہ وہ درخواست وہ دعا جو پوری ہوئی)

بے جی پے در پے اس کے اندھے منہ سر کو چومنے لگیں۔ دونوں ماں بیٹا رونے لگے۔ حیران سا طالب بھی بے جی سے پٹ گیا تب ہی پنگوڑے سے سوئے طارق کی آواز آئی۔ اباجی نے آگے ہو کر صندوقچی پکڑ لی۔ بے جی کو بھی یاد آ گیا۔

"طارق کو دودھ دینا ہے۔" تارے بھی الرٹ ہوا۔

"کاکا رو۔۔۔" بے جی نے پیار سے تارے کا گال سہلایا اور اثبات میں سر ہلایا۔

اباجی احساس جرم میں گھرے تھے۔ پتا نہیں آج کیا ہوا تھا۔ پدرانہ شفقت سے ہاتھ بڑھایا کہ تارے کو گلے لگا لیں۔

مگر تارے تو پھر تارے تھا۔ اس نے بری طرح ہاتھ جھٹک دیا۔

منہ بسورا اور "ابا کھوتا" کہہ کر اندر بھاگ گیا۔ طالب نے نظریں جھکا لیں۔ اباجی شرمسار سے کھڑے رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اباجی نے بڑے صبر سے انتظار کیا اور برداشت کیا، کہ تارے کی ابا کھوتا والی گردان کب تک چلے گی، تاوقتیکہ کوئی نیا لفظ منہ پر چڑھے۔ تارے نئے لفظ کو پکڑ کر پچھلے والے کو یوں بھول جاتا تھا جیسے کبھی کہا ہی نہیں، ساڑھے تین ماہ بعد ابا کھوتا کا وقت ختم ہوا تارے کو نیا جملہ مل گیا تھا۔ مگر اباجی تو اباجی اس بار بے جی بھی سر پیٹ کر رہ گئیں۔ جب تارے گالی سیکھ کر آ گیا۔

وہ ناراض ہے تو گالی۔۔۔ خوش ہو گیا تب بھی گالی۔ وجد میں آ کر گالی۔ سانو اٹھتے بیٹھتے گالی۔۔۔ دے گالی پہ گالی۔

اور اس میں شیخ اور زاہد کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ سب کو برتیں۔ چلتی ہوا کو، سر پر منڈلاتی مکھیوں کو۔ مرغیوں، بھینسوں کو، منڈیر پر بیٹھے کوے۔۔۔ راہ گیروں کو ہمسایوں کی ماسیاں، ماسیاں۔۔۔ یہاں تک کہ بے جی کو بھی۔۔۔ جب وہ اسے سمجھانے لگتیں۔

"تارے مسیت (مسجد) جایا کر۔ چنگے بول بولیا کر۔۔۔ اللہ ناراض ہو جاندا اے۔" تارے یوں سر ہلاتا جیسے سب سمجھ رہا ہو۔ فرماں برداری کا یہ دورہ ہوتا جب بے جی تارے کے منہ میں نوالے بنا بنا کر ڈال رہی ہوتیں۔

جیسے ہی تارے کا پیٹ بھرتا وہ طوطے کی طرح

آنکھیں پھیر لیتا جست لگا کر منجی سے اترتا اور باہر کی جانب لپکتا۔ بے جی اسے گھر ہی میں روکے رکھنا چاہتیں۔ تارے کو دور دور نکل جانے کی عادت تھی۔ بے جی کو گھبراہٹ ہوتی اور جب سے پنڈ کے دوسرے کنارے سے ریل گزرنے لگی تھی۔ تب سے تو وہ بالکل ہی وہمی ہو گئیں۔ کہیں تارے ریل میں نہ بیٹھ جائے یا اگر ریل کے آگے لیٹ گیا۔ توبہ توبہ۔

کیونکہ جب کبھی وہ مغرب تک گھر نہیں آیا تو وہیں سے پایا گیا تھا۔ مگر بھرے پیٹ کا تارے گھر میں رکنے والا کب تھا۔ کہاں دبلی پتلی بے جی اور کہاں تنومند تارے۔ بے جی کے روکنے کا انداز کوئی لالچ ہوتا، گڑ کی ڈلی دیں گی یا حلوہ یا میٹھے چول (زردہ) مگر تارے کا تو پیٹ بھر چکا ہے۔ وہ اب کیوں رکے گا۔ سو بے جی اس کی کمر سے لپٹ جاتیں کہ جانے نہ دیں گی مگر تارے کے آگے بے بس ہو سکتی تھیں۔ وہ ایک جنبش خود کو چھڑواتا۔ اکثر بے جی دھکا سا لگنے سے گر جاتیں۔

تیری ماں۔ تیری بھین۔ تارے پیچھے دیکھے بغیر کوالٹوں کو جتا چھوڑیہ جا وجا۔

اب تارے بے اور تارے کی من مانیاں۔ گھنٹوں تک کھلا ڈلا نیکر اوپر کرتا۔ کرتے کی لمبائی گھٹنے سے نیچے۔ زیادہ تر ننگے پیر ہوتا۔ "تنجاسر" گلے میں تعویذ جو بے جی نے آج بھی اس امید سے باندھ رکھے تھے کہ ان کا سپوت ایک دن ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔

اس کی خوراک کا وہ سب گھر والوں سے ہٹ کر زیادہ خیال رکھتی تھیں۔ بادام کھلاتیں۔ دودھ مکھن کی تو خیر فراوانی تھی۔ دیسی گھی بھی گھر کا۔ بس وہی خیال کہ دماغ طاقت پکڑے تو سب ٹھیک ہو جائے۔

اب دماغ نے تو کیا طاقت پکڑنی تھی۔ جسم نے جو جان پکڑی تو یہ پہلوان سا تارے۔ قد کاٹھ قدرتی کھلا ڈلا تھا اور اس پر خوراک کا اثر کہ رنگ گورا۔ گالوں سے گویا لہو ٹپکتا۔

اور کون تھا جو تارے کے شر سے محفوظ تھا۔ وہ دانہ چگتی مرغیوں کو تاک تاک کر پتھر مارتا۔ ایک بار تو مرغی منٹ کے اندر چت پٹ ہو گئی۔ مرغی کی مالکن مرغی کو دونوں پنجوں سے الٹا پکڑ کر لے آئی۔ ساتھ ساتھ دہائیاں بھی۔

"پہلے ہی سردی سے دو ککڑیاں مر گئیں۔ ایک کڑک ہو کر بیٹھی ہے۔ دو ہی بچی تھیں انڈے دینے کے لیے اور اس تارے نے یوں ایسا نشانہ باندھا جیسے بندوق کی گولی ماری ہو۔ اب ٹھنڈ میں میرے انڈوں کا کیا ہو گا بی بی۔ اس تارے کو۔" آگے اس نے لب بھینچ لیے۔

بے جی تحمل سے سنتی رہیں۔ تارے پاس ہی کھڑا تھا اور بے حس و حرکت۔ مرغی کو پکڑ کے چیک کرنا چاہتا تھا۔ مگر شکایتی ماسی نے ہنوز مرغی کو پنجوں سے الٹا پکڑ رکھا تھا۔ اور سچ یہ بھی تھا کہ اس کا نقصان ہوا تھا۔

گاؤں دیہاتوں میں ڈھور ڈنگر ہی تو سب سے بڑا اثاثہ ہوتے ہیں۔ بے جی اسے پرسکون رہنے کا اشارہ کر کے اٹھیں۔ ڈربے سے اپنی سب سے موٹی مرغی نکال کر اس کے حوالے کی۔ ساتھ چار انڈے بھی لیے۔

"مرغی کے بدلے مرغی دے رہی ہوں۔ اور یہ انڈے میری طرف سے تیرے بچوں کے لیے۔ مگر دیکھ میرے تارے کے لیے بددعا نہ کریں۔ اللہ نوک ہے یہ شودا۔"

شکایتی ماسی حیرانگی سے کبھی بے جی کو دیکھے، کبھی مرغیوں اور انڈوں کو۔ اور تارے کو بھی دیکھا جو سب کو بھول کر بس اس مری مرغی کو تک رہا تھا۔ آنکھوں میں ایک چمک سی تھی۔

اب شکایت کے پیچھے بچا کیا تھا۔ اسے لوٹتے ہی بنی۔ بے جی کسی بھی ملال کے بغیر اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگ گئیں۔

مگر تارے کا دماغ کسی شکاری بلے کی سی مشاقی سے دانہ چگتی مرغیوں میں ایک یا کبھی بھار بیک وقت دو پر جھپٹا مارتا اور انہیں پنجوں کے بل الٹا پکڑ لیتا پھر ایسے سر سے اوپر ہوا میں گھماتا جیسے تھرو بال کے کھیل میں لوہے کی گیند کو گھماتے ہیں۔

کبھی مرغیاں بچ جاتیں۔ کبھی مر بھی گئیں۔ بے جی

شکایت تحمل سے سنتیں اور خاموشی سے ہرجانہ بھر دیتیں۔

مگر خالی مرغیاں ہی کیوں؟ تارے چاولوں کی پنیری میں گھس جاتا اور ننھی ننھی کونپلوں کے اوپر دھمال ڈالتا۔

تیار گنے کی فصل سے گنا توڑتا وہیں پھسکڑا مار کے بیٹھ کے چھلتا جاتا۔ چوستا جاتا۔ اب انسان تھا، کتنے گنے چوس سکتا تھا۔ خیر ہے مگر مصیبت یہ ہی کہ عزیزی تارے کو گنے کے تاخ، خڑ خڑ۔ ٹوٹنے کی آواز بہت بھاتی تھی۔ سو اس انجوائے منٹ کے لیے وہ ڈھیروں گنے توڑ ڈالتا۔

اسلم حسن نے ایک دن تارے کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

"دیکھ تو نے جتنے کھانے ہیں لے جا۔ مگر توڑ توڑ کر ڈھیری نہ لگا ورنہ میرے سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

تارے اتنا مودب ہو کر سننے لگا جیسے ہمیشہ کے لیے تائب ہو گیا ہے۔ اسلم ہدایت کے بعد جانے لگا۔ تارے نے تاخ، خڑ خڑ کی آواز سے جارحانہ انداز اپناتے ہوئے گنا توڑا۔ اسلم شدید اشتعال سے پلٹا، آج وہ تارے کو نہیں چھوڑے گا۔

اور اگلے پل پورے گاؤں میں چیخ و پکار تھی۔ ہر ضرب پر یوں لگتا تھا۔ جیسے جان نکل رہی ہو۔ آوازیں اتنی دہشت ناک تھیں اور کھیتوں میں کام کرتے کتنے لوگ آواز کے تعاقب میں ہجوم بنا کر کھڑے ہو گئے اور منظر حیران کن اور تکلیف دہ تھا۔ تارے کے ہاتھ میں گنا تھا اور اسلم پٹ رہا تھا۔ تارے نے کتنے گنے توڑ دیے اسلم کے اوپر ۔۔۔ مگر جنون کم نہ ہوا۔ کسی نے بھاگم بھاگ خبر گھر تک پہنچا دی ۔۔۔ بے جی، ابا جی، طالب دوڑے آئے، کسی نہ کسی طرح قابو کر کے گھر لائے۔

شام کو پنچائیت بیٹھ گئی۔ اور سب ہی بہر حال تارے کے خلاف ایک قرار داد چاہتے تھے۔ سب ہی کو کوئی نہ کوئی شکایت یاد آ رہی تھی۔ عورتیں، مرد، بچے۔

ابا جی مجرموں کی سی خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ طالب فکر مند، تارے بوسکی کے کرتے اور سرمئی نیکر میں نہایا دھویا بے جی کے ساتھ کھڑا تھا، ٹھنڈے تیل کی مالش کے بعد لشک رہی تھی۔ آنکھوں میں سرما لگا کر بے جی نے لاڈلے کو تیار کر رکھا تھا۔ بے جی کے دوپٹے کا پلو پکڑے وہ اتنا بے ضرر اور معصوم لگ رہا تھا کہ کئی کو اپنی شکایت خود ہی غلط لگنے لگی۔ مگر اسلم اور اسلم کے چاروں بھائی اور ابا اور چاچے، تارے کے جرم معاف کرنے کو تیار نہیں تھے۔

جب معذرت، شرمندگی، ہرجانہ سارے تھیشنز فیل ہو گئے اور معاملہ جیسے لٹکنے لگا اور اسلم والوں کی آنکھوں سے شرارے نکلتے رہے۔ تب بے جی نے چند منٹوں کے لیے گھر جانے کی اجازت طلب کی۔ جو نا سمجھی کے عالم میں دے دی گئی۔ طالب اور طارق ماں کے پلو سے بندھے ساتھ چلے، تارے بھی لپکا مگر بے جی نے اسے ابا جی کی موجودگی کی یقین دہانی سے روکنا چاہا مگر تارے کی ابا جی سے کبھی بنی تھی جو آج بن جاتی، سو تارے بھی روانہ ہوا۔

پنچائیت میں سانسوں کی آواز تھی یا پھر حقے کی گڑگڑ...

انتظار زیادہ طویل نہیں ہوا۔ بے جی آتی دکھائی دیں۔ تارے پیچھے پیچھے طارق، طالب دائیں بائیں اور جب وہ نزدیک پہنچے تو منظر واضح ہونے پر کتنوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ کئی ایک تو جگہ سے کھڑے ہو گئے۔

تارے کے دونوں ہاتھ بکری باندھنے والی زنجیر سے بندھے تھے اور زنجیر کا سرا بے جی کے ہاتھ میں۔

بے جی سب کو نظر انداز کرتیں نزدیکی درخت کے پاس گئیں۔ زنجیر کو سیتے سے درخت کے تنے سے باندھ دیا۔ پھر اسلم کے سر پر پہنچ گئیں اور طالب کے ہاتھ سے کچھ لیا۔ یہ کپڑے دھونے کا تھاپا (ڈنڈا) تھا۔

"میں نے اسے باندھ دیا ہے۔ پلٹ کر جواب نہیں دے سکے گا۔ یہ پکڑو۔" (ڈنڈا بڑھایا) اور جب تیرا بدلہ پورا ہو جائے تو اتنی مہربانی کرنا اطلاع دے دینا۔ میں اپنے پتر کو لے جاؤں گی۔"

بے جی نے طارق طالب کو خود سے قریب کرتے ہوئے واپسی کے لیے رخ موڑا پھر یکدم جیسے کچھ یاد آیا۔ اور اس بار لہجے میں تنبیہہ چھپی تھی اور بات بڑی گہری شہادت کی انگلی اٹھا کر گویا ہوئی تھیں۔

"مگر دیکھو یاد رکھیں۔ نہ اک وار کم۔ نہ ایک وار زیادہ۔" پھر شوہر کی جانب مڑیں۔

"چلیں تارے کے ابا جی۔ اب ادھر ہمارا کوئی کام نہیں۔"

ابا جی نے گہری سانس لی اور کھڑے ہو گئے اور ان کے قدم اٹھاتے ہی کتنے لوگ اور بھی پنچائیت سے رخصت کے لیے کھڑے ہوئے۔ یہاں تک کہ سب چلے گئے۔ پیچھے رہ گئے اسلم اور اس کے حمایتی۔ سہما ہوا اکڑوں بیٹھا تارے۔ جو بس تھا پے کو دیکھتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ جوان ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ کے لڑکے پڑھتے تھے۔ کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ ذمہ دار "سمجھ دار"... اور اس دن اسلم والے واقعے کے بعد سے تو تارے کے لیے سب کے دل میں نرم گوشہ بیدار ہو گیا تھا۔ بے جی نے کہا تھا۔ وہ سائیں لوک ہے۔ کوئی دھیان نہیں دیتا تھا۔ سب برافروختہ رہتے تھے۔ مگر اس دن جب بے جی ہمراہ اہل خانہ بیٹے کو دشمنوں کے حوالے کر کے چلیں۔ تب ہی دوسرے بھی ششدر رہ جانے والے اسلم پر نفرین بھیجتے کھڑے ہوئے تھے۔

تب سب نے عجیب منظر دیکھا۔ سہمے بیٹھے تارے نے تیز قدموں سے جاتے ماں باپ اور بھائیوں کو دیکھا تھا۔ پھر کچھ کھڑے ہوتے لوگ۔ اور کچھ سب کی طرح ساکت لوگ اور ہاتھ میں ڈنڈا پکڑے کھڑا اسلم۔ اور اس کے تکتے تکتے۔ تارے نے اک بے بس نگاہ اپنے اہل خانہ پر ڈالی جو گلی مڑنے ہی والے تھے (اور پیچھے پلٹ کر دیکھنے والے قطعی نہیں تھے) اور ان لوگوں کو جو بے جی کے فیصلے کے بعد شاید خود سے بھی نظریں ملانے سے قاصر تھے اور کچھ وہ لوگ جو سمجھتے تھے کہ تماشا ابھی ختم نہیں ہوا۔

ہاں تو تارے اب اسلم کے رحم و کرم پر تھا۔ اسلم ڈنڈا تھامے پہلے رخصت ہوتی بے جی کو دیکھتا رہا پھر سب لوگوں کو اور اپنے اہل خانہ کو۔ اس نے اپنے ہاتھ کے ڈنڈے کو دیکھا۔ پھر تارے کو جو سہمی نگاہوں سے اسے اور ڈنڈے کو دیکھ رہا تھا۔ کچھ من چلے شرارتی بے ضمیروں کو اپنے اندر ایک حیوانی سی خوشی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ بندھے ہوئے تارے کو پٹتا دیکھنا یقیناً "مزہ دیتا"۔

اسلم کشمکش و پیچ میں جلتا تھا۔ سب ساکت تھے، جب تارے کھڑا ہوا۔ سب چونکے۔ وہ اتنا آگے آیا جتنی اجازت بندھی زنجیر نے دی۔ اسلم تھوڑا سا پیچھے سرکا۔ تارے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے اسلم کو دیکھا اور اسلم کے ہاتھ کے تھامے ڈنڈے کو۔ زمین پر بیٹھ کر سر کو جھکائے ——— نظر اٹھا کر اسلم کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ان میں رحم کی اپیل ابھری پھر اپنی بے چارگی کا احساس اور پھر اس نے نظریں جھکا لیں لو ہے۔ اور سر کو بھی جھکا لیا۔ کہ وہ سر جھکائے بندھا بیٹھا ہے اسلم آگے آئے اور اپنا بدلہ لے لے۔

آنے والے ہیجان انگیز لمحات کا تصور لے کر خود کو جو شیلا کرتے دل سکڑے تھے۔ پھر پھسلے تھے۔ پھر جیسے دھڑکنا بھول گئے۔ ایسی بے بسی اور ایسا انصاف اور اب اسلم کیا کرے گا۔

ماں باندھ کر رو گئی تھی۔ بیٹے نے چوں نہ کی اور گردن جھکا دی۔ سب کو سکتہ ہو گیا۔ پھر مسجد کے امام صاحب ہی کو ہوش آیا۔ انہوں نے سب پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی اور اپنی نماز کی ٹوپی سر سے اتار کر اسلم کے منہ پر مارتے دائرہ توڑتے باہر کو چلے اور پھر ان کے پیچھے چلنے والوں میں سب شامل ہو گئے۔

یہاں تک کہ حق دق اسلم کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ گیا۔

پھر اسلم کا باپ آگے بڑھا۔ تارے ہی کی طرح اکڑوں بیٹھا۔ تارے آنکھیں سختی سے میچے بیٹھا تھا۔ اسلم کے باپ نے بندھے ہاتھوں کی زنجیر کو کھول دیا۔

پھر تارے کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔ پہلوان جیسے ڈیل ڈول کا تارے خوف کے مارے لرز رہا تھا اور اس پر آنکھوں سے چھلکتی ترحم اور بے بسی کی درخواست' بہت خاموشی سے اپنے گھروں کو لوٹتے کئی لوگوں نے حیرت سے اسلم کے باپ کو دیکھا جو تارے کے شانے پر ہاتھ ڈالے اس کے گھر کا دروازہ بجا رہا تھا۔

دروازہ بے جی نے کھولا۔ اسلم کے باپ نے تارے کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا۔

"معاف کر دینا بہن جی!" وہ بولا۔

"تم نے کر دیا؟" بے جی کی آواز صاف تھی۔

"ہاں کر دیا۔" اسلم کا باپ بوجھل آواز سے بولا تھا۔

"پھر میں نے کر دیا۔"

"آئندہ خیال رکھیں گے جی۔ یہ تو اللہ لوک ہے۔"

"لیکن میں ایسا وعدہ نہیں کر سکتی۔ ہاں دعا کروں گی۔ اللہ اسے ٹھیک کر دے۔"

بے جی نے صاف گوئی سے کہا تھا۔ اسلم کے باپ نے پورے دل سے ہاں میں سرہلایا تھا۔

✲ ✲ ✲

اور ٹھیک ہونے کا کیا قصہ۔ بس وقت گزرنے لگا۔ اتنا گزرا کہ تارے جوان جہان ہو گیا اور طالب جوان۔ طارق قد میں تو بھائیوں کے برابر تھا۔ مگر ویسے نو عمر ہی دکھائی دیتا' تارے کی طالب سے ٹھنتی تھی۔ شاید یہ اوپر تلے پیدا ہونے والے بچوں کا مزاج ہوتا ہی ہے۔ مگر یہ کھنچاؤ تارے کی طرف سے تھا۔ طالب کو بھائی سے بہت پیار تھا۔ مگر جتانے کا موقع کبھی ملا نہیں اور چھوڑیں بھی۔ بہن بھائیوں سے محبت جتانے' دکھانے کی ہوتی بھی کب ہے۔ یہ تو بس ہوتی ہے۔ بے حد و بے حساب ہوتی ہے۔

یہ کوکھ کی شراکت ہوتی ہے۔ دودھ کی حصے داری۔ ایک چنگیر کے نوالے۔ ایک تکیے کا جھگڑا ایک کمبل کی کھینچا تانی۔

مگر تارے کو یہ سب کون سمجھاتا۔ وہ طارق کے لاڈ اٹھاتا تھا اور طالب سے بھاگتا تھا۔ کبھی اس سے لاتعلق ہو جاتا۔ طالب جیے یا مرے؟ کبھی مدمقابل آجاتا۔

شریکے کی یہ کشمکش اب زیادہ دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔ کہ طالب پڑھ لکھ کر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ پھر ٹریننگ اور پوسٹنگ۔ تارے طارق کے ساتھ خوش رہتا۔

تارے کا متشدد رویہ اب گنے وقتوں کا حصہ تھا۔ جب وہ شور کرتا تھا اور نعرے بلند کرتا تھا۔ مارتا پیٹتا تھا۔ ہٹ دھرمی۔ تارے اب بہت بدل گیا تھا۔

اب وہ خاموش رہتا گھنٹوں۔ دنوں مہینوں تک بھی۔ اکثر مسجد چلا جاتا تھا۔ پڑھنا پڑھانا تو خیر کیا آتا۔ جس رخ دل کرتا سجدہ کر لیتا شاید اسی کے لیے کہا گیا تھا۔

تجھے سجدے سے مطلب ہے جہاں چاہے وہاں کر دے۔

اب اسے کوئی تنگ نہیں کرتا تھا۔ کوئی اس کے خلاف بات نہیں کرتا تھا۔ بڑوں نے بچوں کو سمجھا دیا۔ "تارے کو کچھ نہ کہنا۔ وہ سائیں ہے۔ اللہ کا خاص بندہ۔" جمعرات کو جب کئی جگہوں پر شیرینی' نیاز بٹتی تو کسی کے کہے سے بغیر تارے کا حصہ الگ کر دیا جاتا۔

اور تارے کو میٹھا بہت پسند تھا۔ اس روز وہ قہقہے لگاتا اور سب چٹ کر جاتا۔ اسی لیے طالب کی شادی سے وہ کھیر کا پورا کونڈا ساتھ اٹھا لایا اور اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو دو کونڈے وہیں ہضم کر لیے تھے۔

دلہن کے ساتھ آئے مٹھائی کے ٹوکرے بھی اپنے قبضے میں کر لیے۔

✲ ✲ ✲

طالب کی دلہن۔ طالب کی زندگی میں تو رونق لائی ہی تھی۔ گھر بھر کے لیے خوشی بن گئی۔ اس گھر میں عورت کے نام پر ایک بے جی ہی کا وجود تھا۔ اور لڑکوں والا گھر ہونے کی وجہ سے محلے پڑوس' عزیز رشتے

داروں کی لڑکیوں بالیوں کی آمد تقریباً" ختم ہونے کے برابر تھی اور اب یہاں مستقل ایک لڑکی جیتی جاگتی چلتی پھرتی لڑکی۔

طالب کی دلہن لمبے قد کاٹھ اور سانولے رنگ کی پرکشش لڑکی تھی۔

لمبی لٹ میں سوت کے ہم رنگ خوب بھاری بھاری پراندے ڈالتی۔ ہتھیلیاں مہندی سے رنگی سرخ۔ ناخن سرخ، مہینے والی چوڑیاں دونوں ہاتھوں میں بھری، سرے پر سونے کا ایک ایک کڑا۔ کانوں میں بہت بھاری جھمکے جن کا وزن سہارنے کے لیے سرخ دھاگے کی ڈوری بٹ کر کانوں پر چڑھا رکھی تھی اور ناک میں کوکا۔ وہ دنداسا لگا کر دانت چمکاتی تو ہونٹ بھی رنگے جاتے، جہاں سے گزرتی خوشبو سی چھوڑ جاتی، چلتی تھی تو بجتی تھی۔

نکھر جاتی تب بھی محسوس ہوتی تھی۔ دولہنا پے کی شرم اور بے جی کے لاڈ ارمانوں کے دن جلد ختم ہو گئے اور عملی زندگی کا آغاز۔

مشرقی روایتوں کے مطابق بہو سے خدمت، تابعداری کی توقعات بہت زیادہ ہوتی ہیں اور اگر سترکی دہائی چل رہی ہو اور یہ ہو پنجاب کا کوئی بہت دور افتادہ گاؤں تب تو پتھر پر لکیر ہوتا ہے کہ اب سب کچھ بہو کے کندھے پہ ہے۔

اور یہ نصیحت ہر ماں بیٹی کو رخصتی کے ساتھ ہی کر دیتی ہے کہ ساس سسر کی خدمت کرنا، وہی تمہارا اصل گھر ہے۔ جان مار کر جان کمالو گی جاؤ گی۔ سو طالب کی دلہن جس کا نام عابدہ تھا۔ چیتھے میں ہاتھ ڈالنے کے اگلے ہی دن گھر کے کاموں میں یہاں سے وہاں تک ایسے جتی جیسے ہمیشہ سے یہیں رہتی ہو اور یہ ہی سب کرتی آئی ہو۔

ابا جی کی بھتیجی تھی اور امام مسجد کی بیٹی۔ یہ بھی پہلی بار ہوا کہ جب بے جی تہجد کے لیے اٹھیں تو وہ لکڑیاں جلا کر پانی گرم کر چکی تھی۔ خود نے وضو کر لیا تھا۔ ابا جی اور بے جی کو لوٹا ہاتھ میں پکڑ کر کروا دیا، سردی سے کپکپاتے ابا جی اور بے جی جب اپنے کمرے میں گھس

رہے تھے تب لالٹین کی لرزتی روشنی کا سایہ دیوار پر پڑ رہا تھا۔ اور سائے میں عابدہ رکوع میں جھکی نظر آ رہی تھی پھر قومہ کرتی سجدے میں چلی گئی۔ دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا اور خود بھی رب کے حضور جھکنے اندر چلے گئے۔ تہجد کے بعد بے جی تسبیح پڑھتی تھیں اور ابا جی سینے پر ہاتھ باندھ کر رضائی میں بیٹھ کر سورۃ یٰسین، سورۃ الرحمٰن، سورۃ ملک اور اسی طرح کی اور چھوٹی صورتوں کی اس وقت تک زبانی تلاوت کرتے جب تک اذان کی آواز نہ سن لیتے۔ اذان کی آواز پر جب بند آنکھیں کھولتے تھے۔ تب بے جی چائے کا پیالہ آگے رکھ دیتیں۔ جلدی جلدی پیتے اور مسجد کو نکلتے۔

مگر آج چائے کا پیالہ بے جی کے بجائے عابدہ لے کر آئی۔

بے جی اور ابا جی نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہاں تو یہی اولاد کا وہ سکھ ہوتا ہے۔ جس کے قصے کیے جاتے ہیں۔ جس کے لیے اولاد مانگی جاتی ہے۔

بیٹی کا وجود گھر کی اصل رونق ہوتا ہے سن رکھا تھا۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیا۔ بے جی کی تو آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ایسی صبح بھی آ سکتی تھی زندگی میں۔ جب انہیں کوئی بستر میں بیٹھے بیٹھے چائے کا پیالہ پیش کرے۔

پیالہ ٹیبل پر رکھا اور عابدہ کا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر دونوں گالوں کو چوم لیا۔ وہ شرما گئی۔

"رب شالا جیو، تی وا وہ نہ لگے۔ اللہ اولاد کا سکھ دے مورے ست پتر۔ پر نہیں۔ اللہ پتر دے اللہ دھیاں دے، ویڑہ بھر جائے۔"

گال چومے جانے پر شرما جانے والی عابدہ سگے تائے کے سامنے اس دعا پر جیسے زمین ہی میں گڑ گئی۔ اس کے اس انداز پر تو بے جی بالکل نہال ہو گئیں۔ آگے ہو کر خود سے لپٹا لیا۔ سر پہ پورے بوسے دیے۔

شرم کی ماری تپ سی گئی تھی۔ سردی کے باوجود ہتھیلیوں سے پسینہ چھوٹتا تھا۔

"دھی نہ ہو تو...." بے جی نے پیار سے ڈپٹا۔ "تو

نے اپنے لیے چائے نکالی۔"

اس نے ہاں میں سرہلایا۔

"چل اور میری رضائی ہی میں آجا۔ چاء پی لے۔ بڑی ٹھنڈ ہے۔"

"میں اور ہی پی لوں گی بے جی۔۔۔ چولہے کے پاس بیٹھی ہوں ٹھنڈ نہیں ہے۔ پھر نماز بھی پڑھنی ہے۔"

"او ٹھیک کہہ رہی ہے عابدہ۔۔۔ نارے کی ماں، جانے دے اس کو۔" ابا جی نے پیالے کا آخری بڑا گھونٹ بھرا تو عابدہ تابعداری سے پیالہ لینے کو کھڑی ہو گئی۔

ابا جی نے پیالہ بڑھایا اور دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر بالوں پر بوسہ دے کر کمرے سے نکلے۔

بے جی پیالہ ختم کر کے جب گرم رضائی سے نکلیں، تب عابدہ فجر کی نماز ادا کر رہی تھی۔ جب بے جی نماز سے فارغ ہوئیں۔ تو عابدہ بلونی چلا رہی تھی اور پہلی نظر سے دیکھنے پر ہی اس کی مشاقی ظاہر تھی۔ دونوں ہاتھوں سے بلونی کے رسے تھامے انہیں کھینچتے ہوئے اس کا چہرہ زور لگنے سے تپ سا رہا تھا۔

رسے سے بندھی چاٹی کے اندر پڑی بڑی مدانی زور زور سے بلتی تھی۔ بے جی کے لبوں پر مسکراہٹ آن رکی۔ وہ اب بوڑھی ہو چکی تھیں۔

ان سے تو رسے کھینچے ہی نہیں جاتے تھے۔ سو لسی صحیح طرح بلوئی نہیں جاتی تب مکھن بھی کم نکلتا۔ مگر آج تو عابدہ پیڑے پہ پیڑے نکالتی ہی جاتی تھی۔ بے جی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ ایک بار پھر شرما گئی اور گرم سرخ شال جس پر سنہری تلے کا خوب کام تھا۔ ماتھے سے ذرا اور نیچے کھینچ لی۔

بے جی نے نظریں پھیر لیں۔ اب ذرا سی روشنی پھیلی تھی۔ آٹا گوندھنے کی چنگل کی پرات میں آٹا نکلا ہوا تھا۔ بے جی نے آگے ہو کر دیکھا تو آٹا بھگو چکی تھی کوئی (گوندھنا) لگانا باقی تھا۔

بے جی نے پرات پکڑ لی۔ عابدہ بری طرح چونکی۔

"میں کرلوں گی بے جی، آٹا مل کے رکھ دو تو پھر اچھا گندھتا ہے۔" وہ معذرت کر رہی تھی۔ "ہم ایسے ہی گوندھتے ہیں گھر میں۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ بالکل ٹھیک۔ میں گوندھ رہی ہوں تو اپنا کام کر۔۔۔ طالب اٹھ گیا؟"

عابدہ نے ہلکا سا ہاں کا اشارہ کیا "مسجد گئے ہیں۔"

"اچھا اچھا!" بے جی نے چوکی سنبھالی۔

"میں کرلیتی ہے بے جی۔۔۔ لسی تیار ہو گئی ہے۔" وہ شرمسار سی ہو گئی تھی۔

"بالکل تو کر لیتی ہو گی پتا ہے اور تو نے ہی کرنا ہے۔ گھر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے کیسے بیٹھوں۔ آٹھ سال کی عمر سے صبح اٹھ کر آٹا گوندھنے کی عادت ہے۔ بیمار رہتی تھیں میری ماں جی بس وہ دن اور آج کا دن۔۔۔"

بے جی اداس ہوئیں پھر لسی سے نکلے مکھن کو دیکھ کر ہلکا سا ہنس دیں۔

"اتنا مکھن تو میں تین دن میں نہیں نکال سکتی جتنا تو نے آج نکال لیا۔ سب رج کے کھائیں گے۔ خاص طور پر نارے اور یہ دیکھ نام لیا اور میرا نارے آ گیا۔"

بے جی کے لہجے میں شہد گھل گیا۔

"اٹھ گیا میرا پتر۔ اور یہ سوئٹر کیوں اتار دیا۔ ٹھنڈ لگ جائے گی میرے نارے نوں۔"

مگر نارے کچھ سن نہیں رہا تھا۔ وہ تو صرف سراغ لگانا چاہ رہا تھا۔ بلونی کی ردھم آواز کے بیچ یہ چھن چھن کس چیز کی تھی۔ عابدہ نے آخری بار رسوں کو کھینچا۔ لسی تیار ہو چکی تھی۔ تب ہی نارے کو پتا لگا۔ یہ چوڑیوں سے پیدا ہونے والی آواز ہے۔ وہ ذرا جھجکی نگاہ سے عابدہ کو دیکھتا تھا۔ دراصل اسے عابدہ سے شرم آتی تھی۔

عابدہ کھڑی ہوئی تو پراندہ بل کھا گیا۔ گھٹنوں کو چھوتے پراندے میں ان گنت گھنگھرو لگے تھے۔ نارے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اتنے دن سے تو بھابھی کمرے کے اندر رہی ہوئی تھی اور آج باہر تھی۔ نارے اسے یوں دیکھتا تھا جیسے یہ مخلوق زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے۔

"آتیرا منہ دھلا دوں۔ بھک نہیں لگی... دیکھ آج سج کے مکھن کھانا' بھرجائی نے دل سے نکالا ہے۔"

بے جی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تارے معمول کی طرح اٹھا۔ بے جی نے منہ ہاتھ دھلوایا' تولیے سے خشک کیا۔ شلوار کو اوپر کر کے ذرا سا تنگ دیا۔ پھر لاڈلے کو سوئٹر بھی پہنایا۔ ٹوپا پہننا تارے کو پسند نہیں تھا۔

اب دن چڑھ آیا تھا۔ ابا جی' بے جی' طالب' طارق اور تارے چولہے کے قریب دائرہ بنائے بیٹھے تھے۔ عابدہ رخ موڑے دوپٹے سے چہرہ مقدور بھر چھپائے پراٹھے بنا رہی تھی۔ اور مصیبت میں گرفتار تھی۔ نال نال پراٹھے بنانا تو بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ ایک طرف بزرگوں کی شرم۔ شوخ دیور طارق جو طانب کی چوری پکڑ کر ٹھکھورا مارتا (کھکھنارتا) اور طالب جو بیوی کو میٹھی نظروں سے دیکھتا تھا۔ (بظاہر سب سے نچو تعشق) اور ان سب سے پرے تارے۔ جس پر بھرجائی آج جیسے کسی انکشاف کی طرح کھلی تھی۔

وہ پراٹھوں اور مکھن کی جانب دیکھے بنا بس اندازے سے نوالے منہ میں بھرتا تھا اور ٹکٹکی باندھ کر عابدہ کو تکتا تھا۔ کبھی کان کا جھمکا... کبھی ذرا سی نظر آتی مدہم ہوتی مہندی والی ایڑی... اور ہاتھ جو سرخ تھے۔ تارے نے اپنے ہاتھ سامنے پھیلا کر دیکھے۔ نری سفید ہتھیلیاں۔ تو عابدہ کی لال کیوں؟

☼ ☼ ☼

طالب چھٹی ختم ہونے پر واپس چلا گیا۔ طارق اب شہر جاتا تھا۔ کالج کا پہلا سال... ابا جی' بے جی' عابدہ اور تارے... چار افراد کا گھر' طارق صبح منہ اندھیرے نکلتا تھا اور شام چار بجے کے قریب واپس آتا تھا۔ پہلے آرام اور رات کو پڑھائی۔

بے جی کے گھر اب آنے جانے والیوں کی رونق رہتی تھی۔ بے جی کی بہو جو اتنی ہر فن مولا تھی۔ چھوٹی بچیوں کو قرآن پڑھاتی' ذرا بڑیوں کو حساب کے سوال سمجھا دیتی' اردو بھی پڑھا دیتی۔ کئی لڑکیاں سوئٹر کے نمونے سیکھنے آتیں۔ کچھ سلائی اور کڑھائی' عابدہ کو اڈا لگا کر بھاری گوٹے دبکے کا کام بھی آتا تھا۔ اخلاق کی بھی اچھی تھی۔ با اصول' صاف گو... مہمان نواز... غرض لوگ بے جی پر رشک کرتے تھے۔

اور بے فکر ہو کر اپنی بیٹیاں' بہوئیں بھیج دیتے۔ کہ گھر میں تھا ہی کون' طارق پڑھنے کے لیے باہر۔ طالب چھٹی پر جب آئے تب آئے اور تارے تو اللہ لوک تھا۔ کبھی مسجد... کبھی کنوئیں پر' کبھی ریلوے ٹریک پر ریل کے انتظار میں گھنٹوں کھڑا رہتا کہ مسافروں کو دیکھ کر ہاتھ ہلا سکے۔

یا پھر اب گھر میں بھی تارے کا دل لگتا تھا۔ اسے کام کرتی عابدہ کو دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ مگر نگاہوں میں الجھا سا ہوتا۔ دلہناپے کی شرماہٹ اور جھجک کے بعد اب جب عابدہ پوری طرح ایک گھر گرہستی والی عورت تھی۔ اسے اپنا یہ بایا زاد اور جیٹھ بے ضرر لگتا۔ وہ اس پر ترس کھاتی تھی۔ رحم کرتی تھی۔ اس نیت سے کہ اللہ خوش ہو گا اور ثواب ملے گا اور پھر اس کا فرض بھی تو ہے کہ وہ گھر کے ہر فرد کا خیال رکھے۔

تارے کی خوراک غیر معمولی حد تک زیادہ تھی۔ وہ ناشتے میں پانچ یا سات پراٹھے کھا جاتا۔ لسی کا پورا جگ' مکھن کے پیڑے... اور بارہ بجے ہی تندور کے گرد چکر لگانے لگتا۔ عابدہ پرات سر پر اٹھا کر تندور والے چبوترے پر چڑھ آتی۔ تارے بھوک کی بے کلی سے للچائی نگاہوں سے مگر صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیڑھی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا۔

اور روٹی بننے کے ایک ایک مرحلے کو دیکھتا پھر جیسے ہی عابدہ چمٹے سے روٹی باہر نکالتی' تارے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہوتا۔ وہ گرم گرم روٹی کو جھپٹ لیتا پھر ہاتھ جلنے پر اسے اپنے کرتے میں لپیٹ لیتا۔ چٹکی سے پکڑ کر لہراتا اور منہ سے دھواں نکالتے ہوئے تین چار نوالوں میں روٹی ختم... پر تب تک دوسری اور تیسری بھی آ جاتی۔ تین روٹیاں اس طرح کھانے کے بعد... عابدہ چار پانچ مزید روٹیوں کو سلیقے سے دسترخوان میں

لپیٹ کر ایک بڑی پلیٹ میں سالن نکال دیتی۔ پانی کا پورا جگ۔۔۔ نارے سیر ہو کر کھاتا، ہاں رات کو وہ تین یا کبھی چار روٹیوں پر ہی اکتفا کر لیتا تھا۔

عابدہ کا دوسرا کام نارے کے کپڑے دھونا تھا۔ شروع میں بے جی نے اس کام سے اسے منع کیا۔ وہ بنیادی طور پر نارے کے زیادہ تر کام خود ہی کرتی تھیں۔ مگر عابدہ نے دیکھا کہ وہ بوڑھی ہیں اور نارے کے کپڑے بہت گندے ہوتے ہیں۔ اب بے جی کے اندر جوانوں جیسی جان تو نہیں تھی ناں کہ تھاپے سے چوٹ مار مار کے میل نکالیں۔ دھبے دور کریں اور چھنک چھنک کر رسیاں بھرتی جائیں۔

کپڑوں میں میل کی بھی قسمیں تھیں۔ سب سے پہلے تو یوں لگتا جیسے مٹی میں لوٹنیاں لگائی گئی ہوں۔ پھر صبح ناشتے میں گھی اور مکھن والے ہاتھ اور منہ دامن سے ہی پونچھا جاتا۔ دوپہر کو سالن کے ڈھیروں نشانات' اکثر گریبان سنا ہوا ہوتا۔

اور بے جی یہ برداشت تو کر ہی نہیں سکتی تھیں کہ ان کا نارے گندا لگے فوراً" کپڑے بدلواتیں۔ وہ آج بھی نارے کو بچپن ہی کے چاؤ سے تیار کرتی تھیں۔ تیل' سرمہ' پاؤڈر۔۔۔

عابدہ کپڑے دھو کر رسیاں بھر دیتی۔ دو جوڑے سسر کے۔۔۔ دو دیور کے۔۔۔ بے جی اکثر اپنے کپڑے نہاتے وقت دھو کر ہی نکلتی تھیں۔ سو چار جوڑے نارے کے اور دو ہی اپنے۔۔۔

یہاں نئی کہانی شروع ہوئی۔ نارے کو دھلے کپڑوں میں خصوصی دلچسپی پیدا ہو گئی اور وہ بھی عابدہ کے کپڑے' جو شوخ رنگوں کے گوٹے لشکیے سے سجے ہوتے۔ نارے موقع کا انتظار کرتا اور کبھی سرخ دوپٹا لپیٹ کر بیٹھ جاتا۔

کبھی گلابی۔۔۔ سلور کڑھائی والے کو گلے میں ڈال کر خوش ہوتا۔

کھلے رنگ والا تو پسندیدہ ترین تھا۔ گلے میں ڈالا اور ایک رقص مجذوب شروع ہو جاتا۔ کبھی دھلے پراندے کو کلائی میں اٹکا لیتا اور آگے ڈال کر گھنگھرو سے کھیلتا۔ پہلے تو عابدہ سے چھپ کر یہ کام ہوتا پھر ہمت بڑھی تو سامنے کرنے لگا۔ عابدہ نرمی سے چیز واپس لے لیتی تو اداس ہو کر دے دیتا پھر نیا طریقہ سوچتا چیز لے کر باہر کو بھاگ جاتا۔

بے جی کو بڑی شرم آئی بہو کا شگنوں والا دوپٹا بعد میں مٹی میں رلتا ملا' سو وہ خود نگران بن جاتیں ابا جی نے بھی نارے کو سمجھایا بے جی نے بھی۔۔۔

دنیا کا خیال تھا بہو کے آنے سے نارے کی اہمیت کم ہو گی یا پھر اس کی مٹی پلیت ہو جائے گی۔ مگر ایسا تو کچھ نہ ہوا۔ عابدہ ملی تو نہیں تھی' نارے سے دس بارہ برس چھوٹی ہی ہو گی۔ مگر وہ نارے پر ممتا لٹانے لگی۔

نارے بھی اس سے اشارہ کر کے ہاتھ کی چینی چوڑی مانگ لیتا اور مل جانے پر اتنا خوش ہوتا کہ کیا کہنے۔۔۔ بجا بجا کر گلیوں میں بھاگتا۔

اب جب عابدہ کو میکے جانا ہوتا تو نارے بیچ گلی میں بیٹھ کر رونا ڈال دیتا۔ طالب کی غیر موجودگی کے باعث اگر میکے جانا ضروری ہو جاتا تو ابا جی ہی بہو کو لے کر جاتے تھے۔ نارے کو بھی ساتھ پکڑ لیتے۔ زندگی بھر اپنے گھر اور گاؤں میں رہنے والا نارے نئی جگہ پر بڑا خوش ہوتا۔

جہاں عابدہ کا نارے سے رویہ بالکل الگ تھا وہیں طارق سے مختلف۔ امام مسجد کی بیٹی تھی۔ پڑھی لکھی اور سمجھ دار۔۔۔ خیال تو اتنا ہی رکھتی مگر زیادہ بے تکلفی نہیں تھی۔ ضرورتاً" بات کرتی۔ وہ بھی بڑے سلجھے انداز سے۔۔۔ طارق جو شروع میں بے تکلفی اور شوخی دکھاتا تھا' وہ بھی آہستہ آہستہ ویسا ہی برتاؤ کرنے لگا' جیسے کہ چاہیے تھا۔ عزت احترام۔

سب رشک کرتے تھے' بے جی کا گھرانہ کیسے چین و سکون کی بنسی بجاتا ہے۔ پھر خیر سے عابدہ کے گھر خوش خبری ملی۔ بے جی کو خود بڑی دعاؤں کے بعد اولاد نصیب ہوئی تھی۔ سات سال کا طویل انتظار۔۔۔ اور یہاں یہ

خوش خبری شادی کے گیارہویں ماہ میں ملی کہ وہ دادی

بننوائی ہیں۔

پرانے زمانے کی جفاکش عورتیں (شہری یا دیہاتی دونوں) اپنی روٹین سے ذرہ بھر بھی پیچھے نہ سرکتی تھیں۔

مگر عابدہ کے ساتھ عجیب صورت حال ہوگئی۔ وہ سخت بدحال رہتی' کوئی چیز معدے میں ٹکتی نہیں۔ چکرائی رہتی' گھبرائی رہتی۔ شروع کے چار ماہ سخت مشکل میں گزرے۔ بے جی نے روٹی لگانے' کپڑے دھونے کے لیے گاؤں کے کمیوں کے گھر سے عورت بلالی۔

تارے نے بے جی سے پوچھا "عابا نہیں (عابدہ نہیں ہے' کہاں ہے)" بے جی بتاتیں تپ چڑھا ہے اسے تنگ نہ کریں۔ تارے مان جاتا۔ کبھی چھپ کر کمرے میں جھانکتا وہ اوندھی سیدھی پڑی ہوتی۔ سوتی جاگتی۔

ان دنوں میں تارے بہت چڑچڑا ہوگیا۔ اس نے خوراک بھی کم کردی۔ کبھی کبھی تو گھر بھی نہ آتا۔ مسجد ہی میں پڑجاتا۔

☆ ☆ ☆

عابدہ نے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ ایک صحت مند' تندرست و توانا مکمل بیٹا۔ خوشی اور شکر کی انتہا۔

ننھا شجاع ہر ایک کے ہاتھ کا کھلونا تھا۔ مگر تارے کا دل تو بچے کے لیے ہمکتا تھا۔ وہ بس اسے گود میں بھر کے بیٹھا رہنا چاہتا تھا۔ مگر عابدہ سے ڈرتا تھا۔

عابدہ کو اس چیز کا اندازہ بعد ہوا کہ تارے چپکے چپکے بچے کو دیکھتا ہے اور کبھی ڈرے ڈرے جھجکے انداز میں چھوتا بھی ہے۔ مگر اٹھانے سے ڈرتا ہے' پھر عابدہ نے جانچا کہ تارے عابدہ کے سامنے بلکہ دراصل عابدہ کے ڈر سے بچے کو اٹھا نہیں پاتا۔ اس نے خود سے ایک دن آگے بڑھ کر بچے کو تارے کی گود میں ڈال دیا۔ تارے پہلے خوف زدہ ہوا پھر حیران اور پھر دیوانہ وار بچے کو چومنے لگا۔ بے جی گھبرائیں' "بچے کو نقصان نہ پہنچادے۔"

عابدہ نے بے فکری سے نفی میں گردن ہلا کر تسلی دی "کچھ نہیں ہوگا۔"

اور پھر یہ تارے کی نئی زندگی کا آغاز تھا۔

گلیوں' کھیتوں' ویرانوں میں یونہی اکیلا بھاگنے والا تارے اب گھر میں رہتا تھا۔ ننھے شجاع کو لیے۔ چوکڑی مار کے بیٹھ جاتا۔ اسے سینے سے لگا کر اللہ اللہ کہتے سلا دیتا۔ وہ جتنی دیر سوتا یہ پنکھا جھلے جاتا مکھی نہ آئے گرمی نہ لگے۔

کبھی چارپائی سے کس کے جھولا باندھ دیتا۔ بچہ سب کی آنکھ کا تارا تھا۔ مگر یہ تارا آسمان کا تارا ہی لگنے لگا کہ کسی کے ہاتھ ہی نہ آتا۔ تارے کے لاڈ ختم ہوتے تو کسی اور کی باری آتی ناں۔ اور شروع میں ذرا جھجکنے والا تارے اب باقاعدہ حق' دھونس اور ہٹ دھرمی سے بچے کو خود میں بھینچتے ہوئے صاف انکار کردیتا کہ نہیں دے گا۔ ہاں عابدہ سے ذرا ڈر جاتا۔

عابدہ کہتی "دودھ پیے گا دے دو اسے مجھے۔" اور بچہ تھوڑی دیر بعد بھوکا ہوتا تھا۔ تارے سخت بدمزہ ہو کر عابدہ کے حوالے کرتا۔

عابدہ اپنے کمرے میں لے جا کر باقاعدہ کنڈی چڑھا کر دودھ دیتی۔ اس دوران تارے کھڑکی کے نزدیک ہو جاتا۔ عابدہ پشت کیے دودھ پلا رہی ہوتی پھر وہ کاروائی۔ اکثر بچہ سیر ہوتے ہی گہری نیند سو جاتا' عابدہ دروازہ بھیڑتی باہر آتی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کے پُراسرار انداز میں خاموش رہنے کی تلقین کرتی۔ تارے کا چہرہ اتر جاتا۔ ڈھے جاتا۔ دیوار سے ٹیک لگا لیتا۔ یہاں تک کہ شجاع کے رونے کی آواز آئے اور وہ اسے فوراً اٹھا لے۔

بے جی شجاع کے حوالے سے بڑے تحفظات کا شکار رہتیں کہ دل کے کسی گوشے میں ایک وہم سانس لیتا تھا۔ کہیں خدانخواستہ وہ بھی۔ ہائے اللہ نہ کرے۔

دوسرا بڑا وہم یہ تھا کہ اسے کسی بدنظر' بدبخت کی نظر نہ لگ جائے۔ غیر محسوس طریقے سے وہ اسے آنے جانے والوں سے چھپائے رکھتیں۔ عابدہ کو آنکھ کا اشارہ کردیتیں بچے کو لے کر ادھر ادھر ہو جائے۔

(انہیں عابدہ کو بھی نظر نہ لگ جائے کا اندیشہ ستاتا تھا۔)

مگر اب کچھ دن سے تارے بچے کو گھر سے باہر لگے دھریک کے نیچے لے کر بیٹھنے لگا تھا۔ باہر نکلنے والے معاملے سے سب گھبراتے تھے۔ تارے کے ہاتھ سے بچے کو لیتا تو خیر ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن اگر تارے خود ہی بے خیالی میں کوئی نقصان پہنچا دے یا کہیں لے کر ادھر ادھر نکل جائے۔ لہٰذا ادھر تارے دو ماہ کے شجاع کو لے کر باہر نکلتا ادھر بے جی کے پیروں سے بھی پہیے بندھ جاتے۔

☼ ☼ ☼

بل بل کر جانفشانی سے آٹا گوندھتی عابدہ ٹھٹک کر رک گئی۔ یہ شجاع کے رونے کی آواز تھی۔ عابدہ کو دھیان آیا شجاع بہت دیر سے بھوکا ہے۔ وہ تیزی سے آٹے پر مکے مارنے لگی۔ وہ تارے کی گود میں تھا۔ تارے اسے بھلا ہی لیتا تارے کی تانیں اندر تک آ رہی تھیں۔

"اللہ کاکا! سو جا۔ میرا کاکا۔ آ آ آ۔ سو سو سو۔"

مگر بھوکے کو لوری کیا دیتی تارے کی تان۔ پھر خاموشی اور اب کی بار جب شجاع رویا تو آواز میں شدت، بے تابی، جھنجلاہٹ اور احتجاج تھا اور رونے میں شدید تڑپ تھی۔ آٹے کی تہہ بٹھاتی عابدہ کا دل دفعتاً پتے کی طرح لرزا۔ شجاع کی آواز غیر فطری سی تھی۔

"نی عابدہ۔ کاکے نوں دیکھ لے۔ کیوں رونا ہے۔ دیکھ کسی کیڑے پتنگے نے نہ کٹ لیا ہو۔"

غسل خانے میں نہاتی بے جی کا سارا دھیان بھی آواز پر تھا۔ عابدہ آٹا چھوڑ سر پر دوپٹہ نکاتی بھاگی۔ باہر دھریک کے نیچے پہنچی پر تارے کی پشت تھی اور شجاع اس کی گود میں رو رہا تھا۔ عابدہ کو اس کے احتجاج "ہلتے پیر نظر آ رہے تھے اور تارے کسی جدوجہد میں تھا۔

اس کی چال اور آنکھوں میں ہرنی کی سی تیزی اور وحشت اتری۔ وہ ہرنی جس کا نوزائیدہ۔ شیر نے جبڑوں میں کس رکھا ہو۔

وہ تارے کے سر پر پہنچی تھی۔ شجاع کے رونے میں شدت اور احتجاج تھا، وہ سر بھی پیخ رہا تھا۔ مگر تارے کے عین سامنے آ کر عابدہ رک گئی، بعض دفعہ زمین مقناطیس ہو جاتی ہے۔ جکڑ لیتی ہے۔

اور عابدہ جکڑی گئی تھی۔ وہ پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تڑپ تڑپ کر روتا اس کا بیٹا شجاع۔ اور تارے۔ تارے نے اپنا کرتا سینے سے اٹھا رکھا تھا۔ وہ دراصل پوری تندہی اور ذمہ داری سے شجاع کو دودھ پلانا چاہ رہا تھا۔

کہ وہ دودھ بھی اگر عابدہ ہی کی طرح خود ہی پلائے تو عابدہ کی اس محتاجی سے بھی جان چھوٹے۔ پہلے وہ کاکے کو دودھ پلاتی ہے۔ پھر سلا دیتی ہے اور اسے کمرے سے نکال دیتی ہے اور وہ گھنٹوں انتظار کرتا ہے۔ لہٰذا وہ آج سے کاکے کو خود ہی دودھ پلائے گا۔

تارے کے چہرے پر فکر مندی تھی۔ عابدہ تو جب دودھ پلاتی ہے کاکا چپ ہو جاتا ہے مگر ادھر تو وہ مزید تڑپ تڑپ کر رو رہا تھا۔

"اللہ کاکا سو جا۔ اللہ سوہنا۔ آ۔" تارے نے بہت بے بسی سے عابدہ کو دیکھ لیا کاکا بھی رو رو کر تھک گیا تھا جیسے اب وہ ہونے سے سسک رہا تھا۔ تارے کو لگا اب وہ چپ کر گیا ہے۔

اس نے عابدہ کو دیکھا اور کاکے کو۔ پھر بالکل عابدہ کے سے محتاط انداز سے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کے آنکھیں موند کر دکھایا۔

کہ اب کچھ نہ بولے "کاکا سو رہا ہے۔" مگر کاکا تو ایک بار پھر رو رہا تھا۔ ایک تو بھوکا۔ دوسرا نیند سے بے حال۔

عابدہ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مگر تارے کا بچہ دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"کاکا بھوکا ہے تارے!" عابدہ کا دل پگھل چکا تھا۔ یہ محبت اور لگاؤ کا کیسا روپ تھا، یہ کیسا بھول پن تھا۔

یہ کم عقلی تھی۔ یہ کیا تھا۔ چھوٹے سر والا بڑا آدمی...

اس کے دل میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

وہ تارے کو لپٹا کر دھاڑیں مار مار کے رونا چاہتی تھی،

اس کا منہ سر چومنا چاہتی تھی۔ وہ کیا کیا نہ سوچ کر آئی تھی۔ ایک سے ایک بدخیال۔۔۔ اور اب خالی الذہن۔۔۔ یا اللہ تو کیسے رنگ دکھاتا ہے اور کیسے ڈھنگ بتاتا ہے۔

کچھ کو عقلوں والا بناتا ہے اتنا کہ چاند پر پہنچ جاتے ہیں اور کچھ کو بے عقلا مگر ایسے کہ وہ زمین پر چاند کی طرح دمکتے ہیں اور سورج بھی ان کے آگے شرماتا ہے۔ ایسا چاند جو کبھی بدلی کی اوٹ میں نہیں جاتا۔

"اے اللہ۔۔۔ تو ایسے لوگ بناتا ہے۔ اور پھر انہیں ایسے دل دیتا ہے۔

تو پھر ایسے کمال اللہ ہی کرتا ہے۔

دنیا کو لگتا تھا اللہ نے تارے کو کچھ نہیں دیا تھا۔

اللہ نے تارے کو محبت دی تھی۔ جو عابدہ کو نظر آرہی تھی۔ محبت سے بڑھ کر بھی کچھ ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼
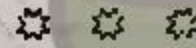
یہ 71 کی جنگ کے بعد کا زمانہ تھا۔ فوجی جوانوں کو چھٹی بڑی مشکل سے مل رہی تھی۔ طالب نے ابھی تک بیٹے کو دیکھا نہ تھا۔ وہ بڑی مشکل سے دس دن کی چھٹی پر آیا۔ تین ماہ کا گل گوتھنا شجاع۔۔۔ اس نے بے جی سے پیار لیا۔ اباجی کے گلے ملا اور تیزی سے شجاع کو عابدہ کی گود سے اچک لیا۔

ایک تحیر کے عالم میں وہ بیٹے کو تکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر ننھی سی ناک کو چھو کر دیکھتا تھا۔ پھر اس نے ایک دیوانے کی طرح اس کے منہ سر کو چومنا شروع کر دیا۔ اتنا پیارا۔۔۔ اس کا بیٹا۔۔۔ بھئی واہ! مزہ آگیا۔

اس کے اس انداز پر بے جی اور اباجی شفقت سے مسکرا رہے تھے اور عابدہ کو اتنی شرم آرہی تھی کہ حد نہیں۔۔۔

عابدہ نے فوجی صاحب کے لیے کرسی میز پر کھانا چن دیا۔ بے جی قریبی چارپائی پر بیٹھ کر پنکھی جھلتی تھیں۔ ملک کی موجودہ صورت حال، جنگی قیدیوں کی واپسی۔ بنگلہ دیش، انڈیا اور امریکہ کی چالیں۔ موضوع گفتگو تھیں۔ اباجی اور طارق فکر مندی سے

سن رہے تھے۔ بیچ میں بے جی کی تاسف سے بھرپور آہیں ماحول کو اور افسردہ کر دیتیں۔ عابدہ چولہے پر چائے رکھے بڑے غور سے سن رہی تھی۔ آنکھوں میں چمک اور ہنسی تھی۔ خوشی و فخر کے گہرے رنگ۔۔۔

طالب نے کبھی ہونے والے بچے کے حوالے سے خاص بات چیت نہیں کی تھی۔ ہاں بچے کی پیدائش سے پہلے خط لکھا تھا اگر بیٹا ہو تو اس کا نام شجاع رکھا جائے کہ شجاع وہ دوست تھا۔ جو جنگی قیدی بنا اور پھر دوران قید ہی فوت ہو گیا۔

اور اب یہ والہانہ پن سب کے لیے حیرت آمیز خوشی تھا، وہ سب کے منع کرنے کے باوجود کھانا کھاتے ہوئے بھی شجاع کو رانوں پر ڈالے ہوئے تھا۔ اس سارے منظر سے پرے تارے بالکل دور۔۔۔ زمین پر ٹانگیں لمبی پھیلا کر بیٹھا تھا اور دکھی، پیاسی نگاہوں سے شجاع کو دیکھتا تھا اور کینہ توز نظروں سے طالب کو۔۔۔ اور اس کے دیکھنے پر اس وقت کسی کا دھیان نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"شرافت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔" تارے نے یقیناً یہی سوچ کر اسٹیل کا جگ پوری طاقت سے طالب کے سر پر مارنا چاہا تھا۔ وہ تو بے جی کی بروقت چیخ نے طالب کو رخ بدلنے پر مجبور کر دیا اور جگ بس شانے کو چھو پایا (پھر بھی اچھی سی لگ گئی) طالب کو اس اچانک حملے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ ہاں یہ ہوا کہ تارے نے جگ کو دور پھینک دینے کے بعد شجاع کو طالب کی گود سے جھپٹ لیا اور بڑی جتاتی نگاہوں سے عابدہ، بے جی اور طالب کو دیکھا۔ بچے کو شانے سے لگا کر سب سے دور جا کر بیٹھ گیا۔ طالب نے پریشانی سے بے جی اور عابدہ کو دیکھا۔ مگر وہاں موجود بے فکری اور سکون نے اسے بھی پرسکون کر دیا۔

اور پھر اس وقت اور بعد کے سات دن میں اس نے بخوبی جان لیا کہ تارے کے لیے کاکا کیا ہے۔ محبت ہے، زندگی ہے، خوشی ہے، اعتماد ہے۔ کاکا۔۔۔ تارے کا

سب پتہ ہے۔

اور شجاع کی کھینچ تانی کے اس مرحلے پر طالب کو پسپا ہونا پڑا۔ اس کے پاس محبت جتانے کے لیے صرف دس دن تھے۔ اور تارے کا یہ حال تھا کہ وہ دس منٹوں کے لیے بھی کاکے کو کم از کم طالب کی گود میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ ان دس دنوں میں وہ اور زیادہ جنونی ہوا تھا جیسے۔۔ اور یہاں طالب نے ہوش مند انسان ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اسے خوشی ہوئی تھی۔ اس کے دیوانے 'بھائی' کی زندگی میں ایک مقصد در آیا ہے۔ کاکے کو ہنسانا 'اٹھانا' کھلانا اپنے سارے مشغلے چھوڑ دیے تھے (آوارہ پھرنا کتوں کو پتھر مار کے یا ان کے پیچھے بھاگنا۔۔ یا ان کو ماؤں بہنوں کی گالیاں دیتے ہوئے آخر میں درخت پر چڑھ جانا۔ دور دور نکل جانا بند، کی بھینس کا دودھ نکال کر پی جانا اور دو دیرے بڑے کام۔ تارے کے پاس کوئی مشاغل کی کمی تھی۔

سو یہ ایک خوش آئند تبدیلی تھی۔

اور اس دن بھی تارے دھوپ میں چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔ سر تپ رہا تھا۔ کنپٹیوں سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ مگر وہ ہلنے کو تیار نہ تھا۔ بس یہیں بیٹھا رہے گا۔ اس کی نگاہیں مسلسل عابدہ کے کمرے کی جانب تھیں، اندر آتی جاتی عابدہ اور تیار ہوتا طالب اور بے جی کی گود میں شجاع۔۔

عابدہ اور طالب۔۔ عابدہ کے میکے جا رہے تھے اور ظاہر ہے شجاع نے ساتھ ہی جانا تھا۔ عابدہ بڑا پیارا تیار تھی۔ طالب نے بھی سفید کرتا شلوار زیب تن کیا۔

عابدہ کے مہندی سے سرخ ہاتھ گوٹے لشکے والا جوڑا ڈنداسہ اور پراندے کے گھنگھرو۔۔ مگر تارے کو ان سب میں قطعاً" دلچسپی نہیں تھی اس کی دلچسپی شجاع میں تھی۔۔۔ جسے بے جی نے دینے سے منع کر دیا تھا۔

اور بے جی کا لاڈلا تارے بے جی کے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے قطعیت کو بھانپنے کے بعد اب سچا گمّا بیٹھا تھا۔ بے جی قصداً" نظر انداز کر رہی تھیں۔

اباجی نے مٹھائی کا ٹوکرا لا کر دیا۔ بہو پہلی بار بچے کے ساتھ جا رہی تھی۔ تارے کی ناراضی کا عالم یہ کہ اس نے مٹھائی تک کو نہ دیکھا ورنہ تارے اور مٹھائی نہ کھائے۔

اور اسی چیز نے طالب کو متوجہ کیا۔ پھر تو اس نے تارے کا بغور جائزہ لیا اور آخر وہ بھائی تھا 'تاڑ' گیا۔ کیسے نہ جانتا یہ ناراضی ہے۔ بے جی سے پوچھا تو انہوں نے لاپروائی سے "اللہ جانے" کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی۔

مگر طالب نے تارے کو آنسو پونچھتے دیکھا اور وہ تو نجانے کب سے رو رہا تھا۔ سرخ 'بے بس' بے قرار شکوہ کناں نگاہیں۔۔ قریب آ کر شفقت محبت سے پوچھنا چاہا تو تارے نے ہاتھ جھٹک دیا۔ طالب سے اینٹ کتے کا بیر والی مثال شروع دن کی تھی۔

طالب خود ہی سوال جواب کرنے لگا۔

"مٹھائی کھانی ہے؟ بے جی نے کچھ کہا؟ میری گھڑی لینی ہے (اتار دی۔۔ تارے نے وہ ماری) کیا چاہیے۔۔ کیا ہوا؟" تارے چپ۔

"بے جی! آپ ہی بتا دیں۔" طالب ہار کے بے جی کے پاس آیا۔ اس کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ تارے میلے کرتے کے دامن سے آنسو صاف کرتا تھا۔

بے جی نے جواب نہیں دینا تھا مگر طالب کے اصرار پر غصیلے انداز سے۔

"کیا ہونا ہے تمہارے جانے سے ناراض ہے۔"

"ہیں جی۔۔!" طالب چونکا "ہم نہیں جاتے بے جی!"

"پاگل ہو گیا ہے۔ جانا لازمی ہے۔"

"تارے کو روتا چھوڑ جاؤں؟" طالب کا دل نہ مانا۔

"آپی چپ کر جائے گا۔" بے جی نے باقاعدہ منہ موڑ رکھا تھا۔

"ایسے کیسے؟" طالب کی سوئی اٹک گئی تھی۔

"او عابدہ پتر! جلدی کرے گڈی نکل جائے گی پھر۔"

اباجی بیوی کے مددگار بنے۔ عابدہ بیگ ہاتھ میں لیے تیار سامنے آ کھڑی ہوئی۔ طالب نے بیگ پکڑ لیا۔ عابدہ نے بے جی کی گود سے شجاع کو لے لیا اور دعا لینے کے

لیے سر جھکا دیا۔

"اللہ خیری جاؤ۔ سب کو سلام دعا۔۔۔ تے اپنی نانی نوں میرا بوہتا بوہتا سلام تے نال لے۔"

دونوں تابعداری سے سلاموں کی تفصیل سننے لگے۔ طالب کا دھیان بار بار تارے پر جاتا۔ جواب باقاعدہ بھول بھال کر کے رونے لگا تھا۔ اس کی شکوہ کناں نگاہیں۔ بے جی، ابا جی اور عابدہ پر تھیں۔

طالب اور عابدہ اس کی منجی کے پاس سے گزرے۔ تب ہی تارے نے طالب کا ہاتھ جکڑ لیا۔ طالب نے اچنبھے سے دیکھا۔ تارے روئی آنکھیں اٹھا کر۔

"تارے نال جانا۔" طالب کی آنکھیں حیرت سے چھلیں۔ اتنی سی بات۔۔۔ اس نے سب کو دیکھا۔ پھر تارے کے شانے پر ہاتھ رکھا "بالکل تارے نال جانا۔۔۔ بالکل جانا۔" تارے کا چہرہ کھل اٹھا۔

بے جی اور ابا جی متامل تھے۔

"او جب میں جاتا ہوں تو ساتھ ہی لے کر جاتا ہوں۔ مگر تیرے سے یہ سنبھلے گا نہیں اور عابدہ کو بھی اب کا سنبھالنا ہوتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں ابا جی۔۔۔ وہاں اتنے لوگ ہیں، تارے خوش ہوگا۔"

"تم بیٹھو۔۔۔ میں تارے کو خود تیار کرتا ہوں۔"

طالب نے بیگ رکھ دیا۔ عابدہ نے خوش دلی سے سر ہلا دیا۔

طالب نے خود سے تارے کا منہ دھلوایا۔ پھر بوسکی کا کرتا سفید شلوار دھلی بنیان۔۔۔ عابدہ نے اتنی دیر میں ایک بیگ تارے کے کپڑوں کا تیار کر لیا۔ (تارے ایک دن میں تین سوٹ تو بدلتا تھا ہی)

اور تارے اچانک ہی طالب کا بھائی بن گیا۔ فرماں بردار جو کہے وہ مانے۔ شلوار بنیان۔۔۔ طالب نے جھک کر جوتے پہنائے۔ تارے نے پاؤڈر لگانے کے لیے بازو سر سے اوپر اٹھا دیے۔ طالب کو ہنسی آگئی۔ تارے نے سرما بھی لگوایا۔

عابدہ بوسکی کے کرتے پر کوئلے کی استری پھیرلائی۔ تارے کی خوشی کا عالم ہی کیا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر طالب چلا گیا وہی پرانی ڈگر لوٹ آئی۔ مگر نیا پن یہ تھا کہ عابدہ ایک بار پھر امید سے تھی۔ وہی حال سے بے حال۔۔۔ مگر اب ایک بچہ بھی تھا۔ اس کی کل ذمہ داری۔۔۔ مگر یہاں تارے کام آیا۔ اسے بس کاکے کی فکر رہتی۔

وہ پیشاب پاخانہ کر دیتا تو تارے بڑی سلیقہ مندی سے اسے دھلا دیتا، کپڑے بھی بدل دیتا، کمر پر لگائے گھومتا رہتا۔ ایک دن نہلا ہی دیتا۔ بچے کو شکلیں بنا بنا کر ہنساتا، اچھل اچھل کر دکھاتا۔ گیت سناتا جو کہ اس کی زندگی کا واحد گیت تھا۔ اللہ ہی اللہ کیا کرو۔ یا پھر اللہ کاکا سو جا۔ اللہ سوہنا۔۔۔ آں آں آں، ناں ناں ناں۔

یہاں تک کہ وہ رات کو چت لیٹتا اور شجاع کو اپنے سینے پر اوندھا لٹا کر سلانے لگا۔ شجاع بھی سب سے زیادہ خوش تارے کی سنگت میں رہتا۔ بے جی اور ابا جی خوش اور مطمئن سے رہنے لگے کہ شجاع کی وجہ سے وہ اب گھر میں رہتا تھا۔

اور بے مقصد زندگی گزارتے تارے کے پاس بھی ایک مقصد آ گیا تھا۔

ایک دلچسپی۔۔۔ ایک ذمہ داری جسے وہ جی جان سے نبھاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

طالب کو اگلی چھٹی نجانے کب ملنی تھی۔ مگر وہ آیا تو سب حیرت آمیز خوشی میں گھر گئے۔ عابدہ کا پانچواں مہینہ تھا۔ شروع مہینوں کی بدحالی کے خاتمے کے بعد وہ اب بہتری کی جانب گامزن تھی۔

"کتنے دنوں کی چھٹی آئے پتر۔۔۔؟" ابا جی نے بہت سے کام روک رکھے ہوتے تھے۔ جو طالب کے آنے پر کرنے تھے۔ ذرا اندازہ ہو جاتا تو۔۔۔

"تین دن کی چھٹی ہے ابا جی۔۔۔!" طالب نے آہستگی سے کہا۔

"تین دن کی۔۔۔ خیر ہے ناں؟" بے جی چونکیں۔ طالب ہمیشہ زیادہ چھٹیاں لے کر آتا تھا۔ تین چار دن

کے لیے لمبا سفر کرنا اسے پسند ہی نہ تھا۔

"جی خیر ہی ہے۔" طالب نظریں بھی چرا رہا تھا۔ سب خوش تھے مگر حیران بھی تھے۔

"میں عابدہ کو لینے آیا ہوں ابا جی۔ اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔"

بے جی اور ابا جی کے سر پر جیسے دھماکا ہوا۔ کیا وہی کہا گیا جو انہوں نے سنا تھا یا پھر۔

"کیا مطلب؟" بے جی کے ہونٹوں سے بمشکل نکلا اور طالب کے لیے جواب بنا بہت مشکل تھا۔

"ہاں ہاں، لے جانا۔ مگر ابھی اس کا حال نہیں ہے اتنے لمبے سفر کا۔" ابا جی نے جیسے بات سمجھ کر فیصلہ سنایا۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں تیرے ابا جی۔ ایسے کیسے آنا" فانا" اور اس حالت میں سفر بھی مشکل اور خدانخواستہ میرے منہ میں خاک۔ اگر جو کچھ اوپر نیچے ہو جائے۔" بے جی کا پرزور احتجاج بھی سامنے آگیا۔

"خیر سے فارغ ہو جائے تو لے جانا اس کا بھی حق ہے کہ تیرے ساتھ جا کر رہے۔ مگر ابھی تو میں نہ جانے دوں۔" طالب سر جھکائے سن رہا تھا۔ وہ یک دم اٹھ کر بے جی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"مجھے معاف کر دیں بے جی۔ میں اپنے بچے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میس کا کھانا اب مجھ سے نہیں کھایا جاتا میں گھر کے کھانے کو ترس گیا ہوں۔" وہ بہت بے بس، بے قرار اور شرمندہ نظر آتا تھا۔

بے جی کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔ طالب زمین سے اٹھ کر چارپائی پر جا بیٹھا۔ بے جی کی مدد طلب نگاہیں ابا جی کے چہرے کی جانب اٹھیں۔ اب وہی کچھ کریں تو۔ مگر ابا جی کا منہ کھلا تو سب کی جیسے سانسیں رک گئیں۔

"عابدہ پتر! پھر تو تیاری شروع کر لے۔ ابھی تو فوری ضرورت کا سامان رکھنا پھر بعد میں پیچھے طارق کو بھیج دیں گے۔ برتن بھانڈوں کی بھی ضرورت ہوگی اور میں ایک بوری دانے بھی پسوا دیتا ہوں (گندم کا آٹا) دیسی گھی لازمی رکھ لینا۔ ادھر پڑا تو سڑتا ہی رہے گا۔" ابا جی کھڑے ہو گئے۔ طارق اور طالب بھی۔

"مجھے معاف کر دیں ابا جی!" طالب رلو میں آگیا۔ سر جھکایا اور ہاتھ بھی جوڑ دیے۔ ابا جی نے ہاتھ کھولے اور گلے سے لگا لیا۔

تارے پر کیا گزرے گی؟ سب سے بڑا سوال۔

☼ ☼ ☼

معصومہ صبح اٹھتے ہی بڑے جوش و خروش میں تھی۔ نماز اور وظیفے سے فارغ ہوتے ہی گودام میں گھس گئی۔ پیتل کی پرات میں لمبا، باستی، خوشبودار، پرانا چاول نکال لائی۔ ساتھ بڑے پیلے بھی اٹھا رکھے تھے۔ بڑی مگن دکھائی دیتی تھی۔ پھر ناشتہ بنانے لگی۔ اپنا اور طارق کا ناشتہ۔ بے جی اذانوں سے پہلے اٹھ کر اپنے لیے دو بڑے پیالے چائے بنا لیتی تھیں۔ باقر خانی کے ساتھ کھا کر پھر قرآن پڑھتیں۔ وظائف و مناجاتیں۔

معصومہ کا پکا کھانا کھانا مجبوری تھی کہ اب بڑھاپے کے باعث چولہے کے کام نہیں کر پاتی تھیں۔ مگر معصومہ کے ہاتھ سے کھانا کیا پسند نہیں تھا۔ خود سے نکالتیں۔ معصومہ ناشتہ لیٹ کر رکھتی تھی۔ وہ دس ساڑھے دس بجے خود ہی اٹھ کر کرتیں۔ مگر ابھی طارق چھٹی آیا ہوا تھا۔ تو تینوں ایک دسترخوان پر آگئے۔

معصومہ بے جی کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے ناشتہ کر رہی تھی۔ اور طارق بہت چپ چپ تھا۔ ناشتہ مکمل ہونے پر اس نے اپنے ہاتھوں سے بے جی کو جوڑوں کے درد کی حکیمی دوا کھلائی مگر خاموشی کے ساتھ... پھر وہ گھر سے نکل گیا۔ گھر میں کام کرنے والی عورت بھی آگئی۔ معصومہ نے اسے مستقل رکھ لیا تھا۔ وہ اسے ہدایتیں دینے لگی۔ بے جی کو اندازہ ہو رہا تھا۔ معصومہ نے آج کوئی ختم شتم دلانا ہو گا ویسے تو کام کرنا اس جوان کی موت تھا۔ مگر ایسے کام وہ ذوق و شوق سے کر لیتی تھی اور حکم چلانے میں بھی ماہر تھی۔

طارق کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد گھر لوٹا، دونوں ہاتھوں میں

تھیلے۔۔۔ سامان تو سارا معصومہ کا منگوایا ہوا تھا۔ مگر حسب عادت اور بوجہ احترام طارق نے اسے رکھا بے جی کی منجی پر۔۔۔ بے جی کسیج والا ہاتھ سینے پر دھرے آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ اور اپنی بوڑھی لرزتی آواز میں گنگنا رہی تھیں۔

سدا نہ باغیں بلبل بولے ' سدا نہ باغ بہاراں
سدا نہ راجے راج کریندے ' سدا نہ سنگت یاراں

یہ اشعار پڑھتے ہوئے اکثر آواز بھرا جاتی تھی۔ ان کی اور تارے کی سنگت کو چھوٹے بھی تو پانچ برس ہونے کو آئے تھے۔ ہجر 'فراق کے ان ہی جیسے اشعار کو پڑھتے وہ اکثر اونگھ جاتیں۔ پھر یکدم ہڑبڑا کر اٹھتیں اور سلسلہ جہاں سے ٹوٹا ہوتا 'دوبارہ گانے لگتیں۔ طارق پیروں کے پاس کھڑا بے جی کے اشعار کو بغور سن رہا تھا۔ اس نے بچپن میں ماں کو یہ اشعار پڑھتے دیکھا تھا۔ مگر ایسا سوز اور درد۔۔۔ ایک بے بسی آمیز تڑپ جو اب لہجہ میں در آئی تھی۔ وہ پہلے نہیں تھی۔ لہجے میں انتظار تھا۔ یقین و بے یقینی کی درمیانی کیفیت۔ آواز اکثر آنسوؤں سے بوجھل ہوتی۔ مگر بے جی اب روتی نہیں تھیں۔ شروع سالوں میں تو آنسو خشک ہوتے ہی نہ تھے۔ پھر انہوں نے رونا چھوڑ دیا تو سب نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔ مگر طارق کو اس وقت لگا۔ بے جی نے رونا یقیناً "چھوڑ دیا ہو گا مگر کیا فائدہ۔۔۔ وہ تو اب اک چلتا پھرتا نوحہ تھیں۔ اک آنسو جو ٹھہر رہ گیا۔ اک سانس اٹکی ہوئی سی۔۔۔ بیٹے کی جدائی نے انہیں اک آہ بنا دیا تھا۔ اک خلش۔۔۔ دل ایسا زخمی تھا جیسے کانٹے دار جھاڑی میں لپٹا ہوا زخمی 'رستا ہوا۔

اولاد کی موت زخم ہوتی ہے مگر بھرتے بھرتے۔۔۔ بھر جاتا ہے۔ اولاد کی جدائی ناسور ہوتی ہے۔ ایسے ناسور جسے بے جی ریجھوں سے پالے ہوئے تھیں۔ تارے کی جدائی نے بے جی کا اندر پھونک دیا تھا۔ دھواں آنکھوں سے اکثر نکلتا تب وہ سب سے چھپ جاتیں۔ بہادر ہونا کوئی کمال نہیں بہادر ظاہر کرنا بہت مشکل کام ہے۔ جبکہ اندر سے آپ کھوکھلے ہوں اور بزدل ہوں اور کمزور ہوں۔۔۔ بے بس اور غمگین ہوں۔

بے جی ایک نوحہ تھیں۔
مرگھٹ کی شام تھیں۔
ویرانے کی رات۔۔۔
جنگل کا بھٹکا راستہ تھیں۔ جس کا کوئی انت نہیں۔
ایسی سڑک جو کہیں نہیں جاتی۔
ایسا دل جو چلتا تھا۔۔۔ دھڑکتا نہیں۔
نم آنکھ اور اٹکی سانس۔۔۔ کہیں سے تو کوئی خبر آئے اور سوچتے سوچتے بے جی اب یہاں تک آ گئی تھیں۔

جیتے کی نہ آئے مرتے کی آجائے کوئی تو تارے کی
خبر لائے کوئی تو۔

☼ ☼ ☼

معصومہ کی آواز میں کھنک تھی۔ جوش امید۔۔۔ علم عزم۔۔۔ وہ کام والی سے مخاطب تھی اور دماغ کے کونے میں یہ بھی موجود تھا۔۔۔ بے جی سن رہی ہیں۔

"بڑے جلالی تعویذ دیے ہیں اس بار سائیں جی نے۔۔ ایک پیٹ پر باندھا ہے تو دو گلے میں۔۔۔ اور ایک تعویذ طارق کو بھی دیا۔" اس کا لہجہ مدہم مگر فاتحانہ ہو گیا۔ "اور طارق پہلے تو مانتے نہیں تھے۔ مگر اس بار مان گئے ہیں۔"

"ہیں جی۔۔۔!" کامی (کام کرنے والی عورت) کی آنکھیں پھیلیں۔

"ہاں تو میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں۔ بڑے پہنچے بزرگ ہیں۔ نذر نیاز کچھ نہیں لیتے۔ بس جو اپنے دل کی خوشی ہو۔ اللہ میری مراد پوری کرے۔

"گیارہ جمعراتوں تک۔۔۔ میٹھا بنا کر معصوم بچوں کو کھلانا ہے۔ بچوں کے دل تو صاف ہوتے ہیں۔ خوش ہوں گے تو دعا دیں گے۔"

"ہاں ہاں جی۔۔۔ بالکل۔۔۔ تو آج آپ زردہ بناؤ گی ناں۔"

"ہاں زردہ آج بناؤں گی اور بھی کئی چیزیں ہیں جیسے کھیر۔۔۔ حلوہ جلیبیاں۔"

اور بے جی کے کانوں میں یہ سب پڑ رہا تھا۔ طارق

کے لائے تھیلوں کو انہوں نے ہی کھولا تھا پھر طارق ہی سے برتن مانگے اور چوکڑی مار کے بیٹھ گئیں۔ کشمش کی ڈنڈیاں اتارنے لگیں۔ کھوپرے کو باریک کتر دیا۔ بادام بھگو دیے پھر چھلکے اتارے۔ رنگین اشرفیاں کھویا اور چھوٹی گلاب جامنیں۔ بھی زردے میں پڑی تھیں۔ یہ سوا چار کلو کا زردہ تھا۔ معصومہ کے ہاتھ میں ذائقہ بھی تھا اور جس دلچسپی اور یقین سے اس بار وہ لگی تھی۔ بتاتا تھا' سائیں جی کی دعا کے ساتھ دوا کر کے وہ کوئی کسر نہ چھوڑے گی۔

معصومہ نے چاول بھگو رکھے تھے جب پانی جوش مارنے لگا۔ تب اسے زردہ رنگ ڈالنے کا خیال آیا۔ اس نے کامی کو بے جی کی منجی تک بھیجا۔ طارق کے لائے زردے کے تمام لوازمات بے جی کے پاس تو تھے۔ وہ سب کچھ صف کر کے کاٹ چکی تھیں۔ کامی نے سب چیزیں معصومہ کے حوالے کیں۔

"لو پہلے زردہ رنگ تو دے دے۔ یہ سب تو بعد میں ڈلنا ہے۔" معصومہ جھنجلائی پھر زردہ رنگ تو تھا ہی نہیں۔ ہڑبونگ سی مچ گئی۔

"یار! میں نے خود دو پیکٹ خریدے پنساری سے۔" طارق الجھ کر کہہ رہا تھا۔

"او تسی منجی کے پاس جا کر دیکھو۔" اس نے کامی سے کہا۔ پھر خود بھی آ گیا۔

"بے جی! سامان سے زردہ رنگ نہیں نکلا؟ میں بھول آیا کیا؟"

معصومہ بھی چولہے کے پاس سے اٹھ آئی۔ بے جی لیٹے سے اٹھ بیٹھیں۔

تینوں بندے منجی کو اوپر نیچے آگے پیچھے سے ٹٹول رہے تھے۔ بے جی نے اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر آیا تو زردے رنگ کی دو پڑیاں۔

"یہ ڈھونڈ رہے ہو تم لوگ۔۔۔؟" سب کے چہروں پر سکون پھیلا۔ معصومہ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ کہ لے سکے۔۔۔ بے جی نے مٹھی بند کی اور ہاتھ پیچھے کر لیا' تینوں کے چہرے پر اچنبھا پھیل گیا۔

"زردہ بنانے پر اعتراض نہیں۔ معصوم بچوں کی دعا اللہ رد نہیں کرتا مگر طارق۔۔۔! زردے میں رنگ نہیں ڈالنے دینا میں نے۔"

"بے جی۔۔۔!" طارق نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ اور پھر معصومہ کو۔ جس کا منہ کھلا تھا۔

"پنج سال ہو گئے تارے کو گئے۔۔۔ میں نے اس وقت سے اپنے ہاتھ سے کوئی مٹھی چیز نہیں بنائی نہ ہی کھائی۔ اب یہ نذر نیاز اور منت کا معاملہ ہے۔ میں منع نہیں کرتی مگر زردے میں رنگ نہیں ڈلے گا۔"

معصومہ کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ کامی نے حق ہا کہہ کر منہ پہ ہاتھ رکھا' بے جی کا دماغ پھر گیا ہے۔ اس نے سوچا اور طارق کی زبان گنگ ہو گئی۔ بے جی پڑیاں پکڑے پکڑے کھڑی ہو گئیں۔

"تارے کے لیے بنائی تھی میں زردے اور کھیریں۔ پتیلے پہ پتیلا چڑھاتی تھی۔ میرا پتر تھا ہی مٹھے کا اتنا شوقین۔" بے جی کے چہرے پر یاد چمکے مارنے لگی' پھر یکدم چہرہ بجھ گیا۔ سیاہ گھور تاریکی چھا گئی۔

"اور اب پتا نہیں۔۔۔ اسے کھانے کو بھی ملتا ہے یا نہیں۔۔۔ مٹی کھاتا ہو گا یا پتھر۔۔۔ پتے' یا بھوکا ہی سوجاتا ہو گا۔

کون ہو گا جو اس کے لیے میٹھے بناتا ہو گا۔ میں نے پنج سال سے مٹھی چاہ وی چھوڑ دی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر میرے دل پر آرے چل رہے ہیں۔ پانی میں جوش مارتی الائچی کی خوشبو۔۔۔ مجھے لگتا ہے میری سانس رک جائے گی۔ پر میں منع نہیں کرتی۔ گیارہ جمعراتیں چھوڑ ہر روز مٹھا بنا کر سارے پنڈ کو کھلا دے یہ۔" ہاتھ سے معصومہ کی طرف اشارہ کیا۔

"پر زردے میں رنگ نہیں ڈالنا۔ یہ میں نے کہہ دیا۔"

اور طارق اور معصومہ کی زبان جیسے تالو سے جا چپکی تھی۔ بے جی کا لہجہ مضبوط تھا چٹانوں کی طرح۔۔۔ مگر ان کے ہونٹ لرزنے لگے تھے اور وہ کھڑے کھڑے یوں ہلتی تھیں جیسے جھکڑ کی زد میں آیا کمزور تنا۔۔۔

اور سر نفی میں ہلتا تھا۔ "رنگ نہیں ڈالنا رنگ نہیں ڈلنا۔"

طارق جیسے ماں کو سہارا دے کر بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر بے جی نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں رک جانے کا اشارہ کر دیا۔ پھر خود اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی تھیں۔ مٹھی میں پڑیاں دبی تھیں۔

طارق سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ معصومہ میں اتنی سکت بھی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

رات وہ موہنی ناگن تھی اور پل پل ڈستی تھی۔ ادھر معصومہ بلند آواز میں روتی تھی اور شکایتیں لگاتی تھی۔ ادھر بے جی چت لیٹی چھت کو تکتی تھیں اور آنکھوں کے کناروں سے آنسو نکل کر بالوں میں گم ہوتے ہوتے تکیے کی روئی میں جذب ہو جاتے اور رونا ہر دو صورت میں تکلیف دہ ہے۔ وہ جب با آواز بلند رو کر بین ڈالے جاتے ہیں۔ اور وہ جب بے آواز آنسو بہتے ہیں۔

پر پتا نہیں کیوں یہ خاموش شکایت اور آہ و زاری صداقت کے ترازو میں ہمیشہ اوپر اٹھ جاتی ہے۔

اور تارے کو رونے کے لیے بے جی کو کسی عمر کی ضرورت نہیں تھی۔

تارے بے جی کے دل کا وہ اُدھڑا حصہ تھا' جسے اپنے ہاتھوں سے سینے کی کوشش میں انگلیاں فگار ہو رہی تھیں اور چاک پھر بھی نہ سلا۔ مگر بے جی کو اس ادھڑے کٹے پھٹے حصے سے بھی پیار تھا۔ تارے ایسا درد تھا جس کی کسک میٹھی تھی۔ نشے کی طرح مہلک... مگر نہ چھوڑے جانے والی۔

"تو کدر ہو گا تارے! میرے سوہنے' میرے سائیں۔ میری عرضی۔۔۔ میرے اللہ۔" بے جی نے سخت لاچاری کے عالم میں کروٹ بدلی تھی۔

"اتنا تو مجھے یقین ہے تارے تو زندہ ہے۔ مگر تو کدھر ہے پتر۔۔؟ دنیا کہتی ہے اللہ جانے زندہ بھی ہو گا یا۔۔۔ پاگل ہے دنیا' ٹڈ (پیٹ) سے جمے کو ہچکی لگ جائے تو ماں کے لوں کنڈے کھڑے ہو جاتے ہیں اور نمانا دنیا چھوڑ دے تو ماں کو خبر نہ ہو' یہ بھی کبھی ہو سکتا ہے بھلا۔۔ (پیٹ سے پیدا کیے کو ہچکی لگ جائے تو ماں کے جسم کے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں) پتا نہیں کیا کھاتا ہو گا' کیا پیتا ہو گا' تن پر لیرے بھی ہوں گے یا۔۔ اور سوتا کہاں ہو گا۔ سارے ملک کے مزار چھان مارے۔ کہیں تو جھاڑو دیتا مل جاتا۔ کسی مسجد' مندر کے دروازے بیٹھا ہوتا مگر پتر تو تو کہیں نہ ملا رب سوہنے! میں کملی' میں گناہ گار آج آ گئی اس تک کہ تو پھر اسے میرے ہاتھوں سے واپس لے لیتا۔ میں نے کوئی انکار کرنا تھا۔ روتی پیٹتی غش کھاتی مگر اتنا تو کرتی سوہنے اللہ۔ قبر بناتی۔ اوپر بوٹا لگاتی' پانی ڈالتی۔

یاسین شریف اور کلمہ پڑھ کر بخش دیتی۔ اب تو یہ حال ہے سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔ گم جانے سے بہتر تھا تارے! تو میری گودیں سر رکھ کے دم دے دیتا۔ تینوں رو لیندی۔ میرا دل ٹھنڈا ہو جاندا (تمہیں رو لیتی) توں میرے کولوں اے حق وی چھن لیا (مجھ سے یہ حق بھی چھین لیا) تارے تو میرے نال چنگا نہیں کیتا۔ چنگا نہیں کیتا۔"

ضبط کی طنابیں چھوٹ گئیں۔ کمرے کے سناٹے میں کوئی آواز نہیں تھی۔ مگر بے جی کی منجی یوں ہلتی تھی۔ جیسے زمین زلزلے کی زد میں ہو۔ آج کی رات بے جی نے تارے کو یاد کرنا تھا۔ اور بے حد و بے حساب کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

غالب' عابدہ اور شجاع کے جانے سے گھر میں قطعا" کوئی خاموشی یا سناٹا پیدا نہیں ہوا تھا اس لیے کہ تارے نے رو رو کر اور شور مچا مچا کر وہ طوفان اٹھا رکھا تھا کہ جانے والوں کی کمی کا احساس بھی جاتا رہا۔

"تارے کا کا نئیں۔۔" (تارے کا کا نہیں ہے)

وہ اپنا منہ سر پیٹتا۔

"عابا نہیں۔۔ کاکا لے گی۔ عابا لے گئی۔ تارے کاکا نہیں۔" اس نے سارے برتن اٹھا کر مارے۔ بستروں کی چادریں اٹھا کر تندور میں جھونک دیں' ایک

زور کا دھکا بے جی کو بھی لگ گیا۔ اباجی نے دیکھا مارا تو تیزی سے ان کے ہاتھ سے لاٹھی اچک لی اور لاٹھی لہرا کر خطرناک عزائم جتائے کہ اباجی بیچ میں نہ آئیں۔ اباجی کو پسپا ہونا پڑا پھر بے جی اور اباجی نے جیسے تارے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ جیسے بھی اپنی بھڑاس نکالے۔

مگر اتھرا بیل بھی آخر ہانپ کر ڈھے جاتا ہے۔ وہ بھی تھک کر گر گیا۔ سارے گھر کا حشر ہو گیا تھا۔ کارنس پر کوئی برتن نہیں ہے۔ دودھ کا پتیلا دروازے تک بہہ گیا۔ سالن سے بھری پکی مٹی کی ہانڈی اٹھا کے فرش پر ماری، شلجم لوھر۔ بوٹیاں لوھر۔ وہ سارا گھر ڈھا دینا تب بھی جانے والے اب لوٹنے کے نہیں تھے۔ آخر تھک ہار کہ ڈھے گیا۔ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ روتے روتے گر گیا۔ گرے گرے سو گیا اور اس کے بعد جیسے کھو گیا۔ سا تو بولنا بھول گیا۔ صدمہ لگا لیا۔ کاکے کے بغیر کیسے جیے؟ تو پھر مر نہ جائے۔ بخار چڑھا لیا۔ ایسا تیز کہ دانے بھون لو۔ سرخ آنکھیں گرم سانسیں ہے۔ غنودگی میں چلا گیا۔ ہوش بے ہوشی کے وقفے میں کاکا "کاکا" کرتا بڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا' دیوانہ ہو گیا جیسے۔ بے جی ہلکان ہوئے جاتیں۔ لاڈلے کا سر گود میں بھر کے بیٹھی رات کرو دیتیں نچوے جاتیں۔

مولوی صاحب نے تعویذ بھی دیا۔ پرسکون رہنے کے لیے دم والا پانی۔ تارے بے جی کے ہاتھ تھام لیتا۔ آنسو بھری ناامید نگاہیں "کاکا نہیں" بے جی آنسو صاف کرتیں۔ سر چومتیں اور تسلی دیتیں "کاکا آئے گا۔" چنگھاڑ تا۔ للکار تا تارے جیسے کہیں کھو گیا۔ چپ چاپ پڑا ہے۔ منہ پر مکھیاں بھن بھنا رہی ہیں ہم صنم بے منہ پر مٹی مل لیتا۔ نگاہوں میں خالی پن سا آ گیا۔ بے جی چھپ کر روتیں۔ ڈھیروں روٹیاں کھانے والے کی خوراک تک کم ہو گئی۔ آنکھیں خلاؤں میں چکراتیں نجانے کیا کھوجتیں۔

اب پھر ایسا کیا کیا جائے کہ دل آباد ہو۔ ہوش مندوں کے دل کو لگانے کے سو سامان ہے۔ اب دیوانے کو کیسے بہلائیں۔

اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

"طالب بھائی نے اچھا نہیں کیا۔" طارق سے تارے کی حالت دیکھی نہ جاتی۔ "عابدہ بھابھی نے ان سے کہا ہو گا۔" "آپ کو نظر نہ آیا بے جی۔ ساری ذمہ داریوں سے جان چھوٹی اب رہتی ہوں گی عیش سے۔"

"نہ طارق! عابدہ ایسی نہیں ہے۔" بے جی کا انداز قطعی تھا۔

"آپ بہت بھولی ہیں بے جی...!" طارق بہت سوچ سمجھ کر نتیجے پر پہنچا تھا۔

"پر بے وقوف تو نہیں ہے۔" بے جی کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ آ گئی۔

"طالب بھائی نے یہ بھی نہ سوچا" آپ کیسے اس عمر میں گھر بار سنبھالیں گی۔"

بے جی خاموش رہیں۔ کہہ نہ سکیں گھر سنبھل جاتا ہے۔ دل نہیں سنبھلتا۔ وڑے کی گرد بو کرا (جھاڑو) سمیٹ لیتا ہے۔ آنکھ کا جالا کیسے اتاریں۔ دل جلنے سے دھواں نہیں اٹھتا پھر یہ کیسا کالا اندھیرا ہے جو ان کے گھر کے اوپر مستقل ڈیرا ڈال چکا تھا۔ کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔

عابدہ کے دن نزدیک آئے تو طالب نے خط لکھ دیا۔ بے جی آ جائیں اور تارے کو بھی ساتھ لائیں۔ خط میں عابدہ کا بھی رقعہ تھا۔ نہ سلام نہ دعا فقط۔ بے جی سے آ جائیں۔ درمیان کا سارا حصہ خالی۔

آپ کی بیٹی عابدہ۔

یہ کیسا خط تھا۔ طالب کا خط تین صفحات پر مشتمل تھا۔ مگر بے جی نے سن لیا سنبھال کر رکھ لیا۔ مگر عابدہ کے خط کو کتنی ہی بار نکال کے دیکھا۔ درمیان کے حصے کے لیے عابدہ کے پاس کچھ نہیں تھا۔ کوئی سچ کوئی جھوٹ... یہ کیسا خط تھا۔ بے جی ہچکیوں سے روتی رہیں۔ زچگی کے لیے جانے سے منع کر دیا۔ اباجی کو بھیج کر عابدہ کی ای چھوٹی بہن اور بھائی کو جانے کا کہہ دیا۔ ساتھ طالب کے لیے خط۔

"میں تارے کو چھوڑ کر نہیں آ سکتی اور تارے کو

لے کر بھی نہیں آ سکتی۔ اگر جو اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا' بڑی مشکل سے سنبھلا ہے۔ بھو فارغ ہو تو تم آنا۔"

طالب ان ہی سطور پر اٹک گیا۔ ہاں تو تارے انکار کر دیتا تو کیا ہوتا کیا۔ وہ رکھ لیتا تارے کو اپنے پاس۔ ارے یہ کیوں نہ سوچا۔ ہاں بالکل' وہ تارے کو اپنے ساتھ لے آئیں گے۔ طالب نے فیصلہ عابدہ کو سنایا تو وہ خوشی سے اچھل ہی پڑی۔

"ہاں تارے ان کے پاس بھی تو رہ سکتا ہے۔ اچھا تو طے رہا' وہ اب جب جائیں گے تو تارے کو ساتھ لے آئیں گے۔ ٹھیک ہے۔"

☼ ☼ ☼
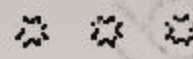
پھر جب کاکے کا ایک اور کاکا بھائی پیدا ہو گیا۔ تب کوئی آٹھ ماہ بعد طالب' عابدہ۔۔۔ دونوں بیٹوں کے ہمراہ ڈیرہ شاہو واپس آئی۔ وہ کوئٹہ شہر سے سب کے لیے تحائف لائی تھی۔ تارے کے لیے گرم ٹوپے۔ کوٹ اور جوتے خشک میوے اور کپڑے۔

پر یہ کیا! تارے تو ایسی اجنبیت سے دیکھتا تھا۔ جیسے پہچان کے سارے رنگ کھو چکا ہو۔ اس نے طالب کو دیکھ کر حسب عادت منہ بھی نہیں موڑا تھا۔ اس نے عابدہ کو نہیں پہچانا اس نے کاکے کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ عابدہ نے نوزائیدہ کاکا گود میں دینے کو بڑھایا تو تارے کی بانہیں وا نہیں ہوئیں۔ اس کی آنکھوں میں خالی پن تھا۔

اور آنے والوں کو جانا تھا۔ چلے گئے۔ بے جی خدا حافظ کہہ کر ویڑے کے بیچ و بیچ پڑی تارے کی منجی پر گھٹنے پر کہنی ٹکا کر گال پر ہاتھ رکھے۔ چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ بالکل خاموش' بے تاثر۔۔۔ ماں بیٹا الٹ نتھا کی سی جسامت رکھتے تھے۔ تارے یہ تیم تحیم اور بے جی دبلی پتلی سی۔۔۔ تارے ماں کے عین سامنے چوکڑی مارے بیٹھا تھا۔ جیسے خاموشی سے گھبرا گیا۔ بے جی کی گود میں سر گھسانے لگا۔ جیسے سینے میں دبک جانا چاہتا ہو۔ بے جی بھی چونکیں اسے لپٹائے گئیں' منہ سر چوما تب ہی بری طرح چونکیں۔ تارے کے سر پر شروع دن سے بال کم تھے۔۔۔ ہاں سینے پر بال تھے اور بے جی ان ہی بالوں کو دیکھ کر چونکی تھیں۔ بال۔۔۔ بالوں سے جھانکتے کچھ سفید بال۔۔۔ بے جی نے گریبان کھول کر انگلیوں سے ان بالوں کو چھوا۔

پھر بڑی کھوجتی نگاہ سے رواں نما داڑھی کو دیکھا اور دل بھر آیا۔ بے جی نے انڈے سر کو کھوجا۔۔۔ اور اس میں بھی سفید بال۔

بے جی کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ تارے سے لپٹ گئیں۔ تارے اس افتاد پر پریشان ہوا تھا۔ مگر اسے ماں سے چپٹنے میں مزہ آتا تھا سکون۔۔۔ مگر ابھی بے جی کس بات پر تڑپ رہی تھیں۔ روتی جاتی تھیں اور کچھ کہتی بھی تھیں۔

"دنیا کہتی تھی پاگل پتر جمیا (پیدا) ہے کیسے پلے گا۔ لو آ کر دیکھ لو میں نے پال لیا۔ جوان کیا اور بڈھا بھی کر دیا۔ ہائے تارے تو بڈھا ہو گیا۔ لو میں نے بڈھا بھی کر دیا۔

ہیں تارے! انی کی جنی جندڑی انی چھیتی مک گئی اتنی سی زندگی اتنی جلدی ختم ہو گئی) پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بڈھے ہونے سے کیا ہوتا ہے یہ تو تو میرا تارے' میرا کاکا' میرا سائیں میری عرضی۔۔۔" تارے کو بے جی کے پیار کا والہانہ پن اچھا لگا۔

بے جی رونے سے باز آتی ہی نہ تھیں۔ تارے نے اپنی قمیص کا دامن اٹھایا اور بے جی کا چہرہ پونچھنے لگا۔ "بے جی نہ۔" پھر خود بھی رونے لگا۔ روتا رہا اور روتا ہی رہا۔

☼ ☼ ☼

"چاچا خیر دین کے بچے تو بڑے ہو گئے بے جی۔۔۔!" طارق چولہے کے پاس بیٹھا ناشتہ بھی کر رہا تھا اور بے جی کو قصے سنا رہا تھا۔

"ہاں تو اللہ رکھے ہونا ہی تھا۔ یہی زندگی ہے۔ بچے بڑے ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڈھی اور بڈھے مر کھپ جاتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بے جی۔۔۔ مگر میں تو اس معصومہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا اتنی بڑی ساری۔۔۔ پھوپھی رفعت کے بیٹے کی بارات میں جب نوٹ اچھالے گئے تو مردوں کی ٹانگوں سے گھس گھس کر سب سے زیادہ اکٹھے کر کے بھاگی تھی اور آج۔۔۔"

"لڑکیوں کے بڑا ہونے کا کون سا پتا لگتا ہے۔ توری کی بیل ہوتی ہیں نری۔"

"ہاں مگر پھر بھی۔" طارق کی آنکھوں میں معصومہ کا سراپا آن ٹھہرا۔

تندرست جسم بوٹا سا قد۔۔۔ گندم کی پکی بالی سا دمکتا رنگ۔۔۔ اور رنگین آنکھیں۔۔۔ کبھی سبز لگتیں۔ کبھی سرمئی اور کبھی نیلی سی۔۔۔ بال بھی کالے نہیں تھے۔ کیونکہ کالے پراندے سے بالکل الگ نظر آتے۔ سب سے بڑی متوجہ کرنے کی بات یہ تھی وہ ایک ادائے مغرورانہ سے چلتی تھی۔ جیسے گرد و پیش سے بے خبر۔۔۔ خود میں مگن۔

"ہاں اپنا آپ اتنا پیارا ہو تو بندہ خود ہی سے نہیں رجتا کسی اور کو کیا دیکھے۔" طارق نے ذرا حیرانی کے بعد خود کو بڑے سلیقے سے سمجھایا تھا۔ اور اس کے ہاتھ بھی بڑے پیارے تھے۔ جیسے۔۔۔ جیسے۔

وہ میز پہ چائے کے لوازمات رکھ رہی تھی اور طارق تشبیہات کھوج رہا تھا۔ خمیرے آٹے سے پھولے ہوئے ذرا سخت انگلی لگے تو پور اندر دھنس جائے اور اس اچھوتے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی خواہش نے طارق کو حیران کر دیا کہ وہ ہاتھ تھامے اور اپنی انگلی کے دباؤ سے جانچے خیال محض خیال ہے یا واقعی۔۔۔

طارق کو ملازمت مل گئی تھی۔ دوسرا شہر۔۔۔ مگر نوکری کی تے نخرہ کے مصداق۔۔۔ وہ نا چاہتے ہوئے بھی گھر چھوڑ اجنبی جگہ آگیا۔ چلتے وقت ابا جی نے ایک خط اپنے دور کے رشتے کے بھائی کے نام لکھ دیا۔

اور طارق کو تاکید کی کہ ایک ملاقات ضرور کرنے جائے۔ اجنبی شہر کے سو مسائل۔۔۔ طارق کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ کوئی بچہ تھا کیا؟ پہلی ملاقات کا وقت بھی کوئی ڈیڑھ ماہ بعد نکل سکا اور نہ چاہتے ہوئے گیا اور وہیں معصومہ کو دیکھا۔ چاچا خیر دین کی اکلوتی صاحبزادی اور پھر حال یہ ہو گیا کہ واپسی کا دل نہ کرے۔ یا یہ کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمیں کہیں پڑ جائے۔

ادھر آگ بھڑک اٹھی تھی کہ کہیں جائے پناہ نہیں۔ ادھر سے بے خبری کا یہ عالم کہ ہر بار دستک کے جواب میں "آپ کون۔۔۔ نام بتائیں۔" طارق دل مسوس کر رہ جاتا۔ وہ قدموں کی چاپ سے پہچان لیتا تھا۔ دروازہ کھولنے کون آ رہا ہے۔ چاچا خیر دین یا ماسی یا بھابھی یا وہ۔۔۔؟

ایسے کیسے چلے گا۔ ایسا ذہن تو تھا نہیں کہ لڑکی کو پٹا لیا جائے۔ ایک تو شرم و حیا کا ماحول۔۔۔ دوسرے وہ اب بھی پوچھتی تھی۔ "طارق؟ کون طارق تو کیا ہی اچھا ہو کہ طارق اپنا تفصیلی تعارف پیش کر دے کہ کون طارق اور کیوں طارق۔۔۔

اور اسی مقصد سے وہ چھٹی آیا تو بے جی کے سامنے چاچا خیر دین کے بچوں کے بڑے ہو جانے کا ذکر لے بیٹھا مگر بے جی ہیں کہ سمجھتی نہیں۔ ان کے نزدیک تو یہ عام سی بات تھی۔ چھوٹوں نے بڑے تو ہونا ہی ہے۔ اس کا تذکرہ بار بار چہ معنی۔۔۔

طارق جھنجلایا پھرنے لگا۔ منہ پھاڑ کر کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ یہاں تک کہ چھٹی ختم ہو گئی۔ اور اب سامان باندھے بیٹھا ہے۔ ابا جی بھی الوداعی سلام کے بعد مسجد جانے کے عذر سے گھر سے نکل گئے۔ تارے سے گلے مل لیا۔ پھر بھی بیٹھا ہے۔ بے جی کو ہی دھیان آ رہا ہے وہ نکلے تو وہ بھی نماز کو کھڑی ہو جائیں۔

"اچھا بے جی! پھر چلتا ہوں۔" کھڑا ہونا ہی پڑا۔

"ہاں پتر! اللہ کے حوالے۔۔۔" بے جی آستین موڑنے لگیں۔ وضو کرنے کا قصد۔ طارق دروازے پر جا کر پھر رک گیا۔ کچھ کہنے کی کو مگو کیفیت۔۔۔

"کوئی چیز رہ گئی پتر؟" بے جی نے پوچھا۔

"آں۔۔۔ نہیں بے جی۔۔۔ بس چلتا ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھنا۔"

بے جی نے سر ہلایا۔ اب یہ بات بھی ہو گئی۔ بے جی چوکی پر بیٹھ گئیں وضو کے لیے بسم اللہ کہی طارق

نے ناچاہتے ہوئے بیگ کندھے پر ڈالا۔

"وہ بے جی۔۔۔ میں کہہ رہا تھا کہ۔" بے جی نے مڑ کر دیکھا۔

"مجھے پتا ہے' تو کیا کہہ رہا ہے۔ یہی کہ چاچا خیر دین کے بچے بڑے ہو گئے ہیں اور وہ معصومہ بھی بڑی ہو گئی ہے۔ مجھے پتا لگ گیا ہے۔ طارق! تو جا میں تیرے ابا جی سے بات کروں گی۔"

بے جی نے بات مکمل کر کے تن وہیں سے وضو شروع کر دیا۔

طارق کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "ہیں جی۔۔۔!" وہ بھاگ کر آکر بے جی کی پشت سے لپٹ گیا۔

بے جی نے بمشکل خود کو چھڑایا "لو تاں کر میرا وضو خراب ہوتا ہے طارق! نہ کر۔" مگر طارق کو کہاں ہوش۔۔۔ یعنی بے جی کو سب پتا تھا۔ یعنی۔

✡ ✡ ✡

مگر ابا جی نے صاف منع کر دیا تھا۔ وہ تو سالوں سے سوچے بیٹھے ہیں۔ عابدہ کی بہن زاہدہ۔۔۔ بھائی کے کان میں بات بھی ڈال رکھی ہے۔

"طالب' عابدہ کو بھی خبر ہے۔"

طارق سنتے سے اکھڑ گیا۔ "وہ معصومہ سے شادی نہیں کرے گا۔ ٹھیک ہے مگر زاہدہ سے تو کبھی بھی نہیں کرے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"وہ ہے تو عابدہ ہی کی بہن۔۔۔ اور عابدہ نے تارے کے ساتھ جو کیا وہ سب وہ بھولا تھوڑی ہے اور اس نے اس سب کے لیے کبھی عابدہ کو معاف نہیں کیا۔۔۔ اور نہ کرے گا اور طالب بھی برابر کا جرم دار ہے۔ زاہدہ چاچے کی بیٹی ہے بس یہیں تک ٹھیک ہے۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں طارق!" بے جی حیران تھیں۔ طارق کے دل کے اندر یہ سب۔۔۔ افسوس صد افسوس۔

"آپ بھول گئی ہوں گی بے جی۔ یہ سب عابدہ بھابھی کا منصوبہ تھا۔ آپ نے کوئٹہ میں جا کر طالب بھائی کا گھر نہیں دیکھا تاں تب ہی۔۔۔ وہ فوجی صاب کی کوٹھی ہے کوٹھی۔۔۔ چار چار ملازم۔۔۔ پانی کا گلاس تک پیٹ میں لا کر دیتا ہے۔ کپڑے باہر سے دھل کر استری ہو کر آتے ہیں۔ حکم چلاتی ہے عابدہ بھابھی۔۔۔ آپ خود سوچیں یہ زندگی اچھی ہے۔ یا یہاں کی مشکل زندگی۔۔۔ خدمتیں۔۔۔ اور کام۔۔۔"

"یہ صرف بدگمانی ہے طارق۔۔۔ عابدہ ایسی نہیں۔" بے جی صدمے سے بے حال تھیں۔

"آپ نہیں مانتیں تو نہ مانیں بے جی۔۔۔ میں تو کہہ چکا ہوں معصومہ نہیں تو ٹھیک ہے۔ میں نافرمانی نہیں کرتا۔ مگر زاہدہ کا تو سوال ہی نہیں۔"

بے جی آگے ایک لفظ نہ بول سکیں۔ گنجائش نہ چھوڑی تھی اگلے نے۔۔۔ اب ابا جی کو کیا اور کیسے رام کیا طارق کو اس سے غرض نہیں تھی۔ بہرحال پیغام کہلوا دیا گیا اور ساتھ ہی طالب کو بھی خط لکھا جتنی جلدی ہو چکر لگا جائے یا پھر عابدہ کو بھیجے۔ طارق کی ایکسائٹمنٹ ہی تھی اور وہ کلفی تھی۔ بڑی بہو کے بغیر وہ بیٹے کے شگن ڈالنے پہنچ جائیں توبہ توبہ۔۔۔ یہاں طارق کو بھی چپ کر جانا پڑا۔ وہ جلد از جلد پیغام بجھوا دینا چاہتا تھا مگر عابدہ سے نفرت یا بدگمانی کا یہ عالم تھا کہ اس نے بے جی کے بہت جلدی ہے تو جا کر عابدہ کو کوئٹہ سے لے آ کہنے پر طارق کے جواب نے انہیں ششدر کر دیا۔

"بے جی! ادھر رشتہ ہو۔۔۔ یا نہ ہو مجھے ایسی بھی کوئی بے چینی نہیں پڑی کہ عابدہ بھابھی کے دروازے پہنچ جاؤں۔ آپ ہی نے قسم کھائی ہے کہ ان کے بغیر نہیں جانا تو اس مسئلے کو بھی پھر آپ خود ہی حل کیجیے۔"

اور بے جی نے ابا جی سے کہا "جب کرنا ہے تو دیر کیسی۔۔۔ آپ ہی تکلیف اٹھائیں اور جا کر عابدہ کو لے آئیں۔"

✡ ✡ ✡

اور عابدہ کا رشتہ لے جاتے ہوئے سادگی کا عنصر نمایاں تھا کہ بھائی نے بھائی کے آگے جھولی پھیلا کر خیر مانگی تھی۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگا کر

زبان سے ایک لفظ نکالے بنا ہی سب طے کر لیا تھا۔ مگر اب اس بار برادری تھی، مگر اس طرح کا رشتہ جوڑنا پہلی بار تھا۔ بے جی لدی پھندی معصومہ کے گھر پہنچی تھیں۔

اور معصومہ خوب صورت تھی، کمرے میں آتے ہی چھا گئی، سب کچھ جیسے پس پردہ رہ گیا۔ وہ صورت شکل، قد کاٹھ میں عابدہ کا الٹ تھی اور بے جی نے تسلیم کیا کہ زاہدہ اور معصومہ کے تقابلی جائزے میں زاہدہ نے منہ کی کھائی تھی۔

معصومہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ معصومہ کے ابا جی۔ چاچا خیر دین بہت خوش نظر آتے تھے۔ ان کے انداز میں عاجزی، انکساری تھی اور ان کے ہر انداز سے لگتا تھا، وہ اس رشتے سے بہت خوش ہیں۔ جبکہ چاچی خیر دین کے چہرے سے تاثرات ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ وہ اچھی میزبان ضرور ثابت ہو رہی تھیں۔ مگر کھل کر کچھ بولتی نہ تھیں۔ جبکہ بے جی نے سارا کچا چٹھا بیان کر دیا تھا۔ تین دن کے اس قیام میں چاچی خیر دین نے یہ بھی باور کروا دیا کہ آپ کی آمد بسم اللہ۔ مگر ایسے ہی فلاں ڈاکٹر کا رشتہ آچکا ہے۔ خود ان کے اپنے خاندان میں کتنے ہی لوگ بارہا کہہ چکے ہیں، مگر وہ سوچتی ہیں۔ ایک کو ہاں کہہ کر باقی کو ناراض کر دیں کیا؟ اس لیے یہ تو طے ہے کہ رشتہ باہر کریں گی۔ شارٹ لسٹ میں ایک تو آگئے ڈاکٹر صاحب، ایک محلے داری میں بہن بنی ہوئی ہیں اور ان کا فوجی افسر بھائی اور اب یہ طارق۔ سو بڑا ہی مشکل مرحلہ ہے۔

بے جی کا چھوا تر گیا۔ پریشانی میں گھر کے عابدہ کی صورت دیکھی۔

طارق کا تو سارا اندر وہ پڑھ چکی تھیں۔ وہ عابدہ کو لے جانے پر پہلے ہی بدگماں تھا۔ پھر کہیں یہ نہ سوچے، ماں نے کوشش نہیں کی۔ بے جی ہراساں دکھائی دیتی تھیں۔

"چاچی جی! آپ کی بیٹی کا معاملہ ہے۔" عابدہ بولی۔ "آپ سے بڑھ کر اس کا ہمدرد اور کون ہو گا، اچھا برا دیکھنے والا۔ مگر ہم بھی اتنا ضرور جانتے ہیں، طارق کے گھر جو بھی آئے گی، بڑے نصیبوں والی ہو گی، شریف، پڑھا لکھا، اچھی ملازمت ہے۔ اخلاق و کردار بھی ماشاء اللہ۔ ہم نے تو درخواست دی ہے۔ آپ سے فیصلے کا حق نہیں چھیننا۔ جو آپ کہیں گی، ہمیں منظور ہو گا۔ لیکن اگر آپ ہاں کہیں گی تو یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔"

بے جی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کی اچھی نیک طبیعت بہو۔ طارق تو ایسے ہی بس۔

عابدہ کی اس چھوٹی سی تقریر نے چاچی خیر دین کی بولتی بند کر دی۔ یہ سچ تھا کہ معصومہ کے لیے رشتے موجود تھے۔ مگر طارق ان میں سب سے اچھا لگ رہا تھا۔ اس لیے کہ جن بھانجوں، بھتیجوں کا بھرم لگایا تھا۔ وہ کم پڑھے لکھے تھے یا پھر زمین داری کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا رشتہ واقعی پرکشش تھا۔ مگر ڈاکٹر شکل کا ماٹھا تھا اور خود کو پری سمجھنے والی معصومہ کو اس جن میں دلچسپی نہیں تھی۔

فوجی والا رشتہ ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ مگر معصومہ نے اعتراض کیا۔ وہ ساری زندگی ٹرانسفر کرا کرا کے گھومے گا تو زندگی گھن چکر بن جائے گی اور چاچی خیر دین کو بھی گوارا نہ تھا کہ اکلوتی بیٹی دور دور گھومے۔

لہٰذا طارق کے پلس پوائنٹ زیادہ تھے۔ چاچا خیر دین کو طارق بہت پسند آیا تھا اور ابا جی کی عزت بہت تھی۔ اس کے نزدیک۔ پکی ملازمت ترقی کے مواقع۔ پھر دو ہی بھائی۔ ایک دور کوئٹہ۔ عید شبرات ہی آئے گا۔ اور ایک کما بھائی جو کبھی بچپن میں دیکھ رکھا تھا۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ زمین دو بھائیوں ہی میں تقسیم ہو گی۔ نند کا سیاپا ہی نہیں۔

وقت رخصت چاچی خیر دین محض ایک اچھی میزبان تھیں جبکہ چاچا خیر دین کی گرم جوشی اچھی امید دلاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھر واپس آکر چولہے کے پاس چائے کے پیالے لے کر ساس بہو نے تین روزہ دورے کی تفصیل

طارق کے حضور پیش کی۔

ابا جی بہت پُر امید تھے۔ چاچا خیر دین نے ہی کچھ یقین دہانی کروائی ہو گی کیونکہ چاچی خیر دین تو منہ پکا کر کے ہی بیٹھی تھیں' دنیا جہان کے قصے کر لیے مگر بس وہی بات نہ کی جو دل کا بھید کھولے۔

"سوہنی تے وہ رج کے ہے۔" بے جی کو یہی خوبی نظر آئی تھی۔ "اکھاں دی نیلیاں تے ہتھ مکھن ورگے پیڑے۔"

طارق نے تھوک نگلا' ساتھوں ہی نے تو جکڑا تھا اور یاں آنکھیں بے جی نیلی کہہ رہی ہیں اُسے تو سبز لگی تھیں یا سرمئی۔۔۔ یا۔۔۔

"ذرا آجائے سامنے' سب سے پہلے یہ پکا کرنا ہے' اصل رنگ ہے کون سا۔" طارق نے مصمم ارادہ باندھا۔

ادھر تبصروں میں بے جی سوہنی سے آگے بڑھتی نہ تھیں۔ یا پھر گفتگو دھاکے بنگال تک ہو آتی مگر معصومہ کا ذکر غائب ہو جاتا۔ عابدہ کے پاس یقیناً "بہت سی باتیں ہو سکتی تھیں' مگر طارق عابدہ سے پوچھنا چاہتا ہی نہ تھا۔ عابدہ خود سے کچھ بول دیتی تو لاپروا ظاہر کرتے ہوئے بغور سن لیتا۔

"باقی سب تو ٹھیک ہے بے جی۔۔۔! بس یہ دھیان رہے۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے' گھرداری میں اتنا ہاتھ نہیں ڈالا اس نے۔ ہمارے آگے کھانا پانی بہرحال وہ ہی لے کر آئی۔ مگر میں نے دیکھ لیا تھا۔ دونوں بھرجائیاں ہی بناتی تھیں سب۔ اور چاچی خیر دین نے یہ تو خود ہی کہہ دیا۔ تندور میں روٹی لگانی نہیں آتی اور کام کا بوجھ انہوں نے خود ہی نہیں ڈالا۔ اگلے گھر جا کر تو سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے ماں پیو کے گھر تو سکھ سے رہے۔

میں چپ بیٹھی سنتی رہی' یہ نہ بولی کہ ماں پیو کے گھر کیا ہو گا تو اگلے گھر جا کر کرنا آئے گا۔ لیکن خیر سر پڑے تو سب سنبھال ہی لیتی ہیں۔"

"میں بیوی بنا کر لاؤں گا بھابی عابدہ! کوئی کامی نہیں لا رہا جو چیچ (ہنر سلیقہ) پوچھوں۔"

بہت خوش دلی سے بولتی عابدہ کا منہ بند ہو گیا۔ وہ کوئی برائی تو نہیں کر رہی تھی۔ بس بات میں سے بات۔۔۔ بے جی نے بھی چونک کر طارق کے لہجے پر غور کیا تھا۔

"کامی بنا کر تو کوئی نہیں لاتا ویرے۔ مگر اپنے گھر بار کو سانبھ کر رکھنا ہی تو عورت کا اصل حسن ہوتا ہے۔ ورنہ میں نے تو ادھر کوئٹہ کے بازار میں یہ اپنے قد جتنی گڈی دیکھی ہے۔ سنہرے بال۔ نیلی آنکھیں گورا رنگ' مگر بس یہ ہے رک کر دیکھ لیتی ہوں۔ شوق کی ماری گھر لے بھی آؤں تو کیا کروں گی۔ شوکیس ہی میں سجانی پڑے گی۔"

عابدہ کا لہجہ بہت نرم اور حقیقت بتاتا ہوا تھا۔ اسے بس ہنسی آ رہی تھی' ابھی سے اتنی طرف داری واہ جی۔۔۔ مگر طارق کا دماغ کہیں اور ہی جا پہنچا تھا۔ اس کے لہجے اور چہرے سے جارحانہ پن جھلکنے لگا۔ جو عابدہ کو حیران کر رہا تھا۔

"آپ یہ کہنا چاہتی ہیں وہ بد سلیقہ ہے' صرف شکل ہے اس کے پاس۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا طارق۔۔۔!" عابدہ کا چہرہ پُر سکون تھا۔

"نہیں چلیں' آپ نے اگر کہہ بھی دیا تو کیا۔ کرتے کرتے سب آجاتا ہے۔ اسے بھی آجائے گا۔"

"اچھا تو پھر لڑائی کس بات کی۔۔۔ بات ختم ہو گئی۔" عابدہ نے پوچھا۔

طارق کے اندر کچھ اور زہریلے جملے بھی بن رہے تھے مگر بے جی نے مداخلت ضروری سمجھی۔

"نہ تم دونوں یہ کس بحث میں پڑ گئے۔ ماں پیو کے گھر کڑیوں کے ایسے لاڈ پیار ہوتے ہی ہیں۔ یہ کوئی لڑنے کی بات ہے۔ وسوزرا (جاؤ بھلا) اور طارق تو ادھر بڈیوں (عورتوں) میں بیٹھ کر کس کرید میں لگا ہے۔ چل جا کر اپنے کام کر۔۔۔ بلکہ نارے کو دیکھ۔۔۔ چار دن تیرے ساتھ رہ کر تیرا ہی ہو گیا شیدائی۔"

بے جی نے لہجہ بدل کر طارق کو وہاں سے اٹھایا۔ عابدہ چائے کے ٹھنڈے گھونٹ بھرنے لگی۔ اور

سوچنے لگی۔

جس نے باپ بھائیوں کو کپڑے دھو کر نہ دیے وہ شوہر کے دھوئے گی؟ یا شاید دھولے اب نئے زمانے میں لڑکیاں بھی تو نئی قسم کی آرہی ہیں۔ نظر کچھ آتی ہیں۔۔۔ ہوتی کچھ اور ہیں۔ کتنے ہی گھروں میں اب ٹی وی آگیا ہے اور لڑکیاں کپڑے کے ڈیزائن تک ٹی وی سے دیکھ کر بناتی ہیں۔ اللہ جانے یہ ترقی کہاں جا کر رکے گی۔

کوہلی جوڑے اور کاجل آنکھوں کے اوپر۔۔۔ فلیپر کے ساتھ بند دامن کی تنگ اونچی قمیص۔۔۔

"ہیں عابدے۔۔۔ بالکل ہی کچ چیچ جی (بدسلیقہ، بے ہنر) ہے۔" بے جی کا لہجہ ہراساں تھا۔ عابدہ بری طرح چونکی۔

"نہیں بے جی۔۔۔ اکلوتی بیٹی ہو تو مائیں ایسی ہو ہی جاتی ہیں۔ اور اپنا گھر تو پھر عورت کو سنبھالنا ہی پڑتا ہے۔" عابدہ کا لہجہ اطمینان دلاتا ہوا تھا۔

بے جی بھی فوراً "پرسکون ہو گئی تھیں۔

"ویسے کڑی سوہنی بڑی ہے۔ اللہ کرے بس جلدی سے خیر کا جواب آئے۔ نیلیاں اکھاں تے مہندی رنگے ہاتھ۔۔۔"

بے جی جھومنے لگیں۔ عابدہ نے ہنسی روکی۔۔۔ مگر خود کو یہ سوچنے سے نہ روک سکی کہ جب کام کاج کیا ہی نہ گیا ہو تو ہاتھ مکھن ملائی خود بخود ہو جاتے ہیں۔ خیر جانے دو۔

چاچا خیر دین کی طرف سے "ہاں" کے پیغام نے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ شادی تین ماہ بعد رکھی گئی۔ بے جی نے حلوائی کو ویڑے میں بٹھا لیا اور ڈھیر گرما گرم جلیبیاں گانے گانے کے لیے آنے والی اہل محلہ کے لیے اترنے لگیں۔ عابدہ کی دفعہ سادگی کا عنصر نمایاں تھا کہ عابدہ کے مولوی ابا جی نے یہی شرط رکھی تھی نکاح جتنی سادگی سے ہو۔۔۔ جبکہ یہاں چاچی خیر دین نے اکلوتی بیٹی کے حوالے سے ارمانوں کی تفصیل یوں بتائی کہ ازبر ہو گئی۔

"ساری دنیا کو جواب دے کر آپ کے گھر آئی ہوں آپا جی۔۔۔ بری ایسی بنانا کہ دنیا دیکھتی رہ جائے۔"

اور یہ کوئی کہنے کی بات تھی بھلا۔۔۔ بے جی نے کس کے لیے سنبھال کر رکھنے تھے زیور کپڑے۔۔۔ اور اب تو عابدہ شہری بھی کہلائی جاتی تھی۔ بری واقعی بہت شاندار بنی کہ کتنی ہی لڑکیوں بالیوں نے ڈیزائن اور رنگ آنکھوں ہی آنکھوں میں ازبر کر لیے کہ اپنی باری میں ایسا تو لازمی بنوانا ہے۔

بے جی بھی ہر بار جب کوئی نئی چیز بنواتیں۔ پیغام کہلوا دیتیں۔ انہیں بھی بڑا اچھا لگتا جب سب تعریفیں کرتیں۔ عابدہ کوئٹہ سے تیاریاں کر رہی تھی۔ بے جی کے گھر لڑکی تو تھی نہیں۔ کتنی ہی لڑکیوں نے جوڑے ٹانکنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

لڑکیاں آتیں۔ بڑی ذمے داری اور سلیقے سے کام نبٹاتیں۔ ہنسی مذاق بھی چلتا اور بے جی ان کے لیے بہترین چائے کا اہتمام کر لیتیں۔ اہتمام بھی کیا سامان منگوا لیتیں۔ کوئی نہ کوئی لڑکی اٹھ کر خود ہی ذمے دار بن جاتی۔ گانے بھی گا لیے جاتے۔ بے جی کا دل لگ گیا۔ رونق ہی رونق ماشاءاللہ۔

اور بے جی کے علاوہ تارے بھی اس میلے سے بڑا خوش تھا۔ اس کی کھوئی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوتی، رنگ برنگے دوپٹے۔۔۔ رنگ ریز سے آئے تب تارے پر پھیلا دیے گئے۔ اب ان پر کرن اور بیل لگنی تھی۔

تارے ان دوپٹوں کو چھو کر دیکھتا اور سونگھ کر۔۔۔ لونہہ مگر سونگھنے سے برا لگا۔ فنائل کی بو۔۔۔ گندی مند

پھر نظر کرن پر پڑ گئی۔ سنہری بھاری گوٹے والی تلے کی کرن اٹھا کر اپنے گلے میں ڈال لی۔ لڑکیوں نے قہقہہ لگایا۔ تو تارے کو لگا اس نے کوئی بڑا ہی اچھا کام کیا ہے۔ مزید شیر ہوتے ہوئے ایک میرون چنری انڈے سر کے گرد کس لی۔ لڑکیوں کے ہنسنے پر خود بھی قہقہے لگائے۔ پھر دھمال ڈالنے لگا۔ لڑکیاں اور ہنسیں، تارے اور خوش ہوا۔ بے جی کی نظر پڑ گئی۔ خونی نگاہ سے تارے کو دیکھا۔ تارے فوراً ساکت ہو گیا۔ دوپٹا بھی دے دیا۔ کرن بھی مرے دل سے لوٹا دی اور بیبا بچہ بن

کرچوکی پر بیٹھ گیا۔

بے جی نے چائے کا پیالہ اور بالو شاہی کی پلیٹ اس کے آگے رکھ دی۔ ذرا دیر پہلے کی شوخی دم توڑ گئی۔ اب پھر وہ سر جھکا کر کھانے لگا تھا۔ پھر پیٹ بھر گیا اب کیا کرے۔ لڑکیاں اپنی باتوں میں مگن۔۔۔

تب ہی نگاہ ڈھول پر پڑ گئی۔ جست لگا کر ڈھول کو اچک لیا۔ انتہائی بھدے پن سے ہاتھ مارا۔ دھام کی آواز پھر دھام دھام۔۔۔ واہ۔۔۔ دھم دھم دھم۔۔۔ دھم دھماد ھم دھماد ھم دھد دھماد ھم۔۔۔

تارے کا چہرہ تمتمانے لگا۔ لڑکیاں پہلے گھبرائیں پھر مسکرائیں اور ہنستی چلی گئیں۔ تارے کو اپنے آپ پر فخر محسوس ہوا۔ وہ کتنے انوکھے کام کرتا جاتا ہے۔ بے جی کو بھی ہنستا تارے بڑا اچھا لگا۔ فوراً" کچھ پڑھ کر پھونکا۔ کہیں لاڈلے کو نظر نہ لگ جائے۔ رب شالا یونہی ہنستا رکھے۔ اور یہ دعا فوراً" قبول بھی ہو گئی۔

تارے نے ڈھول کا بیلٹ گلے میں ڈالا گھر سے باہر نکلا دونوں ہاتھوں سے ڈھول کو پیٹتا آگے کو چلا۔ تھاپ پڑتی تھی تو یوں لگتا تھا۔ دیگوں پر ڈھکن بدسلیقگی سے پٹخے جاتے ہوں۔ لوگوں نے گھروں سے باہر جھانکا اوہ یہ تو تارے ہے۔ بچوں نے بھی جھانکا ارے واہ تارے ڈھول بجاتا ہے۔ گاؤں کی گلیوں میں شام اندھیرے تک تارے نے ڈھول پیٹا اور خوب قہقہے لگائے۔ بڑا خوش رہا گاؤں کے سارے بچے تارے کے پیچھے اچھلتے کودتے ناچتے گاتے۔ تارے خوش۔۔۔ بہت خوش۔

۞ ۞ ۞

تارے کی دلچسپیاں بڑھتی چلی گئیں۔ اس کے لیے سب نیا تھا گیا جی سے لے کر گھر کے ہر فرد کے تقریبات کے حوالے سے گن کر لباس تیار ہوئے تھے۔ تارے کے ایک ایک دن کے تین تین جوڑے۔

طارق کی شادی میں تارے اس انجان پردیسی کی طرح تھا جو اجنبی رسم و رواج کو منہ کھول کر معصوم حیران آنکھوں سے کبھی گھبرا کر اور کبھی شرما کر دیکھتا ہے۔ مگر تارے دیکھنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ۔۔۔ یا نیا کچھ کرنا بھی چاہتا تھا۔ بلکہ کر رہا تھا۔

طارق کو تیل لگا۔۔۔ تارے نے اپنا منہ سر دیکھا دیکھی خود ہی مل لیا۔ بے جی نے طارق کے پیروں میں مہندی لگائی۔ تارے نے بھی ہاتھ پیر رنگ لیے اور بعد میں الٹیاں کرتا پایا گیا کہ چکھنے کی کوشش کی تھی۔

اصل تماشا بارات کے روز ہوا جب۔۔۔

"ایک دو۔۔۔ تین۔۔۔" اور اس سے آگے کی گنتی تارے کو آتی ہی نہ تھی۔ وہ اسی کرسی کے قریب کرسی ڈال کر بالکل طارق ہی کے انداز میں بیٹھا تھا۔ مگر یہ کیا ہر آنے والا نوٹوں کے ہار طارق کے گلے میں ڈالتا تھا۔ اور تارے کے لیے کوئی نہیں۔۔۔ اور برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ (تارے کی حد تو پہلے بھی بہت پہلے آتی تھی) اس نے یکدم ایک مہمان جو طارق کے گلے میں ہار ڈال رہا تھا۔ سے ہار اچکا اور اپنے گلے میں ڈال لیا۔ پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو طارق کے گلے سے تمام ہار جارحانہ انداز سے اچک لیے اور تن کے بیٹھا۔ ایک لمحے کو سناٹا سا چھا گیا یہ تو بدشگونی سی ہو گئی ناں۔۔۔ مگر اگلے ہی پل بیچ جانے والے ایک ہار کو طارق نے خود ہی تارے کے گلے میں ڈال دیا۔

جیسے اسٹاپ کی گئی ویڈیو میں دوبارہ جان پڑ گئی۔ آخر میں رہ گیا سنہری تاروں کا سہرا۔۔۔ اور تارے نے بہتیرے دولہے دیکھے تھے اور یہ سہرے بھی مگر طارق کے منہ پر سہرا۔۔۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ سہرے کو دونوں ہاتھوں سے ہٹایا۔ اندر طارق کا چہرہ۔۔۔ واہ تارے کو مزہ آ گیا۔ نیا کھیل ہاتھ آ گیا' ہاتھ ہٹانا ہاتھ چھوڑنا ایک دنیا تماشا دیکھنے والی۔۔۔ کہ کوئی پل جائے اور سہرا طارق کے منہ سے تارے کے منہ پہ۔

اور یہی ہو جاتا مگر عابدہ تارے کی رمز شناس تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے نکلی اور وہ سہرا جو بڑے سینتے سے اخباروں میں تہہ کر کے بکسے میں سب سے نیچے پڑا تھا۔ نکال لائی۔۔۔ طالب کا سہرا۔۔۔ (جو فوجی صاحب نے بوجہ شدید شرم باندھنے سے صاف انکار کر دیا تھا' صرف پھولوں کے ہار ڈالے تھے) بے جی نے عابدہ کا

منہ چوما ان کی سوہن بنی۔۔۔ عقلاں والی۔۔۔

اور نارے کا فساد شروع ہونے ہی والا تھا کہ اسے بھی سہرا درکار تھا مگر جب عابدہ کے ہاتھ میں سہرا دیکھا، جھپٹ لیا اور خود ہی سر پر رکھ لیا۔ بارات روانگی کے لیے گھر سے نکلی۔ طارق کا سہرا چہرے پہ۔۔۔ اور نارے کا سہرا سر کے پیچھے کمر پر یوں گرا تھا جیسے انگریز گڈی۔۔۔ سنہرے ریشم بالوں والی۔۔۔

فوجی بینڈ کی دھن کے ساتھ بارات لمبا سفر کر کے شہر پہنچی۔

لڑکی والے استقبال کے لیے دیدہ و دل وا کیے منتظر تھے۔۔۔ پہلا ہار نارے کے گلے میں ڈالا۔ وہی تو سب سے آگے نمائندہ تھا۔ ڈھیروں نوٹوں کے ہار، گلے میں ڈھول، جھومتا بھاگتا۔۔۔ انوکھا شہہ بالا۔۔۔ محمد طاہر پرویز عرف نارے۔

یہاں تک کی نارے کی زندگی کو وہ لوگ دیکھ رہے تھے جو اسے پیدائش کے دن سے جانتے تھے ان سب کے لیے نارے کے کسی عمل میں حیرانگی یا شرمندگی نہیں تھی۔ نارے اللہ لوک "نارے سائیں"۔ مگر لڑکی والے گھر میں دنیا کے لیے نارے حیرانگی اور شاید مضحکہ خیز چیز تھا لیکن بارات کی عزت و احترام تشریف آوری تک اندازہ ہو گیا عجیب حرکتیں کرتا عجیب اخلاقت نظر آتا وہ شخص دولہے کے وڈے پاء جی ہیں۔ اور دولہا نے خود بیٹھنے سے پہلے بھائی کی کرسی کو ذرا آگے سرکایا تھا۔

چاچا خیر دین نے لال شربت کا ٹھنڈا گلاس اباجی کے آگے کیا۔ اباجی نے گلاس ٹیبل پر رکھا تھا اور جگ ہاتھ میں لے کر نارے کی جانب بڑھایا۔ پھر سب نے دیکھا، پہلے نارے نے سیر ہو کر شربت پیا۔ اس کے بعد بارات کے باقی بندوں نے گلاس تھامے۔

دوسری جانب چھتوں دیواروں کونوں کھدروں سے منتظر عورتیں لڑکیاں بارات دیکھنے کے جوش و خروش سے گرتی پڑتیں۔۔۔ ایسی ہی ایک کھڑکی سے معصومہ کی سہیلیاں بھی چپکی کھڑی تھیں کچھ سہیلیاں تھیں۔ کچھ شریکنیاں۔۔۔ جو بھی سہیلیاں تک معصومہ کی چھپ دیکھ کر دل کے اندر امنڈتے حاسدانہ جذبات کو بمشکل بہلا پا رہی تھیں تو دو سروں کا کیا حال۔۔۔ چاچی خیر دین نے بے جی سے اچھی بری بنانے کی فرمائش کی تھی تو خود بھی اکلوتی بیٹی کے لیے کسر نہیں چھوڑی تھی۔

اتنے زیور تو کوئی اکلوتے بیٹے کی بری میں نہیں چڑھاتا جتنے اس وقت معصومہ کے تن پر سجے تھے۔

چاچی خیر دین نے ہونے والے داماد کی تعریفوں میں اتنے پل باندھے تھے کہ لگتا تھا کسی ریاست کا راجہ مہاراجہ معصومہ کو بیاہنے آرہا ہے۔

مگر ادھ کھلے پٹ سے جو نظر آرہا تھا "یہ وہ تھا؟

ایک سہیلی نما حاسد نے قہقہہ لگایا اور کھڑکی سے ہٹ گئی۔ سب نے حیرت سے اسے دیکھنا شروع کر دیا۔ سہیلی نے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے تالی پیٹی اور ہنستے ہنستے رکوع میں چلی گئی۔ دولہن بنی معصومہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ حیرت سے دیکھنے لگی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا یہ تعریف ہے یا۔۔۔

"مان گئے معصومہ! چاچی صحیح کہتی تھی ہس کے جوائی جیسا جوائی پہلے کبھی اس شہر میں آیا ہی نہیں۔۔۔ ہاہاہا۔" وہ تو لوٹ پوٹ ہونے کو تھی۔

حیران معصومہ پریشان ہو گئی۔ ایسا کیا دیکھ لیا۔ اس نے طارق کو بارہا دیکھا تھا اور وہ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر شرمایا جائے مسکرایا جائے اور دیکھا تو لازما" جائے مگر ایسا تو نہیں تھا۔ وہ لڑکیں فارغ بیٹھی یوں بھی خدشے پالتی ہیں۔ معصومہ کا معصوم دل بھی دھڑک دھڑک گیا۔ وہ سارا دولہناپا بھول تیزی سے اٹھی اور کھڑکی تک آئی۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی رقم تھی کہ اسے راستہ دے دیا گیا اور سامنے بیٹھا وہ شخص دولہا ہی لگتا تھا۔ مگر معصومہ کا دولہا تو طارق تھا۔ تو پھر یہ۔۔۔ اس سے پہلے کہ معصومہ چکراتی اسے یاد آگیا۔ "یہ جو سامنے پینٹ شرٹ والے ہیں۔ وہ بڑے بھائی جی طالب ہیں اور جن کو تم لوگ دولہا کہہ رہی ہو، یہ سب سے وڈے پاء جی طاہر ہیں۔"

"ہیں وڈے پاء جی۔۔۔ ایسے ہوتے ہیں وڈے پاء جی

بھلا۔ لڑکیوں کی مشترکہ سوچ تھی۔

اسی وقت مولوی صاحب نکاح کے رجسٹر لیے آ گئے۔ کرسیوں کی ترتیب بدل گئی تھی۔ تارے کو اباجی نے نرمی سے ذرا دور کر دیا۔ وہ بھی اب مٹھائی کا ڈبا لے کر سب فراموش کر چکا تھا۔

"دیکھ کے معصومہ! تیرا دولہا کہیں وڈے پاء جی پر نہ چلا گیا ہو۔" کسی سہیلی نے شوشہ چھوڑا۔ معصومہ جواب دیے بغیر اپنی جگہ پر لوٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے درشتی جھلکتی تھی۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اس کا جو تپ رہا تھا اور اسے رونا آ رہا تھا بہت سارا۔ مگر ضبط کیے رہی۔ حیرت تھی کہ کہاں تو وہ سب کے جل جانے کا خیال کرتی تھی اور اب اپنے اندر بھانبڑ جل رہے تھے۔ غصہ دراصل تھا کس پر۔ اس وقت سمجھ میں نہ آیا۔

ایجاب و قبول کے بعد طارق کا سہرا کھول دیا گیا۔ تو واقعی ہر بندے نے چاچی کے جوائی کی تعریف کی۔ بانکا سجیلا نوجوان۔ معصومہ کو ساتھ لا بٹھایا گیا۔ ماشاءاللہ چاند سورج کی جوڑی۔ پھر بری دکھائی گئی تب بھی عورتوں نے انگلیاں منہ میں ڈال لیں۔ کپڑے تو کیا جوتیاں، چوڑیاں، زیور۔ ہر چیز زیادہ۔ اور قیمتی خوب صورت۔ دیکھنے کی چیز تھی معصومہ کی بری۔ اور معصومہ کا دولہا بھی اور معصومہ کے وڈے پاء جی۔ جنہوں نے بد (میوے چھوہارے) بٹنے پر پھندا ڈال دیا تھا اور پورا تھیلا اپنے قبضے میں کر لیا۔ اسی پر بس نہیں بعض کے تو ہاتھوں سے چھوہارے جھپٹے۔ چاچا خیر دین اور اباجی نے ہاتھ جوڑ کر معذرت کی "اللہ لوک ہے سائیں ہے۔"

اور میزبان سارے کے سارے۔ وڈے پاء جی کی حرکتوں پر شروع کی حیرت اور ہنسی کے بعد موؤب سے ہو گئے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے، باراتی وڈے پاء جی کو عزت دیتے ہیں کچھ کہتے نہیں بلکہ سب کا انداز فدویانہ ہے۔ مرید سا۔ جیسے وڈے پاء جی کسی وڈے درجے پر ہوں۔

اور درجہ سب سے الگ تو تھا۔

بے جی کا سائیں، بے جی کی عرضی۔

اللہ لوک۔ بے ضرر تارے (ہاں وہ اب پہلے جیسا تارے تو نہیں رہا تھا۔ عابدہ کے چلے جانے کے بعد تو اسے جیسے روگ ہی لگ گیا تھا۔ یہ تو بس گزشتہ اک ڈیڑھ ماہ سے۔ تارے بدل گیا تھا نیا تارے۔ خوش تارے ہنستا مسکراتا۔ شوخیاں کرتا۔)

گاؤں کی کئی عورتیں اسے کسی ولی کا درجہ بھی دے گئی تھیں۔ جس کا دل دکھانے سے اللہ ناراض ہو گا اور جس کی خفگی اچھی نہیں۔

تارے کو دیکھنے والے، جاننے پہچاننے والے ہر شخص نے جان لیا تھا۔ اللہ نے تارے کو کیوں بنایا تھا۔ اس لیے بنایا تھا کہ شکر گزار ہو جاؤ، میں ایسے انسان بھی بنا سکتا ہوں اور سجدہ ریز ہو جاؤ کہ تم ایسے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

تم پورے ہو۔ مکمل ہو۔

طاقت ور کا کام ہے کمزور کی ڈھال بنے۔ آنکھ والے کا کام ہے نابینا کو راستہ دکھائے اسی طرح عقل والے کا فرض ہے، بے عقلی کو ڈھانپ لے در گزر کرے۔

مگر نہیں۔ معصومہ کے لیے وہ ایک نئی صورت تھا۔ ایک اچنبھا۔ ایک سوال کہ کیوں۔ ؟ ایک شرمندگی۔ اک خلش۔ اک کڑواہٹ۔

☼ ☼ ☼

دولہن کو کھانا تینوں وقت کمرے ہی میں دے دیا جاتا تھا کہ سب کے درمیان جھجک کی ماری کھا ہی نہ پائے۔ مگر جس دن طالب اور عابدہ نے واپس جانا تھا۔ اس دوپہر کا کھانا سب نے برآمدے میں دستر خوان لگا کر کھایا۔ زیور کپڑے سے سجی سنوری معصومہ بھی دستر خوان پر آ بیٹھی۔

اس کے دونوں ہاتھوں میں سونے اور کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ سرخ ہتھیلیاں۔ سرخ ناخن۔ کھلے رنگ کا سنہری کام سے بوجھل سوٹ۔ کرن لگا دوپٹا جس کا وہ تقریباً "گھونگھٹ" نکالے ہوئے تھی۔ گندمی گال سرخ تھے اور پلکیں حیا سے جھکی جھکی سی۔

کھیر۔ پلاؤ۔۔۔ گوشت آلو' دہی کا رائتہ اور تندور
سے آئی گرم گرم روٹیاں' ابا جی ایک احساس تشکر سے
اپنے کنبے کو دیکھتے تھے۔ بے جی نے تو کتنی ہی آیات
پڑھ کر پھونک دیں۔ کہیں نظر نہ لگے۔ ہلکی پھلکی گفتگو
کا متن عابدہ اور طالب کی واپسی کا سفر تھا۔ موسم ٹھنڈا
تھا اور بے جی اس حوالے سے فکر مند تھیں کہ شجاع
اور رافع کو ٹھنڈ نہ لگ جائے پہلے ہی گلا بند ہے۔

طارق کے انداز میں شوخی تھی مگر بڑوں کا احترام
ملحوظ خاطر تھا۔ گفتگو میں پیش پیش رہنے کے باوجود ساری
توجہ کا مرکز معصومہ کی ذات تھی۔ جو یقیناً" اس کی
شوخ نگاہوں اور بڑوں کے احترام کے پیش نظر دوپٹے کو
ماتھے سے خوب نیچے تک کھینچ چکی تھی اور کھانا اتنی
رغبت سے نہیں کھا رہی تھی۔ تھوڑے سے چاول
لیے' بے جی نے دو تین بار اچھی طرح سے کھانے کی
تلقین کی' عابدہ نے تو کھیر کا پیالہ بھر کے آگے رکھ دیا۔
البتہ سالن روٹی کے لیے معصومہ نے قطعیت سے
منع کر دیا۔ ہو سکتا ہے۔ اسے پلاؤ زیادہ پسند ہو۔ عابدہ
نے سوچا۔

مگر حقیقت عابدہ اور طارق کی سوچ سے قطعاً"
مختلف تھی۔ معصومہ نے گھونگھٹ سا اس لیے نکال
رکھا تھا کہ وہ نارے کو غیر ارادی طور پر بھی دیکھنے سے
بچی رہے اور سالن روٹی اس لیے نہیں کھا رہی تھی کہ
جس طرح سے نارے کھا رہا تھا۔ اس سے اسے ابکائی
آتی تھی۔ بلکہ دل کرتا تھا نارے کو فوراً" یہاں سے
اٹھا دے یا پھر خود بھاگ جائے۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ ناممکن تھا۔ تو حتی الوسع خود کو
دیکھنے سے بچائے وہ دھیان بٹانے کی کوشش میں تھی'
اور ناکام تھی۔ اس لیے کہ نارے دکھائی نہیں دیتا
تب بھی سنائی دے رہا تھا۔ سمجھو جس کونے میں
نارے براجمان تھا وہاں دھما چوکڑی کا عالم تھا۔ بے جی
نے بڑے سلیقے سے نارے کے گریبان میں تولیہ اڑس
رکھا تھا مگر نارے کی بوٹیاں کھانے کی کوشش اور لقمہ
بنانے کی عجلت۔۔۔ انگلیوں سے ٹپکتا شوربا۔ وہ کھانا
کھاتے آواز بھی نکالتا تھا۔

واقعی کسی اجنبی کے لیے یہ منظر کوئی اتنا خوش کن
بھی نہیں تھا اور بے جی اس بات سے واقف تھیں۔
نارے کو ہمیشہ اپنے پاس بٹھا کر تحمل سے کھانا کھلا دیا
کرتی تھیں مگر یہ تو ایک الوداعی کھانا تھا' سب اہل خانہ
مل کر بیٹھے تھے۔ پھر نجانے کب موقع ملتا۔ گاڑی
پکڑنے کی عجلت تھی۔ کھانا ابھی ہی تو تیار ہوا تھا ورنہ
بے جی نارے کو پہلے ہی کھلا دیتیں (بعد میں کھلانے کا
خیال مشکل تھا۔ نارے میں کب تھا اتنا تحمل کہ وہ
بھوکا بیٹھ کر سب کے کھالینے کا انتظار کرے)

معصومہ کو نکال کر باقی سب اس چیز کے عادی تھے۔
معصومہ کے علاوہ سب جانتے تھے۔ نارے
آزمائش ہے' نارے امتحان ہے۔۔۔ بے جی کا صبر نارے۔۔۔
بے جی کی دعا نارے۔۔۔ بے جی کی آزمائش نارے۔۔۔
ماں کے پیروں تلے جنت ہے اور اگر اولاد ایسی ہو تو
جنت کا درجہ۔۔۔ کون سا۔۔۔؟

مگر معصومہ کا ذہن ابھی وہاں تک نہیں پہنچا تھا کہ
گہرائی ناپتی اور سوچ بچار کرتی۔ اس وقت تو جب اس
نے شکایتی نگاہیں شوہر کی جانب اٹھائیں تو مزید حیران
رہ گئی۔

طارق بہت محبت سے تولیے سے اس کی انگلیوں کو
پونچھ رہا تھا۔ پھر اس نے منہ بھی بالکل صاف کر دیا اور
نارے قرینے سے کھانے کے آداب سے ناواقف تھا۔
مگر پیٹ بھر جانے کے بعد اسے اپنے گندے ہاتھوں
سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ معصوم بچے کی طرح ہاتھ
کسی کے آگے کر دیتا تھا۔ تھوڑی اٹھا دیتا اب اس کا کیا
کرے اور سامنے والے مدعا جان کر منہ ہاتھ صاف کر
دیتے۔ تب نارے پرسکون ہو جاتا کہ نارے کوئی گندا
غلیظ تھوڑی تھا۔

اس ماں کا بیٹا تھا جو آج بھی اسے نہلا دھلا کر پاؤڈر
تیل اور سرمہ اس اہتمام سے لگاتی تھیں۔ جیسے چار ماہ
کے بیٹے کو مائیں سجاتی ہیں۔

تو اس وقت جب طارق نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔
تب نارے خوش ہو گیا۔ ہلکا پھلکا ہو گیا اس نے خوشی
کے اظہار کے لیے طارق کا گال بڑی زوردار آواز سے

چوم لیا۔ طارق ہنس پڑا۔ تارے یوں شرمایا جیسے کارنامہ انجام دینے پر داد ملی ہو۔
معصومہ کے لیے حیرت اب صدماتی تھی۔ چاچی خیردین نے بیٹی کو گھر بسانے کے لیے جائز و ناجائز ڈھیروں پٹیاں پڑھائی تھیں۔ ایسے تو کیسے اور ویسے تو جیسے۔ مگر یہ۔ ابھی تو معصومہ شادی کے روز سہیلیوں کا وہ مذاق بھی نہیں بھولی تھی۔ ایک خجالت۔ ولیمہ پر آنے والیوں نے کھوجتی نگاہوں سے تارے کو ڈھونڈا تھا۔
"تیرے جیٹھ جی نظر نہیں آتے معصومہ۔؟"
(تارے کی ولیمہ والے روز مرغوں کی لڑائی تھی۔ تارے نے ولیمہ پر لعنت بھیجتے ہوئے سارا دن کھیتوں میں گزارا تھا۔)
ولیمے کی تقریب کے خاتمے پر جب ڈھنڈیا مچی۔ تب طارق معصومہ کے گھر سے آئے مہمانوں سے معذرت کرتا خود ڈھونڈنے چلا گیا۔
سب نے کہا تھا وہ ابھی تو میدان ہی میں تھا۔ مگر اب کہاں ہے پتا نہیں۔
روتا دھوتا نڈھال تارے۔ طارق کو ملا۔ نیا جوڑا مٹی مٹی اور خود بھی جیسے مٹی میں لوٹنیاں لگائی تھیں۔ طارق کے پچکارنے پر بمشکل بتایا۔
"تارے بھکا" (تارے کو بھوک لگی ہے) طارق نے خود منہ ہاتھ دھلوا کر تارے کو ٹرے میں میٹھے چاول نکال کر دیے۔ جسے بھوک کے مارے نے دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کے منہ میں ڈالا۔
معصومہ کی شرمندگی حد سے سوا ہو گئی۔ اسے صرف اپنی بے عزتی نظر آرہی تھی وہ ٹھٹھا جو سب نے اس کا اڑانا تھا اپنی سوچوں میں مگن بےوقوف نے یہ نہیں دیکھا۔ عابدہ نے دھلی چادر ننگی منجی پر ڈال کر پھر تارے کو بیٹھنے دیا تھا۔ گاؤں کے ایک من چلے نے بڑی ذمہ داری سے تارے کے آگے پانی کا جگ رکھا تھا۔ اور دیگ والا چوکی دیگ کے نزدیک ہی دھر کے بیٹھ گیا تھا کہ تارے جب اور مانگے تو وہ فوراً پیش کر سکے۔
یہ ایک عجیب سا احترام تھا یا خوف خدا۔

تارے پیٹ بھرنے کے بعد اب وہیں لیٹ گیا۔ عابدہ بچوں اور سامان کو سنبھالتی گھر سے نکل رہی تھی۔ دروازے پر تانگہ آچکا تھا۔ پر نکلتے نکلتے عابدہ ٹھٹکی اور پھر اندر کمرے میں جا گھسی کچھ بھول گئی ہو گی۔ معصومہ نے سوچا۔ واپس آئی عابدہ کے ہاتھ میں تکیہ تھا۔ جو اس نے بعد احتیاط بے خبر سوتے تارے کے سر کے نیچے دے دیا۔ پھر بچے کو شانے سے لگائے دہلیز پار کر گئی۔
تارے کو زمانے ہوئے نہ عابدہ سے دلچسپی تھی نہ عابدہ کے کاکوں سے۔ کھانا کھانے کے بعد اسے ایسے ہی نیند آتی تھی۔ جہاں دل چاہا پڑ گیا۔
طالب سب سے گلے ملا۔ بے جی کی آنکھیں نم تھیں۔ بیٹے کے گال زور زور سے چومے تھے۔ اب زیر لب دعا پڑھ رہی تھیں۔ طالب نے بھی نکلتے نکلتے تارے کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ پھر ہاتھ کو بھی چوم لیا۔ معصومہ ہکا بکا۔
اسے دھچکا تو نہیں کہیں گے مگر بے جی نے مہینہ ڈیڑھ مہینہ ہی میں بھانپ لیا۔ نئی بہو صورت شکل، رنگ روپ قد کاٹھ ہی میں نہیں عادات و خصائل مزاج۔ طرز زندگی کے حوالے سے پرانی بہو کا بالکل الٹ تھی۔
بیٹا صورت پر ریجھا تھا اور وہ بھی گلگلے ہاتھ اور نیلی آنکھوں کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھیں۔ تو طارق تو پھر جوان لڑکا تھا۔ یہ سب یوں ہی ہونا تھا۔
اپنے دھیان میں گم بندے کے سر سے سورج سرک جائے اور بادل چادر تان لیں تو نگاہیں خود بخود اوپر اٹھ ہی جاتی ہیں۔
سو عابدہ اور معصومہ کے بیچ کا فرق بھی بے جی پر اور سب پر یوں ہی منکشف ہو گیا تھا کہ دراصل معصومہ ہے کیا؟
عاشق ہونا اپنے آپ ہی میں ایک بڑی مصیبت ہے۔ نری تباہی۔ سراسر بربادی۔
اور معصومہ عاشق تھی اپنے آپ کی۔
عشق کسی اور سے ہو تو نامور ی۔ کہ بدنام ہوں

گے تو کیا نام نہ ہو گا۔

عشق اپنے آپ سے ہو تو بڑا ہی غرق۔

خود اذیتی اپنی جان پر عذاب ہوتی ہے۔ اور خود ستائشی۔۔۔ دوسروں پر۔۔۔ اور معصومہ اسی علت میں مبتلا تھی اور اس کی بھی بڑی مصیبتیں۔

خود کو چاہنے والے پھر کسی اور کو نہیں چاہ سکتے۔

اپنی ہی پوجا کرنے والے لوگ پھر کب کسی اور در پر جھک سکتے ہیں۔ کبھی نہیں۔۔۔ صبح شام بس اپنی ہی آرتی اتارتے ہیں۔ خود پر ہی چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ وان پن سب اپنے لیے۔۔۔ نذر نیاز بس اپنے حضور۔۔۔

آپ ہی مرشد۔۔۔ آپ ہی مرید۔

خود پر نچھاور ہوتے خود پرست لوگ۔۔۔ خود پرستوں کے دل نہیں ہوتے۔ خود پرستوں کی آنکھ بھی نہیں ہوتی۔ اپنے آپ میں مست ملنگ یہ لوگ پھر کسی کے دل میں بھی نہیں ہوتے۔ پھر کسی کی آنکھ میں بھی نہیں ہوتے ہیں۔ مگر کہیں ہوتے معصومہ وہ مورنی تھی جو جنگل میں ناچ کر خوش ہوتی ہے۔ ایسی مورنی جس کی نظر کبھی اپنے پیروں پر نہیں جاتی (دیکھ لے تو جائے تو اوقات یاد آجائے کہ بہت کچھ ہے مگر کچھ نہیں بھی ہے)

خود پرست اس کتھک رقاصہ کی طرح ہوتے ہیں جو ناچتے ہے کبھی کسی سے آنکھ نہیں ملاتی۔ ہاتھوں پیروں کی تھی ہوئی جنبش۔۔۔ بے تاثر آنکھیں۔۔۔

جسم کا ہر عضو بولتا ہے۔ بس آنکھ گنگ ہوتی ہے۔

ایک جم غفیر کے ہوتے ہوئے اپنے ہی نرت بھاؤ میں گم۔۔۔ تھا تھئی تھا۔۔۔ تھا تھا تھا۔

بے خودوں سا کھلا میدان نہیں ہوتا کہ رقص مجنونانہ میں ملنگ یہاں سے نکلا۔۔۔ تو وہاں تک پہنچا۔

اور عشق نکما بھی کر دیتا ہے۔

بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے۔ اور بات تو پھر وہی آ گئی۔۔۔ کہ جاناں بھی اگر خود ہی ہو تو۔۔۔ لہٰذا۔۔۔ معصومہ نکمی بھی جی بھر کے تھی۔

اب کہاں سے شروع کریں۔۔۔ اور کہاں ختم۔

✿ ✿ ✿

دوسری جانب شدید دھچکے اور صدمے سے معصومہ کی معصوم ذات بھی دوچار ہوئی تھی۔ معصومہ کو یہاں رہنا تھا ڈیرہ شاہو۔۔۔ ساس سسر کے ہمراہ۔ وہ طارق کے ساتھ شہر نہیں رہے گی۔ شہر جو اس کی ماں کا گھر تھا اور حاجی خیر دین نے تو اپنے ہی محلے کے ایک گھر سے بات بھی کر لی تھی کہ شروع کے تین چار ماہ بعد معصومہ جب طارق کے ساتھ مستقل رہنے آجائے گی تو اس گھر میں رہے گی۔

خیر سے جب پہلی بہو کو شوہر کے ہمراہ روانہ کر دیا تو...

معصومہ کا کیا وہ اچار ڈالیں گی اور طارق تو خیر سے معصومہ کے عشق میں ایسا گرفتار ہے کہ۔۔۔ بس۔۔۔

مگر طارق کے تو سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ معصومہ کو یہاں لائے گا بلکہ اس نے تو سوچا ہی نہیں۔ ڈیرہ شاہو کوئی دور تو نہیں تھا۔ پورا ہفتہ ڈیوٹی دینے کے بعد جمعرات کو عصر کی نماز گھر آکر ادا کرتا اور جمعہ کی چھٹی گزار کے ہفتے کی صبح ناشتے کے بعد پورے وقت پر آفس بھی پہنچ جاتا۔ اپنی کسی رخصت اتفاقی کو جمعرات کے ساتھ ملا لیتا تب دو روز پہلے ہی آجاتا۔ تو پیچھے کیا بچے صرف پانچ دن۔۔۔

اور معصومہ حق دق رہ گئی۔ اس کا تو خیال تھا طارق اس کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا اور وہ تو پورے پانچ چھ دن مزے سے غائب ہو جاتا۔

خوش دلی سے خدا حافظ۔۔۔ ہفتہ بعد جوش سے السلام علیکم۔

جتنی حیرت، صدمہ اور مصیبت معصومہ کے اوپر آن پڑی تھی۔ وہ کسی۔۔۔ کسی ایک انسان کے بھی ذہن و گمان میں نہیں تھی۔ گاؤں کے ہر دوسرے گھر کی بیٹی یا بہو ایسی ہی زندگی گزارتی تھیں۔ معصومہ کا شوہر تو پھر بھی دو ڈھائی گھنٹے کی دوری پر تھا اور مہینے میں چار چکر لگاتا تھا۔ جبکہ دوسری کئی عورتوں کے شوہر ملک سے باہر تھے۔ کئی لاہور اور کراچی بوجوہ ملازمت۔۔۔ تو لوگ معصومہ پر رشک کرتے تھے۔ مگر معصومہ خود پر ترس کھاتی تھی۔

اور بات پھر وہیں آکر ٹھہر جاتی ہے۔ انسان نرم دل

ہو، غم زدہ ہو۔ ستم رسیدہ۔۔۔ کسی دوسرے پر ترس
کھائے تو رقیق القلب ہو جاتا ہے۔ دل بھرتا ہے اور
آنکھ سے ٹپکتا ہے اور۔۔۔ انسان خود پر ترس کھائے۔
بات وہیں پھر معصومہ کی اپنی ذات پر آکر رکتی تھی۔
"میں" کا کلمہ۔۔۔
"میں" کے دکھڑے۔۔۔
دراصل دنیا میں فساد کی جڑ "میں" ہی تو ہے۔
آہ بے چاری معصومہ۔

☼ ☼ ☼

مشکل زندگی تھی یہ۔۔۔ دنیا کی آنکھ سے دیکھتے تو
معصومہ کے عیش تھے۔ سیاہ و سفید کی مالک تھی، وہ گھربار
سب اس کے حوالے مگر۔
معصومہ کی زندگی مصیبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔
کہاں تو ایسی زندگی کا خواب کہ وہ اکیلے گھر میں رہے گی۔
طارق کام پہ جاتے وقت اسے اماں کے گھر چھوڑے
گا اکیلے پن کا خیال اور وہ ہر روز خوب تیار شیار ہو کر ملا
کے گھر جائے گی۔ وہاں آنے جانے والوں کے
جمگھٹے میں رانی بن کر بیٹھے گی۔ دوپہر کا کھانا وہیں
کھائے گی۔ رات کے لیے اماں سے لیتے ہوئے بھی جا
سکتی ہے۔ ورنہ چلو پکالے گی۔
بڑی ہی شاندار زندگی۔۔۔ مگر اب یہاں پورے گھر
کی دیکھ بھال معصومہ کے ذمے تھی۔ اباجی اور بے جی
تہجد گزار۔ معصومہ بمشکل نماز پڑھ پاتی اماں کے گھر تو
نماز چھوڑ ہی دیتی۔ یہاں بے جی آواز لگاتی تھیں اور آنا
کانی کی گنجائش نہیں تھی۔
اباجی نے گائے اور بھینس گھر سے باہر رکھی تھیں۔
اور انہیں سنبھالنے کے لیے تنخواہ دار ملازم تھا۔ مگر گھر
کے اندر دودھ آنے کے بعد اسے سلیقے سے گرم کرنا،
جاگ لگائے دودھ کو بلونا سے شروع ہونے والے کام
رات دوبارہ جاگ لگانے (دہی جمانا) پر ہی ختم ہوتا تھا۔
اور باقی کے پورے دن کی ذمہ داریاں۔۔۔ یہ اتنی ساری
بھی نہیں تھیں۔ ہلکی نہیں تھیں تو بھاری بھی نہیں
تھیں۔

مگر جب معصومہ ایک کام کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔
تو ایسا لگتا جیسے کسی شکنجے میں جکڑی ہو۔ بیگار میں پڑ گئی
ہو اور کام تو روتے دھوتے کر لیتی طارق سے ضد کر کے
ایک مستقل کامی بھی رکھوائی مگر وہ اپنے گھربار کو
سنبھالنے کے بعد نو بجے کے آس پاس آتی اور نو بجے
سے پہلے تک کرنے کے سو کام تھے۔ جو معصومہ کی
سانس خشک رکھتے۔
گاؤں کی ہر عورت چھوٹی بڑی کے حساب سے
معصومہ اس ڈھب سے رہتی تھی جیسے چوہدرائن ہو۔
شکل کی تو ملکہ رانی پہلے ہی تھی۔ مگر کوئی معصومہ سے
بھی تو پوچھتا۔ وہ اپنی اماں کے گوڈے لگ کر آٹھ آٹھ
آنسو روتی۔ مگر تابعدار، فرماں بردار جوائی آنکھ بند کر
کے کھوہ کے بیل کی طرح چکر تو کاٹ سکتا تھا مگر اپنی
بات سے پیچھے ہٹنے والا نہیں۔
معصومہ بی بی نے رہنا وہیں گھر میں تھا۔ طارق نے
بڈھے وارے ماں پیو کو بے یار و مددگار چھوڑ کر کیا لوگوں
سے تھو تھو کروانی تھی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
اور کام کاج۔۔۔ شہر گاؤں۔۔۔ ماں بیٹی ان سب سے
بڑے گھر سے نکل بھاگنے کی سب سے بڑی وجہ تارے
تھا۔

☼ ☼ ☼

تارے نے عاپا سے دوستی کی تھی۔ تارے کو
معصومہ سے شرم آتی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی گھبرا جاتا
تھا بعض دفعہ تو منظر سے غائب ہو جاتا۔ سر میں کوئی
سودا سمایا ہوا ہے تو اور بات ہے۔ ورنہ اب تارے
چپ رہتا تھا۔ کہیں بھی پڑا تارے۔۔۔ ہاں بھوک
برداشت نہیں ہوتی تھی۔
معصومہ کے لیے اس کی روٹی ڈالنا عذاب ہوتا۔ وہ
روٹیاں اباجی کی۔ دو بے جی، دو ہی معصومہ اور ان چھ
ناشتے کی روٹیوں کے بعد جب تارے کی چھ روٹیوں کی
باری آتی۔ معصومہ کا جیسے دماغ الٹ جاتا۔
وہ بہت بے دردی سے تھپ تھپ ہاتھ پر پیڑہ
جھلاتی۔ توے پر یوں ڈالتی جیسے تارے کے گال پر ایک

الٹے ہاتھ کا جھانپڑ جمارہی ہو۔

اس کے لیے سالن نکالتی تو نمک مرچ تیز کر ڈالتی۔ شروع کے سال میں تو ساس کی شرم اور ڈر شامل تھا۔ مگر پھر بعد میں اس نے اپنے جذبات کو مخفی رکھنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔

بہو کے گن بے جی پر بہت جلد کھل گئے تھے۔ فطرت آشنائی ہو چکی تھی۔ بہو کام چور تھی۔ مارے باندھے ذمہ داریاں نبھاتی تھی۔ اکثر منہ بنا کر یوں اپنے کام سے کام رکھتی جیسے اس اتنے بڑے گھر میں اور کوئی رہتا ہی نہ ہو کہ جس سے کلام کیا جا سکے' اور تارے کا نظر انداز کیا جانا تو بے جی نے سب سے پہلے بھانپ لیا تھا۔ پھر یہ پتا چلا' وہ تارے کو ناپسند کرتی ہے۔ بے جی نے صبر کیا۔ تارے سے نفرت کرتی ہے۔ (توبہ!) اللہ... کوئی بات نہیں تارے سے گھن کھاتی ہے۔ بے جی کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ مانو کسی نے دل اور آنکھیں نوچ کر چرواہے کی گزرگاہ پر ڈال دیں۔

"جا معصومہ تیرا ککھ نہ جائے (جا معصومہ تیرا تنکے کا بھی نقصان نہ ہو) بے جی کے دکھی دل سے آہ نکلتی۔ (بے جی ایسی بددعا ہی دے سکتی تھیں)

اور دوسری طرف تارے ایک رجسٹرڈ بے عقلا تھا۔

مگر نفرت اور حقارت تو پتھر کو بھی سمجھ میں آتی ہے۔ جب ہی تو ٹکڑوں کی ٹھوکر کھاتے کھاتے اک روز کھل جاتا ہے۔ اکثر گھروں کی دیوڑھیاں گھسی ہوئی ہوتی ہیں۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے' زندگی بھر محبتیں سمیٹتا تارے اس ناپسندیدگی' بیزاری اور نفرت کو پہچان نہ جاتا۔

معصومہ کی آنکھوں میں سے شرارے لپکتے دیکھے (دانت بھینچ کر آنکھوں سے دبکاتا) شرماتا تارے ڈرنے لگا اس سے۔ مگر۔

تارے کے اندر رویے جانچنے کی سمجھ تو تھی۔ مگر حل نہیں تھا۔ معصومہ اس کے سالن میں نمک بڑھا دیتی۔ چپکے سے کئی ہری مرچ ڈال دیتی۔ تارے تڑپ اٹھتا اور جگ کا جگ خالی ہوتا۔

بے جی ہر وقت تارے کی نگران تھیں۔ نگہبان تھیں۔ مگر بڑھاپے نے قویٰ کمزور کر دیے تھے۔ دکھائی بھی کم دیتا تھا۔ تارے کے بالکل ذاتی کام وہ آج بھی خود کرتی تھیں۔ اس کا منہ دھلاتا' صاف کپڑے پہنا کر تیار کرنا۔ اس کے پیدا ہونے کے دن سے آج تک یہ روٹین نہیں بدلی۔ وہ آج بھی تارے کو چوکی پر بٹھا کر نہلا دیا کرتیں۔ مگر اب وہ ہمت نہیں رہی تھی۔ تو یہ تفصیلی صفائی او پاکیزگی کا کام طارق بروز جمعہ پوری ذمہ داری' لگن اور محبت سے سرانجام دیتا اور بے جی سے نہانے میں تارے کو مزہ نہیں آتا تھا جیسے کہ طارق کے نہلانے سے... جمعہ کے دن وہ مسجد بھی جاتا اور نماز ادا کرتا' تارے کو ہمیشہ آخری صف کا کونہ دیا جاتا۔ طارق نے جلدی پہنچ جانے کے باوجود آخری صف ہی میں کھڑا ہوتا ہوتا کہ تارے کو وہیں ٹکنا ہوتا تھا جہاں طارق ہے۔

کبھی کبھار وہ مسجد سے واپس آنے سے انکار بھی کر دیتا اور وہیں کہیں برآمدے میں پڑ جاتا۔ وہ رات بے جی کی بے چین گزرتی۔ ساری رات تسبیح چراتی اور وہی رات معصومہ کے لیے بے حد پر سکون ہوتی۔ وہ گہری پُرسکون نیند سوتی اور دوپہر اور رات بلکہ ناشتہ تک سے معصومہ کی جان چھوٹ جاتی۔ کیونکہ امام صاحب کا کھانا لانے والوں کو جب خبر ملتی کہ آج تارے مسجد ہی میں سو رہا ہے تو وہ الٹے قدموں ایک خوان اور سجالاتا۔

جارحانہ وحشت بھرے عزائم و رویے رکھنے والا تارے اب خاموش رہتا تھا۔ خاموش' چپ چاپ خلاؤں میں تکتا۔ نگاہ پہلے بھی کہیں گڑتی نہیں تھی۔ اب تو اور خالی پن آ گیا تھا۔

اور اباجی کے انتقال کے بعد تو جیسے اس کے اندر سے کسی نے حرکت کرنے تک کی سکت چھین لی۔ زندگی بھر اباجی سے باقاعدہ دشمنی پالی تھی اور قبر کے کنارے تک نبھائی بھی تھی۔

نہلانے دھلانے سے لے کر قبرستان پہنچانے

تک وہ صاف ستھرے شلوار قمیص میں باہر مردوں میں ہاتھ لٹکائے یونہی بیٹھا تھا۔

تارے نے جنازے کو کندھا دینے سے بھی انکار کر دیا۔ جنازہ پڑھنے سب کھڑے ہو گئے۔ یہ رکوع و سجود بھی کرتا رہا۔ پھر جنازہ قبرستان کو چلا۔ کھلے منہ کی قبر کے آگے رکھ دیا گیا۔ سب نے الوداعی چہرہ کشائی کی۔ یہ شخص کھڑا رہا‘ ہاں چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور بار بار سر کو جھٹکتا تھا۔ قبر میں اتارنے سے قبر کا منہ بند کرنے تک سب سے آگے یونہی کھڑا رہا۔ مٹی برابر کر دی گئی۔ کوہانی ڈھیری بنا کر اوپر گلاب کے پھولوں کی چادر بچھا دی۔ پھر کانٹے دار جھاڑیاں قبر پر خوب اچھے طریقے سے رکھ دیں۔ لوگوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

الٹے قدموں کی واپسی سے پہلے طارق اور طالب نے تارے کو بھی ہمراہ لیتا چاہا اس نے بے دردی سے ہاتھ جھٹک دیے۔ اکڑ کر کھڑا تھا۔ ہونٹ لرزنے لگے۔ آنکھیں بھر آئیں۔ طارق‘ طالب نے نرمی سے ایک بار پھر رخ موڑنے کی سعی کی مگر تارے نے ان دونوں کو ایک حیوانی طاقت سے دھکیل دیا‘ دونوں گرنے سے بمشکل بچے۔

تارے نے دوسرے ہاتھ سے کانٹے دار جھاڑی کو ایک جھٹکے سے دور دھکیل دیا۔ وہ مٹی کی ڈھیری پر سجدے کے سے انداز میں گرا تھا ڈھیری کو جپھا ڈال لیا۔ سر کو دائیں بائیں گھماتے ہوئے مٹی پر ملنے لگا۔

"تارے ابا۔۔۔ اندر۔۔۔ تارے ابا اندر۔۔۔ ابا بار آ۔۔۔ ابا بار آ۔۔۔ (ابا باہر آؤ)"

وہ دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا۔ سر پٹختا تھا۔ جب سب رو رہے تھے تب وہ چپ تھا اب وہ رو رہا تھا۔

اصل مصیبت تب شروع ہوئی۔ جب اس نے یکدم حیوانی انداز سے مٹی کی ڈھیری کو ڈھانا شروع کر دیا۔ اسے ابا کو باہر نکالنا تھا۔

طارق اور طالب۔۔۔ اور دیگر لوگوں نے اسے کیسے باز رکھا‘ جانے دیں۔۔۔ اب آخر کتنے صفحے کالے کیے جا سکتے ہیں۔

"مجھے تیرے ساتھ جا کر رہنے پر کوئی اعتراض نہیں طارق!"

بے جی کے جملے نے معصومہ کے رگ و پے میں بجلی سی دوڑا دی۔ "پر تارے شہری گھر میں نہیں رہ سکتا۔ اسے کھلے کمروں‘ ویڑے اور میدانوں کی عادت ہے۔ میں اسے کمرے میں بند نہیں رکھ سکتی۔"

معصومہ جیسے منہ کے بل گری۔ کیونکہ طارق کا اگلا جملہ گمان سے پرے تھا۔

"ٹھیک ہے بے جی۔۔۔! میں نے تو بس ایک بات کہی تھی۔"

"تو وہ کون سا سارا وقت گھر میں رہتا ہے۔ ابا جی کی قبر پہ لیٹ کر سوتا ہے یا جا کر مسجد میں پڑ جاتا ہے۔ گھر سے اچھا کھانا دیتے ہیں بنڈ والے اسے رہنے دو یہیں۔ بے جی ہمارے ساتھ چلیں۔" معصومہ ناگن سی بل کھائی ہوئی تھی۔

"کیا؟" طارق کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "وہ کوئی لاوارث ہے معصومہ۔۔۔ جو مسجدوں اور قبروں کے سرہانے زندگی گزارے گا۔ ہمارا بڑا بھائی ہے تارے۔۔۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟"

"تو پھر کیا میں لاوارث ہوں‘ جو ادھر پڑی سڑتی ہوں؟" معصومہ کا انداز ہنوز تھا۔ اسے آج یہ مسئلہ حل کرنا ہی تھا۔

"یہ کیا بکواس ہے۔ تمہارا گھر ہے یہ۔۔۔ سڑنے کا کیا سوال عورتیں گھروں میں رہنے سے سڑتی ہیں کیا؟"

"مجھے نہیں پتا۔۔۔ مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔ بہت کر لی چاکری۔"

"نوکری چھوڑ کر تمہارے گوڈے لگ جاتا ہوں۔"

"الٹی بات نہ کریں۔ مجھے اپنے ساتھ رکھیں جیسے اور بیویاں رہتی ہیں۔"

"میں سات سمندر پار نہیں رہتا معصومہ!" طارق نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تمہارے اپنے دو بھائی کراچی اور لاہور میں ہیں۔ دونوں بھابھیاں ادھر ہی ہوتی ہیں اور میں تو ہر چھٹے دن ادھر ہوتا ہوں۔ آندھی آئے طوفان

کچھ بھی ہو، میری کوئی غیر حاضری ہے تمہارے رجسٹر میں ــ بولو۔"

"میری بھابیوں کی بات نہ کریں ایک کے پانچ بچے ہیں ایک کے دو ــ دل لگا ہوا ہے ان کا۔" معصومہ نے ہاتھ نچایا۔

"تو یہ تو اللہ کی دین ہے۔ جب وہ دے ــ تم اکیلی تو نہیں ہو ــ بے جی ہیں' نادرے ہے۔ اتنے بڑے گھر کی ذمہ داری ہے۔ تم نے نہیں اٹھائی تو کون اٹھائے گا۔ اور اکیلے پن کا سوال سمجھ میں نہیں آتا۔ محلے پڑوس کی اتنی لڑکیاں ہیں۔ تم نے کسی سے رابطہ تک نہیں رکھا۔ نہ خود کہیں جاتی ہو نہ میں نے کبھی کسی کو آتے دیکھا ڈیڑھ سال سے اوپر ہو گیا۔ کسی ایک سے دوستی نہیں ہوئی۔ ایک عابدہ بھابی تھیں شادی کے ڈیڑھ مہینے کے اندر کیا ڈھی ــ کیا جوان سب ان کے نام کی مالا جپنے لگے۔ اور تم ــ" طارق نے اپنی حیرانگی جتا ہی دی۔

معصومہ کو پتنگے لگ گئے۔

"کیا عابدہ بھابی ــ عابدہ بھابی ــ ان کے جیسے گن تو واقعی میرے پاس نہیں ہیں۔ ایسی چالاکیاں اور عقلیں ہمارے اندر ہوتیں تو یہاں پڑے نصیبے کو رو رہے ہوتے کیا۔ وہ سکھانے پر راضی نہیں ہوں گی' ورنہ ان سے بیٹھ کر دو چار سبق میں بھی پڑھ لوں کہ کیسے سب کچھ سیٹ کر لیا۔" جسے دیکھو عابدہ ایسی عابدہ ویسی۔ سارے پنڈ سے دوستیاں بھی گانٹھ لیں ــ خوب واہ واہ کرالی۔

نہ سوھرے (سسر) کی زبان سے شکایت نکلی خیران کی تو وہ بھتیجی تھی' سس بھی اسی کے نام کا کلمہ پڑھتی ہیں اور آج شوہر صاحب نے بھی جتا دیا کہ ــ" معصومہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ مگر ان آنسوؤں کا مصنوعی پن اتنا نمایاں تھا کہ طارق کا دل اوب سا گیا۔

"گلے تک بات ایسے ہی نہیں پہنچ جاتی ہے معصومہ ــ تھوڑا حق سچ تو دل لگتا ہے تب ہی زبان سے گواہی نکلتی ہے۔ کلمہ سودائی کی بڑ نہیں ہوتا نہ ہی خالی پیٹے کی باز گشت ــ دل تسلیم کرتا ہے تب ہی منہ کھلتا ہے۔"

طارق بحث سے تھک گیا تھا جیسے ــ مگر معصومہ کو آج فیصلہ کروانا ہی تھا۔

"میرے سامنے نہ کریں۔ یہ عالموں فاضلوں والی باتیں ــ سیدھی اور صاف بات تو یہ ہے کہ عابدہ بھابھی اس جنجال پورے سے جان چھڑا کر مزے سے عیش کی زندگی گزار رہی ہیں۔ یہ بیگم صاحب جیسا گھر... اچھے انگریزی اسکول میں پڑھتے بچے ــ کل کو ہمارے بچے تختی پکڑ کر اسی برگد کی چھاؤں کے نیچے بیٹھ جائیں۔ اک دونی ــ دونی ــ دو دونی چار ــ اور الف انار تے بے بستہ ــ"

معصومہ کے لہجے سے ناکامی' غصہ' حسد اور نجانے کیا کیا نمایاں ہو رہا تھا۔ طارق کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آگئی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی چلی جاؤ۔ انار الف اور بستہ ب سے ہی ہو گا۔ نمبر دو میں نے اور طالب بھائی نے بھی اسی برگد کی چھاؤں تلے ہی پہاڑے پڑھے ہیں اور نمبر تین' مگر سب سے اہم بات پہلے بچے تو آ جائیں پھر اسکول بھی چن لیں گے کہتے ہیں پنڈ بسے نہیں منگتے گھر سے (گاؤں بسا نہیں اور فقیر پہلے ہی سے اکٹھے)"

طارق نے بات کو ہلکا پھلکا رنگ دے کر سمیٹنا چاہا تھا مگر معصومہ کے بکھیڑے تو ابھی بہت تھے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اب یہ طعنہ مارنا ہی رہ گیا تھا۔ کہ پہلے بچے لے کر آ ــ"

"اس میں کیا طعنہ ــ تم مجھے مار لو کہ پہلے بچے تو دے دیں۔" طارق نے قہقہہ لگایا۔ "یار میری جان ــ بچے ہونا یا نہ ہونا ایسی کامیابی یا ایسی ناکامی ہے۔ جس میں ہم ہمیشہ برابر کے حصے دار رہیں گے۔ تم اپنا خون کیوں جلاتی ہو' اور بچوں کی کیا جلدی ؟ ابھی تو تمہارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں' ہیں کہ نہیں ہیں۔"

طارق نے بات ختم کر کے معصومہ کا بازو کھینچ کر اسے خود سے قریب کر لیا اور گدگدانے کی کوشش کی'

"مگر یہ کیا" معصومہ ہنسنے کے بجائے منہ پر ہاتھ رکھ کر باآواز بلند رونے لگی۔

طارق کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ آواز باہر ویڑے میں سوتی بے جی تک جاتی تو۔

"معصومہ... معصومہ... میری جان... چپ۔ خدا کی بندی اور رحم کر یار رونا تو بند کر۔"

"اخلاق 'کردار عابدہ کا... سلیقہ 'طریقہ عابدہ پر ختم۔ نمازی متقی تو خیر وہ ہے ہی... بے جی بھی خوش... سارے عیب مجھ میں' ساری ذمہ داریاں میری... اور سب سے بڑی مصیبت تارے' پہلے ہی سارا دن تارے کے کام۔ ہانڈی چڑھاؤ... تارے کو بھوک جلدی لگتی ہے۔ آٹے میں نمک نہ ڈالنا' تارے پھر روٹی نہیں کھاتا' کھانا پھیکا مریضوں والا بناؤ۔ مکھن کا پیڑہ کسی کو ملے نہ ملے' تارے کو لازمی ملنا چاہیے۔ روٹیاں تھوپ تھوپ کر میرے ہاتھ گھس گئے۔ اب جب شہر جاکر رہنے کی بات آگئی' تب بھی تارے نہیں رہ سکتا' نہ مجھے یہ بتائیں' میں نے کوئی اس مصیبت کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ نرا جان کا عذاب۔"

"تارے ہمارے بڑے بھائی ہیں معصومہ!" طارق کی تاسف آمیز آواز نکلی۔

"چھڈو جی... وڈے بھائی... منہ میں نے کبھی طالب بھائی جان کے لیے کوئی لفظ کہا۔ بتائیں... قسم کھائیں جو اک لفظ بھی کہا ہو۔" معصومہ نے ناگواری سے آنکھیں چڑھائیں۔

"بندے کے کرتوت بھی تو ہوں نا' وڈے پاء جی والے۔ ہائے جو مجھے پتا ہوتا کہ ایسی مصیبت مول لگے گی تو..." معصومہ اب جاہلوں کی طرح اپنی ران پر پچھتاوے کے ہاتھ مل رہی تھی۔ آ... ہائے... افسوس...

معصومہ بولتی ہی چلی جارہی تھی۔ طارق ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

"یہ جھوٹ کہتی ہے طارق... بالکل جھوٹ۔"

اپنی رو رو کر سوجی آنکھیں اٹھا کر بے جی نے کہیں رات گئے جاکر یہ جملہ بولا تھا۔

"جھوٹ... بے جی..." طارق کے سر پر جیسے کسی نے ڈنڈا مارا۔ "اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی آپ کہتی ہیں' جھوٹ ہے۔"

"ہاں..." بے جی کا لہجہ دوٹوک تھا۔ "کیونکہ وہی دیکھا جو اس نے دکھایا طارق..."

"بے جی...!" طارق نے مٹھیاں بھینچ لیں' وہ کیا کرے۔

آنکھوں کے آگے سے وہ منظر ہٹتا ہی نہیں تھا۔ کھلے کھلے بالوں کے ساتھ روتی منہ دبا کر چیخیں روکتی معصومہ۔ وہ سیاہ اور گلابی پھولوں والے لباس میں تھی۔ دوپٹہ ندارد... گریبان چاک تھا۔ جسے معصومہ نے ایک ہاتھ سے دبوچ رکھا تھا اور ادھڑا ہوا شانہ... اور آستین اتنی کہ زیر جامہ تک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ہراساں بھی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے اتنی مظلوم لگ رہی تھی کہ اس منظر کو دیکھنے سے عرش تک کانپے۔

اور منظر تو بے جی کی آنکھوں میں یوں تن رکا تھا۔ جیسے مردے کی آنکھ کی حسرت آخری دید۔ یاس اور بے یقینی۔

لاتوں' گھونسوں' تھپڑوں سے پٹتا تارے... اور مارنے والا طارق' تارے اس کی ٹھوکروں میں پڑا تھا۔ بچاؤ کی کوششوں میں... سوال تھا کہ کیوں... ؟ حیرت تھی کہ طارق...

تارے نے زندگی لکھے پڑھے بغیر گزاری تھی۔ دیکھا بہت کچھ تھا' مگر سمجھا نہیں تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں کہتی تھیں "بروٹس یو ٹو..."

طارق کا مارنا یوں تھا جیسے پشت سے وار... جیسے قلعے کا اندر سے کھلتا دروازہ جیسے اندھے کو ٹھوکر...

ایسا ظلم جس سے ظالموں سے بھی پناہ مانگی ہو۔

طارق کا تارے کو مارنا سارے سچ جھوٹ سے پہلے فقط حیرت تھا۔ اور سوال تھا' کوئی تارے کو بھی یوں مار

سکتا ہے؟

اور تارے کا مار کھانے کا بھی اپنا انداز تھا۔ وہ شروع میں احتجاج کرتا تھا۔ پھر شور کرتا تھا اور پلٹ کر دو بدو جواب دینے کی پوری کوشش۔ اور پھر ناکام ہو کر خود کو حالات کے دھارے پر یوں چھوڑ دیتا تھا۔

جیسے کڑاہی کی ریت کی تپش پاتے ہی دانہ چونک کر اچھلتا ہے۔ اتنی بڑی جست لگاتا ہے کہ کڑاہی سے باہر جا پڑے۔ مگر پھر کڑچھے کے مستقل وار پر تھم جاتا ہے اور ہار مانتے ہوئے ریت کے ساتھ بھنتا چلا جاتا ہے۔

پھر احتجاج نہیں کرتا۔ تڑ جائے یا جل جائے۔

تو تارے، طارق کے ہاتھوں وہی ہارا ہوا دانہ بن گیا۔ اس نے خود کو بھننے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس نے خود کو طارق کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا۔

اور طارق کس جنون میں تھا۔ وہ آج تارے کو نہیں چھوڑے گا۔ وہ اس کی جان ہی لے لے گا اور تب بھی شاید قرار نہ پائے۔

تارے نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ روتی، کرلاتی، اپنی عزت بچانے کو بھاگتی معصومہ۔۔۔ کھلے بال، دوپٹہ ندارد اور چاک گریبان۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اس کے پاس فوری طور پر کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ایک بندوق کہ وہ ٹھا کر کے قصہ ختم کر دے۔

یا ایک ٹوکا جس سے وہ تارے کو وڈ دے۔ سو ایک مناسب ہتھیار نہ ہونے کے باعث وہ اسے مسلسل مار رہا تھا۔

اور تارے نے مزاحمت تو ترک کر دی تھی۔ مگر اتنی عقل نہیں تھی کہ رونا بھی نہ ہو۔ سو وہ رو تا تھا بے پناہ۔ اور چلاتا تھا بے حد۔۔۔

اور تارے کے رونے کی آواز۔۔۔ شروع میں یوں تھی جیسے کسی ویرانے کے تنہا درخت پر آدمی رات کو بولتے الو۔ وہ بچاؤ کی کوشش کے دوران ایسی آوازیں نکالتا تھا جیسے ڈھیروں چمگادڑیں پھڑپھڑاتی ہوں اور پٹ پٹ کر جب بے دم ہو گیا اور چلانے اور رونے کی سکت بھی جواب دے گئی۔ تب آواز ایسی تھی جیسے بلی

کے بچے کی گردن کسی شکنجے میں کس گئی ہو اور اب اس میں جدوجہد، مزاحمت اور پکار تک کے لیے جان نہ بچی ہو۔ بس یوں ہی بے ارادہ سی ایک آواز۔۔۔ جو بلا ارادہ نکل جائے۔

اور طارق اس سب سے بے نیاز تھا۔ وہ اسے مارتے مارتے برآمدے میں لایا تھا۔ برآمدے سے ویڑھ۔ یہ بڑا سارا ویڑا۔۔۔ ویڑے سے دروازہ اور دروازے سے گلی۔۔۔ اور گلی تو در اصل تماشا گاہ ہے۔ تو پھر اس لیے تماش بینوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔

اور وجہ ایک زبان سے ہوتی دسویں کان تک پہنچی۔ اتنی رنگین و سنگین ہو چکی تھی کہ استغفراللہ۔۔۔ دنیا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"میں خود ویکھی معصومہ دی پانی قیص (پھٹی قیص)"

"او وچاری جمعہ پڑھن نوں۔۔۔ نہا کے نکلی اے بس تارے پچھوں جھپا پالیا۔" (وہ بے چاری جمعہ پڑھنے کے لیے نہا کے نکلی ہے، بس تارے نے پیچھے سے جا لیا۔)

"ہائے اسی تے انوں سائیں کہندے ساں۔" (ہائے ہم تو اسے سائیں کہتے تھے۔)

"طارق نے تے فیروی رحم کھایا، میں ہوندا تے لت تے لت رکھ کے چیر دیندا۔" مردوں میں بھی موضوع گفتگو یہی تھا۔ (طارق نے پھر بھی رحم کیا، میں تو لات پر لات رکھ کے چیر دیتا۔)

"او جان دے یار۔۔۔ کملا جیا اے تے سی، انوں کی پتا صحیح یا غلط۔" (او جانے دے یار۔۔۔ کملا سا تو ہے۔ اسے کیا پتا، صحیح اور غلط۔) کوئی حقیقت پسند بھی تھا۔

اور بہت رات گئے معصومہ کے بند ھے صندوقوں کو طارق بمشکل کھلوا پایا تھا، کیونکہ معصومہ نے اعلان کر دیا تھا۔ وہ اب یہاں نہیں رہے گی، یا پھر وہ رہے گی یا تارے۔

اور تارے کہاں تھا۔ پیٹتے پیٹتے جب طارق اسے گلی تک لے آیا۔ ٹھوکریں کھا کھا کر عجیب سے انداز سے زمین پر اوندھا تارے۔۔۔ بتایا تا اس نے خود کو پیٹنے

کے لیے چھوڑ دیا تھا اور مزاحمت تو کب سے ترک کر دی تھی۔ مگر طارق کا جنون۔۔۔ آنکھوں میں اترا خون۔۔۔ بہت دیر تک تماشا دیکھنے کے بعد دو چار نے طارق کو شانت کرنے کی کوشش کی۔ تب ہی یک دم تارے نے جھکا سر اٹھایا۔ اس نے چاروں جانب کھڑے لوگوں کو دیکھا۔ پھر طارق کو جو ایک بار پھر مارنے کے لیے اچھلا تھا۔ مگر کچھ لوگوں نے اسے جکڑ لیا اور تارے جیسے ایسے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ سر پر پیر رکھ کے بھاگا' گرتے پڑتے اور مڑ مڑ کر یہ تصدیق بھی کرتا تھا۔ کوئی پیچھے آ تو نہیں رہا۔ وہ گلی کے کونے تک نظر آیا' پھر کھیت کی پگڈنڈی پر۔۔۔ اور بس۔۔۔ پھر رات کے دس بجے جب گاؤں کی گلیوں میں کتے بولنے لگے اور خراٹے گونجنے لگے۔

تب ایک تھکا ہارا۔ نڈھال ہیولہ بے آواز انداز سے دروازہ کھولتا اندر داخل ہوا۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ لٹکتا زرد بلب۔۔۔ طارق کے کمرے کا بند دروازہ۔ چولہے میں بجھی راکھ کے اندر کوئی چنگاری زندہ تھی۔ دودھ کے پتیلے پر روٹی پتھر رکھا تھا۔ ایک چوکنی موقع پرست بلی پتیلے کے گرد چکر کاٹ رہی تھی۔ کھٹکے پر ٹھٹکی اور پھر پھلانگ کر دیوار پر چڑھ گئی اور اب بلی کی نگاہیں اسی آنے والے پر ٹکی تھیں۔

کولر کی ٹونٹی کسی ہوئی نہیں تھی۔ کمرے سناٹے میں پے فرش پر گرتی ٹپ ٹپ کی آواز ہر بار چونکاتی تھی۔

سرد رات میں کھلے آسمان تلے کھری منجی پر تھک ہار کر آنے والی بے جی سرد و گرم سے ناآشنا تھیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں اکڑ گئی تھیں اور پیر کسی صحرا نورد سے تھے' جس نے ننگے پیر خاک چھانی ہو اور جوتی تو بے جی کی بھی ٹوٹ گئی تھی اور کیسے نہ ٹوٹتی۔ کہاں کہاں نہ ڈھونڈ کر آئی تھیں۔ اپنے تارے کو۔۔۔ مسجد۔۔۔ چوپال۔۔۔ پنسری۔۔۔ برگد کی چھاؤں والا اسکول۔۔۔ کس کس سے نہ پوچھا تھا کہ "تارے کو دیکھا ہے۔ کسی نے میرے تارے کو دیکھا۔۔۔؟

بادلوں سے ڈھکے آسمان پر آج تارے نہیں تھے اور بے جی زمین کے تارے کو ڈھونڈنے چلی تھیں۔ یہ مائیں بھی نا آدھی پاگل تو ہوتی ہی ہیں۔

اور عصر کے بعد جب سورج نے واپسی کا سفر اختیار کیا' تب دوپہر سے ساکت جامد بیٹھی بے جی چونکی تھیں۔

"تارے۔۔۔ تارے کہاں ہے؟" اس سے پوچھا اور اس سے بھی۔۔۔ اور پھر کس کس سے نہ پوچھا۔

اور جواب ندارد۔۔۔ تو کیا بے جی چپ بیٹھ جاتیں۔

وہ سر پر دوپٹا ڈال کر گھر سے نکلیں۔۔۔ گلی کے اندر۔۔۔ پھر گلی کا کونہ۔۔۔ اور کھیت کی پگڈنڈی تک نظر آئیں۔۔۔ اور اب رات کے دس بجے ناکام و نامراد لوٹی تھیں۔

کہاں چلا گیا تھا ان کا تارے۔۔۔ اتنی رات' اتنی ٹھنڈ۔۔۔ اور ٹھنڈ میں تو زخم اور دکھتے ہیں۔۔۔ اور تارے کو زخم نہیں لگے تھے۔ تارے پورا کا پورا زخم بن گیا تھا۔ پورا ناسور۔۔۔

"تو کدھر ہے تارے؟" بے جی نے ساری رات اسی کھری منجی پر بیٹھ کر گزاری' یہ پہلی رات تھی شاید جب بے جی نے یوں ہی یاد آنے پر بے وضو منجی پر بیٹھے بیٹھے عشاء پڑھ لی اور عجیب نماز تھی' اتنے سارے سجدے۔۔۔

اور عجب دعا تھی۔ جس میں کوئی طلب نہیں تھی' کچھ نہیں مانگا' ہاں بس وہ تارے۔۔۔

صبح اذانوں کے بعد طارق کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ یہ طارق تھا اور پیچھے معصومہ۔۔۔ طارق کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔ وہ لپک کر یہاں تک آیا۔۔۔ بے جی کو چھوا' وہ تپ رہی تھیں۔۔۔ بے جی نے آنکھ اٹھا کر طارق کو دیکھا۔

"تارے رات گھر نہیں آیا' طارق۔۔۔" طارق منجی پر ٹک گیا۔

"وہ مسجد میں بھی نہیں ہے طارق۔" طارق کے جبڑے بھینچ گئے

"وہ سارے پنڈ میں کہیں نہیں ہے۔ میں نے اک اک گلی چھان ماری۔"

طارق کی نظریں اٹھیں اور ان میں کیا کیا نہ تھا۔
شکوہ' شکایت... الزام... دکھ۔
"آپ کو اب بھی تارے کو ڈھونڈنا ہے بے جی؟ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد۔"
"کیا ہوا ہے؟" بے جی نے سوال کیا۔
انجان بنی معصومہ بھی ٹھٹکی۔
"آپ کو نہیں پتا کہ کیا ہوا ہے بے جی!" طارق چلا اٹھا' جیسے اس کی نظریں معصومہ پر اٹھی تھیں اور معصومہ کا چہرہ مظلومیت کی تصویر بن گیا تھا۔ بے جی نے طارق کی نظروں کا تعاقب کیا۔
"یہ جھوٹ بولتی ہے طارق... بالکل جھوٹ..."
طارق کا دماغ بھک سے اڑا۔
"یہ جھوٹ ہے... اچھا یہ جھوٹ ہے۔ اس کی پھٹی قمیص' اس کی چیخیں' اس کے آنسو۔"
"یہ جھوٹ کہتی ہے طارق... اس کو بول سچ بولے۔"
بے جی کے انداز اور جملے نے طارق اور معصومہ کا دماغ جیسے الٹ دیا۔ معصومہ نے رونا شروع کر دیا۔ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی۔ دروازہ دھاڑ سے بند کیا۔
"اس بات کو جان دے طارق... یہ بحث کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دے' میرے تارے کو ڈھونڈ کر لے آ... وہ بھکا ہے... اوپر سے تو نے مارا بھی بڑی بے دردی سے... قسمے خدا دی... میرے جسم کی بوٹی بوٹی درد کرتی ہے... تو نے بڑے زور سے مارا طارق..."
"میں نے تارے کو مارا ہے بے جی... آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" طارق نے گھبرا کر کہا۔
"اچھا... یہ تو تو کہتا ہے نا طارق... تارے کو مارا ہے۔ میری قمیص چک کے دیکھ... تیرے ٹھڈوں (ٹھوکروں) مکوں' تھپڑوں کے نیل وہاں نہ ملیں تو کہنا۔"
"خدا کا واسطہ بے جی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے مجھ پر کوڑھ گر جائے۔" طارق کھڑا ہو گیا۔
"میرا سر بھی چکراتا ہے طارق۔" "تو نے بڑے زور' زور سے مکے مارے۔ "یقین نہیں تو ہاتھ لگا کے دیکھ لے گومڑ نہ ملیں تو کہنا۔"
"بے جی...!" طارق نے خود کو پاگل ہوتا محسوس کیا۔
"اور جھڑیاں توں گلاں کڈیاں... جھڑے توں عیب ٹوہنڈے اتاں نے میرا اندر ساڑ دیا۔"
(جو تم نے گالیاں دیں اور جو عیب ڈھونڈ نکالے تارے میں... مجھے اندر سے جلا دیا۔)
"بے جی...!" طارق اپنا سر دیوار میں مارنے والا تھا۔
"میری دعا اے طارق... رب تینوں بھاگ لائے۔ تینوں تتی وا نہ لگے۔ (رب تیرا مقدر اچھا کرے' تجھے گرم ہوا نہ لگے۔) مگر میرے معصوم تارے نال جو توں کیتا۔"
بے جی نے شہادت کی انگلی آسمان تلک اٹھائی... پھر منجی سے اتر آئیں۔ موذن پکار رہا تھا۔ بے جی وضو کرنے لگیں' پھر انہیں تارے کو ڈھونڈنے بھی تو جانا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور جسے ڈھونڈنے جانا' وہ کیا نشان پا چھوڑ گیا تھا۔
کہانی کی چڑیا تھوڑی تھا۔ تارے کہ جنگل میں گھسنے سے پہلے راستے کی نشانی دہی کے لیے باجرہ گراتا جاتا۔
تارے تو بس تارے تھا۔
وہ آنکھ کا آنسو ہو گیا۔ اک بار چھلک جائے تو واپس آنکھ میں جاتا نہیں۔
وہ نکلی ہوئی سانس ہو گیا' بیتا ہوا پل بن گیا۔
گاگر سے چھلکا پانی تارے...
مٹی کے کچے کی ترڑ... تارے (مٹی کا چٹخا برتن)
تارے کا گھر سے نکلنا کوئی سورج کا غروب ہونا تھوڑی تھا کہ اگلی صبح پھر نئے دم خم سے طلوع ہو جائے۔
تارے' ٹوٹا تارا ہو گیا' آسمان سے ٹوٹا اور زمین پر نجانے کہاں جا گرا۔

☆ ☆ ☆

اور بے جی درست کہتی تھیں۔ مرجانے والے پر صبر آجاتا ہے۔ گم جانے والے پر کیسے آئے۔ تو ان پانچ سالوں میں وہ یہاں تک آگئیں کہ اچھا چلو مرنے کی خبر ہی آجائے۔ پھر یہ بھی سوچنے لگیں۔ مرنے کی بھی چھوٹ۔ ہاں ان کے تارے سے الزام اتر جائے ایسا کچھ ہو جائے کہ بہتان کا داغ دھل جائے۔

مگر معصومہ اپنی بات کی پکی تھی۔ اس نے رو رو کر قسمیں کھا کر جو ڈراما پیش کیا تھا' وہ جھول سے پاک تھا۔ اس مقدمے کی وہ واحد گواہ تھی اور واقعات و شواہد سب تارے کے خلاف جاتے تھے۔ کاش تارے ہوتا تو وہ صفائی دیتا' مگر تارے کب صفائی دینے سے واقف تھا۔ سو سچ بولے تو پھر معصومہ ہی بولے اور بے جی کو یقین تھا کہ تارے بے قصور ہے۔ پہلے پہل وہ تارے کے حق میں صفائی دیتی تھیں پھر یہ بھی چھوڑ دیا۔

تارے بھولا قصہ ہو گیا تھا۔ کبھی نہیں ذکر چھڑتا تو بے جی لب سیے رہتیں۔ ہاں پر وہ معصومہ سے ضرور کہتی تھیں۔ جس دن اس نے سچ بولا اس دن بات کریں گی پر معصومہ مصر رہتی اس نے سچ ہی کہا تھا۔

اور وہ تو اپنے حمل کے ضائع ہو جانے کا الزام بھی تارے پر لگاتی تھی۔ اس واقعے کے وقت وہ چار ماہ کے حمل سے تھی۔ شادی کے دو سال بعد یہ کرم ہوا تھا۔

معصومہ کا کہنا تھا۔ جب اس روز تارے اس پر جھپٹا تھا اور وہ بچاؤ کے لیے بھاگ رہی تھی۔ تب تارے کا ہی گوڈا اس کے پیٹ کو لگا تھا اور تارے کے جانے کے پانچویں دن اس کا حمل ضائع ہو گیا۔

بے جی نے سر جھکا کر اس الزام کو بھی سن لیا اور پھر ہر سال حمل ٹھہرتا اور چوتھے مہینے میں یوں ضائع ہو جاتا۔ جیسے اچانک آنے والی چھینک۔

پہلے والا تو تارے کی وجہ سے ضائع ہوا۔ تو بعد والے۔۔۔؟

اور معصومہ کہتی تھی۔۔۔ بے جی نے اسے بددعا دی ہے' جب ہی تو چوتھا مہینہ چڑھتے ہی۔۔۔ اور بے جی خاموش رہتیں۔ طارق نے شروع میں معصومہ کو یہ بکواس کرنے سے منع کیا۔ بے جی ایسا کر ہی نہیں سکتیں۔ مگر ان پانچ برسوں میں وہ بھی جیسے قائل ہونے لگا کہ واقعی معصومہ کسی بددعا کے زیر اثر ہے اور واقعی بے جی کے علاوہ کون ہو سکتا ہے جو۔۔۔

اور پھر اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنا خدشہ بے جی کے آگے بیان بھی کر دیا۔

"میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا طارق۔۔۔ اگر بددعا دی ہوتی نا تو کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر جھولی اٹھا کر دیتی۔ مجھے تو دعا تک کرنا بھول گئی۔"

بے جی نے کہا تھا اور طارق سے اگلا لفظ بھی نہ بولا گیا۔

"تہجد اور چاشت ملا کر سات نمازیں پڑھتی ہوں ایک دن میں۔۔۔ اور اس سے بڑی کیا تکلیف۔۔۔ کیا سزا کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں اور مانگنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ سارے الفاظ بھول گئی طارق۔۔۔ سارے جملے۔۔۔ ساری خواہشیں۔۔۔ ضرورتیں تک یاد نہیں۔۔۔ پنج سال ہو گئے طارق۔۔۔ مجھے معاف کر دینا طارق۔۔۔ ماں کے لیے سارے بچے برابر ہوتے ہیں مگر مجھے تارے کے علاوہ اور کوئی یاد نہیں۔"

"بے جی۔۔۔؟" طارق ششدر رہ گیا' بے جی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ طارق نے لپک کر دونوں ہاتھوں کو تھام کر ہونٹوں سے لگایا' آنکھوں سے لگایا۔

"آپ کا اصل مجرم تو میں ہوں نا' میں نے ہی تارے کو۔۔۔"

بے جی نے طارق کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آگے کچھ نہ بول۔"

"شہر کی سب سے بڑی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا بے جی معصومہ کو۔۔۔" وہ کہتی ہے کوئی خرابی نہیں ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ماں بھی ٹھیک ہے اور بچہ بھی۔۔۔ مگر پھر بھی چوتھا چڑھتے ہی۔۔۔" طارق نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اس وقت بھی چوتھا مہینہ تھا نا جب تارے کو تو نے مارا تھا۔؟" بے جی کا انداز سادہ تھا' مگر سوال بہت معنی خیز۔ طارق چونکا اور ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں بے جی۔۔۔!" دونوں کے درمیان خاموشی کی

چادر تن گئی۔ "تھک گیا ہوں بے جی... ویڑے کے کونے میں ٹوبا کھود کے اپنی اولاد کو دباتے دباتے" (صحن کے کونے میں گڑھا کھود کر اپنی اولاد کو دفن کرتے کرتے۔) دنیا کے کہنے سننے کو وہ گندے خون کا نا سمجھ میں آنے والا لوتھڑا ہوتا ہے' کراہت انگیز۔ مگر بے جی میری پوری حیاتی' میرے خواب' میری خواہش جسے اپنے ہاتھوں سے زمین میں دبا دیتا ہوں۔ میری اولاد بے جی! آپ دل سے نہ دیں' میری تسلی کے لیے بس دو لفظ کہہ دیں۔ میرے دل کو سکون آجائے گا۔ اچھا چلیں معاف کر دیں۔ نہ میں تارے کو اس طرح مارتا' نہ وہ گھر چھوڑ کر جاتا' اور نہ..."

"تیرا بھلا کیا قصور..." بے جی نے نظریں پھیریں۔

"میں نے مارا تھا نا اسے... میں نے آپ کا دل دکھایا بے جی... میں نے..."

"تجھے یہ کیوں لگا طارق... میں تیرے مارنے سے ناراض ہوئی تھی؟" بے جی نے عجیب سوال کیا۔

"تو پھر..." طارق حیران رہ گیا۔

"میں تو مارنے کی وجہ سے..." بے جی نے جملہ مکمل نہ کیا۔

"میں کبھی نہ مارتا بے جی... آپ کے جتنا تو نہیں' مگر میں تارے سے بہت پیار کرتا تھا۔ مگر معصومہ کی اس حالت نے میری سوچنے سمجھنے کی طاقت چھین لی بے جی... میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہ ہی کرتا میں تو بس..."

"مجھے تجھ سے شکایت نہیں طارق...!" بے جی نے حیران کر دیا۔

"تو پھر... کیا معصومہ سے...؟" طارق آج سچ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

"ہاں...!" بے جی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اس سے بول سچ بولے۔"

☆ ☆ ☆

اپنے کمرے کی کھڑکی کے ادھ کھلے پٹ سے معصومہ کو ماں' بیٹا صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سنائی نہیں دے رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود معصومہ گفتگو کے متن سے بخوبی واقف تھی۔ وہی طارق کا ہارا لہجہ اور معذرت... معافی کی طلب... اور وہی... وہی بے جی کی ہٹ دھرمی... بے تاثر چہرے کے ساتھ سنتے رہنا' مگر کہنا وہی... جو پانچ سال سے کہہ رہی تھیں۔

طارق کی نظروں کے تعاقب میں معصومہ نے بھی صحن کے اس کونے کو دیکھا تھا جہاں دائی نے اور طارق نے بھی اس کے نامکمل بچوں کو گاڑا تھا۔

چار بار۔ اور اب یہ پانچویں بار... اور ایک دنیا اس پر ترس کھاتی تھی' رحم کرتی تھی بس بے جی بس...

"اور وہ تارے..." اس نے اپنی جلتی آنکھوں کو مسلا۔ اتنا تو وہ حاضر رہ کر بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ جتنا کہ اس نے غائب ہو کر ستایا۔ جلایا کلسایا۔

کیسی یاد تھا تارے... سب کچھ بھول گیا۔

کیسا عذاب تھا تارے... جو ختم ہی نہ ہوا۔

کتنی نفرت تھی اسے تارے سے... گھن آتی تھی اس کی جانب دیکھنے سے۔ معصومہ کی نفیس طبع پر جیسے کوڑے لگتے تھے اس کی حرکتوں سے... وہ بول رہا ہوتا تو سہا نہیں جاتا۔ خاموش ہوتا' تب بھی ناقابل برداشت۔

اور صرف بے جی ہی کا سایا تھوڑی تھا کہ وہ ماں ہیں اور چاہے چلی جاتی ہیں۔ یہاں تو سب اپنے کیا... اور غیر کیا اسے کسی ہیرے کی طرح چاہنے لگے تھے۔ یہ تو بے جی کی ہوش مندی تھی کہ انہوں نے بیٹے کو انسان ہی رہنے دیا تھا' وگرنہ کچھ ضعیف الاعتقاد تو پھونکیں مروانے اور سر پر ہاتھ پھروانے آہی جاتے کہ تارے اللہ لوک ہے۔

لیکن معصومہ کو اس سب سے کیا۔ وہ موجود تھا' تب بھی معصومہ کو حرز سوار لگتا اور اب نہیں تھا تو اور زیادہ لگتا بلکہ معصومہ کو بھولتا ہی نہیں تھا۔ بھلے سے وہ لاحول پڑھتی یا خیال کو جھٹکتی۔

ابا جی کے جانے کے بعد بے جی نے تارے کی وجہ سے طارق کے ساتھ شہر چل کر رہنے سے منع

کردیا اور نارے کے چلے جانے کے بعد بھی نارے ہی کی وجہ سے ایک بار پھر شروع کر دیا۔

"تو اپنی بیوی کو لے جا طارق! میں کیسے جا سکتی ہوں۔" بے جی کا سر نفی میں ہلتا۔

"تو آپ یہاں اکیلی کیسے رہیں گی بے جی۔ اچھا میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو طالب بھائی کے ساتھ چلی جائیں۔" طارق زچ ہو گیا۔ بے جی کا سر صرف نفی میں ہلتا تھا' قطعیت سے بھرپور۔

"نہ طارق۔ نہ طالب۔ صرف نارے۔" بے جی کے لب کھلے۔

"کیا مطلب نارے۔" طارق چونکا۔ بے جی کی آنکھوں میں غم ابھر آیا۔

"میں بوہے نوں جندرا پا کے ٹر جاواں۔ تے جے پچھوں میرا پردیسی پتر آگیا تے جندرا ویکھ کے کدی ماں نوں ماں آکھے گا۔"

(میں دروازے پر تالا ڈال کر چلی جاؤں اور اگر جو پیچھے سے میرا پردیسی بیٹا آگیا تو تالا دیکھ کر پھر کس کی ماں کو ماں کہے گا۔)

"تسی دونوں جاؤ۔ میں تے اس دروازے نوں نئیں چھڈ سکدی۔" (تم دونوں جاؤ' میں تو اس دروازے کو نہیں چھوڑ سکتی۔)

"بے جی تسی کلے کس طراں رہو گے (بے جی آپ اکیلے کیسے رہیں گی۔)" طارق بمشکل بولا۔

"اک نہ اک دن کلا تے بندے نوں ہونا ای پیندا اے۔"

(ایک نہ ایک دن انسان کو اکیلا تو ہونا ہی پڑتا ہے۔) بے جی فلسفی ہو گئیں۔

طارق کی منطق اور دلیل پھر نیا بچی۔

شریعت کہتی تھی' بیوی شوہر کے ساتھ رہے اور اگلے ہی صفحے پر طارق کے لیے یہ بھی درج تھا۔ بوڑھی ماں کی دل آزاری نہ کرے۔

طارق دوراہے پر۔ لیکن وہ کون سا معصومہ سے سات سمندر کی دوری پر تھا۔

چاچا خیردین تو مر گئے تھے اور انہیں معصومہ کے شہر یا گاؤں کہیں بھی رہنے سے قطعی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہاں چاچی خیردین اٹھتے بیٹھتے ہو کے بھرا کرتی تھیں۔

لیکن عجیب بات یہ بھی ہوئی کہ معصومہ نے شہر جا کر رہنے کی ضد یک دم ہی چھوڑ دی۔ دراصل اس نے شروع کے احتجاج کے بعد ایک روز سوچا اسے اب یہاں رہنے میں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ جو فساد تھا' وہ تو ختم ہوا۔

زندگی اب پرسکون تھی۔ اپنی مرضی کا سونا جاگنا' کہنا سننا۔ کوئی جواب دہی نہیں۔ ہاں بے جی کی خاموشی۔ شروع میں منہ چڑا کر اور نہ تھی۔ نہیں تو نہ سہی اور پھر یہ ہی خاموشی وقت گزرنے کے ساتھ سزا بن گئی۔

زندگی ٹھہرے پانی سی پرسکون۔ مگر ٹھہرے پانی ہی سے تو بساند اٹھتی ہے۔ کائی جمتی ہے۔

اور معصومہ کی زندگی پر بے اولاد ہونے کی پھپھوندی لگ گئی تھی۔ بے اولادی بھی کیا۔ اولاد آنے کی نوید تو ملتی تھی مگر اولاد ہاتھوں میں آتی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

زردے میں رنگ نہ ڈالنے کی تنبیہ۔ سارے پنڈ نے بے جی کی ہٹ دھرمی پر تاسف کا اظہار کیا تھا۔ لوگوں کے پاس اب جیسے کوئی اور موضوع ہی نہ تھا۔ سوال' خیال' اندازے۔ کچھ بے جی کا ساتھ دینے والے۔ کچھ معصومہ کے ساتھ اور کچھ فقط چسکا لینے والے۔ کلائمکس کے منتظر۔ معصومہ کے دن عورتوں نے انگلیوں پر گن رکھے تھے۔ معصومہ نے بھی اس بار سرد مہری کی بازی لگائی تھی۔ آرام کرتی بے حد و بے حساب کھاتی۔ پہلے تو بستر سے نیچے قدم ہی نہ اتارتی تھی۔ پھر بڑی شہری ڈاکٹر نے واک کی اہمیت جتائی تو صبح شام ویڑے کو ناپنے لگی۔ مگر تب بھی یوں چلتی' جیسے پانی پر چلتی ہو۔

اور بے جی نے زردے میں رنگ ڈالنے والے معاملے کو زندگی' موت کا مسئلہ بنایا تھا۔ مگر اس کے بعد

وہ کچھ نہ بولیں۔ چاچی خیردین نے کسی بڑے پہنچے بابا جی سے تعویذ لا لا کر پورے گھر کے کونوں میں گاڑے۔ خود معصومہ کی گردن' بازو پیٹ تک سے تعویذ اور کالے دھاگے بندھے تھے۔

اور... معصومہ کا چوتھا بخیر و خوبی گزر گیا اور پانچواں شروع۔ اور یہ پہلی بار ہوا تھا۔ اس بار تینے والی جمعرات کو طارق نے کھیر کی دیگ بنوائی' وہ بہت خوش تھا۔ اس نے صدقے کے لیے کالا بکرا ذبح کیا۔ معصومہ کی امی بھی آگئی تھیں اور بڑی جتاتی نگاہوں سے بے جی کو دیکھتی تھیں کہ اس بار تیری بددعا اب نہیں چلنی پیا توڑ کیا ہے۔ بے جی مسکراتی رہیں۔ طارق بہت مصروف و مگن تھا۔ کھیر کی دیگ کھلی' پورے پنڈ کے بچے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔ بس جلدی سے مل جائے مگر طارق نے یہ کیا' کیا۔ ایک پیالہ بھر کے لایا اور بے جی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ایک دنیا تماشا دیکھنے والی تھی۔ اب کیا ہو گا اور ششدر کھڑی معصومہ نے سوچا۔

اگر بے جی نے کھیر کھالی تو سمجھو مراد پوری ہوئی' لیکن اگر منع کر دیا۔

پھر بے جی نے سر اٹھایا' پھر نظریں' طارق پیالہ تھامے ان ہی کو دیکھ رہا تھا اور اس کی نظروں میں کیا کچھ نہیں تھا' سب کچھ۔ تڑپ' طلب' امید' خواہش۔ سامنے ہی تو جگر کا ٹکڑا کھڑا تھا اور طارق کی آنکھوں میں جھانکا اور وہاں سوال تھا۔ میں بھی تو آپ ہی کا بیٹا ہوں' بے جی۔

بے جی نے پیالہ پکڑ لیا اور انگلی سے کھیر بھر کے منہ میں ڈالی۔ پیالہ گود میں رکھ لیا۔ کسی کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔ مگر سب انہیں دیکھ رہے تھے۔

طارق' بے جی ہی کی چارپائی پر ٹک گیا اور بے جی کو کھاتا دیکھنے لگا۔ ہر ایک کو نظر انداز کرتی بے جی نے طارق کو دیکھا۔ جو بہت پرسکون نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو بے جی نے اپنی کھیر سے بھری انگلی طارق کے ہونٹوں سے لگا دی۔ طارق نے انگلی چاٹ لی۔ پھر بے جی کا ہاتھ چوم لیا۔ پھر ان سے لپٹ گیا اور بالوں کے بوسے لیے۔

✽ ✽ ✽

پانچواں بھی گزر گیا' چھٹا بھی' ساتواں۔ خطرناک آٹھواں یہاں تک کہ نویں کا آغاز ہو گیا۔ چاچی خیردین تو آٹھویں ہی میں۔ بیٹی کی دیکھ بھال کی غرض سے آگئی تھیں۔ ماں بیٹی سارا دن ایک دوسرے میں مگن رہتیں۔ بے جی کو مکمل نظر انداز کر کے۔

اور وہ بے جی کو نظر انداز کرتی تھیں یا جتا جتا کر رہتی تھیں۔ بے جی کو اس سب کی کوئی پروانہ تھی۔ اب اتنے بڑھاپے کے بعد یوں بھی دنیا داری کرنا جچتا نہیں ہے۔ چاچی خیردین گھر کی ہر شے پر حاوی نظر آتیں۔ پورے پنڈ کے لیے یہ انوکھا منظر تھا کہ بہو کی ماں یوں دھان بن کر رہ رہی ہے۔ پنڈ کی عورتیں معصومہ کا حال احوال لینے روز ہی آتی۔ ایک نیا شغل ہاتھ آگیا تھا سب کے۔ ساتھوں کا چسکا۔ بے جی نے ہمدردی کر چغلی کرنے آئی عورتوں کو ماتو لب کھلتے ہی ٹوک دیا۔

"میرے ساتھ اپنی بات کرو یا میری بات... کوئی کیا کہتا ہے' کیوں کہتا ہے یہ نہ کرنا۔"

کوئی بڑی دلگیری سے کہتی۔ "آپ کو تو جیتے جی ہی دیوار سے لگا دیا ہے بے جی' چلو نوں (بہو) کی تو خیر ہے' کمرنوں کی ماں کیسے گھومتی ہے جیسے وہی مالکن ہو۔"

"مالکن کی کیا بات' یہ تو ان کی مہربانی ہے جو وہ میرے کرنے والے کام کرتی ہے۔ ورنہ فرض تو میرا تھا کہ میں بہو کو سنبھالتی۔" بے جی رسانیت سے ساری کہانی ہی بدل دیتیں۔ کہنے والی کو منہ کی کھانی پڑتی۔ مگر پھر کوئی ہمت کر کے ایک کوشش کی مصداق نب کھولتی۔

"تارے کو باقاعدہ کوستی ہے نوں کی ماں..." بے جی بری طرح چونکتیں۔

"کوسنا کیا۔ چاچی بتا رہی تھی' تارے ایسا ہی تھا۔" "اب تارے سامنے تو ہے نہیں کہ بولے۔ معصومہ جھوٹ کہتی ہے۔ او جانے دے اس نمانے

ہوتا بھی تھا تو کون سا کچھ بتا دیا تھا۔

ہر عورت ایک ایک جملہ کہہ کر الزام ہی لگا دیتیں۔ صفائیاں بھی دے دیتیں، مگر مقصد وہی کہ بے جی سن لیں۔ یا کچھ بول دیں۔

"سارے کا نام نہ لو جاؤ، جا کر اپنی ہانڈی، روٹی دیکھو، بچے تھکے ہوں گے۔" بے جی متوازن لہجے میں کہتیں اور آنے والیوں کے اٹھنے سے پہلے خود جگہ چھوڑ دیتیں۔

(ادھر معصومہ کھا کھا کے پھٹنے جوگی ہو گئی تھی۔ عورتیں پیٹھ پیچھے منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنستیں۔ انوکھا بچہ پیدا کرنے جا رہی ہے معصومہ۔ بے جی کے سامنے تو ایسی چلتی ہے اور انہیں یوں دیکھتی ہے جیسے کوئی اپنی بانجھ سوت کو جلاتا ہے کہ دیکھو جی میں کیا ہوں اور تم نہیں ہو سکی۔ ہی ہی ہی۔)

☆ ☆ ☆

ابھی تو اٹھارہ بیس دن باقی تھے۔ جب گاؤں کی عورتوں نے طارق کو اندھا دھند دائی نذیراں کا دروازہ بجاتے دیکھا۔ پھر سر پر دوپٹا ٹکاتی دائی تیز قدموں سے طارق کے ساتھ بھاگی اور پیچھے دائی کی بہو نسیم بھی۔

منٹوں کے اندر عورتوں نے دیواروں سے منہ نکال کر یا پھر اونچی آوازیں لگا کر سارے پنڈ میں خبر کر دی۔

"معصومہ کا ٹیم پورا ہو گیا۔ طارق، دائی نذیراں کو لے گیا ہے۔"

کئی عورتوں نے اپنے کام تو عمر بچیوں پر ڈالے اور معصومہ کے گھر کی طرف بھاگیں۔ بہت سی نے پکتی ہانڈی کے نیچے جلتی آگ پر پانی کا چھینٹا مار دیا۔

بے جی کے کھلے ویڑے میں عورتوں کا جم غفیر ہی لگ گیا۔ جس کو جہاں جگہ ملی ٹک گئی۔ دائی نذیراں اور ان کی بہو۔ اور چاچی خیر دین، معصومہ کے ساتھ اندر کمرے میں تھیں۔ چاچی خیر دین کی حالت غیر تھی۔ حلق خشک تھا اور وہ سوکھے کپکپاتے لبوں سے ساتھ ہر ایک سے کہتیں۔

"دعا مانگو میری دھی کی مشکل آسان ہو۔"

تب سب نے زور و شور سے تسلی کروائی، سب دعا کے معاملے میں پرخلوص تھیں اور یہ ایسا وقت تھا، جب صرف دعا ہی سارے مسئلوں کا حل تھی۔

معصومہ کی دلی کراہیں اور سسکیاں سماعتوں سے ٹکراتیں تو عورتیں بے چینی سے پہلو بدلتیں۔

اس بے حد بے چین پل میں اگر کوئی پرسکون تھا تو وہ بے جی تھیں۔ جائے نماز پر قبلہ رو بیٹھی وہ تسبیح کے دانے گراتی تھیں۔ جیسے گرد و پیش سے ناآشنا کسی دوسرے ہی جہان میں پہنچی ہوئی ہوں۔

"بے جی! نوں کے لیے دعا کرو۔" کسی نے انہیں پکارا، بے جی نے بس نظر اٹھا کر دیکھا اور شہادت کی انگلی اوپر اٹھا دی۔ بچہ صحت مند تھا۔ پھر پہلا بچہ تھا۔ معصومہ کی آہ و زاری پیٹ میں گرہیں ڈالنے والی تھی۔

چاچی خیر دین سے اب بیٹی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی، وہ ویڑے میں آکر چوکی پر بیٹھ گئیں۔

"اولاد نہیں تھی تو ساری رات جاگ کر دعائیں مانگتی تھی۔ اب اللہ اولاد دے رہا ہے تو لگتا ہے کوئی مجھے کھنڈی چھری سے وڈ تا ہے۔ نہ پہلے سکون تھا نہ اب دیکھا جاتا ہے۔ ہائے ربا کیڑے امتحان پے پا دیتا، نہ ایدر جوگی، نہ اودر جوگی۔"

چاچی خیر دین کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے تھے۔ کتنی ہی عورتوں نے اس بیان کی تائید میں سر ہلایا، اور آنسو بھی پونچھے۔ چاچی خیر دین نے ایک زخمی جتاتی نگاہ سے بے جی کو دیکھا اور ان کی نگاہوں کے تعاقب میں سب نے بے جی کو دیکھا اور حیران رہ گئیں۔ وہ اتنی پرسکون اور بے خبر دکھتی تھیں جیسے بالکل تن تنہا ہوں۔

ہر ایک نے اپنے انداز سے سوچا۔

ہاں بے جی کو کیوں دکھ ہو گا یا وہ فکر مند ہوں گی۔ انہوں نے ہی تو بددعا دی تھی کہ معصومہ اولاد کو ترسے۔ مگر اللہ کیا صرف بے جی کا تھا۔ معصومہ کا نہیں تھا؟

اپنی خود کی بیٹی اس عالم میں ہوتی نا پھر دیکھتے۔ اور کیسی ضدی اور ہٹ دھرم۔ پتھر دل والی

عورت تھیں بے جی۔
ماں کے لیے تو سب اولاد برابر ہوتی ہے۔ مگر بے جی نے ثابت کردیا وہ صرف مارے کی ماں ہیں۔
کانا پھوسی کے اڑتے پڑتے لفظ بے جی کے کانوں میں بھی پڑ رہے تھے۔ مگر وہ نفس بیٹھی تھیں۔ کیس دائی نذیراں کے ہاتھ میں تھا۔ مگر مشکل تھا اور یہ مشکل ایک چیخ کی آواز سے ٹلی۔ بچے کے رونے کی آواز اور دائی نذیراں کی بہو کا خوشی سے بھرپور چہرہ۔
"متیوں خرچا پے گیا چاچی۔ میں تے سونے دے کانٹے ہی لواں گی۔" (آپ پر خرچا پڑ گیا میں تو سونے کے جھمکے ہی لوں گی۔)
اس بیان کی گہرائی تک پہنچنے میں ایک پل ہی لگا تھا۔ ایک تیلی چیختی آواز آئی۔ "ہائے صدقے معصومہ دے پتر ہویا۔"
چاچی خیردین نے آواز کا تعاقب کیا' پھر نذیراں کی بہو کو دیکھا جو مسکراتے ہوئے تائید کررہی تھی پھر۔
چاچی سے لپٹ گئی اور پھر باری باری سب عورتیں چاچی سے گلے ملنے لگیں۔ ایک بے حد خوشی کا ماحول بن گیا۔ چاچی تیزی سے اندر جانا چاہتی تھیں۔ مگر یک دم رک گئیں۔ انہیں بے جی کا دھیان آیا تھا۔ ان کے نزدیک آگئیں۔
"مبارک ہو بن جی! خیر سے پوترا ہوا ہے۔ لوگوں نے تو خیر کونے کی کسر نہ چھوڑی تھی مگر رب سوہنے نے من لی۔ برا دکھ سہا میری دھی نے۔ اس کے بھی خوشیوں کے دن آئے۔"
بے جی نے بڑے تحمل سے بات سنی' پھر اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھادی۔ "جو رب سوہنے کا حکم۔" چاچی خیردین کو اس جواب سے مزہ نہ آیا۔ بات سے بات نکلتی تب ہی تو بھڑاس نکل پاتی۔ انہوں نے مقررانہ انداز سے عورتوں کے مجمعے کو دیکھا۔ ایک چھوٹا موٹا خطاب۔ خیالات کا اظہار تو بنتا تھا اور دوسری طرف ساری عورتوں کے لیے دو سمدھنوں کے بیچ کا کھنچاؤ کسی چٹخارے دار قصے کی جانب اشارہ کرتا تھا۔ وہ سب کچھ شروع ہوجانے کی منتظر تھیں۔ "سارے پنڈ کی دعوت کروں گی سب منتیں پوری کروں گی۔ ایسے ویسے تو ارمان اور منتیں دادیاں کرتی ہیں۔ مگر اب دادی کو کوئی فرق نہیں پڑا تو نانی تو زندہ ہے نا۔"
سب عورتیں بغور سن رہی تھیں۔ وہ کسی تماشے کی منتظر تھیں۔ مگر بے جی کی خاموشی۔ وہ تسبیح کے دانے گراتے ہوئے یوں سن رہی تھیں۔ جیسے کسی اور کا تذکرہ ہو۔ ان کے چہرے پر ایک سناٹے کی سی کیفیت تھی اور یہ بہرحال نظر آرہا تھا کہ ان کے ہونٹ بھینچے ہوئے ہیں۔
چاچی خیردین ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھیں کہ دائی نذیراں حواس باختہ سی باہر کو نکلی۔ سب ہی کو انہونی کا احساس ہوا۔ اللہ خیر۔

☼ ☼ ☼

چاچی خیردین نے بچے کو تخت پر چت ڈال رکھا تھا' اور سر پر ہاتھ رکھ کے بیٹھی اسے تاسف اور غم زدگی سے دیکھتی تھیں۔ بچہ تندرست تھا اور بنا بنایا طارق تھا۔ ہاں بس اس کی بھنویں معصومہ جیسی تھیں۔ بچہ چند لمحے سکون سے سانس لیتا تھا۔ پھر اچانک زور سے جھٹکا کھاتا۔ منہ کھول لیتا اور ایسے میں اس کا رنگ نیلا پڑجاتا تھا۔ دراصل اسے سانس لینے میں تکلیف ہوتی تھی۔
دائی نذیراں نے سارے حربے استعمال کرلیے تھے۔ مگر جب بچے کا سانس رکتا۔ تب وہ تڑپ کر سر مارتا تھا اور پیر یوں رگڑتا تھا جیسے جان نکل رہی ہو۔ دگرگوں حالت والی معصومہ پورے جسم کی طاقت استعمال کرکے اٹھ آئی تھی اور دروازے کو پکڑے کھڑی جھٹکے کھاتے بچے کو دیکھتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی بے بسی اور تڑپ تھی کہ دیکھی نہ جاتی۔ سب عورتوں نے ہم آواز ہوکر فوری طور پہ شہر کے اسپتال لے جانے کی بات کی تھی اور فوری دستیاب گاڑی ایک ٹریکٹر تھا۔ مگر وہ بہت دور کھیتوں کے اندر چل رہا تھا۔ اسے مین روڈ تک لانے کے لیے وقت درکار تھا مگر کیا بچے کے پاس وقت تھا؟

بے قرار طارق اندر آیا' وہ بچے کو تڑپتا دیکھتا تھا اور پرسکون ہوتا دیکھتا تھا۔ آخر اسے ہو کیا رہا تھا؟ معصومہ کی آنکھوں سے لہو ٹپک رہا تھا۔ وہ کمزوری و نقاہت یا بے بسی کے باعث دروازے کو پکڑے پکڑے پھسلتی زمین پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔

"اے میں تاں بے... ایسے رونا نہ پا' ایسے رونا مت ڈالو' دعا مانگ 'ماں کی دعا رب سوہنا کبھی رد نہیں کرتا۔" دائی نذیراں نے اسے پچکارا تھا۔ معصومہ نے اپنی بے یقین آنکھیں دائی پر ڈالیں' تب دائی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی بات کا دوبارہ یقین دلایا۔

"اور ماں کی دعا..." طارق نے چونک کر اپنی ماں کو دیکھا۔ بے جی کی تسبیح کے دانے برابر گر رہے تھے۔ اور نگاہیں بچے پر تھیں۔ پھر عجیب مسکراتی نگاہ سے انہوں نے معصومہ کو بھی دیکھا تھا۔

"بے جی... بے جی! میرے بچے کے لیے آپ دعا کریں۔ آپ کی دعا اللہ سنے گا۔ ماں کی دعا رائیگاں نہیں جاتی بے جی!" طارق' بے جی کے قدموں میں آکے بیٹھ گیا۔

"ہاں... ماں کی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔" بے جی نے طارق کے سر پر شفقت سے بھرپور ہاتھ پھیرا۔

"میری بھی پوری ہو گئی۔"

سب بری طرح چونکے بے جی کی کون سی دعا... طارق کی اولاد کی دعا... تو کیا بے جی بھی دعا کرتی تھیں۔ مگر دنیا نے تو یہ ہی سنا تھا۔ بے جی نے بددعا دی تھی تو پھر...

طارق کا دھیان نہیں تھا' اس نے خود سے بے جی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر دعا کی طرح پھیلائے۔ "بے جی! دعا مانگیں... میرا بچہ... بے جی..."

"مانگوں گی... ابھی مانگوں گی... پر اس سے بول..." معصومہ کی طرف اشارہ کیا۔ "پہلے سچ بولے۔"

یہ کوئی وقت تھا اس بات کا... طارق ششدر رہ گیا۔ باقی تمام دنیا نے انگلیاں منہ میں ڈال لیں۔ طارق شدید صدمے کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ وہ بے جی کو یوں دیکھتا تھا جیسے ان کی دماغی حالت کے بگڑ جانے کا شبہ ہو۔ مگر بے جی یوں مطمئن تھیں جیسے اپنی شرط بتا دینے کے بعد گیند اب طارق کے کورٹ میں ہو اور بات مانی ہے تو مانو' ورنہ جاؤ۔

"میرے بچے کی زندگی کا سوال ہے بے جی۔"

طارق کی آواز پھٹی پڑ رہی تھی۔

"اور میرے بچے کی عزت کا سوال ہے طارق...!"

بے جی کا لہجہ چٹانوں سی سختی لیے ہوئے تھا۔

"یہ بات آپ کسی اور وقت بھی کر سکتی تھیں بے جی۔" طارق کا دل بند ہونے والا تھا۔ ماں سے ایسی امید نہ تھی۔

"میں نے ایسا موقع مل جانے کے لیے راتوں کو جاگ جاگ کر دعائیں کیں طارق کہ اللہ اسے..." معصومہ کی طرف بڑی جتاتی نگاہ سے دیکھا۔ "ایسی جگہ لے آئے جب یہ صرف سچ بولے۔ میں اس موقع کو جانے نہیں دوں گی۔ فیصلہ اب یہ کرے۔"

"بے جی... ہٹ دھرم... اجنبی اور کٹھور دکھائی دیتیں۔ طارق کو تو یوں ہی لگا جیسے قدموں سے زمین سرکی ہو۔ چاچی خیر دین نے با آواز بلند رونا شروع کر دیا۔ مجمع کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

طارق الٹے قدموں پیچھے سرکتے ہوئے بے جی سے دور ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی بے یقین صدمائی نگاہیں بے جی پر ٹکی تھیں۔ پھر اس نے نظریں پھیر کر اپنے نومولود بچے کو دیکھا۔ جو پرسکون سا سانسیں لے رہا تھا۔ اور پھر اس نے معصومہ کو دیکھا' جو بہت عجیب نگاہوں سے بے جی کو دیکھتی تھی۔ بے جی کی نگاہیں بھی بچے پر ٹکی تھیں اور اتنی تاثرات سے عاری تھیں کہ بے جان لگتی تھیں۔ اسی وقت بچے کو پھر جھٹکے سے لگے۔ اسے سانس لینے میں سخت دقت کا سامنا تھا۔ وہ نیلا جامنی سا ہونے لگا۔ وہ جیسے ختم ہونے لگا۔

ایسی ضدی' ہٹ دھرم' ظالم عورت تھیں۔ بے جی... ہر ایک کا دل پکار رہا تھا۔ طارق کے پیچھے ہٹتے قدم یوں تھے' جیسے وہ الٹے قدموں دنیا سے رخصت

ہو رہا ہو۔ جیسے کسی پہاڑ سے نیچے کھائی میں گرنے کے لیے اٹھائے قدم۔ جیسے۔

طارق کی آنکھوں میں نمی بھی آئی تھی۔ اس نے ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا اور ایسی نظر جیسے وہ نظروں سے گر رہی ہوں۔ گر گئی ہوں۔ کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔

چاچی خیردین کی آہ و زاری میں کئی عورتوں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں اور یہ آوازیں اتنی مکروہ لگ رہی تھیں جیسے کانوں میں سیسہ۔

"طارق بھائی ٹریکٹر آگیا ہے۔ جلدی آؤ۔ (جلدی آؤ)"

طارق نے سنا نہیں۔ نزدیکی عورت نے طارق کا کندھا چھو کر متوجہ کیا۔ طارق چونکا اور خالی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ چاچی خیردین خود ہی اٹھیں' بچے کو اٹھانے لگیں کہ وہ طارق کے ہمراہ جائیں گی۔ بچہ ایک بار پھر اکڑ گیا تھا۔ وہ سخت اذیت میں لگتا تھا۔ چاچی نے طارق کو متوجہ کیا' تب وہ یوں چلا جیسے کسی ٹرانس میں ہو۔ چاچی کے قدموں میں تیزی تھی۔ جتنی بھی جلدی کی جائے۔

"میں سچ بولوں گی طارق۔ اماں! آپ رک جائیں۔"

دہلیز پار کرتی چاچی خیردین ٹھٹک کر رکیں۔ طارق بری طرح چونکا' اس نے رک کر پیچھے دیکھا۔ انہیں پکارنے کے بعد معصومہ دروازے کو پکڑے بڑی مشکل سے کھڑی ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر فیصلہ کن کیفیت تھی۔ جیسے اب اور کوئی چارہ نہیں اور ایک آخری کوشش۔

"سچ۔؟ تو کیا کوئی اور بات بھی ہے جو کہ دراصل سچ ہے' تو اگر سچ کچھ اور ہے تو باقی سب جھوٹ تھا۔ مگر کیوں۔؟"

اور معصومہ کی صدا پر بے جی بھی تو چونکی تھیں' اتنا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کیا واقعی معصومہ سچ بولنے لگی ہے۔

"نارے نے کچھ نہیں کیا تھا طارق۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔"

طارق جس عجائب دماغی کی کیفیت کے زیر اثر تھا' اس سے ابھرا۔ اس نے بری طرح چونک کر اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ اس نے غلط سنا۔ طارق نے ماں کو دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ آئی تھیں۔ ان کا پورا وجود صرف کان بن گیا تھا۔

معصومہ بھی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور نقاہت' مگر وہ زیادہ چل نہ پائی اور ڈھے جانے کے انداز میں چارپائی پر بیٹھی۔

"میں نے بالکل جھوٹ کہا تھا' نارے تو۔" وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی یا اسے واقعات کو جمع کر کے کہنا مشکل لگ رہا تھا۔ یا۔

مگر بے جی نے یک دم ہاتھ اٹھا دیا۔ "بس۔ اب اور نہ بول' مجھے یہیں تک سننا تھا۔ کیوں اور کیسے سے میرا کوئی مطلب نہیں۔؟"

بے جی کی چال میں تیزی اور لہجہ میں بشاشت عود کر آئی تھی۔ وہ چاچی خیردین تک گئیں اور پوتے کو گود میں لے لیا۔ بچے کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور اس پر نظر ڈالنے سے دل رحم سے بھرتا تھا۔ بے جی سب کو ساکت چھوڑ کر اپنے تخت پر آگئیں۔

"بسم اللہ۔" بچے کو اپنے ہاتھ پر الٹا ڈال لیا اور دوسرے ہاتھ سے پیٹھ تھپکنے لگیں۔ بچے کو الٹا لٹکا دیا اور کمر پر زور زور سے ہاتھ مارے۔ یہ سارے کام دائی نذیراں پہلے ہی آزما چکی تھی۔ بچہ بس پل بھر کو نارمل ہوتا تھا۔ پھر دوبارہ وہی حالت۔

اور دنیا کی نظریں بے جی پر تھیں۔ جواب بھی لگتا تھا۔ بالکل اکیلی ہیں اپنے پوتے کے ہمراہ۔ دنیا کے کان معصومہ کی آواز پر تھے۔

اس کا لہجہ مدھم۔ ناکام۔ اور نقاہت سے بھرپور تھا' مگر اس کا کہا حرف حرف سمجھ آرہا تھا۔ مگر یقین نہیں آرہا تھا کہ۔

"زہر لگتا تھا وہ مجھے۔ گھن آتی تھی اس سے۔ وہ چپ بیٹھا ہوتا' تب بھی۔ بولتا تب بھی۔" معصومہ اپنی ایک ایک کیفیت بتانے لگی۔ "شادی کے دن سے

لے کر اسے گھر سے نکالنے تک۔

وہ میرے سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ خلاؤں میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے وہ سر مار' مار کے نوالے بنا تا تھا۔ بڑے بڑے بڑے۔ آلو گوشت کے سالن میں اسی کی وجہ سے نہ ہونے کے برابر نمک مرچ تھی۔ اسے سالن پسند تھا۔ میں نے نظر بچا کر تیز لمبی مرچ پلیٹ میں ڈال دی اور وہ اسے چبا گیا۔ ساتھ ہی تڑپ گیا۔ اس نے پانی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھرا جگ اسے دکھا کر زمین پر الٹ دیا۔ وہ چینی کے ڈبے کی طرف ہوا۔ میں نے ڈبا اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ جھپٹ لینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے ترسانا شروع کر دیا۔ ڈبا اس کے نزدیک کرتی۔ وہ لینے لگتا میں پیچھے کر لیتی۔"

مگر وہ مجھ سے تھوڑا ڈرتا بھی تھا۔ پانی اور چینی نہ ملی تو اس نے زور' زور سے زمین پر تھوکنا شروع کر دیا۔ پھر روکھا بڑا سا نوالہ تیز تیز چبانے لگا۔ وہ مجھ سے ڈرتا تھا یا شاید گھبراتا' بے بسی کے مارے رونے والا ہو گیا۔ جگ تو اسے مل نہیں سکا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور پورے گھڑے کو منہ لگا لیا۔ میرا منصوبہ تو ناکام ہو جاتا۔ میں نے پوری طاقت سے ڈوئی مار کے گھڑا توڑ دیا۔ میں تارے کو اشتعال دلانا چاہتی تھی۔ اتنا کہ اپنا مقصد پورا کر سکوں اور تارے اب باقاعدہ ڈر چکا تھا۔

اس نے بے جی کو آواز لگانے کے لیے منہ کھولا تو میں نے ڈوئی لہرا کر دکھائی' وہ وہیں دبک گیا۔ وہ میرے رویے سے حیران و پریشان تھا۔ پھر اس نے نظریں گھما کر اپنے کھانے کو دیکھا۔ جیسے وہ اپنا کھانا اٹھا کر کہیں اور جا کے کھائے گا اور اگر وہ چلا جاتا تو۔۔۔ میں نے چھ مہینے لگا کر وہ دن اور موقع چنا تھا۔ اگر ضائع ہو جاتا؟؟ میں کچھ اور سوچنے والی تھی' ایسا کہ وہ بھڑک جائے اور۔۔۔ تب ہی مجھے لگا' طارق آ رہے ہیں۔

میں نے تیزی سے لال مرچ کا ڈبا اٹھایا اور تارے کی جانب اچھال دیا۔ وہ تڑپ اٹھا اور اگلے ہی پل مجھ پر جھپٹ پڑا۔"

معصومہ چپ کر گئی۔ وہ بے جی کو دیکھنے لگی تھی۔ ششدر کھڑی عورتوں نے بھی اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ بے جی نے اپنے ہونٹ بچے کے ہونٹوں سے جوڑ رکھے تھے اور اسے مصنوعی سانس دے رہی تھیں۔ دائی نذیراں نے بھی یہ کیا تھا' مگر۔۔۔ بچہ چند لمبے سانس لینے کے بعد رک جاتا تھا' پتا نہیں کیوں؟

حیران کن بات یہ بھی تھی کہ بے جی اس سارے قصے کو سن ہی نہیں رہی تھیں۔ ان کا سارا دھیان بچے پر تھا۔ بچے کا سانس ایک بار پھر رواں ہوا تھا۔ بے جی نے اس پر کچھ پڑھ کر پھونکنا شروع کر دیا تھا۔ پھر وہ کھڑی ہو گئیں۔ ننگے پڑنگے نومولود کو اپنے شانے سے لگا کر پیٹھ تھپکنے لگیں۔ تھوڑا سا ٹہلتے ہوئے وہ مسلسل کچھ پڑھ رہی تھیں۔ بچے نے ایک عجیب سی چیخ ماری' اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے جھاگ دار لعاب نکل کر بے جی کے شانے کو بھگوتا چلا گیا۔

طارق بے تابی سے ایک قدم آگے آیا تھا۔ معصومہ نے آنکھیں بند کر لیں' اپنے بچے کی آخری ہچکی دیکھنے کی ہمت کسی ماں میں بھی نہیں ہوتی۔

"مگر یہ کیا؟" بے جی نے بچے کا منہ پونچھ دیا۔ پھر تخت پر ڈال کر اسے تولیے میں لپیٹ دیا۔ ماتھے پر بوسہ دیا۔ تب آنکھ چھلک پڑی۔ مگر چھلکتی آنکھ کے ساتھ مسکراتا مطمئن چہرہ۔ عجب منظر تھا۔ وہ بچے کو لیے معصومہ تک آ گئیں۔

"اسے دودھ پلاؤ۔ پیٹ صاف ہو گیا ہے۔ اب بھوک سے رو رہا ہے۔"

اور معصومہ کے ہاتھ بچہ لینے کو اٹھتے نہیں تھے۔ دائی نذیراں سر پکڑے بیٹھی تھی۔ اس کی پوری زندگی اسی کام میں گزری تھی اور وہ دعوے سے کہہ سکتی تھی۔ اس نے خود بچے کے حلق میں انگلی ڈال کر حلق صاف کیا تھا۔ پھر۔۔۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ مجمع میں موجود ہر عورت کے لیے بے جی انسان نہیں رہی تھیں۔ انسان سے کچھ اوپر۔۔۔ پہنچی ہوئی عورت۔۔۔ یا ایک ماں جو اولاد کی فطرت سے واقف ہوتی ہے۔ بے جی کا یقین۔۔۔ کس پر۔۔۔؟ خود پر۔۔۔ تارے پر۔۔۔ یا اللہ پر۔۔۔؟

بے جی پھر سے طارق کے نزدیک آ گئیں۔ جو کھڑا نہیں تھا۔ گڑ گیا تھا۔

دھلوائی کو مٹھائی کا کہہ دے۔ میں نہا کر شکرانے کے نفل پڑھ لوں۔" بے جی کی بوڑھی آواز میں کھنک تھی۔

سب حیران عورتوں نے سوچا' پوتے کی پیدائش کے نفل ملانے ہوں گے' مگر بے جی کے اگلے جملے نے جہاں سب کے منہ کھول دیے' وہیں طارق اور معصومہ مزید چھوٹے ہوگئے۔

"خوشی کا موقع ہے' شکر کا مقام ہے' کیوں بہن جی؟" بے جی نے چاچی خیرون کو مخاطب کیا۔ جواب نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ "میرے پتر کے متھے سے داغ ہٹنا۔ میں نے اللہ سے دعا مانگی تھی۔ اتنی زندگی ضرور دینا اور ایسا موقع بھی بنانا کہ میں اپنے تارے کا مقدمہ جیت لوں۔ مجھے سارے قصے کا نہیں پتا تھا مگر یہ ضرور پتا تھا۔ معصومہ جھوٹ کہتی ہے' دیکھی پھر اولاد کی مجبوری۔ اور سمجھ میں آیا ماں سے بڑھ کر مجبور اللہ نے دوسری کوئی مخلوق پیدا ہی نہیں کی۔"

"یہ آج کیا ہوا تھا؟" طارق گھر سے باہر نکل کر کسی پتھر پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ معصومہ بچے کو پہلو میں لٹائے سوچ رہی تھی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اپنے منہ سے اپنے جرم کا اقرار یوں کرے گی۔

اسے بے جی نے گھیرا تھا' یا اللہ نے۔ کہتے ہیں' اللہ کی پکڑ سے ڈرنا چاہیے۔ اس کی پکڑ سے پھر چھڑائی کیسے ہو۔ طارق کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ جاگ معصومہ بھی رہی تھی۔ ننھے معصوم بچے کو گود میں لیے۔ بچے کی سانسوں میں روانی تھی۔ وہ غلط ثابت ہوئی تھی۔ بے جی نے اسے واقعی بددعا نہیں دی تھی۔ ہاں بس اپنا معاملہ اللہ پر ڈال دیا تھا۔ پھر اللہ سے بڑھ کر فیصلہ ساز اور کون؟

طارق سوچ رہا تھا۔ انسانوں میں سب سے بلند رتبہ ماں کا۔ اس کے صبر کا۔ اس کی محبت کا۔ اس کے یقین کا۔ اس کا وجود سب سے معتبر۔ اسے اب زندگی بھر حیران رہنا تھا اور سوچنا تھا۔

وہ تو اپنی ماں کو ایک عام سی ماں سمجھتا تھا۔ جیسے کہ سب مائیں ہوتی ہیں۔ مگر وہ تو کچھ اور نکلیں۔ ان کے یقین' محبت اور صبر کے لیے جملہ کیسے موزوں کرے' اسے خبر نہیں تھی۔

مائیں ولی اللہ نہیں ہوتیں۔ مگر ولی اللہ کو پیدا ضرور کرتی ہیں۔

مائیں پیغمبر بھی نہیں ہوئیں۔ مگر پیغمبروں نے ان کی انگلی پکڑ کے چلنا ضرور سیکھا۔

اور مائیں بددعا بھی نہیں دیتیں۔ بے جی نے بھی نہیں دی تھی۔

طارق' ماں سے نظریں ملانے کے قابل نہیں تھا۔

معصومہ' طارق سے نگاہ ملانے جوگی نہ رہی تھی۔

ہاں۔ مگر بے جی سرخرو رہی تھیں۔ اپنے کھلے بیٹے کے سامنے۔

بے جی نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان تاروں سے بھرا تھا۔ مگر ان کا تارہ۔۔۔؟ ان کا آسمان آج بھی خالی تھا۔

نہ جانے کہاں ہوگا تارے۔۔۔ زندہ بھی یا۔۔۔

نہ جانے کس حال میں ہوگا' نہیں ٹھیک ہی ہوگا۔

اللہ نے دنیا میں معصومہ جیسے لوگ بھی بنائے ہیں' مگر کم تعداد میں۔۔۔ سو امید کی جاسکتی ہے کہ تارے کہیں بہت اچھی جگہ پر ہی ہوگا۔

دنیا میں خوف خدا رکھنے والے لوگوں کی کمی نہیں۔

☼

فرح بخاری

تحفہ

انسان یوں تو زندگی میں بے شمار موقعوں پر کبھی نہ کبھی شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ کبھی یہ کہ اسے اپنی کسی غلطی کی بدولت اٹھانی پڑتی ہے تو کبھی کسی کی یا زیادتی کی وجہ سے۔ لیکن یسریٰ کو کبھی اپنی کسی کمی یا کوتاہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی دوست کے لیے شرمندگی اٹھانی پڑی اور وہیں کھڑے کھڑے شاید کچھ ہی دس سیکنڈز میں اسے اندازہ ہوا تھا کہ دوسرے کے لیے اٹھائی جانے والی شرمندگی کا احساس خود پر گزرنے والی شرمندگی سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ "خصوصاً" اس صورت حال میں جبکہ آپ کی پرخلوص، دیرینہ، پیاری دوست کی کوئی آپ کی "نند" کے سامنے آجائے۔

"چیزیں بانٹنے کے بعد نادیہ نے خاصی ناپسندیدگی سے شاپر کو پرے دھکیلا" حالانکہ نہ تو یہ چیزیں نادیہ کے لیے آئی تھیں اور نہ ان اشیا سے اس کا کوئی سروکار تھا۔ یسریٰ تھک کر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھی اور اپنی سینڈل اتارنے لگی۔

"میں اپنی دوست سے ملنے گئی تھی۔ اس سے کچھ لینے نہیں۔" ناگواری چھپا کر اس نے قدرے تحمل سے جواب دیا۔

"ہاں۔ لیکن اتنی محبت سے آپ کی دوست نے آپ کو بلایا تھا اور جس جوش و جذبے سے آپ کی خاطر مدارت کی تو یقیناً" آپ کی دوست کو آپ کی خوب خدمت کرنی چاہیے تھی۔ میرے حساب سے تو آپ کو تحائف سے لدے پھندے واپس آنا چاہیے

تب" نفرت سے بھرپور لہجے میں اس نے نہایت بھونڈے طریقے سے اپنا تجزیہ پیش کیا۔ جس پر یسریٰ جیسی تو ناسمجھی سے چپ رہی لیکن بمشکل صبر کا گھونٹ بھرا۔

"بھابھی میری زندگی تمہارے حساب سے نہیں چلتی۔"

"بھابھی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں بھابھی۔ لیکن محبتیں تو تحفوں سے ہی جانچتے ہیں۔ لین دین اور لینے دینے سے ہی تعلق قائم رہتا ہے اور ہماری محبتوں کو جانچنے کا پیمانہ بھی۔" جانے کیوں وہ بات کو طول دیے بھی بحث کے موڈ میں آگئی۔

"تحفے کو محبت کا ثبوت تو میں بھی مانتی ہوں، لیکن محبت جانچنے کا آلہ کہنا کچھ نامناسب سی بات ہے، کیونکہ تحفہ خریدنے کے لیے محبت کو نہیں، بلکہ اپنی بساط اور حیثیت کو دیکھنا پڑتا ہے۔ یوں بھی سنتے آئے ہیں کہ "دینے والے کا خلوص دیکھنا چاہیے" چیز کی قیمت نہیں۔"

"یہ ہی تو۔" نادیہ نے ہاتھ نچایا۔ "یہ ہی تو میں کہنا چاہ رہی ہوں۔ بھئی ظاہر ہے جو ہمارے لیے دل میں جتنی جگہ محسوس کرتا ہے اسی حساب سے ہم پر خرچا بھی کرتا ہے۔ دوستیوں اور تعلقات میں بڑی بڑی باتیں تو ہر کوئی کرتا ہے، لیکن پول اس وقت کھلتی ہے جب کچھ رقم خرچ کرنی پڑ جاتی ہے۔ تب صحیح معنوں میں اندازہ ہوتا ہے کہ اگلا ہمارے لیے کتنا پرخلوص ہے۔"

"حیرت ہے کہ تم تعلقات کو دولت کے ترازو میں تولتی ہو۔ میری بے شمار سہیلیاں ہیں اور کئی لوگوں سے اچھے مراسم ہیں۔ میرے لیے تو اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے وقت نکالتے ہیں۔ اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے سے بانٹتے ہیں اور آنکھیں بند کرکے ایک دوسرے کے خلوص پر یقین کرتے ہیں۔ میں نے آج تک کی لائف میں کبھی اس بات کو اہمیت نہیں دی کہ میں نے اپنی سہیلیوں پر کتنا خرچا کیا اور بدلے میں انہوں نے مجھے کیا دیا۔ سچی دوستیوں اور محبتوں کے معیار ان مادی اشیا سے کہیں اوپر کی چیز ہیں ڈیئر!"

یسریٰ نے اس مرتبہ قدرے سمجھانے کے انداز میں نادیہ پر اپنا موقف واضح کیا۔ چند ہی دن رہ گئے تھے نادیہ کی شادی میں، وہ نہیں چاہتی تھی کہ بلاوجہ کی بحث میں دونوں کے درمیان کوئی تلخی پیدا ہو۔

"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں بھابی! حقیقت اس سے بالکل الگ ہے۔" نادیہ بھی طنزیہ لہجہ ترک کرکے اب سنجیدہ سی نظر آنے لگی تھی۔ "میں نے بھیا کی شادی میں اپنی ایک سہیلی کو خوب اصرار کرکے بلایا۔ بلکہ ابا کی خوب منتیں بھی کرنا پڑیں، کیونکہ وہ مختصر لوگوں کو انوائیٹ کرنا چاہتے تھے۔ خیر میں نے پھر بھی آمنہ کو بلالیا۔ لیکن اس نے ایک معمولی سا تحفہ دے کر سب سے ابا کے سامنے میری ناک کٹوادی۔"

"ہو سکتا ہے اس کی حیثیت نہ ہو مہنگا تحفہ دینے کی یا کوئی مجبوری ہو۔" یسریٰ کے دل کو دھکا سا لگا نادیہ کے ایسے بے لاگ تبصرے پر۔

"ارے بھابی! وہ ڈاکٹر کی بیٹی تھی، اچھی خاصی امیر کبیر فیملی سے تعلق ہے اس کا۔ ابا نے مجھے اتنی باتیں سنائیں کہ میں نے آمنہ سے دوستی ہی توڑ لی۔ ویسے بھی کیا فائدہ ایسی بے مروت دوست کا جسے میری عزت کی پروا نہیں تھی۔ ہونہہ۔"

نادیہ نے ناک سکوڑ کر خاصی اکتاہٹ سے دوست نوازی اور یسریٰ تحفے کے موضوع پر ایسا کھلا ڈلا تبصرہ سن کر لحظہ بھر کو چکرا سی گئی۔ حتیٰ کہ یہ گمان بھی گزرا کہ نہیں وہی تو غلط نہیں اور یہ مقولہ کہ تحفے کی قیمت نہیں، بلکہ دینے والے کا دل دیکھنا چاہیے کہ اصل تشریح یہ ہی تو نہیں جو نادیہ کر رہی ہے۔ اور وہ جانے برسوں سے کیا اخذ کیے بیٹھی تھی۔ اوپر سے مرحوم سسر کے خیالات جان کر یسریٰ کو خاصی مایوسی ہوئی، پہلی مرتبہ تہ دل سے ان کی مغفرت کی دعا کی۔ کیونکہ ایسی سطحی باتوں پر یقین کرنے کو دل واقعی نہیں مان رہا تھا۔

"میرا خیال ہے نادیہ! دوستی یا کسی بھی خلوص اور محبت کے رشتے کو دولت کے ترازو میں نہیں تولنا چاہیے۔" اس نے سمجھانے کے انداز میں دوبارہ کوشش کی۔ "میرے لیے تو یہ سوچ ہی انتہائی شرمناک ہے کہ میں تحفہ کھولتے ہی اس کی ماہیت جانچوں۔ میں نے تو جب اور جیسا تحفہ بھی کسی سے دوستوں سے پایا، دیکھتے ہی انتہائی ممنون ہوئی، کیونکہ میری سوچ یہ کہتی ہے کہ اگر دینے والے نے ہمارے لیے شاپ پر جانے کا وقت نکالا۔ اپنی پسند سے کچھ خریدا اور پیک کرکے ہم تک پہنچایا تو یہ ہی اس کا وہ جذبہ اور خلوص ہے جس کی ہمیں بنا تحفہ دیکھے ہی قدر کرنی چاہیے۔"

"آپ بھی نا بھابی!" نادیہ اس کی سادگی پر بے ساختہ ہنسی۔ "ارے بھابی اسی سیدھے پن کا تو لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خود پر ہزاروں خرچ کرنے والے ایسی کنجوسی سے ہمارے لیے تحفہ خریدتے ہیں جیسے مہینے بھر کی بچت آج اسی ایک تحفے سے نکال لیں گے۔ پتا ہے اسما بھابی میرے لیے لاہور سے سوٹ لائی تھیں پچھلے سال۔ نہ کپڑا عمدہ تھا، نہ رنگ اچھا۔ میں نے مروتاً رکھ تو لیا، لیکن ہفتے بھر بعد ہی کام والی کو دے دیا اور جانتی ہیں۔" وہ بات سے پہلے ہی خود قہقہہ مار کر ہنسی۔ "جب رشیدہ وہ سوٹ پہن کر آئی تو اسما بھابی کا چہرا تب سے دیکھنے والا تھا۔"

"اوہ... ان کا تو بہت دل دکھا ہوگا، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا نادیہ!" یسریٰ کا دل تاسف سے بھر گیا۔

"دل تو میرا بھی تو کھانا بھابھی۔۔۔ اپنے لیے وہ ایسی اعلا شاپنگ کرلائیں اور میرے لیے وہی سوٹ ملا انہیں۔ میں نے تو جان بوجھ کر جتانے کے لیے ایسا کیا تھا اور جب انہوں نے پوچھا کہ سوٹ رشیدہ کو کیوں دیا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ میں ایسے کپڑے نہیں پہنتی۔"

نادیہ نے حد کردی تھی صاف گوئی کی۔ یسریٰ نے پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔

"بعض دفعہ تحفہ خریدنے والا یہ سوچ کر ہمارے لیے کچھ پسند کرتا ہے کہ اسے لگتا ہے وہ چیز ہم پر اچھی لگے گی۔ یہ اور بات کہ وہ تحفہ ہمیں پسند نہیں آتا، لیکن تحفہ جیسا بھی ہو۔ تعریفی کلمات کے ساتھ اچھے طریقے سے شکریہ کہہ کر وصول کرنا چاہیے۔ ورنہ معمولی معمولی چیزوں کی وجہ سے ہم آپس میں دلوں میں بھی فاصلے بڑھا لیتے ہیں۔ مجھے بھی بے شمار مرتبہ ایسے تحفے ملے جو ہرگز میرے مزاج سے لگا نہیں کھاتے تھے اور میں نے بھی کئی تحفے بنا استعمال کیے آگے کسی اور کو دے دیے، لیکن کبھی بھی تحفہ دینے والے کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ دیکھو۔ تحفے کا معیار اس کی قیمت یا ہمارا اسٹینڈرڈ۔ ان سب سے کہیں بڑھ کر ہے دینے والے کے جذبات کا خیال رکھنا۔ ایک تحفے کی وجہ سے کسی انسان کا دل توڑ دینا کہاں کی انسانیت ہے۔ جب ہم خود اپنے آپ پر ہزاروں خرچ کرکے اپنی پسند کی عمدہ سے عمدہ چیز خرید سکتے ہیں تو کیوں ناحق کسی کا دل توڑیں اور تم چچی کو کہہ دو۔ تحفے کی اصل خوب صورتی تو بس اتنی ہے کہ "کسی نے ہمیں یاد رکھا۔ مادیت پہ دھیان دینا ہماری بڑائی نہیں، چھوٹا پن ہے۔"

یسریٰ قطعیت سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نادیہ بھی جواباً خاموش رہی۔

اس میں تو یقیناً کوئی شک نہیں کہ اکثر لوگ واقعی سر سے بوجھ اتارنے کے لیے تحفہ خریدتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تعداد ہمارے ہاں ان لوگوں کی ہے جو ان چاہا تحفہ وصول کر لینے کے بعد اس موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ جلد از جلد کسی طرح دینے والے پر ظاہر کریں کہ ایسے معمولی تحفے کے دینے سے تو نہ دینا زیادہ بہتر تھا اور اتفاق سے وہ ایسا موقع ڈھونڈ بھی نکالتے ہیں۔ نادیہ کے چلے جانے کے بعد وہ بیڈ سے ٹیک لگاتے ہوئے ایک بار پھر وہیں بیٹھ گئی اور انعم کے دیے تحائف کو بغور دیکھنے لگی۔ انعم سے اس کی دوستی کالج کے آخری دو سالوں میں ہوئی تھی۔ وہ ایک بہت ذہین اور سادہ مزاج لڑکی تھی۔ دونوں کا وقت ایک ساتھ بہت اچھا گزرتا تھا۔ گریجویشن کے بعد کچھ عرصہ دونوں کا فون پر ایک دوسرے سے رابطہ رہا۔ پھر انعم کی جب بات طے ہوگئی اور اس نے یسریٰ کو بھی اپنی شادی کا کارڈ بھیجا لیکن اتفاقاً وہ ان دنوں بڑے بھیا کے ولیمے پر گئی ہوئی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ انعم کی شادی میں شرکت نہ کرسکی اور واپس آنے کے بعد روزانہ یہ سوچتے ہوئے کہ انعم کو معذرت اور مبارک باد دینے اس کی امی کے ہاں جائے یا سسرال وہ بس سوچتی رہ گئی۔ انعم بھی شاید نئی زندگی میں کافی مصروف ہوگئی تھی۔ اس لیے رابطہ نہیں کرپائی۔ اور ادھر یسریٰ کی شادی بھی درمیان میں واقعہ ہوگیا۔ نیا ماحول، نئے رشتے، ذمے داریوں کا بوجھ۔ وہ مصروف سے مصروف تر ہوتی گئی۔ یوں قریب کے تعلقات کو نبھاتے۔ دل کی دوری چلے جانے والوں میں حقیقی دوری بن گئی۔

یسریٰ ماسٹرز سے فارغ ہوئی تو گھر والوں کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوگئی۔ ابو اور بھائی نے زبیر کو اس کے لیے پسند کیا اور چھ ماہ کے اندر اس کی شادی ہوگئی۔ اب گزشتہ دو سال سے وہ خوش حال ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ پچھلے ہفتے زبیر کے دوست کی شادی میں اتفاقاً انعم سے ملاقات ہوئی۔ تقریباً چار سال بعد دونوں کی ملاقات ہو رہی تھی۔ ایک دوسرے کو بتانے کی اتنی ڈھیر ساری باتیں تھیں کہ گلے شکوؤں کا وقت ہی نہیں ملا دیر تک حال احوال جان لینے کے بعد بھی جی نہیں بھرا۔ دونوں نے ہی ایک دوسرے کو گھر

آنے کی دعوت دی' لیکن انعم نے چوتھے روز دوبارہ یاد دہانی کا فون بھی کر دیا تھا تو یسریٰ نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ زبیر اسے انعم کے گھر چھوڑ کر آگے کہیں کام سے چلے گئے۔

انعم بہت گرم جوشی سے ملی۔ وہ ایک بھری پُری جوائنٹ فیملی میں رہتی تھی۔ اس کے ساس سسر دونوں حیات تھے۔ چار کنواری نندیں اور ایک جٹھانی بھی تھی' گھر میں اچھی خاصی محسوس کی جانے والی رونق تھی۔ رہن سہن اور گھر کی حالت ان کے لوئر مڈل کلاس ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ یسریٰ کو دل ہی دل میں قدرے دکھ ضرور ہوا کیونکہ کالج کے دنوں میں جتنا وہ انعم کو جان پائی تھی اس حساب سے یقیناً" اس کا تعلق ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ پھر اب... شاید یہ ہی نصیبوں کے کھیل ہیں۔ اس نے انعم کے کھلے چہرے پر اطمینان محسوس کرتے ہوئے خود سے کچھ بھی پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ویسے بھی وہ ان دنوں امید سے تھی۔ یہ اس کا تیسرا بچہ تھا جس کی آمد چند ماہ میں متوقع تھی۔

انعم کے سسرال والے کافی ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے۔ اس کی ساس' جٹھانی اور نندوں نے یسریٰ کو ہرگز یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ یہاں صرف انعم کی مہمان ہے۔ ہنسی مذاق میں گزارے ان دو ڈھائی گھنٹوں میں یسریٰ نے سالوں بعد اتنا انجوائے کیا۔ واپسی پر انعم نے اسے کچھ تحائف دیے جنہیں اس سے پہلے نادیہ نے دیکھا اور فوراً" ہی یہ کہہ کر ریجیکٹ کر دیا کہ اتنے برسوں بعد کی ملاقات میں آپ کی دوست نے بس یہ ہی کچھ دیا؟

انعم کے دیے تحائف میں ہاتھ سے بنی بہت سی اشیا تھیں۔ یسریٰ دھیان سے ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔ سب سے پہلے اس نے چھ پیس کا کشن کور سیٹ دیکھا۔ لائٹ براؤن کلر کے کورز پر کھلتے ہوئے تیز اونی دھاگوں سے سائیڈ بارڈر اور کشن اسی ہی ہوئی تھیں۔ کسی پر بے بی ڈول' کسی پر سورج مکھی کا پھول' پتنگ' صراحی' پرس اور اونی ٹوپی وغیرہ۔ اور اسی سے ملتے جلتے ہاتھ سے بنے تین ٹیبل رنر۔ یسریٰ کو سیٹ بہت پسند آیا۔ آج کل ایسی چیزوں کا بہت فیشن تھا۔ روایتی اور ماڈرن کے حسین امتزاج سے بنے سارے ہی کورز بہت خوب صورت تھے۔ یہ اور بات کہ سب ہی کچھ بازار سے الگ الگ خرید کر خود ہاتھ سے گھر میں محنت کی گئی تھی اور نادیہ کی عادت بھی وہ جانتی تھی۔ ان ہی اشیا کو اگر کسی مہنگی کا ٹیگ لگا ہوتا اور ان میں ڈس پلے پر لگا دیا جاتا تو یقیناً" وہ [illegible] دیکھتی بھی ضرور اور بہت ممکن تھا خرید بھی لیتی۔

یسریٰ نے اپنے جہیز کے صوفے پر ایک نظر ڈالی۔ [illegible] کے صوفے کے ساتھ یہ ساری چیزیں بہت خوب صورتی سے میچ کر رہی تھیں۔ اس نے دوسرا پیکٹ کھولا۔ ہاتھ سے بنے ہوئے قرآن پاک کے دو غلاف تھے۔ یسریٰ نے غلاف پر کی گئی نہایت باریک کڑھائی پر حیرت سے ہاتھ پھیرا۔ اتنا نفیس اور [illegible] کوئی کاریگر مشین پر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ [illegible] غلاف پر گہری سبز اور سنہری کڑھائی کا عمدہ کام کیا ہوا تھا اور دوسرے غلاف پر میرون اور گولڈن کام تھا۔ اس [illegible] سخت شرمندگی محسوس کی۔ ان [illegible] کا کبھی خرید کرنے کی سادگی اور [illegible] قرآن پاک [illegible] پیک دیا ہوا تھا۔ اگر قرآن [illegible] تلاوت پر تھوڑی زیادہ توجہ اور دھیان دے دیا [illegible] ثواب اور دلی سکون حاصل ہو گا۔ جانے اب سے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ اس نے چیزوں کو دوبارہ پیک کر کے سنبھال کر الماری میں رکھ دیا۔

☆ ☆ ☆

روشنیوں اور قمقموں سے سجے گھر میں جب چند باجوں اور شہنائیوں کے سُر اترے تو صحن کی رونق دوچند ہو گئی۔ اورنج اور شاکنگ پنک عروسی لہنگا ڈریس میں نادیہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ نکاح کی رسم بخیر و خوبی انجام پا گئی تھی۔ دونوں طرف سے منہ میٹھا کروایا گیا۔ یسریٰ بھاگ دوڑ کر سارے انتظامات دیکھ رہی تھی۔ تب ہی نظر اپنی ساس پر پڑی۔ جانے

کیوں اتنی خاموش اور گم صم سی بیٹھی ہیں۔ یسری سارے کام چھوڑ کر ان کی طرف آئی۔

"کیا بات ہے امی... اداس ہیں؟" اس نے ہولے سے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"ہاں...!" فاطمہ بیگم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"کتنی بڑی پتھر کی سل رکھنی پڑتی ہے ماؤں کو اپنے سینوں پر... بھاگتی دوڑتی گھر کی رونقوں کو مال اسباب کے ساتھ خود ہی رخصت کرنا کتنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔"

انہوں نے ضبط سے لب بھینچے۔ شاید رونا چاہتی تھیں، لیکن عین اسی وقت سمدھن صاحبہ ڈھونڈتی ہوئی آنکلیں۔

"بہن! ایک بات یاد دلانی تھی۔ آپ نے جو جہیز بھجوایا تھا اس میں شاید قرآن پاک رکھنا بھول گئیں۔ جہیز میں قرآن پاک نہیں تھا۔"

نادیہ کی ساس نے باآواز بلند اعلان فرمایا تو یسری اور فاطمہ بیگم نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا۔

"جی جی... ہم نے بھی کہا تو تھا شاید کوئی رکھنا بھول گیا... بچے... جاؤ یسری قرآن پاک لے آؤ۔"

انہوں نے اندرونی گھبراہٹ چھپا کر لہجے کو بارعب بنانے کی ناکام سی کوشش کی۔ یسری ان کے نظریں چرانے سے کچھ نتیجہ اخذ کرتی اندر کی طرف دوڑ گئی۔

فاطمہ بیگم کے کمرے میں آکر اس نے الماری کھولی۔ قرآن پاک اور دیگر دینی کتب یہیں پر رکھی جاتی تھیں۔ اس نے پہلی نظر میں جانچ لیا کہ کوئی نیا قرآن پاک وہاں نہیں ہے۔ یسری سمجھ گئی کہ بھاری بھرکم زیورات اور فرنیچر سے لے کر سوئی تک کی تیاری میں خوب باریک بینی کا مظاہرہ کرنے والی اس کی ساس اور نند صاحبہ نیا قرآن پاک لینا یکسر فراموش کرچکی تھیں۔ اس نے الماری بند کرکے اپنے کمرے کی راہ لی۔ اس کا اپنا جہیز میں آیا قرآن پاک کافی نیا تھا۔ لیکن... غلاف بالکل ہی سادہ سے کپڑے کا تھا۔ اس کی اپنی ساس تو ان باتوں پر دھیان دینے والی تھیں نہیں۔

اس لیے کسی نے خاص نوٹس نہیں لیا تھا، لیکن نادیہ کی ساس کافی نکتہ چین تھیں۔ بھری محفل میں پوری [illegible] کوئی بھی بات اچھال سکتی تھیں۔ یسری نے ذہن ہی ذہن [illegible] جھمکانے سے انعم کے دیے غلاف [illegible] اس نے فورا" کپڑے میں سے قرآن پاک نکال کر سرخ رنگ کے غلاف میں لپیٹا اور فورا" نیچے آئی۔ ستاروں سے چمکتے نئے نکور لش کرتے غلاف کو دیکھ کر فاطمہ بیگم کی بے ربط سانسوں میں خوش گوار سا ردھم پیدا ہوا۔ پورے دانت نکال کر انہوں نے بھرپور اعتماد سے قرآن پاک یسری سے لیا اور فخر سے سمدھن کی طرف بڑھ گئیں۔ نادیہ نے بھی [illegible] لحظہ بھر کو انعم کی ماں کے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور بے ساختہ نظریں یسری کی طرف گئیں۔ یسری معنی خیزی سے مسکرا کر اس کے قریب آئی۔

"یہ وہ بات ہے وہ خلوص جو تحفے کی قیمت میں نہیں... دینے والے کے دل میں پنہاں ہوتا ہے۔ محبت اور رغبت سے دیا کم قیمت تحفہ بھی کبھار لاکھوں کے [illegible] پر بھاری ہو جاتا ہے۔"

یسری نے مناسب موقع محل نہ ہونے کے باوجود اپنا نکتہ نظر فوری طور پر نادیہ تک پہنچایا۔ مقصد اس پر طنز یا چوٹ کرنا نہیں تھا بلکہ صرف اتنا کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ سسرال کی دہلیز پہ پہلا قدم رکھنے والی تھی۔ سسرال... جہاں صرف تحائف ہی نہیں بے شمار دوسرے امتحان بھی لڑکی کے منتظر ہوتے ہیں۔ وہاں بھی نادیہ اگر یہ ہی جملہ بول دے کہ میں ایسی چیزیں نہیں لیتی اور میں ایسے کپڑے نہیں پہنتی تو جوابا" یہ تک سن سکتی ہے کہ۔

"ہم بھی ایسی بہو کو اپنے گھر میں نہیں رکھتے، خدانخواستہ...!"

اور تحفے کی قیمت نہیں، دینے والے کا دل دیکھنا چاہیے۔ اس مقولے کے معنی بھی بس ایک ہی ہیں کہ کم قیمت تحفہ جو خلوص اور محبت سے دیا گیا ہو، اول تو بڑی خوب صورتی سے استعمال میں آجاتا ہے اور اگر نہ بھی آئے تو دل میں جگہ ضرور پالیتا ہے۔

حیا بخاری

معاملہ واقعی بہت بڑا تھا۔ کیونکہ عزت کا معاملہ تھا۔ پھر بھی انہیں یقین تھا کہ ان کا بیٹا بے قصور ہے۔

مکمل ناول

وہ ان کا مان تھا فخر تھا۔ اس کے حسن یوسفی اور اطاعت اسماعیلی جیسی خوبیوں کا تو زمانہ گواہی دیتا تھا۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ وہ آسمانوں پہ پرواز کرنے والا ان کا شاہین بیٹا۔ کیا اس قدر پاتال میں گر سکتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ تب ہی پورے اعتماد سے وہ اپنے بھائی کے ہمراہ جرگہ میں شامل ہوئی تھیں۔ بھائی مردوں میں جا بیٹھے تھے۔ اور ان کا بیٹا بھی جس کا اونچا سر ان کے یقین کے لیے بہت بڑی ڈھارس تھا۔ وہ گاڑی میں ہی بیٹھی رہی تھیں۔

تب ہی وہاں وہ سہمی سہمی سی چڑیا جیسی لڑکی لائی گئی۔ "یہ لڑکی بھی معصوم ہے۔" ان کے دل نے گواہی دی۔ وہ مزید الجھیں۔ قرآن پاک لایا گیا۔ لڑکے نے ہاتھ رکھ کے قسم کھائی کہ وہ بے گناہ ہے۔ کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ گواہوں کو اکٹھا کیا گیا۔ سب نے ان دونوں کے گناہ کا اقرار کیا۔ لڑکی کے سامنے قرآن لایا گیا۔ اس نے ساتھ کھڑی عورت کے کان میں کچھ کہا۔ قسم واپس لے لی گئی۔ اور بیان لیا گیا۔ ڈری سہمی چڑیا میں اچانک ہی اعتماد آیا تھا۔ اس نے بغور سامنے کھڑے مغرور سی شخصیت والے اس لڑکے کو دیکھا اور نظریں جھکاتے ہوئے گناہ کا اقرار کیا۔ اپنے اور اس لڑکے کے تعلقات کا اقرار کیا۔ لڑکے کا سر جھکا نہیں تھا اور تن گیا تھا اور اس کی ماں۔

محبت بہار کے موسم کی طرح ہوتی ہے۔ بے کل کر دینے والی۔ من آنگن میں ایک سرگوشی سی بھر دینے والی جس میں کھٹی سی اداسی بھری کسک بھی شامل ہوتی ہے۔

بالکل ایسی ہی حالت آج کل اس کی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے؟ ہاں مگر کسی کو دیکھ کر بے اختیار ہی دل اس کے اپنا ہونے کی گواہی دے تو محبت ہی ہوئی ناں۔

جب اس سے کوئی رابطہ نہ ہو پھر بھی اس کی شکل نظروں سے اوجھل ہی نہ ہو تو محبت ہی ہوئی ناں۔

جب وہ کبھی آپ سے ہم کلام نہ ہو۔ مگر ہمیشہ اس کی صدائیں دھڑکن کی وادی میں گونجتی رہیں تو محبت ہی ہوئی ناں۔ وہ ابھی تسلیم نہیں کر پا رہی تھی۔ مگر یہی محبت تھی جو آج کل اس کے دل پہ پوری طرح قابض ہو چکی تھی۔ دھڑکنیں اس کی تھیں مگر اس پر مہر سی اور کی۔

دن لمبے ہو رہے تھے۔ تب ہی سورج کی تمازت میں بھی اچھا خاصا اضافہ ہونے لگا تھا۔ اسے دھوپ سے سخت الرجی تھی۔ ذرا دیر دھوپ میں ٹھہرنے سے چہرے اور گردن پہ جگہ جگہ سرخ دھبے سے پڑ جاتے۔ تب ہی اس کی کوشش ہوتی کہ گھر کے کام جلدی نمٹا کر سحر آنٹی کے پاس چلی جائے۔ اس کی اس جلد بازی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ اور وہ تھا اسید محمود۔

اس نے تیزی سے کام نمٹائے۔ حلیہ درست کیا۔ بڑی سی چادر لے کر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر اس نے سامنے لگے وال کلاک پہ نظر دوڑائی۔ سوا آٹھ ہو رہے تھے۔ مطلب اسید محمود گھر سے نکلنے والا ہو گا۔ گھر کا دروازہ اچھی طرح بند کر کے وہ ساتھ والے گھر کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

مین گیٹ کھلا تھا۔ جس کا مطلب تھا اسید محمود ابھی گھر پر ہی تھا۔ اس نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ تب ہی گھر کا اندرونی دروازہ کھلا تھا۔ اور ایک ہاتھ سے موبائل کان سے لگائے بہت عجلت میں وہ دشمن جاں باہر آیا۔ ہمیشہ کی طرح اس نے بلیو جینز پہ سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا فیورٹ لباس، گھنے بال بار بار پیشانی پہ آتے اور وہ مسلسل دوسرے ہاتھ سے موبائل سنبھالے ایک ہاتھ سے انہیں دوبارہ سیٹ کر لیتا۔

ہمیشہ کی طرح ہی اسے آتا دیکھ کر اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ "کاش کہ آج وہ اس کا نوٹس لے لے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح دعا کی تھی۔

اسید محمود کی شخصیت میں عجیب ہی تمکنت تھی۔ وہ مغرور ہرگز نہ تھا۔ پورے خاندان میں اس کی طرح ہنس مکھ اور اچھے اخلاق والا کوئی نہیں تھا۔ سب کا خیال رکھنا اس کی فطرت تھی۔ کسی کا بھی دکھ ہوتا' اسید محمود سب سے پہلے پہنچتا۔ پھر بھی اس قدر میل جول والی عادات رکھنے کے باوجود اس کی شخصیت میں کچھ ایسا تھا کہ جو دوسرے کو خود بخود ایک فاصلہ رکھنے پہ مجبور کر دیتا۔ کالی... بے حد سیاہ چمکدار آنکھیں اور تنے تنے... سے ابرو اس کی شخصیت کو کچھ ایسا غرور بخش دیتے کہ سامنے والا اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکتا۔ مگر اس کی شخصیت کا یہ عنصر کسی کو اس کے زیادہ قریب بھی نہ آنے دیتا۔

صفا کو بھی ان کے گھر آتے جاتے چھ ماہ سے اوپر ہو گئے تھے۔ مگر آج تک اس نے اسید سے بات کرنے کی ہمت نہ کی تھی۔

وقت جیسے تھم سا گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس پہ سحر سا طاری ہوا تھا۔ سانس تک ساکن ہونے لگی تھی۔ وہ قدم بہ قدم قریب آ رہا تھا اور پلکیں جھپکائے بغیر اس دیوؤں جیسی شخصیت رکھنے والے ساحر کو دیکھے جا رہی تھی۔ محبوب کے قدم دھڑکن بن گئے۔ ہوا اس کے بدن کی مہک اور پھر جھونکا جیسے اسے چھو کر گزر گیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ اب اس کا یہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ وہ خاموشی سے اندر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

"سحر آنٹی!" سب جگہ دیکھ لینے کے بعد وہ ان کو ڈھونڈتی پچھلے لان کی طرف نکل آئی تھی۔ اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ پودوں کی صفائی میں لگی ہوئی تھیں۔

"آ گئی صفا بیٹیا۔" اسے دیکھتے ہی نرم سی مسکراہٹ

ان کے نبوں کو چھو گئی۔

"آپ یہاں ہیں آنٹی! اور میں آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈ چکی۔" وہ بھی مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ ہی گھاس پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ موسم بدل رہا ہے۔ تو پودوں کی تراش خراش کروں۔ مگر کوئی نہ کوئی کام نکل آتا۔ آج فارغ تھی تو سوچا یہ کام نبٹا ہی لوں۔" خاک ہو جاتا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! میں تمہاری وجہ سے ہی کہہ رہی تھی۔ تمہاری ماں کی غیر موجودگی میں اس کا اکثر یوں چلے آنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔" انہوں نے صاف گوئی سے کہا۔ صفا کے دل کو ڈھارس سی ہوئی۔

"سچ بتاؤں تو آنٹی! جب سے کالج سے فارغ ہوئی ہوں۔ گھر پہ اکیلے رہتے ہوئے مجھے بھی بے حد خوف آتا ہے۔ مگر سچ میں جب سے آپ لوگ یہاں آئے

انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کرسی پہ پڑا رومال اٹھا کر ہاتھ صاف کرنے لگیں۔

"حیرت ہے آنٹی! اتنے نوکر ہیں آپ کے مگر پھر بھی آپ سارا دن مصروف رکھتی ہیں خود کو۔" وہ بھی اٹھ کر ان کے پاس چلی آئی۔

"خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ کام سے انسان مصروف ہو جاتا ہے اور پھر اچھی صحت کے لیے بھی یہ بے حد ضروری ہے بیٹا۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بی بی جی۔ وہ جی آپ کے کزن آئے ہیں۔ بلا رہے ہیں آپ کو کہہ رہے ہیں کہ کوئی ضروری کام ہے۔" تب ہی سحر محمود کے چوکیدار نے اطلاع دی۔

"تمہاری امی تو اسکول گئی ہوں گی ناں؟" سحر آنٹی نے پُرسوچ نگاہوں سے اس کا پیچ چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی آنٹی! چاچا ان کو بتا دیں کہ میں ابھی ضروری کام میں مصروف ہوں۔ شام میں امی آئیں گی تب آجائیں۔" وہ سرہلا گیا۔

"اور سنو خان کاکا۔ ان سے مزید کوئی بات نہ کیجیے گا۔ دوبارہ یہاں پیغام لانے کی ضرورت نہیں۔" سحر نے سخت لہجے میں ہدایت دی۔ تو سرہلاتا وہ وہاں سے چلا گیا۔

"آئی ایم رئیلی سوری آنٹی۔ آپ کو میری وجہ سے۔" وہ واقعی ان کی ناراضی سے ڈر گئی تھی۔ سحر آنٹی کو ناراض کرنا کسی طرح اس کے لیے مناسب نہ تھا۔ ورنہ اس کا بنا بنایا سارا کھیل بگڑ سکتا تھا۔ سب

تب۔ میں خود کو بالکل محفوظ سمجھنے لگی ہوں۔ سحر آنٹی! یقین کریں اسید سر گھر پر اکثر نہیں ہوتے مگر جب وہ گھر پر ہوں پھر بھی میں نے کبھی ان کی نظروں کو ادھر اُدھر بھٹکتے محسوس نہیں کیا۔ میری زندگی میں کم از کم وہ پہلے مرد ہیں جن کی آنکھوں میں عورت کا احترام دیکھا ہے۔ ورنہ تو۔" وہ ذرا سا رکی۔ سحر کے لبوں پہ مطمئن سی آسودہ سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

"جتنی لڑکیاں آپ سے دین و دنیا کی باتوں میں رہنمائی لینے آتی ہیں، لیکن مجال ہے جو اسید سر کسی کو نظر بھر کر دیکھ لیں۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ حیادار ماں کا بیٹا با حیا ہوتا ہے۔ اسے صرف گھر کی خواتین ہی نہیں بلکہ دنیا کی سب عورتوں کی عزت کرنا آتا ہے۔" وہ پورے دل سے سچائی بیان کر رہی تھی اور مسکراہٹ سحر محمود کے ہونٹوں سے چپک کر رہ گئی تھی۔

"اسید تو میرا فخر ہے بیٹا۔ میری زندگی کا سبب ہے اسید اور اس کا کردار اس پر تو مجھے خود سے بڑھ کر یقین ہے۔ وہ اپنے منہ سے بھی کہہ دے کہ وہ کوئی غلط کام کر کے آیا ہے تو میں تسلیم نہ کروں اور صرف یہی وجہ ہے کہ میں اتنے اطمینان سے اتنے گھروں کی بچیوں کو قرآن و سنت کی تعلیم دیتی ہوں بنا کسی خوف اور خدشے کے۔ خود سے بڑھ کر یقین ہے مجھے اسید پر۔" ان کے لہجے میں ان کے بیٹے کے لیے فخر سمویا تھا اور لڑکیاں بھی آنا شروع ہو گئی تھیں تبھی اس نے بھی مزید گفتگو کرنے سے گریز کیا تھا۔ سحر محمود اپنے تخت کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"صفا۔" امی کی آواز پہ اسے سخت بیزاری محسوس ہوئی تھی۔ سارا دن کام کاج کر کے صرف یہی وقت فارغ ملتا تھا۔ جب وہ اپنے پسندیدہ رسالے پڑھ لیتی۔ مگر امی ہمیشہ اس وقت بھی ضرور اسے پکارتیں۔ اور وہ بس کڑھ کے رہ جاتی۔ امی نے بابا کے بعد اسے پورے عیش و آرام سے پالا تھا۔ اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ وہ کبھی بھی ان کو کسی بات پہ انکار نہ کرتی۔ چاہے دل میں کتنی ہی بیزار کیوں نہ ہوتی۔

"جی امی... آئی۔" ابھی بھی اس نے روز کی ہانک لگائی اور بیزاری سے دوپٹہ لیتی باہر چلی آئی۔

"ساحر آیا تھا؟" اس کے وہاں پہنچتے ہی سوال آیا۔ کوفت دو گنی ہوئی۔

"جی اور پھر آپ کے اسکول ٹائمنگز میں۔" اس نے جواب دیتے ہوئے اگلے سوال کو بھی مد نظر رکھا تھا۔ تبھی جواب لمبا تھا۔

"تو کیا میرے اسکول ٹائمنگز میں یہ تمہارا فرض نہیں کہ مہمانوں کو دیکھو۔" امی نے تأسف سے اسے دیکھا۔

"بالکل ہے... مگر مہمان بھی تو ڈھنگ کے ہوں امی۔" وہ لاپروائی سے کہتی ان کے ساتھ ہی صوفے پہ ڈھے سی گئی۔

"بری بات صفا۔ کزن ہے وہ تمہارا۔ پھر اس میں بری بات کون سی ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ بااخلاق ہے۔" ان کی بات پہ وہ ذرا سا رخ پھیر کے بس منہ ہی بنا سکی۔

"پھر جب وہ اسید کے دروازے پہ بھی چلا آیا تو تمہیں ضرور اس کی بات سننی چاہیے تھی۔ کتنا برا محسوس ہوا ہو گا اسے۔" امی کی بات پہ وہ اندر ہی اندر کلس کے رہ گئی۔

"خبیث نے ساری مووی سنا دی ہے امی کو۔" وہ بڑبڑائی۔

"جو کہنا ہے صاف کہو، مکھیوں کی طرح بھنبھناؤ مت۔" امی نے فوراً ٹوکا۔

"میں نے کچھ نہیں کہا۔ مگر امی! آپ جانتی ہیں کہ میں سحر آنٹی کے گھر ڈانس سیکھنے نہیں جاتی، ورنہ ضرور بریک لے کر اس سے بات کرتی ——— میں دینی تعلیم لینے جاتی ہوں۔ ایسے میں سحر آنٹی کے لیکچر کے درمیان سے اٹھ کر جانا بہت کچھ مس کر دیتا تھا۔ تب ہی میں نہ جا سکی۔" اس کی بات میں وزن تھا۔ اس بار وہ خاموش رہی تھیں۔

"سچ بتاؤں تو امی دنیاوی کاموں کے لیے تو ہمارے پاس بہت وقت ہوتا ہے۔ دینی کاموں کے لیے جو تھوڑا سا وقت میں نکال لیتی ہوں اسے کیوں ضائع کروں۔ مجھے بے حد فائدہ ہو رہا ہے اور میں کسی قیمت پر اپنا نقصان نہیں کرنا چاہتی۔" اس کا لہجہ مستحکم تھا۔ راحت خاموش ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼

پتا نہیں کیوں مگر یہ لڑکی انہیں بے حد عزیز لگنے لگی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سارا دن اس کا معصوم اور پاکیزہ سا سراپا ان کی نگاہوں میں رہتا۔ آج کل کے دور میں بھی وہ یوں بڑا سا دوپٹہ اپنے گرد پھیلائے رکھتی جیسے کسی کی نظریں بھی اس کے شفاف سے سراپے سے چھو گئیں تو وہ میلی ہو جائے گی۔ بیٹیوں کی سی انسیت محسوس کرنے لگی تھیں وہ صفا سے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے اللہ نے صفا کے روپ میں ان کی بیٹی کی خواہش بھی پوری کر دی تھی۔ تب ہی وہ سب لڑکیوں کے چلے جانے کے بعد بھی اسے اصرار کر کے تب تک اپنے پاس ہی روک لیتیں۔ جب تک اس کی امی نہ آ جاتیں۔ ابھی بھی وہ لان کے کونے پہ رک گئی تھی۔ سحر نماز پڑھنے گئیں تو وہ کچن میں آ گئی اور کچھ باقی پڑے کام نپٹانے لگی۔

"امی! میرے سر میں درد ہے۔ پلیز ایک کپ کڑک سی چائے بنا دیں۔" بھاری مدھم لہجے پہ صفا کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ بت بنی وہیں کھڑی رہ گئی۔ یوں جیسے پیچھے مڑ کر دیکھے گی تو پتھر کی ہو جائے گی۔ اسے اپنے

پیچھے کرسی کھسکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ مطلب وہ وہاں بیٹھ چکا تھا اور پھر انگلیاں بجانے کی مدھم آواز کچن میں گونجنے لگی۔ اس نے دھیرے سے ذرا سا رخ پھیر کر دیکھا۔

وہ دائیں ہاتھ سے کنپٹی مسل رہا تھا۔ جبکہ بائیں ہاتھ کی انگلیاں مسلسل ٹیبل پر رقص کر رہی تھیں۔ جن کی وجہ سے ہلکی سی تھاپ بھی پیدا ہوتی۔ اس نے اسید کی غیر توجہی محسوس کرتے ہوئے خاموشی سے چائے کے لیے پانی رکھا۔ اور چائے بنا کر دھیرے سے کپ میز پر دھر دیا' اس نے اپنے تئیں پوری کوشش کی تھی کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہونے پائے اور وہ چائے رکھ کر نکل جائے' مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسید کی نظر کپ پر پڑتے ہی اوپر اٹھی تھی۔ اور ٹھہر گئی تھی۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ یہ پہلی بار تھا جب اس شخص نے اس کی طرف نگاہ کی تھی' جسے نہ جانے کتنے ہی عرصے سے وہ محبت کا حق سونپ چکی تھی۔ تب ہی اسے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

"حسن تو بے شک بہت ہو سکتا ہے۔ مگر یہ معصومیت' یہ پاکیزگی بالکل نہیں۔" اب کی بار اسید کی آنکھوں میں پسندیدگی ابھری تھی۔ صفا کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ سامنے ہی تسبیح ہاتھ میں لیے سحر آ رہی تھیں۔

"کیا ہوا صفا؟" اسے یوں بدحواس دیکھ کر وہ پریشان ہو گئیں۔

"کچھ نہیں آنٹی! وہ اصل میں۔" وہ بات نہ بنا پائی۔

"امی! اصل میں مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ کچن میں ہیں۔ میں سمجھا آپ ہیں۔ میں نے آپ سے چائے کے لیے کہا اور وہیں بیٹھ گیا۔ سر میں اس قدر درد ہو رہا تھا' کہ توجہ ہی نہ کر پایا کہ آپ کے علاوہ بھی کوئی اور ہو سکتا ہے۔ بس ان محترمہ نے مجھے چائے تو دے دی بنا کر۔ مگر جب میں نے دیکھا تو یہ ڈر کر بھاگ گئیں۔" کپ لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے بات مکمل کی۔

سحر زور سے ہنس دیں۔

"تم بھی نا صفا۔ ایک طرف تو اتنی تعریفیں کرتی ہو اسید کی اور آج اگر اتفاق سے تم لوگوں کی بات ہو ہی گئی تو تم یوں گھبرا رہی ہو۔" سحر کی بات نے اسے شرمندہ کر دیا۔ اس نے دل سے دعا کی کہ کاش ان کی بات اسید نے نہ سنی ہو۔ مگر بات دعا سے پہلے ہی سن لی گئی تھی۔

"اللہ اللہ سچ میں امی میری تعریفیں' واؤ۔" وہ چہکا صفا پانی پانی ہونے لگی۔

"ہاں بھئی۔ میرا بیٹا ہی ہے اس لائق کہ اس کی اچھی عادات کو سراہا جائے۔" سحر خود سے اونچے بیٹے کو ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے بولیں۔

"حیرت ہے امی! مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔" مسکراتی نظر صفا پہ ڈالی گئی۔ اس نے جلدی سے سر پہ اوڑھا دوپٹہ ذرا سا آگے کرلیا۔

"آنٹی! میں چلتی ہوں۔ امی آگئی ہوں گی۔"

"ارے سنو تو۔" سحر اسے پکارتی رہ گئیں، مگر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

"بہت شریر ہو تم' پریشان کر دیا بیچاری کو۔" سحر مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اچھا سر میں کیوں درد ہے۔ خیریت۔" اچانک ہی ان کو خیال آیا تھا۔

"ہاں۔" اسید چونکا "بالکل ٹھیک ہوں امی! چائے بڑی زبردست تھی۔ پیتے ہی آرام آگیا۔" وہ چاہ کر بھی دل کی بات ماں کو نہ بتا سکا تھا۔

چند دن بعد لاہور میں کسی رشتے دار کی شادی تھی۔ اور آج اسے ہر حال میں اپنے اور امی کے لیے کپڑے خریدنے تھے۔ تب ہی وہ آج سحر آنٹی کے گھر نہیں گئی تھی۔ وہ صبح سے اپنی دوست کا انتظار کررہی تھی تاکہ وہ آئے تو وہ بازار جا کر اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خرید سکے' مگر دس بج رہے تھے اور اس کا ابھی تک اتا پتا نہ تھا۔ اب اسے غصہ آنے لگا تھا۔ تب ہی ڈور بیل بجی۔ وہ تقریباً" بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچی تھی اور ایک جھٹکے سے گیٹ کھول دیا تھا اور اگلے ہی لمحے اسے یقین ہوگیا تھا کہ غصہ واقعی دو گنی مصیبت میں گرفتار کردیتا ہے انسان کو۔ گیٹ سے ٹیک لگائے ساحر نے ایک تیکھی نگاہ اس کے حلیے پہ ڈالی تھی۔

"اتنی بے قراری' خیریت تو ہے نا تم تو کہتی ہو کہ اماں گھر پہ نہ ہوں تو کسی کے لیے دروازہ نہیں کھولتی ہو۔ پھر ایسا کون آرہا تھا کہ بوچھ بنا ہی کھٹ سے کنڈی گرادی۔" کمینی سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے وہ خباثت سے بولا۔

"یہ بات میں تمہیں کیوں بتاؤں؟" اس نے پل بھر میں اپنا اعتماد بحال کیا۔

"ابھی اماں زندہ ہیں میرا خیال کرنے کے لیے۔" جتاتا ہوا لہجہ۔

"چلو آج معاف کیا۔ مگر بھی نہ بھی تو بتانا ہی پڑے گا۔" ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا وہ بھی۔ وہ اندر آنے لگا تو صفا نے تیزی سے دروازہ بند کردیا۔

"بتایا نا کہ اماں گھر پر نہ ہوں تو میں کسی کو گھر میں نہیں آنے دیتی۔" ساحر سے بات کرتے ہوئے دنیا جہان کی تلخی اس کے لہجے میں آسماتی۔

"ہاں تو میں بھی اسی لیے دوڑا چلا آتا ہوں کہ کسی کی بری نظر ہمارے گھر پر نہ پڑے۔" اس کے مضبوط آہنی بازوؤں کے سامنے اس کی کوشش ناکام ٹھہری تھی۔ وہ اندر آگیا تھا۔ صفا کا دل گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑنے لگا۔ نہ جانے کیوں اسے اس چچا زاد سے بے اندازہ خوف محسوس ہوتا تھا۔

"یہی تو مسئلہ ہے کہ یہ ایک بری نظر کسی اور کی بری نظر سے بھی کہیں زیادہ خوفناک ہے۔" وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

"اچھا اندر چل' چائے بنا دے۔ کیا یہیں سے ٹرخائے گی۔" اس نے اچانک ہی اس کا ہاتھ تھام لیا۔ صفا یوں اچھلی جیسے سو والٹ کا کرنٹ لگا ہو۔

"خبردار جو آئندہ کبھی ایسی جرات کی ہو تو۔" اس نے یوں دوپٹے سے ہاتھ رگڑا جیسے کوئی ان دیکھی غلاظت صاف کررہی ہو۔

"واہ جی! غصے میں تو اور پیاری لگنے لگتی ہے قسم سے۔" صفا کا دل چاہا اس کے منہ پہ تھوک دے' تب ہی گیٹ پہ آہٹ ہوئی تھی۔ اس کی دوست سویرا تھی۔

"کہاں مرگئی تھیں تم' جلدی نہیں آسکتی تھیں۔" سارا غصہ سویرا پہ نکل گیا۔ وہ بے چاری بس ہوں ہاں کرتی رہ گئی۔

"اب باہر نکلو تاکہ میں تالا لگا سکوں۔ باقی گھر ویسے بھی لاکڈ ہے۔" اس نے روکھے سے انداز میں ساحر کو مخاطب کیا۔ اس نے ایک تیز نظر صفا پہ ڈالی۔

"وعدہ رہا۔ سارے کس بل نکال دوں گا۔ بس موقع ملنے دے۔" جاتے جاتے بھی وہ اسے دھمکی دے کر گیا تھا۔ اور پھر سارا دن وہ بیزار رہی تھی۔

شاپنگ سے لے کر گھر کے ہر کام میں اس نے کچھ نہ کچھ بگاڑ دیا تھا۔ امی بولتی رہ گئیں مگر وہ خاموش ہی رہی۔

✿ ✿ ✿

"کیا مطلب امی۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہی؟" وہ شاکڈ تھی۔ اسے لگا جیسے اس نے کچھ غلط سنا ہو۔

"کہہ دیا نا صفا۔ بار بار ایک بات کے پیچھے نہ پڑ جایا کر۔" راحت نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ لڑکی انہیں زچ کرنے لگی تھی۔

"مگر امی! مسئلہ کیا ہے؟ میں کیوں نہیں جا سکتی آپ کے ساتھ؟ پھر میں یہاں اکیلے کیا کروں گی اتنے دن؟" وہ خاصی پریشان تھی۔ دن میں تو خیر پہلے بھی وہ عادی تھی۔ مگر اس طرح سارا دن اور پھر رات اس کی جان نکلنے لگی۔

"کیونکہ میں تمہیں ہر ایرے غیرے کی شادی میں نہیں لے کر جا سکتی۔" انہوں نے صاف جواب دیا۔

"ہاں اور یوں ہر ایرے غیرے کے ساتھ چھوڑ سکتی ہیں۔" وہ تڑپی۔

"وہ ایرے غیرے نہیں۔ تمہارے اپنے ہیں۔ پھر ساحر اور ثمن دونوں ہی تمہارے پاس ہوں گے۔ تو تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے ان دونوں پر بھروسا ہے۔" انہوں نے قطعی لہجے میں کہا۔

"اور رہی بات ساحر کی تو وہ کوئی اجنبی نہیں ہے' تمہیں پسند کرتا ہے۔ عنقریب تم دونوں ایک ہونے والے ہو' سو اچھا ہے کہ اس کا ذکر عزت سے کیا کرو۔" امی نے جیسے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

"مگر مجھے وہ ذرہ برابر بھی پسند نہیں۔" وہ بے اختیار بولی تھی۔ راحت نے ایک کڑی نگاہ کی تھی۔

"مجھے تمہاری پسند ناپسند سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہارے لیے وہ سب کرنے کا اختیار رکھتی ہوں جو مجھے بہتر لگے۔" وہ بے بسی سے لب کاٹنے لگی۔

"اسے تو فرق پڑے گا نا میری پسند ناپسند سے؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"اس بات کی بھنک بھی پڑی نا اسے' تو دیکھنا میں حشر کر دوں گی تمہارا۔" اب کی بار انہوں نے غصے سے کہا تھا۔

"مگر امی! میری زندگی ہے یہ' یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اتنا بڑا فیصلہ میری مرضی کے بغیر کیا جائے۔" وہ منہ بسورنے لگی۔

"صفا۔" اس کی توقع کے عین مطابق وہ اسے روتا دیکھ کر فوراً" نرم پڑیں۔

"تم جانتی ہو بیٹا! تمہارے باپ کے بعد میں نے کتنی مشکلوں سے تمہاری پرورش کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری مرضی ضروری ہے' مگر بعض فیصلے ماں باپ ہی کریں' تو بہتر ہوتے ہیں۔"

"مگر امی! انہوں نے کبھی ہمارا کب ساتھ دیا۔ اب جب ہمارے حالات کچھ بہتر ہوئے تو آ گئے ہیں پیار جتانے۔" وہ بھی آج سارے حربے آزمانا چاہتی تھی۔

"اب تو آ گئے نا بس میرے لیے کافی ہیں۔ پھر وہ تمہارا اپنا خون ہیں' ماریں گے بھی تو چھاؤں میں رکھ کے۔" راحت کی بات سن کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اللہ اللہ امی! اس قدر زیادتی۔" وہ صدمے کے مارے بول ہی نہ پائی۔

"صفا! اب ایک دو لگا دوں گی تمہیں۔ دماغ خراب مت کرو میرا' جاؤ جا کر کام کرو' میں نے پرچے بھی چیک کرنے ہیں ابھی۔" انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی۔ وہ اداس سی وہاں سے پلٹ گئی۔

✿ ✿ ✿

"اسید کے آفس کے کچھ لوگ آ رہے ہیں کھانے پہ۔ تم آج شام میری مدد کرنے آ سکو گی؟" وہ بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ نکلنے لگی تھی کہ سحر نے اسے روک دیا۔

"جی ضرور آنٹی! امی آ جائیں۔ میں ان کو کھانا دے کر فوراً" آ جاؤں گی۔" اس نے تابعداری سے جواب دیا۔

"دو تین ڈشز تو لازمی بنانی پڑیں گی۔ جلدی آجانا ہاں' میں اسید سے مینو بنوالوں گی۔" انہوں نے ہدایت کی تو وہ سر ہلاتی باہر نکل گئی۔

وعدے کے مطابق راحت کو کھانا دے کر وہ ان کی اجازت سے فوراً" وہاں سے چلی آئی تھی۔

سحر کی توقع کے عین مطابق اسید نے دو تین مین آئٹم کے ساتھ سویٹ ڈش بھی رکھی تھی۔ وہ آتے ہی کام میں جت گئی۔ اسید شام ہونے تک گھر نہیں آیا تھا۔ اسے ایک طرح سے یہ غنیمت ہی لگا تھا۔ اس نے تیزی سے سارے کام شام سے پہلے ہی نبٹا لیے تھے۔

"آج تو پڑوسی کھانے کی خوشبو محسوس کر کے ہمارے گھر ہی ڈنر کرنے آجائیں گے۔" بہترین خوشبو محسوس کرتے ہوئے وہ تعریفی انداز میں کہتا کچن کے اندر آیا تھا۔ ڈنر کے لیے برتن نکالتی صفا گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ سوری۔ آپ... میں سمجھا امی ہیں؟" اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

"آگئے اسید۔" تب ہی سحر بھی اندر آئیں۔

"نہیں امی! ابھی راستے میں ہوں۔" وہ ذرا سی آنکھ دبا' شرارت سے بولا۔ تو انہوں نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"شریر۔"

"آنٹی! سب تیار ہے۔ میں چلوں۔ امی انتظار کر رہی ہوں گی۔" اسے فوراً" جانے کا خیال آیا۔ اسید نے آگے بڑھ کر فریج سے پانی لیا اور گلاس میں انڈیلنے لگا۔

"کتنا بے پروا ہے یہ شخص۔" اسے دکھ ہوا۔ اس دن کے بعد وہ خود بھی اس سے چھپتی پھرتی تھی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اس اتفاقی ملاقات کے بعد اسید نے اس کی طرف بڑھنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔

"ہاں بیٹا۔ مگر یہ سب سرو کرنے میں تو میری مدد کرتی جاؤ۔" وہ اسے مزید روکنا چاہتی تھیں۔

"کاکا ہیں نا امی۔ اچھا نہیں لگے گا یوں غیر مردوں کے آگے خوامخواہ ان کا آنا۔ میں سمجھا دوں گا کاکا کو' آپ فکر نہ کریں۔ جانے دیں انہیں۔" موبائل پہ کسی کے پیغام چیک کرتا آرام سے ماں کو مخاطب کرتا وہ بالکل اس کے پاس سے گزرا تھا اور وہ پھر سے بت بنی کھڑی رہ گئی۔ وہ بے نیاز تھا' یہ بے نیازی' یہ شان' یہ غرور اسے زیب بھی تو دیتا تھا۔ وہ اداس ہو گئی۔

"شہزادے جب نصیب میں نہیں ہوتے تو ملا کیوں کرتے ہیں؟" آج کی رات بیڈ پر لیٹتے ہی اس نے یہ سوچا تھا اور پھر ساری رات اس بات کا جواب ڈھونڈتی رہی۔

☼ ☼ ☼

ساری بحث بیکار گئی تھی۔ امی اکیلی ہی گئی تھیں اور سونے پہ سہاگا ساحر اور ثمن کو اس کے پاس چھوڑ گئی تھیں اور اب وہ بے طرح اداس ہو رہی تھی' اس نے سارا دن تقریباً" سحر آنٹی کے گھر میں ہی گزرا تھا۔

"زندگی بالکل گرگٹ کی طرح ہوتی ہے۔ ہر بار نیا رنگ نیا روپ لے کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ روز نیا امتحان اور نئے پرچے تھما دیتی ہے ہمارے ہاتھ میں۔ نتیجہ البتہ غیر یقینی ہوتا ہے۔ یا تو زندگی میں ہی یا پھر زندگی کے بعد اصل زندگی کے ہاتھ آنے پر۔ کامیاب لوگ وہی ہوتے ہیں جو زندگی کو اس کے ہر ایک روپ' ہر نئے امتحان کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔"

انہوں نے لیکچر ختم کر دیا تھا۔ وہ بھی دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر نکل آئی۔

"لگتا ہے بہت دل لگ گیا ہے تمہارا سحر آنٹی کے گھر میں؟" اندر داخل ہوتے ہی سامنا اسی سے ہوا تھا۔ جس کی شکل تک دیکھنے کی وہ روادار نہ تھی۔

"تم سے مطلب؟" کھردرا سا لہجہ صاف۔ جواب۔

"ہر وقت مطلب نہ پوچھا کرو۔ بہت جلد میری پناہوں میں آنے والی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ سارے مطلب سمجھا دوں۔ ٹوٹ پھوٹ جاؤ گی۔" اس کی نازک سی مرمریں کلائی پکڑ کر وہ غصے سے بولا تھا۔

"میں نے تمہیں وارن کیا تھا ساحر! مجھے آئندہ ہاتھ لگانے کی کبھی کوشش مت کرنا۔" اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ غراہٹ سی تھی اس کے لہجے میں۔

"شیرنی ہے قسم سے۔ تب ہی تو مرتا ہوں تجھ پہ پوری جان سے۔ بس یہ اماں والا کانٹا نہ ہوتا تو کب کا تجھے اپنا چکا ہوتا۔" وہ غلیظ سا مسکرایا۔

"امی کے سامنے تو بڑی شہد ٹپکاتی ہیں چاچی۔ یہ بات ذرا امی کو بتا کر دکھاؤ۔ تب مانوں۔" وہ غصے سے لب کچلنے لگی۔

"پاگل کتے نے کاٹا ہے مجھے کیا؟" وہ ہنسا۔ "تو کیا اتنا بے وقوف سمجھتی ہے مجھے۔ تیرا ہاتھ ایسے نہیں چھوڑنے والا۔ بڑے حساب نکلتے ہیں تیری طرف۔ ایک ایک کر کے چکاؤں گا۔ بس موقع مل جائے کبھی۔ آئے یہ تیری قسمت شادی کے بعد یا۔" وہ کس قدر خبیث تھا۔ اس کا اندازہ اسے بہتر طور پہ آج ہو رہا تھا۔

"موسم بڑا گرم ہو رہا ہے۔ پر تم آج کمرے میں ہی سونا۔ ٹھیک سے دروازے شروازے بند کر کے۔ حالات خراب ہیں ناں۔" دانتوں میں ناخن مارتا، خبیث سی ہنسی ہنستا وہ اندر چلا گیا اور وہ۔۔۔ شل سا وجود لیے وہیں کھڑی رہ گئی۔ اسے آج پہلی مرتبہ اپنی ماں پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ مائیں تو بیٹیوں کی شکل دیکھ کر ان کا درد، پریشانی سمجھ جاتی ہیں۔ بیٹیوں کے گرد منڈلاتے خطرات و محسوس کر کے ہی بھوکی شیرنی کی طرح ان کو تاڑنے والوں پہ جھپٹ پڑتی ہیں اور ایک اس کی امی تھیں کہ اس کے کہنے کے باوجود اس شخص کو اس کا محافظ بنا گئی تھیں، جو جانے کب سے اس کی گھات لگائے بیٹھا تھا۔ شام کے ڈھلتے سایوں نے اس کی پریشانی بھی بڑھا دی تھی۔

ثمن اس کے لاکھ کہنے کے باوجود بھی اس کے ساتھ سونے پہ راضی نہ ہوئی تھی۔ وہ بار بار اس کی منتیں کرتی اور ثمن کے بار بار انکار پر ساحر ایک شیطانی مسکراہٹ اس کی طرف اچھال دیتا۔ بالآخر اس نے ان دونوں پہ پھٹکار بھیج کر اوپر آنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

اس نے سب کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کیے تھے۔ بار بار لاک چیک کیے، دروازے اچھی طرح لاک تھے۔ صرف ٹیرس کی طرف والی ایک کھڑکی اس نے کھلی چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ اس طرف سے اسے ساحر کے آنے کی ذرہ برابر بھی امید نہ تھی۔ ان کی ٹیرس اور اسید محمود کے گھر کی ٹیرس کی گرل بالکل جڑی تھیں تب ہی اس طرف سے وہ مطمئن تھی کہ وہ کمرہ اسید کے استعمال میں رہتا تھا۔ تب ہی اگر وہ آتا بھی تو وہ آسانی سے چیخیں مار کر کم از کم ساتھ والے گھر کے لوگوں کو مدد کے لیے بلا سکتی تھی۔ ہر طرف سے بے فکر ہونے کے بعد بھی اسے نیند بہت دیر سے آئی تھی۔

☼ ☼ ☼
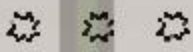
لیپ ٹاپ پر کام کرتے کرتے اسے پتا ہی نہ چلا کب آنکھ لگ گئی۔ وہ وہیں رائٹنگ ٹیبل پہ ہی بازوؤں پہ سر رکھ کر شاید ساری رات کی نیند پوری کر لیتا کہ عجیب سے شور سے کسی پہر اس کی آنکھ کھل گئی۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے کوئی چیز زور سے زمین پہ دے ماری تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی۔ تب ہی آواز بہت تیز تھی۔ ہر رات تو وہ کھڑکی بند کر کے اے سی آن کر کے ہی سوتا تھا مگر آج نہ جانے کیسے اس کی آنکھ لگ گئی۔ بیٹھے بیٹھے سوتے رہنے سے اس کی گردن میں درد ہونے لگا تھا۔ گردن کو سہلاتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا تھا۔ باہر اندھیرا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر کھڑکی بند کرنے لگا۔ اس نے ایک پٹ بند کیا ہی تھا کہ کھڑاک سے کوئی چیز پھر گری۔ اس دفعہ آواز بے حد واضح تھی۔ ٹیرس کے اس طرف لازمی کچھ گڑبڑ تھی، جسے اس بار وہ چاہ کر بھی نظرانداز نہ کر پایا تھا۔ تیزی سے باہر آ کر اس نے لائٹس آن کر دی تھیں اور جھماکے سے نہ صرف اس طرف بلکہ اس طرف کا منظر بھی واضح ہو گیا تھا۔ وہ ششدر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے نہ جانے کس پہر ہلکے سے کھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی۔ دل اس قدر زور سے دھڑکا کہ اسے لگا بس موت ابھی اس پر حاوی ہو جائے گی۔ نیند کی وجہ سے غائب ہونے والا ڈر پوری قوت سے دوبارہ جاگا تھا۔

"نہیں ساحر تو ٹیرس کی طرف سے آنے کی کوشش نہیں کر رہا۔" خوف زبان پہ آیا۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر بیڈ سے نیچے اتری اور اگلے ہی لمحے ساکت رہ گئی۔ ہاتھ پاؤں زبان جیسے سارا وجود شل ہو گیا تھا۔ وہ آرام سے اس کے سامنے صوفے پہ پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ وہ نہ چیخ سکی۔ نہ بول سکی۔

"کہا تھا نا کہ اچھی طرح دروازے بند کر کے سونا۔"

زیرو بلب کی مدھم سی روشنی میں بھی وہ اس کے چہرے پہ جھلکتی شیطانیت واضح طور پہ دیکھ سکتی تھی اور پھر اس نے پھرتی دکھائی تھی۔ تیزی سے اٹھ کر ٹیرس کا دروازہ کھولنے میں وہ کامیاب ہو گئی تھی مگر ساحر بھی تب تک اس کے قریب آ چکا تھا۔ ٹیرس پہ اندھیرا تھا۔ حالانکہ وہ بلب جلا کر سوئی تھی۔ ساحر نے شاید کچھ انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت نے اسے چیخنے چلانے کے قابل نہ چھوڑا تھا، لیکن وہ بھی پوری قوت سے باہر کی طرف خود کو گھسیٹ رہی تھی۔

"ہم اتنی جلدی ہار نہیں جتنی جلدی ہار مان لیتے ہیں۔" سحر آنٹی کی کہی ہوئی بات اسے یاد آ گئی۔ اور اسے جو نہ سے ہار نہیں ماننی تھی۔ لڑنا تھا۔ اسے اس نامراد سے۔ اللہ اس کی مدد کر دیتا اور وہ اس شخص کے ہاتھوں سے خود کو تباہ ہونے سے بچا لیتی۔ تب ہی اس کی نظر دروازے کے ساتھ پڑے شیشے کے بڑے سے گلدان پہ پڑی تھی۔ اس نے پھرتی سے اس گلدان کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ گلدان سیدھا ساحر کے پاؤں پہ گرا تھا۔ ضرب ٹھیک ٹھاک تھی۔ اسے اور صفا کو دوبارہ دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ساحر نے آگے بڑھ کر زیرو کا بلب بھی آف کر دیا۔ اس طرح وہ اسے آسانی سے قابو کر سکتا تھا اور وہ راہ فرار ڈھونڈنے میں بھی ناکام رہتی۔ وہ دروازے سے باہر

نکل آئی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ پوری قوت سے چیختی، ساحر کے مضبوط بازوؤں نے اسے پھر سے جکڑ لیا۔ وہ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ وہ اسے پوری طرح خود سے لگائے اندر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ اسے لگا اس کی ہڈیاں ٹوٹنے لگی ہیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ دل ہی دل میں جتنی بھی دعائیں یاد تھیں پڑھنے لگی۔

تب ہی خود کو چھڑانے کی کوشش میں اس کا پاؤں پاس پڑے گملوں کے چھوٹے سے اسٹینڈ پہ پڑا تھا۔ اور زوردار آواز پیدا کرتے ہوئے وہ گر پڑا۔ گملے ٹوٹنے کی آواز کافی تیز تھی۔ ساحر گھبرا گیا اور مزید تیزی سے اسے گھسیٹنے لگا۔ تب ہی روشنی سی پھیلی تھی۔ اس کا ہاتھ ذرا سا ڈھیلا ہوا تھا اور یہی وقت کافی تھا صفا کے لیے وہ بری طرح چلانے لگی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اسید شاید سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ گرل کے قریب آ کر چلایا۔ ساحر کی گرفت ڈھیلی پڑی۔ وہ تیزی سے اس کے ہاتھوں سے نکلتی ہوئی گرل پھلانگ گئی اور اسید کے پیچھے جا چھپی۔ ساحر نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

"میری کزن ہے وہ۔ تم اس معاملے میں نہ ہی پڑو تو بہتر ہے۔" انگلی سے اسے متنبہ کرتا وہ صفا کی طرف لپکا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ صفا کو پکڑنے میں کامیاب ہوتا۔ اسید نے زبردست مکا اسے جڑ دیا تھا۔ ساحر نے ایک لمحے کو حیرت بھری نگاہ کی تھی اور اگلے ہی لمحے وہ بھی اسید پہ پل پڑا تھا۔ شور سن کر آس پاس کی ٹیرس بھی روشن ہونے لگی تھیں۔ ثمن بھی شور سن کر اوپر آ گئی۔ مگر کمرہ لاک ہونے کی وجہ سے وہ بس دروازہ ہی بجاتی رہ گئی۔ سحر محمود حیران پریشان شور سن کر وہاں پہنچیں تو سامنے کا منظر دیکھ کر دم بخود رہ گئیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟" ان کی تیز آواز پہ وہ دونوں ہی ٹھٹک کے رکے تھے۔

"امی یہ۔" اسید بولنے لگا تھا کہ ساحر نے ٹوک دیا۔

"یہ کیا بتائے گا آنٹی۔ میں بتاتا ہوں۔ رنگے ہاتھوں پکڑا ہے میں نے ان دونوں کو۔ اور یہ بے غیرت"

سحر کا سر چکرا گیا۔ انہوں نے دیوار کا سہارا لیا۔

"ذلیل انسان۔" اسید نے فوراً" اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"ذلیل تو تم ہو۔ ارے خدا کی پناہ اسلام کی باتیں سکھانے لڑکیوں کو گھر بلا کر ان پہ جال ڈالتے ہو۔" وہ زمین پر تھوکتے ہوئے بولا" آواز اس قدر اونچی تھی۔ کہ آس پاس کھڑے تمام لوگ بخوبی سن سکیں۔

وہ سب کانوں کو ہاتھ لگانے لگے تھے اور سحر۔ ان کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ سمی کانپتی شرمندہ سی اپنا وجود ڈھانپتی صفا چاہ کر بھی ان کے نرم مہربان وجود سے نہ لپٹ سکی۔ اس نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی عزت بچاتے بچاتے اتنے شریف لوگوں کی عزت کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ اسے معلوم تھا کہ اب اس کا بولنا" اس کا چیخنا سب بیکار تھا۔ وہ اسید کی میرن پہ تھی اور یہ اسید کے خلاف سب سے بڑا ثبوت تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو سارا منظر دھندلانے لگے تھے۔

ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ جب کوئی اچھی بات ہو۔ کسی میں کوئی اچھائی ہو گی تو اسے صرف اچھی قسمت جان کر کہہ کر چھپانے اور دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر کہیں کسی کی کوئی برائی پتا چل جائے تو پوری طرح تصدیق نہ ہونے کے باوجود بھی وہ قصہ زبان خاص و عام پہ ہوتا ہے۔ جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے بات۔ پوری کالونی نے بچیوں کو سحر مسعود کے گھر آنے جانے سے منع کیا تھا۔ ان کی تمام تر نیکیوں کو رد کر کے اس غلطی کو صحیح مان کر انہیں سزا سنا دی گئی، جس کے بارے میں کوئی بھی ٹھیک سے نہ جانتا تھا۔ صرف اللہ ان کی سچائی جانتا تھا۔ مگر یہاں صرف اسی پر آنکھیں بند کر کے یقین کیا جاتا ہے، جو ظاہر ہوتا ہے۔

❊ ❊ ❊

ثمن نے راحت کو فون کر کے ساری بات بتانے میں ذرا بھی شرم محسوس نہ کی تھی، وہ مرا مرا وجود لیے چہرہ چھپائے گھر میں آئی تھیں اس بار۔

"چاچی! دیکھ لے کیسا منہ کالا کیا ہے ساری برادری میں تیری لاڈلی نے۔" شل وجود لیے وہ صوفے پر ڈھے سی گئیں۔ جب ساحر نے آگران کو ایک اور کوڑا دے مارا۔ انہیں روح تک چھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"سارا محلہ تھو تھو کر رہا ہے چاچی۔ یہ تو شکر ہے کہ کھٹکا سن کر میں اوپر چلا گیا اور موقع پہ سب کچھ سنبھال لیا ورنہ۔" وہ بولتے چلا جا رہا تھا کہ راحت نے ٹوک دیا۔

"صفا کہاں ہے؟" انہیں خود اپنی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

"کہاں ہو گی؟ خود سے نظریں ملانے تک کے تو قابل نہیں چھوڑا اس نے۔ آپ کے کمرے میں خود کو بند کر رکھا ہے اس نے۔" منہ بناتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ اب۔" وہ شاید اب بیٹی سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے ساحر سے رکھائی سے بات کی تھی" وہ ہونقوں کی طرح ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب چاچی؟ میں کہاں جاؤں گا۔ اتوار کو جرگہ ہے۔ ہماری طرف سے اور تو کوئی مرد ہے نہیں۔ تو میں ہی جاؤں گا۔"

"جرگہ۔" ان کا دل کانپ اٹھا۔

"ہاں چاچی! صفا میری عزت ہے۔ ہمیشہ اسے چاہا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ میں اس اسید کو بھی معاف کر دوں۔ جرمانہ تو وصول کر کے ہی رہوں گا۔"

"مگر اس کی کیا ضرورت تھی، عزت تو اور زیادہ خراب ہو گی اس سے۔ اس طرح تو بات گاؤں والوں کے سامنے بھی کھل جائے گی۔" شدید کرب تھا جو ان کے لہجے میں بول رہا تھا۔

"عزت بچی کون سی ہے چاچی۔" وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کمرے کی طرف بڑھتے قدم سو سو من وزنی ہو رہے تھے۔ مگر۔

٭٭٭

وہ دودھ گرم کرکے کمرے میں آئیں تو وہ ہمیشہ کی طرح اپنی کرسی پہ بیٹھا لیپ ٹاپ پہ مصروف تھا۔ وہ بے حد مضمحل نظر آ رہا تھا۔ اس کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا اندازہ اس کی ظاہری شخصیت سے وہ بخوبی لگا سکتی تھیں۔ ان چند دنوں میں ہی وہ بالکل بجھ سا گیا تھا۔ بڑھی بڑھی شیو اسے مزید پریشان ظاہر کرتی تھی۔

انہوں نے گلاس میز پر رکھا تو وہ چونک پڑا۔

"اسید! کوئی تمہارا یقین کرے نہ کرے بیٹا۔ مجھے تم پر یقین ہے۔" انہوں نے نرمی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"مجھے اپنی فکر نہیں ہے امی! میں پھر بھی مرد ہوں۔ مرد ہمارے معاشرے میں چاہے کچھ بھی کرے لوگ انگلی اٹھانے سے ڈرتے ہیں مگر صفا۔" وہ رکا تھا۔

"صفا کے ساتھ بہت برا ہوا امی! وہ کتنی معصوم اور پاکیزہ سی تھی۔ اتنی ذلت اتنی بدنامی۔" سحر محمود نے اس کی آنکھوں کے کونے بھیگتے محسوس کیے تھے۔

"ایک لڑکی کی سب سے بڑی متاع اس کی عزت ہی ہوتی ہے امی اور ایک بار اس متاع کو کھو دے تو وہ بے وقعت ہو جاتی ہے۔"

"ہم جانتے ہیں اسید کہ وہ بے گناہ ہے۔" امی نے اس کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اسے سکون سا ملا۔

"دنیا نہیں مانتی امی! نہ ہی مانے گی۔ میں نے دیکھا ہے، بابا کے بعد کس طرح آپ نے میری پرورش کی، اور دنیا کی ہوس بھری نگاہوں کی تپش سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا۔ لیکن صفا۔ اس کا معاملہ الگ ہے امی! وہ تو گھر کے شیطان کی وجہ سے اس ذلت کا شکار بنی ہے۔" وہ بے حد دکھی تھا۔ سحر جانتی تھیں اپنے بیٹے کو۔ وہ دوسروں کی پریشانی پہ وہ ایسے ہی تڑپ اٹھتا تھا۔

"جرگہ بے نتیجہ رہا۔ دیکھو کیا فیصلہ سناتے ہیں۔ سب کچھ کلیئر ہو جائے گا۔" امی نے اسے ڈھارس دی۔

"یہی بات تو پریشان کر رہی ہے مجھے امی! یہاں ساری برادری ان ہی لوگوں کی ہے۔ ہماری طرف سے بس ماموں ہی ہوں گے۔ ایسے میں کیا آپ کو لگتا ہے کہ کوئی ہماری بات سنے گا۔ پھر محلے والوں کا رویہ آپ کے سامنے ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ہر ایک کی گواہی ہمارے خلاف ہی جائے گی۔ ایسے میں، میں تو پیسے دے کر جان چھڑا لوں گا۔ زیادہ سے زیادہ چند لاکھ روپوں کا جرمانہ ہی لگے گا۔ مگر صفا، صفا ساری عمر کے لیے ذلت اپنی پیشانی پہ کندہ کروا لے گی۔ کون قبول کرے گا اسے۔ اتنی اچھی لڑکی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا امی؟" وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ کچھ بول ہی نہ پائیں۔ جواب تو خود ان کے پاس بھی نہ تھا۔

٭٭٭

"صفا!" تیسری دستک پہ جب ماں کی بجھی بجھی آواز بھی اسے سنائی دی۔ تو اس نے بھاگ کر دروازہ کھولا تھا۔ ماں کا شفیق وجود سامنے پاتے ہی وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ اسے ساتھ لگائے اندر آئیں۔ پھر اسے خود سے دور کرتے ہوئے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ اسے ہاتھ سے پکڑ کر جھٹکے سے بیڈ پر گرایا اور خود بھی اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

"اللہ پوچھے تم سے صفا۔ تم نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔" الفاظ تھے یا زہر میں بجھے تیر۔ اسے سارے وجود میں زہر پھیلتا محسوس ہوا۔ اس کے ایک ایک عضو نے تڑپ کے چیخ ماری اور کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ وہ جانتی تھی وہ بے لباس ہو چکی تھی۔ عزت پہ داغ پڑ جائے تو انسان یونہی تو ہو جاتا ہے بے لباس برہنہ۔ لیکن اسے پورا یقین تھا کہ جب ماں آئے گی تو پورے یقین سے اسے گلے لگائے گی اور اپنے نرم دلاسوں بھرے لفظوں سے اس کی روح کو پیراہن بخشے گی۔ مگر انہوں نے۔ انہوں نے اس کی برہنہ روح کو طمانچہ دے مارا تھا۔

"موت واقعی ڈرنے کی چیز نہیں ہے۔ ڈرنے کی چیز تو واقعی زندگی ہے۔ کاش یہ زندگی ابھی ختم ہو جائے۔"

ریزہ ریزہ ہوتی روح چلبلائی تھی۔

"میرے پاس اور تھا بھی کیا صفا، کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا۔ کیوں؟" دونوں کاندھوں سے پکڑ کر انہوں نے بت کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ بت کی بس صرف آنکھیں چھلکی تھیں۔ اس کے ساکت وجود نے اور کوئی حرکت نہ کی تھی۔ بت بھی روتے ہیں۔؟

اسے آج پتا چلا تھا کہ موت کی سردی کیا ہوتی ہے۔ جب وہ شخص ہی آپ کا اعتبار کھودے، جو آپ کے جسم، آپ کی روح کا ہی ایک حصہ ہو تو احساسات ایسے ہی سردی موت مر جاتے ہیں۔ یہی کچھ ہوا تھا ابھی صفا رحمان کے ساتھ، موت کی سی سردی اس کی روح تک میں سرایت کر گئی تھی۔

"کتنی مشکل سے میں نے یہ عزت بنائی تھی۔ یہ مقام حاصل کیا تھا۔ مگر تم نے سب ایک جھٹکے سے ختم کر دیا" کوئی خنجر جیسے اس کے دل میں پیوست ہوا۔ اسے بے طرح تکلیف محسوس ہوئی۔

"مجھے تو تم پر اتنا اعتبار تھا کہ جب ثمن نے مجھے بتایا تو مجھے یقین ہی نہ آیا۔" اس نے نظریں اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا مگر صرف دھندلا عکس ہی نظر آیا۔

"کہاں ساحر کو دیکھ کر گھبرا جانے والی میری صفا اور کہاں بالکل انجان لڑکے سے" ماں کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا جو کچھ سوچا تھا، اس نے آج اسے سب غلط لگا۔ مائیں بیٹیوں کے دکھ جان لیتی ہیں۔ کیسی ہوتی ہیں وہ مائیں۔ غم کی اس حالت میں بھی اسے رشک آنے لگا تھا ایسی لڑکیوں پر جن کی مائیں ان کو سمجھتی ہیں۔

"اب پرسوں جرگہ ہے۔" انہوں نے لمبی سانس کھینچ کر جیسے خود کو سنبھالا گیا تھا۔

"ساحر اب بھی تمہیں اپنانے پہ تیار ہے۔ تم بس جرگہ میں یہ بیان دے دینا کہ اسید نے سحر کے ساتھ مل کر تمہیں ورغلایا اور اپنے جال میں پھنسا لیا۔ اس طرح کم از کم کچھ تو فائدہ ملے گا تمہیں۔ زیادہ رسوائی ان ہی کے حصے میں آئے گی۔" ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ اپنی کسی شاگرد کو سبق سمجھا رہی تھیں۔

"کسی بے گناہ پہ تہمت لگانے کا انجام جانتی ہیں امی۔" نہ جانے کہاں سے اس میں اتنی ہمت آئی تھی۔ مگر وہ خود بھی جانتی تھی کہ یہ ہمت اسید اور سحر آنٹی کا نام سن کر ہی اس میں پیدا ہوئی تھی، راحت نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی تھی۔

"تہمت تب ہوتی ہے۔ جب کوئی آپ پر الزام لگائے۔ کسی کو پتا نہ ہو۔ یہاں سارا محلہ گواہ ہے۔ اب کیوں کھلوا رہی ہو میری زبان۔" انہوں نے ایک ہاتھ سے اس کے چہرے کو پکڑ کر اس کے دونوں گالوں کو زور سے بھینچا تھا۔ مگر اسے تکلیف نہ ہوئی تھی۔ روح کے زخم اس قدر گہرے تھے کہ جسمانی زخموں کی کوئی اہمیت ہی نہ رہی تھی۔

"سب سے بڑا گواہ اللہ ہے امی اور اسے نہ دیکھنے کی ضرورت نہ سننے کی۔ وہ سب جانتا ہے۔" راحت کو حیرت ہوئی تھی، وہ کس قدر دیدہ دلیری سے بات کر رہی تھی جب بات اسید اور اس کی ماں پر آئی تھی، انہوں نے پوری طرح سے ان کی بیٹی کو اپنے جال میں پھانسا تھا۔

"اللہ کے فیصلوں کا آخرت تک انتظار کون کرتا ہے۔ یہیں اس دنیا میں ہی لوگ گواہ ہوتے ہیں۔ ثبوت دیتے ہیں گواہی دیتے ہیں۔ سزا اور جزا کا فیصلہ سناتے ہیں۔"

"کبھی کبھی اللہ پاک اسی دنیا میں بھی فیصلہ سنا دیتے ہیں امی۔ کیونکہ یہ ضروری ہو جاتا ہے۔ نیک لوگوں کی تو میں بہت اثر ہوتا ہے۔"

"کاش کہ پھر کچھ ایسا ہو جائے صفا! کہ میں تمہارا یقین کر سکوں، تمہارے ہاتھوں مٹی میں ملا میرا اجلا دامن پھر سے شفاف ہو سکے۔" انہوں نے دعا کی تھی۔ صفا کی آنکھوں سے بہتے آنسو مزید تیز ہو گئے۔

"پھر بھی یہ جرگہ تو بھگتنا ہی ہے۔ جو میں نے کہا ہے وہی کرنا۔ اس طرح اسید اور اس کی ماں کو جرمانے کی اچھی خاصی رقم دینی پڑ جائے گی۔ یہ ایک بہت اچھا سبق ہو گا ان ماں بیٹے کے لیے۔" انہوں نے بات ختم کر دی۔ وہ بھی بس انہیں دیکھ کے رہ گئی۔

"اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے مڑیں۔ "پرسوں جرگے کے فوراً بعد ہی تمہارا نکاح ساحر سے کروا دوں گی۔ اب زیادہ دیر میں تمہارا بوجھ اپنے کمزور کندھوں نہیں سہار سکتی۔" وہ چلی گئیں اور صفا پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھی۔

☆ ☆ ☆

کئی دن کی ٹینشن اور صحیح طرح سے نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طبیعت بے حد بوجھل تھی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ سر میں بھی شدید درد تھا۔ کروٹ پہ کروٹ بدلتے بدن بھی جیسے ٹوٹنے لگا تھا۔ تنگ آ کر اس نے تکیہ دور اچھال دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تب ہی سرہانے رکھی ننھی سی چیز چمکی تھی۔ اس نے دیکھا، موبائل فون وائبریٹ کر رہا تھا۔ اسکرین پر سحر آنٹی کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

"صفا" نرم و ملائم شفیق لہجے نے اسے بالکل اسی طرح پکارا تھا جو اس کا خاصا تھا۔ وہ بکھرنے لگی۔ سحر نے شاید اس کی سسکی سن لی تھی۔

"مجھے تم دونوں پہ کامل یقین ہے بیٹا! جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا۔ مگر بتا ہے کیا؟ اتنا برا بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ نہ صرف میرے لیے بلکہ اسید کے لیے ہماری عزت سے زیادہ تمہاری عزت معنی رکھتی ہے۔" اس کے دل نے ایک دھڑکن مس کی تھی۔ آنسوؤں میں اور تیزی آ گئی۔ محبتوں سے گندھے ان لفظوں نے اس کا یقین کیا تھا۔ وہ بھی تو ماں تھیں اپنے بیٹے پہ شک کر سکتی تھیں، مگر انہوں نے تو اس لڑکی کا بھی یقین کیا تھا جو ان کی اولاد نہ تھی، لیکن جسے انہوں نے اپنی اولاد کی طرح ہی مانا تھا۔

"میرا کیا ہے۔ اتنی عمر کٹ گئی۔ تھوڑی سی باقی ہے، یہ بھی کٹ جائے گی۔ اسید کا بھی مسئلہ نہیں۔ وہ مرد ہے اور مرد کے لیے ہمارے معاشرے میں سب جائز ہے۔ لیکن۔" وہ کچھ دیر رکیں اور اسے یہ چند گھڑیاں جیسے صدیوں پہ محیط لگیں۔

"مسئلہ تمہارا ہے صفا! تمہاری عزت پر جو داغ لگا، وہ کبھی نہیں مٹ سکے گا اگر وقت پر نہ دھویا گیا۔" کافی دیر بعد انہوں نے کہا۔

"عزت پہ لگا داغ کیا دھل سکتا ہے سحر آنٹی؟" اس کے لہجے میں نمی تھی۔

"عزت اور ذلت دینے والی صرف اللہ کی ذات ہے بیٹا۔ اسے ہی فیصلہ کرنا زیب دیتا ہے۔ ہم تو خاکی بندے ہیں، اس کے فیصلوں پہ چاہے روئیں، چاہے مسکرائیں، قبول کرنے کے علاوہ ہمارا کوئی اختیار نہیں، اور اگر تم ایک پل کے لیے بھی ساری پریشانی بھول کر سوچو۔ تو تم اس رب کے آگے سر بسجود ہو جاؤ۔ اس نے تمہاری عزت پہ داغ نہیں لگنے دیا۔ حالات کچھ بھی بنے ہوں اور فائدہ کسی نے بھی اٹھایا ہو، اب یہ سب عارضی ہے۔ سچائی کس قدر بھی کمزور دکھائی دے، یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہارتی کبھی نہیں۔ ایک نہ ایک دن جیت سچائی کی ہی ہوتی ہے۔ تمہیں بس صبر کر کے اس وقت کا انتظار کرنا ہو گا صفا!" کس قدر شفیق تھیں وہ۔ صفا کا دل چاہا کہ بھاگ کر جائے اور ان کی نرم سی شخصیت میں پناہ لے لے۔

"میرے لیے تو شاید ساری عمر یہ داغ مٹانا اب ناممکن ہو آنٹی۔ بلکہ قدرت کا فیصلہ تو دیکھیں کہ جس شخص نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اسے ہی میرا مسیحا مان کر ساری عمر کے لیے اس کا احسان مند بنایا جا رہا ہے۔" وہ پھر سے سسکنے لگی۔

"کیا مطلب صفا؟ مجھے پوری بات بتاؤ؟" نہ جانے کیوں ان کے دل نے کچھ غلط ہونے کا الارم دیا۔

صفا نے ان کے تسلی دینے پہ راحت کی جرگہ اور ساحر سے شادی کے متعلق تمام بات ان کو بتا دی۔

"تمہاری امی نے ساحر کی بات مان لی!" وہ واقعی حیران تھیں۔

"شکر خدا کا میں نے ان سے کوئی بات نہ کی۔ میں تو سمجھی وہ ضرور تمہارا یقین کریں گی۔ ایک بیٹی کو بھلا اس کی ماں سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟" ان کے لہجے میں

دکھ تھا۔

"آنٹی شاید میری عزت پہ لگا یہ عارضی داغ کبھی بھی صاف نہ ہو پائے کیونکہ میرے خلاف سب سے بڑی گواہی میری ماں کا مجھ پہ یقین نہ کرنا ہے۔" اس کے لہجے سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کس قدر بکھری ہوئی تھی۔

"رشتے خود عارضی ہیں بیٹا! کبھی کوئی رشتہ ابدی ثابت ہوا ہے۔ سوائے بندے کے اس کے اپنے رب سے تعلق کے۔ رشتے تو آزمائش ہیں۔ ہمیں مکمل طور پہ بس اللہ ہی جانتا ہے۔ اور وہی سب کے لیے کافی ہوتا ہے بیٹا، ظالم کے لیے بھی، مظلوم کے لیے بھی۔"

انہوں نے اس کو کس طرح سہارا دیا تھا۔ دکھ کچھ کم ہونے لگا تھا۔ وہ اس کی رشتہ دار نہ تھیں۔ مگر اسے سمجھتی تھیں۔ انہیں اس پر اعتبار تھا۔

"راحت بھی تمہاری ماں ہیں۔ وہ کبھی تمہارا برا نہ چاہیں گی مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس وقت بے خبر ہیں اور سچ ہوں تو میں نے بھی ہمیشہ تمہیں اپنی بیٹی مانا ہے۔ ہمیشہ مجھے ایسا لگا جیسے تمہیں مجھ سے ملا کر اللہ نے میری بیٹی کی خواہش پوری کر دی ہے۔ صفا تم سن رہی ہو بیٹا۔"

"جی آنٹی۔"

"کیا میری ایک بات مانو گی؟"

"میں پوری کوشش کروں گی آنٹی!"

اور پھر دوسری طرف سے سحر آنٹی کو سنتے سنتے اس کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں۔ منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اس بات کی بھنک بھی اسید کو نہیں پڑنی چاہیے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں بیٹا۔ بس اللہ کرے یہ جرگے والا معاملہ سلیقے سے نبٹ جائے۔" وہ تو کچھ بول ہی نہ پائی۔ سحر محسود نے دعائیں دیتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔ چاہ کر بھی وہ دوبارہ سو نہیں پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

جرگہ میں زیادہ تر ساحر کی برادری کے ہی لوگ تھے۔ اسید کی طرف سے صرف اس کے ماموں اور دور کے ایک چاچو اپنے جوان بیٹوں کے ہمراہ شریک ہوئے تھے۔ اسید کے قرآن پاک پہ ہاتھ رکھ کر قسم کھانے نے سب کے ستے چہروں کو قدرے اطمینان بخشا تھا۔ مگر پھر ساحر اور دوسرے محلے والوں کی گواہی سے یہ اطمینان جاتا رہا تھا۔

سحر گاڑی میں ہی بیٹھی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں صفا پہ جمی تھیں۔ وہی ان کے اور ان کے بیٹے کے کردار کو بچا سکتی تھی۔ ان کے دامن پہ گرے چھینٹے صاف کر سکتی تھی۔ لیکن اس وقت وہ چونکیں، جب برادری کی عورتوں نے اس کے قرآن پاک کی قسم کھانے پہ عذر دیا۔ انہوں نے واضح طور پہ ساحر کو چونکتے دیکھا تھا۔ ایک بے گناہ قرآن پاک پہ ہاتھ رکھنے سے جھجک کھا جائے سہم کے ڈر کے تو ضرور کوئی نہ کوئی بات تو ہو گی نا، ساحر جیسا شاطر انسان بھی صحیح سمجھا تھا۔ سحر کے لبوں پہ مطمئن سی مسکراہٹ مچل گئی۔

"میں ایسی حالت میں ہوں کہ اس پاک کتاب کی قسم کھا کر خود کو عذاب الٰہی کے قابل نہیں بنا سکتی۔ اس لیے میں اپنے گناہ کا ——— اعتراف کر سکتی ہوں۔ اس رات واقعی میں اسید محسود سے ملنے ہی ان کی چھت پہ گئی تھی۔" وہ مضبوط لہجے میں بولنے لگی۔

ساحر کے چہرے پہ اب کمینی سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی اور اسید اس کا تنا تنا سا چہرہ مزید تن گیا تھا۔ غصے سے اس کی آنکھیں لال پڑنے لگیں۔ اس کی نظریں صفا پہ جمی تھیں۔ صفا نے نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

"ہم کبھی اپنی حد سے آگے نہیں بڑھے۔ خدا گواہ ہے کہ میں اسید محسود سے بہت محبت کرتی ہوں اور اس واقعہ کے بعد تو خصوصاً" اب کسی اور مرد کے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے جاں گسل ہے۔"

سارے مجمع میں سرگوشیاں سی ابھریں۔

"میری تمام بزرگ لوگوں سے درخواست ہے کہ اب اس واقعے کے بعد شاید ہی کوئی عزت دار مرد مجھے

قبول کر لے اور شاید کوئی کر بھی لے مگر سب اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے وہ عزت اور احترام کبھی نہیں مل سکے گا۔ اسید محمود آج اپنے وعدوں اور قسموں سے مکر رہا ہے، میری زندگی تباہ کر کے یہ اب مجھ سے جان چھڑا کر اپنی پاک دامنی بچانا چاہتا ہے۔ مجھے امید ہے جرگہ انصاف پہ مبنی فیصلہ کرے گا۔" اسید کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کا گلا دبا دے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا جس لڑکی کے لیے سوچ سوچ کر وہ پریشان ہو تا رہا تھا۔ وہ یوں کھلے عام اس کی عزت کی دھجیاں اڑا کے رکھ دے گی۔ ادھر اس کے مطالبے پہ ساحر کے بھی ہوش اڑ چکے تھے۔

"یہ بات غلط ہے۔ ان دونوں کو سزا دی جائے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سزا کیسی۔ ان دونوں نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی جس قدر بھونگا (تاوان) آپ لوگ کہیں گے ہم بھرنے کے لیے تیار ہیں اور ان دونوں کے لیے یہی سزا کافی ہوگی کہ ان کو ہمیشہ کے لیے بندھن میں باندھ دیا جائے۔" اسید کے چاچا نے پہلی بار مداخلت کی تھی۔

"مگر چاچا۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔

"جو کچھ تم نے کیا وہ کافی ہے اسید بچے اب ہمیں اپنی ذمہ داری سنبھالنے دو۔" اسید کو خاموش کرانے کے بعد وہ دوبارہ جرگہ کے ممبران کی طرف متوجہ ہوئے۔

"میرے خیال میں تو لڑکے کے والدین اور لڑکی کے والدین کو بھی اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔" جرگہ کے معتبرین نے بھی اسید کو فرماں برداری سے سر جھکاتا دیکھ کر آپس میں صلاح شروع کر دی تھی۔

"لیکن ہمیں یہ فیصلہ منظور نہیں، بہتر یہی ہے کہ بھونگے کی رقم مقرر کی جائے اور بس۔" ساحر ایک مرتبہ پھر چلایا۔

"لیکن اس طرح برائی زندہ رہے گی۔ آج یہ لڑکی یوں سر عام اپنے عشق کا اعلان کر رہی ہے، کل یہ کوئی اور قدم بھی اٹھا سکتی ہے اور خصوصاً" شادی کے بعد اس طرح کا قدم مزید گناہ پھیلانے کے مترادف ہوگا۔ ابھی یہ لوگ کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ سو دانش مندی یہی ہے کہ اب لڑکا اس لڑکی سے شریعت کے عین مطابق شادی کرے اور لڑکی کے گھر والوں کو ریت کے مطابق تاوان بھی ادا کرے۔" سب سے معتبر ترین رہنما نے دلائل دیے تو باقی ممبران بھی اثبات میں سر ہلانے لگے۔

"آپ لوگ سزا کے طور پہ جتنی بھی رقم مقرر کریں گے۔ آج شام تک ہی ادا کر دی جائے گی۔ آپ گواہ کے طور پہ کوئی بھی ثالث مقرر کر سکتے ہیں۔ اور میں چاہوں گا کہ نکاح کا اہتمام بھی آج ہی کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ نکاح و شادی میں سادگی تو ویسے بھی سنت رسول ہے۔" اسید کے ماموں نے گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا۔ ساحر اس بار خاموش رہا تھا۔ ورنہ جس ہوشیاری سے صفا اس کے ہاتھ سے نکلی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ رقم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔ دل ہی دل میں کڑھتے اس نے بھی فیصلے کو قبولیت کی سند بخش دی تھی۔

"ٹھیک ہے تو آج شام سات بجے تک اسید محمود مسماۃ صفا بی بی کے گھر والوں کو تین لاکھ پچاس ہزار کی نقد رقم بھی ادا کرے گا اور آج ہی کی شام سادگی سے ان دونوں کے نکاح کی تقریب بھی کاغی کی مسجد میں ادا کی جائے گی اور لڑکے کو گھر بھی کسی اور جگہ لینا پڑے گا۔ مطلب رہائش اس علاقے سے دور کہیں اختیار کرنی پڑے گی، تاکہ آگے کسی تنازع کا باعث نہ بن سکے۔" انہوں نے فیصلہ سنا دیا تھا۔ اسید غصے سے مٹھیاں بھینچتا کھڑا ہوا تھا۔ اور گاڑی میں بیٹھی ساری کارروائی دیکھتی سحر محمود کے ہونٹوں پہ مطمئن سی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"صفا۔"

آتشی گلابی رنگ کے عروسی ملبوس میں سکڑی سمٹی

نازک سی صفا بے شک اس وقت زندگی کے سب سے خوب صورت بندھن میں جڑی تھی۔

"شہزادے بھی کبھی ملا کرتے ہیں؟" انہونی ہی تو تھی۔ تبھی تو اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے اپنے تمام حقوق' اپنی زندگی کسی اور کے نام کردینے کی قبولیت دی تھی۔ پلکوں پہ دھرے خواب کی تعبیر قریب تھی 'مگر ایک انہونی کا خوف بھی دل دھڑکا رہا تھا۔ وہ تو جیسے دور کہیں آسمانوں کی باسی ٹھہری تھی۔

"صفا۔" راحت نے اسے بازو سے پکڑ کر ہلکے سے جنجھوڑا۔ وہ چونک گئی۔ نم آنکھیں ماں کے چہرے پہ پڑیں۔ جہاں چند ہی دنوں میں بڑھاپا ناچنے لگا تھا۔

"تو کیا اس کا غم ان کے لیے بیوگی سے بھی بڑھ کر تھا؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"عزت دار کو عزت سے زیادہ بھلا کیا چیز عزیز ہو سکتی ہے؟" دل نے بڑا تہل جواب دیا تھا اور اس بات کی وہ خود گواہ تھی کہ اس کی ماں نے ساری عمر اسی عزت' اسی نام کی حفاظت کی تھی' تب ہی تو تایا ابا کے ناروا سلوک کے باوجود وہ ان سے رابطہ رکھتیں' تاکہ کسی نہ کسی طرح ساحر کا آنا جانا رہے اور کسی مرد کی ڈھارس ان کے سر پہ ہو' تاکہ کسی کو بھی اکیلا سمجھ کر ان پہ یا ان کی بیٹی پہ نظر ڈالنے کی ہمت نہ ہو۔ لیکن اس بے خبری میں ہی ماری گئیں۔ گھر کا محافظ ہی ان کی عزت پہ نظریں لگائے بیٹھا تھا۔

"امی۔" وہ ان سے لپٹ گئی۔ بکھرنے لگی' سسکنے لگی۔ راحت اس سسکتے وجود کو اس بار نہ روک سکی تھیں۔ ممتا مچل اٹھی تھی اور پھر ان کا تھا ہی کون۔ صرف دو سال کی تھی صفا' جب عبدالرحمان کا انتقال ہوا تھا' تب سے صرف وہی رہی تھی ان کی زندگی کا محور۔ سانس سانس اس کے وجود سے اٹھتی مہک اپنے اندر اتارتے ہوئے انہوں نے آرام سے اسے خود سے الگ کیا۔

"صفا! میں آج تم سے کوئی گلہ نہیں کروں گی۔ مائیں جس قدر بھی خفا ہو جائیں' اس رات ان کا دل سخت نہیں ہو پاتا۔ بہت ارمان تھے میرے 'مگر۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکیں۔ اس نے نظریں اٹھا کر ماں کی طرف دیکھا۔ کتنا روپ آیا تھا اس پر' وہ ننھی سی گڑیا جسے کبھی وہ بڑی چاہ سے ہر نمونے کے فراک پہنا کر طرح طرح کے ہیئر اسٹائل بنا کے سنوارا کرتی تھیں۔ اور ہمیشہ ہی وہ پہلے سے منفرد اور خوب صورت نظر آتی' لیکن آج ان کی گڑیا کا یہ روپ کسی بھی روپ سے انوکھا اور بہترین تھا۔ گو کہ سحر نے اس کے لیے بہترین سامان اور بیوٹیشن بھیجے تھے۔ لیکن اس نے سادہ سا میک اپ کروایا تھا۔ پھر بھی اداسی بھرا گلابی گلابی سا پیکر گلابی پیراہن میں پریوں کی طرح نکھر رہا تھا۔ مزید اجاگر ہو رہا تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتاری۔

"تم ایک بار مجھ پر بھروسا تو کرتیں۔ تو میں خود اسید جیسے لڑکے کو کبھی نہ ٹھکراتی صفا۔ مگر تم نے غلط راستہ چنا۔" ان کے لہجے میں دکھ تھا۔

"نہیں امی۔ اللہ گواہ ہے میں نے یہ راستہ بہت سوچ سمجھ کر چنا اور جس دن آپ کو حقیقت پتا چلی' آپ مجھے غلط نہیں کہیں گی امی۔" اس نے مہندی سے عاری ہاتھوں سے ماں کے ہاتھ تھامے تھے۔ بیوٹیشن کے بے حد اصرار پہ بھی اس نے مہندی لگوانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کیوں کر لگواتی کہ نہ کوئی سکھی تھی' نہ کوئی خوابوں کی تعبیر سی شادی۔ ایک حادثہ ہی تھا جو رونما ہوا تھا۔ اس کی تو ماں بھی جیسے زبردستی اس کی شادی میں رکی ہوئی تھیں۔ نہ کوئی ارمان' نہ کوئی تفکر۔ ان کے چہرے پہ تو ناراضی تھی۔ مان ٹوٹنے جانے کا کرب تھا اور صفا رحمان کے حصے میں آئی تھیں کچھ بھولی بسری دعائیں' جو شاید اس کی ماں کے دل کے کسی کونے میں ابھی تک سانس لے رہی تھیں۔

اور جو رات لڑکی کی آنکھوں کو نئی خواب دے کر جگمگا دیتی ہے۔ وہ رات صفا کو مستقبل کی فکر دے گئی تھی۔ اس نے جو کھیل کھیلا تھا' اس کا انجام کیا ہونا تھا۔ اس رات جب حیا کی لالی عورت کے چہرے کو مزید سنگھار بخشتی ہے۔ اس کے خوب صورت چہرے

پہ تفکر چھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نکاح کے بعد وہ لوگ ابھی ابھی مسجد سے لوٹے تھے۔ چاچا اور ماموں لوگوں کو امی کے ساتھ لاؤنج میں چھوڑ کر وہ اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا تھا اسے کمرے میں داخل ہوتے ہی' کمرے کی سیٹنگ تبدیل کی گئی تھی۔ اور جگہ جگہ پھولوں کی شکل میں سجائے گئے تازہ گلاب کے پھول' جیسے عجیب سانسوں پھونک رہے تھے ماحول میں۔ بیڈ کے چاروں طرف کانچ کی ننھی منی موتیوں جیسی شکل کی لڑیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ محو حیرت تھا کہ امی آئیں۔ اسے یوں حیرت سے سب دیکھتا پا کے وہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

"اچھا لگ رہا ہے نا اسید۔" ان کی شفیق آواز پہ اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

"کتنے خواب تھے نا امی آپ کے میری شادی کے حوالے سے۔ چاچا نے صحیح فیصلہ نہیں کیا' ایک بار مجھ سے تصدیق تو کر لیتے۔ انہوں نے تو میرا اعتبار ہی نہیں کیا۔"

"ہم سب کو تمہارا اعتبار ہے بیٹا اور فیصلہ صرف قبول کیا جاتا ہے یارو۔ لیکن وہ صحیح ہے یا غلط' یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ فیصلہ وقت کرتا ہے۔ اگر ہم یہ فیصلہ اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں تو اکثر سوائے پچھتاووں کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔" انہوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"اور رہی بات میرے ارمانوں کی۔ تو یقین کرو' میرا یہی ارمان تھا کہ میرے اپنوں کے ساتھ بہت ہی سادگی سے تمہاری شادی قرار پائے اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ مجھے کوئی دکھاوا نہیں کرنا تھا۔ سنت نبویؐ کی پیروی کرنی تھی اور مجھے خوشی ہے اور اس اللہ پاک کی کریمی کہ میں کامیاب ہوئی۔"

"پھر بھی امی۔ مجھے اب سنبھلنے میں شاید کافی وقت لگے اور یہ سب۔" وہ پریشان سا دونوں ہاتھ بالوں میں پھنسائے صوفے پہ جا بیٹھا۔

"صفا نے جو کچھ میرے ساتھ کیا اسے قبول کرنا بے حد مشکل ہے میرے لیے۔ اس رات میں نے اس لڑکی کے لیے اس خبیث ساحر سے جھگڑا کیا اور پھر بھی صرف اسی کی عزت کے لیے میں پریشان رہا۔ میں مرد ہوں' مجھے ان باتوں کی کوئی پروا نہیں' لیکن اس لڑکی نے کتنی دلیری سے یوں سب کے سامنے نہ صرف اپنے بلکہ میرے دامن پہ بھی کیچڑ اچھال دی۔"

وہ کس قدر بکھرا تھا۔ وہ بخوبی سمجھ سکتی تھیں' کیونکہ وہ بے حد سمجھ دار عورت تھیں انہیں معلوم تھا۔ مرد کے لیے مشکل کام وہی ہوتا ہے جو اس کے لیے مشکل بنا دیا جائے' عورت خواہ کسی بھی روپ میں اگر اسے دلاسا دے دے کہ وہ مرد ہے' اس میں ہر طرح کی صورت حال سے لڑنے کا حوصلہ ہے تو واقعی وہ ہر حال میں کامیابی پا کر رہتا ہے۔ انہوں نے بھی اس وقت یہی کرنا تھا۔ فیصلہ وقت پر چھوڑ کر بس کسی طرح اسید کو اس کی ذمہ داریوں اور فرائض کا احساس دلانا تھا۔ آہستہ آہستہ خود اس پر سچائی کھل جانی تھی اور وہ جانتی تھیں' تب ان کے بیٹے کے لیے اطمینان ہی اطمینان تھا۔

"ہم کسی کو اتنی جلدی غلط نہیں مان سکتے بیٹا۔ صفا کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بے حد اچھی لڑکی ہے۔ مجھے خوشی یہ ہے کہ تمہارے چاچا کے فیصلے سے کم از کم کسی اور کے گھر جا کر وہ ساری عمر ایک بدکردار کے طعنے کھانے سے تو بچ گئی' یقین کرو فیصلہ کچھ بھی ہوتا۔ تم بے قصور کبھی ثابت نہ ہو پاتے۔ تمہاری سچائی کا کوئی بھی یقین نہ کرتا' مگر اس طرح پیسوں کے ساتھ ساتھ کسی کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی۔"

"پھر بھی امی۔ مجھے نہیں لگتا' میں اب صفا کو کبھی وہ مقام دے سکوں گا اس دل اور گھر میں جو اس کا حق ہے۔"

"نہیں نہیں اسید۔ یہ بات غلط ہے بیٹا۔ فرائض تو فرائض ہیں' حالات خواہ کوئی بھی ہوں' ہم فرائض ادا کرنے سے کیسے چوک سکتے ہیں اور پھر وہ فرائض جو اللہ کے بندوں کے معاملے میں ہم پر عائد کیے گئے۔

یقین کرو ان کی تو کڑی سے کڑی نگرانی ہے۔" وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے بولیں۔

سیاہ آنکھیں ماں کی طرف اٹھیں، سرخ ڈورے اس کے اندرونی انتشار کا پتا دے رہے تھے۔

"اور مجھے میرے اسید پہ پوری طرح یقین ہے۔ وہ مجھے اور خود کو کبھی میرے خدا کے سامنے شرمندہ ہونے نہیں دے گا۔" وہ مسکرائیں۔ اسید نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر ان کے یقین کو پختہ کیا تھا، لیکن یہ سچ تھا کہ اس کا دل مسلسل صفا کے خلاف جا رہا تھا۔

* * *
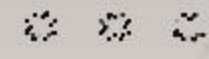
اسے ہرگز ایسے استقبال کی توقع نہ تھی۔ تب ہی کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

"سحر آنٹی۔ یہ سب۔" بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"امی کہا کرو تو زیادہ اچھا لگے گا مجھے۔ اسید کی طرح عزیز ہو تم مجھے۔ سو یہ میں نے صرف تمہارے لیے نہیں کیا۔ بلکہ تم دونوں کے لیے کیا۔ اسید سے جڑی ہر شے مجھے اسی طرح عزیز ہے جیسے اسید۔ پھر تم تو اس کی نصف بہتر ہو۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور اسے بھی خوشیوں کی ونادی تھی۔ وہ اب حلیہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی مگر جیسے ہی باتھ روم تک پہنچی۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا اور سفید آرام دہ لباس میں ملبوس اسید محمود باہر نکلا۔ اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ گہری نگاہ اس کے اداس مگر دلکش سراپے پر ڈالی وہ وہیں ٹھہر گیا تھا۔

"آپ یہاں تھے؟" بے اختیار ہی اس کے لبوں سے پھسلا۔

"جی۔ آپ کا کیا خیال تھا۔ اتنی دھوم دھام سے شادی ہونے کے بعد میرے ایک درجن دوست مجھے تنگ کرتے ہوئے دروازے تک چھوڑ کے جاتے۔"

وہیں دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگا کر سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے اس نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ نظریں ہنوز صفا پہ ہی ٹکی تھیں۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ تب ہی بس کانپتی، لرزتی پلکیں جھکا گئی۔ بول نہ سکی۔ اسید کے دل کو کچھ ہوا۔

"ادھر آؤ۔" اس نے صفا کا ہاتھ تھاما۔ کانچ کی چوڑیاں جھنجھنا اٹھیں۔ اور اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔

"میں کچھ لے ہی نہ سکا تمہارے لیے۔" وہ تیزی سے آپ سے تم تک کا سفر طے کر گیا۔ مرد کس قدر خوش قسمت ہوتے ہیں۔ سب کچھ طے کر لینے کا حق رکھتے ہیں۔ ذرا بھی نہیں جھجکتے۔ اسے اسید پر رشک آیا۔

"ہاں، سچ کہوں تو اگر مجھے وقت مل بھی جاتا۔ تب بھی میں تمہارے تحفے کے لیے کچھ نہ لیتا۔" آئی مین منہ دکھائی کے لیے۔"

"جی میں سمجھ سکتی ہوں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"کیا سمجھ سکتی ہو؟" صفا نے اس بار بغور اسے دیکھا، وہ شاید اسے سمجھنا چاہتی تھی۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ اس کا سامنا ہوتے ہی اسید اسے جھنجھوڑ ڈالے گا۔ مگر اس طرح پُرسکون سا انداز۔ وہ پُرسکون تھا۔ مگر بڑھی شیو اور نڈھال سا وجود اس کے اندرونی انتشار کا بخوبی پتا دے رہا تھا۔ کالی سیاہ آنکھوں کی چمک ماند تھی۔ اور سرخ ڈوروں نے اس کی مغرور شخصیت کو کچھ اور رنگ بخش دیے تھے۔ وہ کوئی نام نہ دے سکی۔

"جواب نہیں ہے تمہارے پاس؟" وہ سر کے پیچھے ہاتھ باندھتے ہوئے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا گیا۔

"میں کوشش کروں گی اسید۔ کہ کبھی خود کو اس قابل بنا سکوں کہ آپ کو کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔ آپ خود بخود مجھے سمجھنے لگو۔" گھنی پلکوں کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی بھیگنے لگا۔

"تم نے مہندی نہیں لگوائی۔" نرم و ملائم، مرمریں سا ہاتھ مضبوط ہاتھوں نے اچانک ہی تھاما تھا۔

مگر بھرے دل کو نہ جانے کیوں خود بخود کسی مضبوط سہارے کا احساس ہوا۔

"شادی اتنی دھوم دھام سے ہوئی کہ مہندی لگانے کا وقت ہی نہیں ملا۔" نم سے لہجے میں وہ ہلکے سے کھلکھلائی تھی۔ اسید کو اپنے چاروں طرف روشنی سی بکھرتی محسوس ہوئی۔

"مجھے نہیں معلوم صفا! کہ تم نے میرا استعمال کیوں کیا؟" وہ بھی اس کی بات پہ دھیمے سے مسکرایا۔ اور پھر بھی سانس کھینچ کر جیسے خود کو کمپوز کیا۔ اس کی اس بات پہ صفا کے اندر کچھ چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ اس نے اس کا اعتبار توڑا تھا۔ جسے وہ دل ہی دل میں کتنے ہی بڑے سنگھاسن پہ بٹھا بیٹھی تھی۔

"لیکن میرا وعدہ ہے میں اپنے فرائض اور تمہارے حقوق کے معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔ لیکن تمہاری غلط بیانی نے مجھے اندر سے اس قدر چوٹ دی ہے کہ شاید ہی کبھی میں تمہیں تمہارا اصل مقام دے سکوں اپنی زندگی میں' اپنے دل میں۔"

اسید نے صفا کے ہاتھ پہ اپنی گرفت مضبوط کی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ اس نے واقعی جو کیا اس کے بعد وہ اس سے زیادہ کی حقدار تھی۔ اسید جتنا چاہتا برا کر سکتا تھا۔ مگر اس محبتوں سے گندھے مرد نے اس موم کی گڑیا کو محبت کی کن من پھوار میں بھگویا تھا۔ سارے حساب وقت پہ چھوڑ دیے تھے۔ اور اسے محبتوں کا امین بنایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"چاچی۔ تین لاکھ روپے دیے ہیں انہوں نے جرمانے میں۔ عزت کی بات تھی۔ تو میں اس پہ چپ ہو گیا۔" اس نے پیسوں سے بھرا لفافہ راحت کے سامنے رکھا تھا۔ کان کھجاتے ہوئے نہ جانے کیوں وہ ان سے نظریں چرا رہا تھا۔ شاید وہی شرمندگی' جس نے ان کو بھی نظریں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"انہیں کسی ٹرسٹ کو دے دو۔ عزت کی نیلامی کی رقم کا میں کیا کروں گی۔" ان کی بات پہ ساحر کی باچھیں کھل اٹھیں۔

"بڑا دل ہے چاچی تیرا۔" لفافہ فوراً سے بھی پہلے اس کی واسکٹ کی اندرونی جیب میں منتقل ہو گیا۔

"ساحر بیٹا! میں ریٹائرمنٹ لے رہی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ یہ گھر بیچ کر دور کہیں کوئی چھوٹا سا فلیٹ لے لوں۔ تم اس سلسلے میں میری مدد کرو۔" ان کی بات پہ اس نے ذرا سا سوچا۔

"گھر بیچنے کی کیا ضرورت ہے چاچی۔"

"کیا کروں گی اب اس گھر کا۔ پھر دونوں گھروں کے درمیان ایک دیوار کا ہی فرق ہے۔ یہاں رہوں گی تو جلتی ہی رہوں گی۔" ساحر نے دیکھا' وہ کافی کمزور لگ رہی تھیں۔ اندر ہی اندر جیسے گھل رہی تھیں وہ۔

"اب اس سے زیادہ تو میں بھی نہیں کر سکتا تھا چاچی۔ اگر صفا بیان نہ دے دیتی تو قسم سے میں تو اسے معاف کر کے ہمیشہ تیرے ساتھ ہی رکھتا۔ کبھی تجھے یوں دکھی نہ ہونے دیتا۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"پر تو فکر نہ کر چاچی۔ جرگے کے فیصلے کے مطابق جلد ہی ان کو گھر تبدیل کرنا پڑے گا۔ تو کیوں اس عمر میں کہیں اور خوار ہو۔ اور تو اگر اکیلے پن سے گھبراتی ہے تو جلد میں تیرے ساتھ ہی شفٹ ہو جاؤں گا۔ بس ذرا کاروبار کے سلسلے میں مصروف ہوں۔" اس کے تسلی دینے پر وہ بس سر ہلا سکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اسید کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزرنے لگا تھا۔ سحر نے بھی اسے ٹوکنے سے گریز کیا تھا۔ وہ کسی بہتر وقت کی تلاش میں تھیں۔ جب وہ اسید کے دل میں صفا کے لیے ذرا سی محبت دیکھتیں۔ تب کسک اور خلش کی ساری گرہ کھلتے ذرا دیر نہ لگنی تھی۔ صفا البتہ مزید اداس رہنے لگی تھی' اسے یوں محسوس ہوتا جیسے صرف اس کی وجہ سے اسید کو نظریں چرانی پڑتی ہیں۔ اور کسی سے بھی سامنا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا وہ۔ ابھی بھی وہ کچن میں کام کر رہی تھی۔ اس نے خود کو حد سے زیادہ مصروف کر لیا تھا۔ تاکہ اسے اسید کے متعلق

سوچنے کا وقت کم سے کم ملے۔ مگر اس کا خیال تھا کہ
اتنی مصروفیت میں بھی جگہ تلاش کر ہی لیتا۔

"صفا!" سحر کی نرم آواز پر برتن دھوتی صفا نے ان
کی طرف دیکھا۔

"کتنے دن ہوئے ہیں تمہاری شادی کو۔ اور تم نے
خود کو ماسی بنا کے رکھ دیا ہے بیٹا۔" انہوں نے محبت
سے کہا۔

"میرا اپنا گھر ہے امی۔ اپنے گھر کے کام کرنے میں
بھلا کیا دقت۔" وہ اداسی سے مسکرائی۔ کتنا روپ آیا
تھا اس پر۔ محبت کے رنگ اپسرائی دھنک بخش رہے
تھے اس پریوں جیسی نرم و نازک لڑکی کو۔ وہ خوش
تھیں کہ اسید نے دل سے نہ سہی صرف ان کی خاطر
صفا کو رونہ کیا تھا۔ اور انہیں یقین تھا۔ کہ ایک نہ ایک
دن صفا جیسی وفاشعار اور قابل لڑکی اس کی ہر شکایت کا
ازالہ کردے گی۔

اس کے دلکش روپ میں اداسی رچی تھی۔ نئے
بندھن کے سارے رنگ اس کے چہرے پر رقم تھے
سوائے خوشی کے۔ سچی خوشی تو ہم سفر کے دم سے ہوتی
ہے۔

جب وہ آپ سے خوش ہو۔ جب وہ صرف اپنے
حقوق و فرائض نہیں بلکہ آپ کے ساتھ وقت بتانے کو
بے قرار ہو۔

"اداس ہو صفا۔" انہوں نے ملائمت سے اس کی
تھوڑی چھوئی۔ چہرہ اونچا کیا۔

"میں نے بہت برا کیا امی' اسید کو کسی سے بھی
نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا میں نے۔ اتنی خود
غرض کیسے ہوگئی میں۔" اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو صفا! تم نے ایسا کیوں کیا۔
اور پھر یہ بھی واضح ہے کہ تم اگر یہ بیان نہ بھی دیتیں تو
بھی تم دونوں نے بے گناہ ثابت نہیں ہو جانا تھا۔ بلکہ
جو سزا تمہاری منتظر تھی۔ وہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔
جس شخص نے تمہیں پاتال کی گہرائیوں میں گرا کر
تمہیں پانا چاہا تھا۔ وہی شخص تمہارا مقدر ٹھہرنا صفا۔"
انہوں نے جو سوچا وہ سچ تھا۔

"اپنی عزت بچانے کے لیے' اپنی قسمت بدلنے
کے لیے میں نے بھی تو اسید کو پاتال میں گرا دیا۔"

"تم نے اس پر کوئی الزام نہیں لگایا کوئی کیچڑ نہیں
اچھالا۔ صرف محبت کا اقرار کیا جھوٹی سہی مگر یقین کرو
نکاح کے بعد جو محبت پیدا ہوتی ہے وہ تو آسمانوں جتنی
بلند اور عرش کے جیسی پاکیزہ ہوتی ہے۔"

"پتا نہیں امی! مگر نہ جانے کیوں میرے دل میں یہی
خیال گھر کر گیا ہے۔ کہ میں نے اسید کے ساتھ بالکل
وہی کیا جو ساحر نے میرے ساتھ۔" لہجہ بھیگنے لگا۔

"اسی لیے تم اس قدر اداس اداس پھرتی ہو۔" وہ
مسکرائیں۔ صفا نظریں چرا گئی۔

"یہ سب تمہارا وہم ہے۔ جسے تم نے اپنے اندر
مضبوطی بخش دی ہے۔ حقیقت کو سامنے رکھ کر سوچو
گی تو نہ صرف خود قائل ہو جاؤ گی بلکہ اسید کے دل پہ
جمی بدگمانی کی گرد بھی اسی قدر تیزی سے صاف
کرلو گی۔" انہوں نے نرمی سے اس کے گالوں پر بہتے
آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لیے۔

"ویسے ایک بات کہوں صفا! پتا ہے' تمہیں یوں
اداس دیکھ کر مجھے کیا لگتا ہے؟" اس بار صفا کو ان کا لہجہ
شریر سا محسوس ہوا۔ اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"یہی کہ روح کی اداسی کے رنگ' دھنک کے
رنگوں سے بھی زیادہ حسین ہوتے ہیں۔" وہ
مسکرائیں۔

"جی۔ کیونکہ اداسی دل کو اللہ کی طرف کشش کرتی
ہے ناں۔" وہ بھی کہتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دی
تھی۔ سحر محمود نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اور کوئی
واپس پلٹ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اللہ نے جس قدر اسے ظاہری خوب صورتی سے
نوازا تھا۔ اسی قدر باطن بھی سجا دیا تھا۔ وہ قول اور فعل
کا پکا تھا۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس واقعے کے
بعد نہ صرف ان کی فیملی کی بلکہ خود صفا کی بھی زندگی
روز انگاروں پر بسر ہوگی۔ وہ حیران بھی تھا کہ ماں ہو کر

انہوں نے اعلا ظرفی نہ دکھائی تھی۔ وہ بھی ایک بیٹی کے لیے۔ صفا نے اس کے ساتھ جو بھی کیا وہ حیرت انگیز اور دکھ دینے والا تھا۔ مگر پھر بھی وہ دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ صفا بد کردار لڑکی نہیں ہو سکتی۔ کبھی بھی نہیں۔ ایسے میں اس کی ماں کا یہ برتاؤ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ پھر بھی وہ ان کے لیے آسانی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

جرگہ میں اس نے وعدہ کیا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر ہی وہ یہ گھر بیچ کر کسی اور گھر شفٹ ہو جائے گا۔ اس نے اپنا وعدہ ایفا کیا تھا۔ صرف سات دن کے اندر اندر وہ فیملی کو لے کر اندرون شہر شفٹ ہو گیا تھا۔

"تم اپنی امی سے مل آؤ۔" سامان روانہ کرنے کے بعد اس نے گاڑی نکلنے سے پہلے صفا سے کہا تھا۔ سحر اندر تھیں۔ تب ہی اس نے مخاطب کیا تھا۔ ورنہ عام حالات میں وہ اس سے زیادہ بات نہ کرتا۔

"کیا فائدہ؟ امی تو میری شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہیں؟" وہ اداس ہوا ہوئی۔

"ماں باپ ناراض ہو کر بھی ناراض نہیں ہوتے' جاؤ مل لو۔ ورنہ صبر نہیں آئے گا' یہی خیال بے چین رکھے گا کہ کاش ملنے چلی جاتی کیا پتا مان جاتیں۔" گاڑی کے بونٹ پہ ہی بیٹھتے ہوئے وہ بولا تھا۔ سفید شرٹ کی آستینیں فولڈ کر رکھی تھیں۔ وہ کس قدر خوب صورت تھا۔ اس کے ہلکے کالے' کچھ کچھ براؤن ہوتے بال' سیاہ آنکھیں، جو وہ ہمیشہ پوری طرح کھول کے دیکھتا یا شاید پھر تھیں ہی اتنی بڑی بڑی' کبھی کبھی اسے اس کی آنکھوں پہ حیرت ہوتی۔ کسی کارٹون کریکٹر کی طرح انوکھی اور عجیب۔ مگر بے حد خوب صورت۔ دیکھنے پہ نظر ہٹانے کو دل ہی نہ کرتا۔

"اتنے غور سے نہ دیکھو۔ ابھی سفر بھی کرنا ہے؟" وہ شریر ہوا۔ صفا جھینپ گئی۔

"میں آتی ہوں مل کر۔" کہہ کر تیزی سے وہ گیٹ کراس کر گئی۔ اس نے چند لمحے آنکھیں بند کر کے خود کو کمپوز کیا۔ پھر دھیرے سے مین گیٹ کی چھوٹی کھڑکی کو ذرا سا دھکا دیا۔ گیٹ کھلا تھا۔ کھڑکی کھلتی چلی گئی۔

ڈرتے ڈرتے اس نے پہلا قدم گھر کے اندر رکھا تھا۔ وہ جو کبھی ہر کسی کو بڑے حق سے دروازے کے پاس ہی روک لیا کرتی تھی۔ آج خود وہی دہلیز پار کرتے ہوئے اس کے پیر کانپ رہے تھے۔

گیٹ سے لے کر برآمدے تک سارا صحن خشک پتوں سے بھرا پڑا تھا۔ کبھی اس فرش کو ستار گڑ رگڑ کے دھویا کرتی تھی وہ۔ ایک پتا تک نہیں چھوڑتی تھی۔ کہ اس کا گھر کالونی کا سب سے صاف ستھرا گھر ہو۔ مگر آج اپنے پیارے گھر کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔

"کون ہے؟" راحت کی آواز پر بری طرح چونکی تھی وہ۔ انہوں نے شاید گیٹ کھلنے کی آواز سن لی تھی۔ اور زرد پتوں پہ اس کے پیروں کی سرسراہٹ بھی۔ وہ جواب نہ دے سکی۔ اپنی سگی ماں سے اسے حیا محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے برآمدے کی طرف چلتی رہی۔ تب ہی اسے امی دکھائی دیں۔ وہ بھی اسی طرف آرہی تھیں۔ پہلی نظر میں ہی وہ صفا کو بے حد کمزور لگیں۔

"صفا۔" لب وا ہوئے تھے۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ خود کو روک نہ سکی۔ بھاگ کر ماں سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اس کے گرد ہاتھ پھیلانے سے گریز کیا تھا۔

"میں جا رہی ہوں امی۔" ان کے انداز میں کوئی گرم جوشی محسوس نہ کر کے وہ خود ہی ان سے الگ ہوئی۔

"تم تو کب کی ہمیشہ کے لیے جا چکی ہو صفا۔ بس افسوس یہ ہے کہ تم نے میری عزت کو سیڑھی بنا لیا۔" وہ چارپائی پہ بیٹھ گئیں۔

"میں نے کچھ نہیں کیا امی! خدا کے لیے میرا یقین کریں۔" وہ ماں کے قدموں میں ڈھے سی گئی۔

"تم اعتراف کر چکی ہو۔ مت بھولو۔" ان کی نظریں صفا پر نہ تھیں۔

"وہ میری مجبوری بن گئی تھی امی! آپ ایک دفعہ میرا اعتبار کرتیں۔ میں تو اپنا آپ بھی وار دیتی۔ مگر

آپ نے جب مجھ پر یقین نہ کیا تو میں کیا کرتی' بتائیں مجھے۔" وہ رونے لگی تھی۔

"تم نے تو خود میرے یقین کو ہی غرق کر دیا صفا۔ میرے گمان پہ یقین کی مہر ثبت کر دی اپنے گناہ کا اعتراف کر کے۔" ان کا لہجہ سرد تھا۔ کیا وہ اب اس کے لیے کوئی جذبہ' کوئی لگاؤ محسوس نہیں کرتی تھیں۔ اس کا دل کٹنے لگا۔

"ہاں امی۔ میں نے ایسا کیا۔ صرف اور صرف آپ کے فیصلے کی وجہ سے مجھے یہ فیصلہ لینا پڑا۔ کیونکہ آپ نے میرا یقین نہ کیا بلکہ اس ساحر۔"

"صفا۔" انہوں نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "میں نے تمہیں معاف کیا' مگر خدارا اپنی جھوٹی کسی اور پہ گناہ تھوپ کر بھاری نہ کرو۔ میں پھر بھی تمہاری ماں ہوں۔ معاف کر دوں گی۔ مگر کسی معصوم پہ بہتان تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔"

اس نے دل سے دعا کی تھی۔ کاش کہ اس وقت زمین پھٹتی اور وہ اس میں سما جاتی۔ اس کی ماں کو اس کے دامن پہ لگے داغ کا احساس تک نہ تھا۔ اور وہ اسے اصل شیطان کا دامن میلا کرنے کے انجام سے ڈرا رہی تھیں۔

"رشتے آزمائش ہیں' ہمارے اصل سے تو ہمارا اللہ ہی واقف ہے۔" اسے آج یقین ہوا تھا۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے صفا۔ میں چاہ کر بھی تمہیں بددعا نہیں دے سکتی' لیکن ساری عمر جب جب تم یاد آؤ گی' مجھے افسوس ہوتا رہے گا کہ تم نے ایک بار بھی میرے بارے میں' میری بیوگی کے بارے میں نہ سوچا۔ میں نے اسی لیے تمہارے لیے ساحر کو چنا تھا تاکہ تم دونوں ہمیشہ میرے پاس رہو۔ میرا تمہارے علاوہ اور کون تھا صفا' لیکن تم نے مجھے بالکل تہی دامن کر دیا' چلی جاؤ صفا۔ خدا کے لیے چلی جاؤ۔ یہاں سے دور۔ اتنی دور کہ جس ہوا میں سانس لو وہ بھی مجھ تک نہ پہنچ سکے۔" وہ ضبط کرتے ہوئے لہجہ سخت تر بنا کر بولیں۔

صفا نے مزید کچھ نہ کہا تھا۔ وہ اپنی عزیز ترین ہستی کو یوں بکھرتا نہ دیکھ سکتی تھی' ہاتھ کی پشت سے سختی سے آنکھیں رگڑتی وہ پلٹ گئی تھی' زرد پتے اس کے پیروں سے لپٹے چلاتے رہ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

دو دن سے صفا کی طبیعت سخت خراب تھی۔ اسید کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا۔ تب ہی سحر اسے سنبھالتے سنبھالتے خود نڈھال ہونے لگی تھیں۔ انہوں نے اسید کو فون کر کے فوراً" واپس آنے کے لیے کہا تھا اور ان کی ہدایت پہ وہ فوراً" ہی سارے کام چھوڑ کر واپس ہوا تھا۔

وہ گھر آیا تو شام ڈھل رہی تھی۔ صفا گہری نیند میں تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر ماں کے پاس چلا آیا تھا۔ سحر اس کے لیے چائے بنا کر لے آئیں۔

"صفا سے مل لیے؟" انہوں نے چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے استفسار کیا۔

"جی امی! وہ سو رہی ہے۔ سو میں یہیں چلا آیا۔" اس نے کپ میز پر رکھ دیا۔

"وہ بہت کمزور ہو رہی ہے اسید۔" انہیں فکر تھی۔

"میں اپنے فرائض اچھی طرح نبھا رہا ہوں امی۔"

"فرائض کسے کہتے ہو بیٹا۔"

"میں اس کا اچھی طرح خیال رکھتا ہوں۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا ہوں۔ اس طرح کہ اسے بھی کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ رہے۔" وہ چائے پینے لگا۔

"یہ سب تو ہر شوہر کرتا ہے۔" انہوں نے اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔

"تو وہ بھی تو میری بیوی ہے۔ اس لیے میں بھی کرتا ہوں۔"

"لیکن ہر اچھا شوہر ایسا نہیں کرتا اسید۔" ان کا لہجہ سادہ تھا۔ اسید نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔

"اچھا شوہر اسے صرف بیوی نہیں سمجھتا' حقوق و فرائض کو نہیں تولتا رہتا۔ وہ خیال اور توجہ کی قیود سے

آزاد ہوتا ہے بیٹا۔ وہ بیوی کو شریک حیات سمجھتا ہے۔ اپنے ہر لمحے میں اس کی شمولیت لازمی بناتا ہے۔" وہ بولتی گئیں۔ اسید نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سر ہلایا۔

"مجھے آفس کے کام ہوتے ہیں امی! ورنہ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ اسے شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔" اسے اب اندر ہی اندر صفا پہ غصہ آنے لگا تھا۔ ضرور اس نے ہی شکایت کی تھی امی سے۔

"وہ کبھی شکایت نہیں کرتی اسید! وہ ہر حال میں خوش رہتی ہے کیونکہ..." وہ کہتے کہتے رکیں۔

"کیونکہ..." بڑی بڑی آنکھوں والے اس شہزادے نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔" وہ کہہ گئیں' رکیں نہیں۔

"محبت کرتے ہیں ہم ایک دوسرے سے۔" کوئی بتا کر خوف سے بولا تھا۔ وہ بھی پورے مجمع کے سامنے۔

"محبت کرنے والے ایسا نہیں کرتے امی! اس نے مجھے بے مول کر کے رکھ دیا۔"

"لیکن وہ تو..." وہ کچھ کہنے لگیں۔

"پلیز امی! آپ نے میری ماں ہونے کے باوجود ہمیشہ اس لڑکی کی سائیڈ لی اور اسے پوری عزت دی۔ میں نے آپ کا پھر بھی ساتھ دیا امی! صرف اس لیے کہ میں رشتہ بنانا اہم نہیں سمجھتا۔ رشتہ نبھانا اہم سمجھتا ہوں۔ حالات خواہ کیسے بھی ہوں' وجہ کچھ بھی ہو۔ میری اس سے شادی ہوئی ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔ اسی لیے تمام تر ناراضی کے باوجود میں نے اسے عزت دی ہے' لیکن محبت..." وہ چپ ہو گیا تھا۔

"میں پھر بھی تم سے یہ ہی کہوں گی اسید! کہ ایسا کرنا مجبوری تھا۔ تب ہی میں نے بھی صفا کا ساتھ دیا اور یقین کرو اس سب کا مشورہ بھی..."

"امی پلیز... میں اب سوؤں گا۔" وہ اسے سچ بتانا چاہتی تھیں اور وہ ہمیشہ ایسے ہی ٹال جاتا تھا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"اسید۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور جو لوگ محبت کی قدر نہیں کرتے' انہیں سب سے سمجھوتا ملتا ہے' پیار کبھی نہیں۔"

وہ کہہ کر کپ اٹھانے لگیں۔ اسید ان کے لفظوں پہ غور کرتا اوپر کمرے میں آ گیا۔ بیڈ کے قریب آ کر وہ رک گیا۔ صفا ابھی تک سو رہی تھی۔ اچھی طرح سے کمبل لینے کے باوجود وہ ہلکے ہلکے کانپ رہی تھی۔ اس نے پہلی بار اسے توجہ سے دیکھا تھا۔ وہ واقعی کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے میں گھلتی گلابیاں' زردی میں تبدیل ہونے لگی تھیں اور گلابی پنکھڑی کے جیسے لب نہ جانے کیوں سیاہی مائل لگے۔ وہ خود کو روک نہ سکا۔ صفا کی قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔ صفا کے پیٹ پہ رکھا کمزور سا ہاتھ اس نے اپنے مضبوط ہاتھ میں تھاما۔ تو چونک پڑا۔ وہ بخار سے تپ رہی تھی۔

"صفا..." بے اختیار ہی وہ پکار اٹھا تھا۔ نیم بے ہوش صفا نے فوراً" آنکھیں کھول دی تھیں۔ اسے خود کے اس قدر قریب دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اسید نے کندھے سے تھام کر اس کی کوشش ناکام بنا دی۔

"آپ کب آئے؟" وہ بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے بولی۔

"یہ چھوڑو' یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ کیوں؟" وہ اس کے گال چھوتے ہوئے بولا۔ وہ حیا سے پلکیں جھکا گئی۔

"میں تو اکثر ایسے چھوٹی موٹی بیمار ہوتی رہتی ہوں۔ اس میں اعلان کروانے والی کیا بات تھی اور پھر آپ دوسرے شہر میں تھے' آپ کو پریشان کرنا بھی مناسب نہ لگا۔"

"اچھا... تمہیں پھر پوچھتا ہوں۔ پہلے بخار اتر جائے' تاکہ تم ڈاکٹر کے پاس چل سکو۔" وہ اسے انگلی سے متنبہ کرتا اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ کہتے ہوئے آنکھیں موند گئی۔ اسید دھیرے سے اٹھا اور وارڈ روب کی دراز سے کپڑے کی سفید پٹیاں نکال کر انہیں گیلا کرنے چلا

گیا' وہ واپس آیا تو صفا پھر سے سو رہی تھی۔
گیلے کپڑے کے نرم ٹھنڈے احساس نے اسے آنکھیں کھولنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا بخار کافی کم ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ اسے کیا کھانا ہے' کیا اسے پسند نہیں ہے۔ کس طرح کی پونی میں کس طرح کے ڈریس پہنتا ہے اسے۔ کمرے کی سیٹنگ میں اسے کس چیز سے چڑ ہے' کیا چیز اسے اچھی لگتی ہے۔ وہ ان سب کا خیال رکھتی۔ اس نے کبھی کسی چیز کی حسرت نہ دیکھی تھی اس لڑکی میں۔ نہ ہی اس نے کبھی اسے خوشی کے لیے ترستا دیکھا تھا۔ وہ بس دوسروں کی خوشی کا خیال رکھتی۔ دوسروں کے آرام کی فکر رہتی تھی اسے۔ دوسروں کے لیے جینے والی اس لڑکی نے پھر اس کا استعمال کیوں کیا؟ وہ چاہتا تھا کہ وہ اس سے پوچھے اور کاش وہ کہہ دے کہ وہ بس اتنا کہہ دے کہ کیونکہ میں تم سے محبت کرتی تھی اور حالات مجھے ہمیشہ کے لیے تم سے جدا کر دیتے۔ اس نے ہزار خواہش کے باوجود مگر یہ نہیں پوچھا تھا۔ اس حساس لڑکی سے وہ پوچھ ہی نہ پایا تھا۔ گھر والوں کے علاوہ اس نے اسے صرف اللہ سے لو لگاتے دیکھا تھا۔ اسے عام لڑکیوں کی طرح بننے' سنورنے' میوزک' ٹی وی سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ابھی بھی وہ کمرے میں آیا تو وہ سفید دوپٹا اپنے گرد لپیٹے جاء نماز پہ بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ دعا کے لیے پھیلے تھے اور بند پلکوں کے پیچھے سے آنسو مسلسل اس کے گال بھگو رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کے قریب آ کر کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

"کس کے لیے دعا مانگ رہی ہو؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔ صفا نے اس کی آواز پہ آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ مطمئن سے انداز میں دعا مانگتی رہی۔ ہاتھوں کا سہارا لے کر وہیں دراز ہو گیا۔ رخ البتہ اب بھی صفا کی طرف تھا۔ اس نے دعا مکمل کی۔ اور اسید کی طرف دیکھنے لگی۔

"بہت سے پیاروں کے لیے۔" مطلب اس نے سوال سنا تھا۔

"مثلاً؟" ایک اور سوال

"مثلاً" امی۔ اور امی لوگ۔" وہ چپ ہو گئی۔

"اور؟"

"آج کیا اللہ نے آپ کو سوال و جواب کا فریضہ سونپا ہے۔" اس نے بات ٹالنا چاہی تھی۔

"میرے سوال کا جواب دو پلیز۔" وہ نہ ٹلا۔

"اور ظاہر ہے۔ میری زندگی میں ہے ہی کون؟" اس نے بھی واضح جواب نہ دیا۔

"مطلب میں نہیں ہوں تمہاری دعاؤں میں۔" وہ خفا ہوا۔

"میں نے ایسا کب کہا؟" وہ حیران ہوئی۔

"خیر۔ مجھے اب تمہاری دعاؤں سے لینا بھی کیا ہے؟" وہ اٹھ بیٹھا۔

صفا کی نظریں جھک گئیں۔ وہ پھر اس موضوع پر آنے لگا تھا۔ جو اسے ہمیشہ ضمیر کی عدالت میں لا کھڑا کرتا۔ اور اسے خود سے نظریں ملانے کے قابل نہ چھوڑتا۔ وہ خود بھی جانتی تھی کہ اس نے چاہے کچھ بھی ہو غلط کام کیا تھا۔

"پتا ہے تم نے مجھے دو طرح سے نقصان دے دیا صفا۔" اس کا لہجہ اداس ہونے لگا۔ اور صفا کا دل۔

"تم نے نہ صرف مجھے بدکردار ثابت کر دیا۔ بلکہ اس لڑکی سے بھی مجھے دور کر دیا' جسے میں اس دنیا میں سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ جسے میں نے صرف ایک بار ہی نظر اٹھا کر دیکھا تھا' مگر وہ میری پلکوں تلے بسنے لگی تھی۔" صفا کے دل کو کچھ ہوا۔ شہزادہ پری کے دل کی حالت جانے بغیر کوہ قاف کے قصے سنا رہا تھا۔

"اس کی پریوں جیسی صورت سے زیادہ مجھے اس کے کردار' اس کے اخلاق نے اس کا گرویدہ بنایا۔ مگر تم نے مجھ سے چھین لیا اسے صفا۔" دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنائے وہ اس پہ چہرہ رکھتے ہوئے بولا۔

"میں اس بات سے خود بھی انکار نہیں کر سکتی۔

لیکن اللہ گواہ ہے میں نے آپ کو بدکردار نہیں کہا۔ صرف ذرا سا بے ایمان کہا۔ دھوکے باز کہا، جس کی مجھے آج بھی شرمندگی ہے۔ میں نے وہاں یہ واضح کردیا تھا کہ ہم ایک دوسرے سے" وہ جھجک کر رک گئی۔

اسید کے لبوں پر شریر سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

"ہاں۔ یاد آیا۔ تم نے تو میری محبت کا بھی اعتراف کیا تھا ناں۔" وہ سر جھکا گئی۔

"ویسے ایک بات بتاؤ۔ اگر میں تم سے اور تم مجھ سے سچ میں محبت کرتیں۔ اور میں تمہیں واقعی اپنے گھر بلاتا۔ تو تم مجھ سے ملنے آجاتیں۔" ایک اور سوال۔

"کبھی نہیں۔" اس بار فوراً" جواب آیا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

"لیکن مجھے یقین ہے، آپ کبھی مجھے بلاتے ہی نہیں۔" اس کے لہجے میں یقین تھا۔

"بہت جاننے لگی ہو مجھے۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

صفا کی نظریں زمین پہ ہی رہیں۔

"کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتی ہو صفا۔" صفا کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔ وہ کچھ نہ بول پائی تھی۔

☼ ☼ ☼
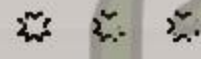
آج عرصے بعد ان کے گھر میں رونق لگی تھی۔ ثمن اور ساحر آئے ہوئے تھے۔ وہ بے حد خوش تھیں۔ ثمن عادت کی اچھی تھی۔ بولنا تو اس کا بہترین مشغلہ تھا اس کی مسلسل باتوں نے راحت کو کافی حد تک سکون دیا تھا۔

"ویسے چاچی! اگر اس رات وہ واقعہ نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا ناں آج صفا بھی ہمارے ساتھ ہوتی۔" اچانک ہی اسے نہ جانے کیا خیال آیا۔ تیزی سے ان کے لیے کھانا بناتی راحت کے ہاتھ ایک دم سست پڑے تھے۔

"واقعی سچ کہہ رہی ہے تو ثمن۔ بہت مزہ آتا۔ چاچی بھی کتنا خوش ہوتیں۔" ساحر نے موبائل پر کھیلتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ویسے بھائی! ایک بات پر آج تک حیرانی ہوتی ہے۔ سوچ سوچ کے میرا دماغ شل ہونے لگتا ہے۔" ثمن بولتی گئی۔ راحت نے بے دلی سے آنچ ہلکی کی۔

"وہ کیا!" ساحر کی توجہ موبائل کی طرف تھی۔

"کہ اس رات جب شور شرابا سن کر میں اوپر آئی تو صفا کے کمرے کا دروازہ تو اندر سے بند تھا۔ پھر آپ اوپر کیسے پہنچے تھے۔" راحت کا شل ہوتا دماغ کرنٹ کھا کے جاگا۔

"وہ تو میں شور محسوس کرکے صحن کی دیوار سے اوپر گیا تھا۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"لیکن دیوار سے اوپر جانے کا بالکل کوئی راستہ نہیں بھائی۔ کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے۔ میں پتا لگا کر ہی رہوں گی۔" وہ کسی سی آئی ڈی آفیسر کی طرح بغور اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"دماغ خراب ہوگیا ہے تیرا۔ آئندہ گھر پہ ہی رہا کر۔ اور فضول نہ بولا کر ہر وقت۔ جا چاچی کے ساتھ کام کرا۔" ساحر نے اسے بری طرح جھاڑ کر رکھ دیا۔ راحت البتہ الجھ کے رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"بولو صفا! میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔؟" اس نے دھیرے سے زمین پہ رکھا صفا کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔ صفا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"ہاں اسید! یہ سچ ہے کہ میں آپ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور پہلے دن سے ہی کرتی تھی۔ مگر اس طرح جرگہ میں یہ سب کہنے کا مقصد آپ کو پانا ہرگز نہ تھا۔ میں نے صرف خود کو اس آدمی سے بچانے کے لیے آپ کا نام استعمال کیا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں۔ امی مکمل طور پر ساحر کی باتوں میں آچکی تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں آپ پر الزام لگا کر خود کو بے گناہ اور مظلوم ثابت کرکے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرلوں۔ تب ساحر مجھے پوری عزت سے اپنا لے گا۔ میں مر سکتی تھی مگر کبھی بھی ساحر

کو اپنے شوہر کی حیثیت سے قبول نہ کر سکتی تھی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ اور سحر آنٹی پر بھی کبھی الزام نہ لگا سکتی تھی' بنجر جرام موت مرنے سے مجھے یہ راستہ آسان لگا تھا۔ تب ہی میں نے آپ پر وہ رونے لگی۔ روح پہ دھرا بوجھ ہلکا ہونے لگا۔ کبھی کبھی اعتراف کس قدر ہلکا پھلکا کر دیتا ہے۔

"اور یہ سب کرنے کے لیے تمہیں امی نے کہا؟" اس نے صفا کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے حیران ہو کر اسید کی طرف دیکھا۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"اس دن کچن میں تم اور امی جو ایک دوسرے کے ساتھ دلوں کا حال شیئر کر رہی تھیں۔ میں نے سن لیا تھا۔ لیکن بات واضح نہ تھی۔ تب ہی میں الجھ گیا تھا۔ آج تم نے بتایا تو سب کلیئر ہو گیا۔" صفا نے اس کے لہجے سے کچھ محسوس کرنا چاہا۔ مگر ناکام رہی۔

"میں ہمیشہ سے اپنے کیے پر شرمندہ تھی۔ اور آج' آج جب یہ پتا چلا کہ آپ کسی اور کو پسند کرتے ہیں۔ تو میری یہ کسک مزید بڑھ گئی ہے۔" وہ مسکرایا تھا۔

"آپ پلیز ان سے شادی کریں۔ ورنہ یہ بوجھ ہمیشہ مجھے پریشان کیے رکھے گا۔" اس کی بات پہ اسید کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"یہ بات پہلے کر دی تھی نا۔ اب تو تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو۔ اب اگر میں نے ایسا کیا نا تو امی میری جان لے لیں گی۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا' صفا کے چہرے پر حیا کی نئی رقص کرنے لگی۔

"ہاں۔ مگر یہ وعدہ رہا کہ تمہیں اس لڑکی سے ملواؤں گا ضرور۔" دھیرے سے اس کا گال چھوا۔ وہ وہاں اٹھ کر جانے لگا۔

"آپ نے مجھے معاف کر دیا۔" صفا کی آواز پر اس کے قدم رک گئے۔

"شاید۔" وہ ذرا سا پلٹا اور واپس مڑ گیا۔ صفا کا دل خوشی کے ساتھ بجھنے بھی لگا۔ ہوتا ہے نا جب کسی کو آپ خود سے بڑھ کر چاہیں اور وہ کسی اور کا طلب گار نکلے تو کوئی خوشی بھی سچی نہیں لگتی' ہر رنگ پھیکا ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

رات کے دس بج رہے تھے۔ مگر سر شام سو جانے والی راحت بی بی کی آنکھوں سے نیند جیسے روٹھ گئی تھی۔ انہوں نے سائیڈ ٹیبل پہ نگاہ کی صفا کی مسکراتی تصویر جیسے ان کے چار سو زندگی بکھیر رہی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھیں اور صفا کی تصویر اٹھا کر اس پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"نہیں میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی تو نہیں کر دی صفا۔" اس کا نکھرا نکھرا معصوم سا روپ اس کی بے گناہی کا گواہ تھا۔ مگر وہ۔ انہوں نے اتنے ماہ میں پہلی بار وہ تصویر دل سے لگائی اور رو دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

نہ جانے کون سا پہر تھا کہ گھبراہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا دل جیسے بند ہونے لگا تھا۔ اس نے گھبرا کر قریب سوئے اسید پہ نظر ڈالی۔ اس کا گریبان ابھی تک صفا کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ دنوں سے یہ معمول تھا۔ نیند میں وہ خوف کا شکار ہو کر اس کا گریبان پکڑ لیتی تھی۔ اسے بھی شاید اس چیز کی عادت ہو گئی تھی۔ تب ہی سکون سے سویا ہوا تھا۔ صفا نے دھیرے سے اس کا گریبان چھوڑا اور سائیڈ ٹیبل پہ دھرا موبائل اٹھا لیا۔ اس نے ایسے ہی موبائل آن کیا اور کنٹیکٹس میں جا کر ایک نمبر پہ کلک کر دیا۔ وہ چپ چاپ اس نمبر کو دیکھے گئی۔

"کبھی تو۔ کبھی تو اس نمبر کو چلتے دیکھوں میں یا پھر آپ نے میرا نمبر ہی مٹا دیا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اسکرین اتنی دھندلی پڑی کہ نمبر' آپشنز سب غائب ہو گئے۔ تب ہی اس کے ہاتھ میں تھا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ اس وقت کون کال کر رہا تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں صاف کر کے اسکرین دیکھنے کی کوشش کی تھی اور اسے یقین ہوا تھا' کہ موت کے بعد زندگی ملے گی تو ایسا ہی محسوس ہو گا

جیسا اس نے اس وقت کیا تھا۔

٭ ٭ ٭

روتے روتے انہیں شدید پیاس لگی تھی۔ انہوں نے صفا کی تصویر واپس سائیڈ ٹیبل پہ دھری اور پانی پینے کچن کی طرف چل دیں کہ لاؤنج سے آتی ساحر کی تیز آواز نے انہیں چونکا دیا۔ ثمن دیر تک ٹی وی دیکھنے کی عادی تھی۔ یہ تو معلوم تھا انہیں مگر ساحر کے الفاظ اسے ٹی وی کے لیے نہیں بلکہ واضح طور پہ صفا کا نام لے کر کہے گئے تھے تب ہی وہ چونکیں۔

"خبردار جو تم نے کبھی آئندہ چاچی کے سامنے اس رات والے واقعے یا صفا کا ذکر بھی کیا ہو۔" اس نے حتی الوسع اپنی آواز کو دبانے کی کوشش کی تھی۔

"بھائی۔ اس کا مطلب ضرور کوئی چکر ہے۔ اب تو میں پتا لگا کر ہی رہوں گی۔" ثمن بھلا کہاں ڈرنے والی تھی اسی کی بہن تھی وہ۔

"کیا پتا لگا کر رہو گی۔؟ ہاں۔" وہ بھڑکا۔

"یہ ہی کہ اس واقعے سے کچھ نہ کچھ تعلق تو آپ کا بھی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں ہے پھر۔ اس رات صفا مجھ سے ہی ڈر کر اسید کی چھت پر بھاگ گئی تھی تو۔" غصے سے وہ بولتا ہی چلا گیا۔

"بھائی۔ آپ۔ مطلب صفا۔" وہ حیرت سے بول ہی نہ پائی۔

"ہاں۔ ہاں۔ میں۔ کیونکہ وہ ہمیشہ مجھے کسی حقیر کیڑے کی طرح ٹریٹ کرتی تھی تب میں نے سوچا کہ جس کردار، جس عزت پہ اسے اس قدر مان ہے اسے ہی ملیا میٹ کروں اور وہ میرے در کی غلام رہنے کے بھی قابل نہ رہے۔" اس کے لہجے میں نفرت تھی۔

راحت نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا۔

"یہ تو اس کا وہ اسید۔" اس نے ایک موٹی گالی دی۔ "اس کی مداخلت سارا کام بگاڑ گئی اور پھنسی ہوئی تھی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔"

"آپ نے بہت برا کیا بھائی۔" ثمن کا لہجہ بھیگ گیا۔ "کتنی اچھی تھی صفا اور میں۔ میں بھی بڑھ چڑھ کر تو کرتوتوں کو بتاتی رہی۔" وہ رونے لگی تھی اور راحت وہ تو رو بھی نہ سکیں کہ انہوں نے تو ماں ہو کر۔ بیٹی کے دامن پہ لگے دھبے پہ مہر شہادت ثبت کی تھی۔

وہ مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے میں آئیں۔ صفا کی تصویر اب مسکرا نہیں رہی تھی۔ بلکہ سارے گلے سارے شکوے جیسے اس تصویر پر تحریر ہونے لگے تھے۔ انہوں نے تیزی سے وہ تصویر اٹھائی اور نم ہوتے لب دھر دیے۔

"صفا۔" وہ کرلائیں۔ دل روح بکھری تو لہجہ آنسو سب بکھر گئے۔ تب ہی ان کی نگاہ ٹیبل پہ دھرے موبائل پہ پڑی تھی۔ انہوں نے جھٹ سے موبائل اٹھایا اور بے قراری سے صفا کا نمبر ملانے لگیں۔ اس بار ایک ماں ایک بکھری ہوئی ماں وہاں موجود تھی۔ تب ہی اس نے وقت دیکھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔

٭ ٭ ٭

یہ وہی نمبر تھا جسے کچھ دیر پہلے وہ حسرت سے دیکھتی رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو اسے یقین ہی نہ آیا۔ مگر پھر مسلسل وائبریٹ کرتے موبائل نے جیسے اس میں زندگی بھر دی تھی۔ اس نے اسید کا خیال کیے بغیر فوراً ہی کال پک کی تھی۔

"امی۔ امی۔" وہ تیز تیز لہجے میں انہیں پکارنے لگی۔ اس کی تیز آواز پہ اسید فوراً اٹھ بیٹھا تھا۔ یوں رات کے اس پہر اسے موبائل کان سے لگائے روتے دیکھ کر وہ بھی شاکڈ تھا۔

"صفا۔" ماں کی ٹوٹی بکھری آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"امی۔" کتنی پیاس تھی اس کے لہجے میں۔ اسید نے ایک ہاتھ اس کے شانوں کے گرد پھیلاتے ہوئے اسے سہارا دیا تھا۔

"صفا۔ میری بچی! مجھے معاف کرو۔" وہ جیسے بین کر رہی تھیں۔

"نہیں امی! پلیز۔ ایسا نہ کہیں امی۔ میں خود آپ سے کس قدر شرمندہ ہوں امی۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ امی پلیز' آپ نہ روئیں۔" وہ نڈھال ہونے لگی۔

"میں نے تمہارا یقین نہیں کیا صفا! اپنی بچی کا' اپنے جسم اور اپنی روح کا یقین نہیں کیا میں نے' یہ میں نے کیا کر دیا صفا۔" کتنا درد تھا' کتنا کرب تھا اس آواز میں۔

"امی! میں آجاؤں آپ کے پاس' آپ ٹھیک تو ہیں ناں۔" وہ بے طرح پریشان ہوئی۔

"ہاں... ہاں صفا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" انہوں نے فوراً" اپنا چہرہ صاف کیا۔ خود کو سنبھالا۔ "تم یہاں مت آنا بیٹا۔ میں خود کل آؤں گی تمہارے پاس۔ بس کچھ ضروری کام ہیں۔ کل شام تک انتظار کرو۔" تب ہی ان کو لگا جیسے باہر کوئی تھا۔

"میں کل ملتی ہوں' تم سو جاؤ' ابھی آرام کرو۔ اوکے۔" انہوں نے مدھم لہجے میں کہتے ہوئے کال بند کر دی تھی۔ صفا کے ہاتھوں سے فون گر گیا تھا۔ وہ خود کو اسید کی پناہوں میں دے کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

☆ ☆ ☆

"وکیل صاحب! راحت بی بی آئی ہیں۔" شاہدہ نے اپنے شوہر کو اطلاع دی۔ وہ راحت بی بی کے پرانے پڑوسی تھے۔

"راحت بی بی... وہ کیوں آئی ہیں؟" انہوں نے عینک کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ کندھے اچکا گئی۔

"اچھا... اندر لے آؤ۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میز پہ رکھتے ہوئے کہا۔ راحت بی بی اندر آئیں' تو انہوں نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ بہت عزت کماتی تھی انہوں نے اپنے اچھے تعلقات سے اس محلے میں' جو محلوں میں ضائع ہوئی تھی۔

"معاف کیجیے گا راحت بی بی! ہم آپ کے ہاں

افسوس کرنے نہ آسکے۔ بات ہی ایسی۔"

"پلیز وکیل صاحب! میں آپ سے بہت ضروری کام سے ملنے آئی ہوں۔" "جی۔ جی بولیں۔"

"اس دن میں نے آپ کو فون پر اپنی جائیداد سے متعلق کاغذ بنانے کا کہا تھا۔"

"جی۔ جی ساحر کے نام سے۔ وہ مکمل ہی ہیں۔ میں دینے آنے ہی والا تھا۔" انہوں نے فوراً" سائیڈ ٹیبل کی دراز سے کچھ کاغذات نکالے۔

"انہیں ضائع کردیں وکیل صاحب۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوئے۔

"مجھے اب صفا کے نام سے کاغذات بنوانے ہیں۔ میں سب کچھ صفا کے نام کرنا چاہتی ہوں۔"

"صفا۔" وہ مزید حیران ہوئے اور راحت بی بی نے سارا ماجرہ کھول کے رکھ دیا۔

"تو اس کا مطلب کہ اصل گناہ گار آپ کا سگا بھتیجا۔" وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

"جی وکیل صاحب!" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"تو اب کیا کریں گی آپ اس کا؟"

"اس کا اب اللہ ہی کچھ کرے گا۔ مجھے بس اپنی بیٹی سے مطلب ہے۔ اللہ سے بہتر انصاف کرنے والا اور کوئی نہیں۔ میں نے گھر کو تالا لگادیا ہے۔ اب میں صفا کے گھر جاؤں گی اور شاید وہیں رہوں اب۔" ان کے لہجے میں اطمینان تھا۔ وکیل صاحب کو نہ جانے کیوں کچھ انہونی ہونے کا احساس ہوا۔

☼ ☼ ☼

اس نے اسید سے' امی سے بات کرلی تھی۔ اب وہ امی کو ہمیشہ پاس رکھنے والی تھی۔ اسید اور امی بھی بے حد خوش تھے۔ اولاد سے ماں' باپ کی ناراضی ان کی جنت جیسی زندگی کو بھی جہنم بنائے رکھتی ہے' وہ خوشی جو آج تک صفا کے چہرے سے غائب تھی۔ وہ ایک ہی رات میں پلٹ چکی تھی۔ وہ خوش تھی' بے طرح خوش۔

☼ ☼ ☼

عبدالرحمان کی وفات کے بعد انہوں نے بہت محبت سے صفا کی پرورش کی تھی۔ انہوں نے بہت چاؤ سے اپنی بیٹی کا نام صفا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ اسے ہمیشہ اس کے اجلے اجلے روپ کی طرح ہی پاک صاف دیکھنا چاہتی تھیں اور یہ ان کی محنت کا ثمر تھا یا دعاؤں کا' وہ اپنے نام کی طرح ہی اجلی تھی۔ اسے عام لڑکیوں کی طرح زندگی سنوارنے کی نہیں' بلکہ اپنی آخرت سنوارنے کی فکر رہتی تھی۔ اس کی زندگی کا اگر کوئی محور تھا تو وہ اس کی ماں' راحت بی بی۔

رکشے کی تیز گڑگڑاہٹ ان کے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ کی آواز سے کہیں کم تھی۔ کتنی بڑی چوک ہوئی تھی ان سے۔ جب ان کے وہ رشتہ دار جو ان کے شوہر کے بعد ان سے منہ تک پھیر گئے تھے۔ ان کی بیٹی پہ کیچڑ اچھال رہے تھے' تو وہ بیٹی کی ڈھال نہ بنیں' اس پر اعتبار نہ کیا' اس کی روتی آنکھیں' کانپتے ہونٹ اور گڑگڑاتی منتیں کرتی سانسیں' وہ ان کو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ان کے چہرے پہ بہتے آنسوؤں میں تیزی آگئی۔ دل میں اٹھتے ننھے ننھے درد نے ایک تیز لہر کی صورت اختیار کی۔ وہ تکلیف سے لب بھینچتے ٹیک لگا گئیں۔

رکشے کی آواز پہ وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بھاگ کے آئی تھی۔

"خالہ! آگیا آپ کا گھر۔؟" رکشے والے نے پیچھے بیٹھی معمر خاتون کو آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ آیا۔

اسید بھی صفا کے پیچھے باہر آیا تھا۔

رکشے والے نے دوبارہ آواز دی۔ اسید بھی قریب آیا۔

"آنٹی! باہر آجائیں' دیکھیں تو صفا کتنی بے قراری سے آپ کا انتظار کررہی ہے۔" وہ رکشے پہ جھکا اور بے حس و حرکت وجود پہ اسے کچھ انہونی ہونے کا احساس ہوا۔

"آنٹی!" اس نے دھیرے سے راحت کا کندھا ہلایا تھا۔ ان کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔ اسید نے جلدی

سے ان کا ہاتھ تھام کر نبض چیک کی --- اس کے خدشے کی تصدیق ہوئی تھی۔ ایک ماں سے غلطی ہوئی تھی۔ اولاد غلطی کرے تو ماں، باپ سے معافی مانگنا آسان ہوتا ہے، مگر ماں، باپ۔ اس شرمندگی اور کرب کو لفظوں میں بیان کرنا۔ تب ہی شاید اللہ پاک نے انہیں آسانی دے دی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ چار مرلوں کا کچا پکا مکان ہے۔ میلے فرش اور جابجا پھیلی گندگی کی وجہ سے مکھیوں کی بھرمار ہے یہاں۔ کچی اینٹوں سے بنے چھوٹے سے برآمدے میں چارپائی پہ بیٹھی شمع، راحت بی بی کی بڑی جیٹھانی جنہوں نے یہ گھر مشترکہ ہونے کے باوجود بھی راحت کو ایک ٹکڑا تک نہ دیا تھا اور ان کا ساتھ دینے والے راحت کے جیٹھ جو کچھ دور کرسی پہ بیٹھے، مشکلیں آسان کرنے کے لیے تعویذوں والی کتاب غور سے پڑھتے کوئی تعویذ ڈھونڈ رہے ہیں۔ پاس ہی بیٹھی ڈائجسٹ پڑھتی ثمن جو شاید اس دنیا کی باسی ہی نہ تھی، یوں مگن تھی وہ اس کتاب میں۔

ماحول پہ عجیب سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ تب ہی وہاں کوئی عجیب سی آواز گونجی تھی۔ جیسے کوئی گونگا آدمی کسی کی توجہ پانے کے لیے زور سے چیخے۔

"جا دیکھ۔ پھر کیا عذاب اتر آیا ہے اس زندہ مردے پر۔" شمع نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"اس سے بڑا عذاب اور کیا آئے گا اس پر، ایک معصوم کے دامن پر کیچڑ اچھالی تھی۔ بھگت رہا ہے، ابھی تو تم ابا کی فکر کرو، یتیم کا مال کھایا ہے۔" وہ بے فکری سے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولی۔

"اللہ غارت کرے ایک تو اس منحوس ماری کی باتیں میرا رہا سہا چین بھی غارت کردیتی ہیں۔" انہوں نے پاس پڑا کھسہ اٹھا کر اسے دے مارا۔

"تو میں نے کتنی بار کہا کہ مجھے ان کے کام کے لیے نہ بولا کریں۔ مجھے ایسے آدمی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ جسے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خوف تک نہ ہو۔" اسے جیسے پروا تک نہ تھی۔ آواز دوبارہ چنگھاڑی تھی۔

ثمن کو کوستے وہ خود اٹھ کھڑی ہوئیں اور پانی کا گلاس بھر کر اندر چلی آئیں۔ وہ نیم تاریک کمرے کے ایک کونے میں بوسیدہ سی چارپائی پہ پڑا وجود کسی اور کا نہیں بلکہ ساحر خان کا تھا۔ اپنی خواہشات کی تقلید میں اللہ کا خوف بھلا کر دوسروں کی "اللہ کے بندوں کی عزت نیلام کرنے والا، زندگی اجیرن کرنے والا ساحر خان" اب اپنی معمولی سے معمولی ضرورت کے لیے بھی دوسرے بندوں کا محتاج تھا۔ یہ فیصلہ اللہ کا تھا اور اللہ سب سے بہترین منصف ہے۔ بے شک --- ساحر خان کو فالج کا شدید اٹیک ہوا تھا اور معذوری اس کا مقدر بنی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ پورے چھ سال بعد اس شہر کی ہواؤں میں سانس لے رہی تھی۔ اس دن رکشے میں امی کی اچانک موت نے اسے بری طرح توڑ ڈالا تھا۔ تب ہی سحر کے سمجھانے پہ ایک بزنس ٹور کے بہانے پر وہ صفا کو شہر سے باہر لے گیا تھا۔ بیٹے سعد کی پیدائش پہ اس نے ماں کو بھی وہاں بلالیا تھا۔ وہ برسوں بعد واپس لوٹے تھے۔ اور صفا پوری طرح پرانی یادوں کی زد میں آگئی تھی۔ صفا کے بے حد اصرار پہ وہ اسے آج ان کے پرانے محلے میں اس کی امی کے گھر لایا تھا۔

مین گیٹ پہ لگا تالا موسم کے تغیرات کی بدولت زنگ آلود ہوچکا تھا۔ تب ہی اسے توڑنا پڑا۔ اسید نے زور لگا کر مین گیٹ کی وہ چھوٹی سی کھڑکی کھولی۔ چیختی آواز کے ساتھ کھڑکی کھل گئی۔ صفا نے مضبوطی سے سعد کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسید کے پیچھے اندر داخل ہوئی۔

مین گیٹ سے لے کر برآمدے تک جاتی پکی روش، ایک طرف بنا کچا صحن، جہاں کبھی ہرا بھرا لان ہوا کرتا تھا۔ اور سامنے برآمدے میں ہر طرف سوکھے پتوں، مٹی اور گرد کا ڈیرہ تھا۔ صحن کی گھاس مکمل طور پہ غائب ہوچکی تھی۔ ننھے ننھے پودوں کا تو نام و نشان تک نہ تھا۔ صرف ایک دو پودے باقی بچے تھے جو سبز لباس

سے عاری تھے۔ دیوار کے ساتھ قطار میں لگے درخت بھی یہی منظر پیش کر رہے تھے۔

رات کافی تیز بارش ہوئی تھی۔ تب ہی جگہ جگہ پانی بھی ٹھہر گیا تھا۔ گھر کے مکین نہ رہیں تو مکان بھی کھنڈر بن جاتے ہیں۔ عجیب تاریکی سی تھی اس گھر کے ماحول میں۔ وہ سعد کو اسید کے ساتھ وہیں چھوڑ کر لان میں لگے درختوں کی طرف آگئی۔

"اندر چلوگی؟" اسید نے سعد کو اٹھالیا اور اس کے پیچھے چلا آیا۔

"نہیں۔۔۔ پہلے صفائی کا انتظام کروائیں گے' پھر اندر چلیں گے' سعد بھی ساتھ ہے نا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"امی! یہ نانو کا گھر ہے۔" پانچ سالہ اسید نے ماں سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا جی! آپ کی پیاری امی کا بچپن گزرا ہے اس گھر میں۔" جواب اسید نے دیا تھا۔

اسید' بیٹے کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا اور وہ درختوں کے پاس کھڑی ایک ایک سوکھی شاخ کو چھو کر۔ جیسے کسی کا لمس محسوس کر رہی تھی۔

"اسید۔۔۔ ادھر آئیں۔" اس نے اچانک ہی اسید کو آواز دی۔ وہ سعد کو نیچے اتارتا اس کے قریب آٹھہرا۔

"دیکھیں تو اسید! دیکھ بھال نہ ہونے کے باوجود سب پودے نئے سرے سے پھوٹنے لگے ہیں۔ ہر سوکھے تنے سے ننھی ننھی سبز شاخیں جیسے باہر آنے کو بے تاب ہیں۔" اس نے ایک درخت کی سوکھی سوکھی شاخوں سے نکلتی سبز نرم پتیوں کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔" اسید بالکل اس کے پاس آٹھہرا تھا۔

"کیونکہ جب بہار آتی ہے تو بنجر مٹی میں بھی جان آجاتی ہے۔ خودرو پودے بنا کسی آبیاری کے زمین کا سینہ چیر کر باہر آجاتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے صفا کا ہاتھ تھاما۔

"بہار تو نام ہی زندگی کا ہے صفا۔ جب بہار دستک دیتی ہے تو پودے تو کیا مرجھائے ہوئے دل بھی مسکرا اٹھتے ہیں۔" صفا نے اس کی سیاہ' چمک دار آنکھوں میں جھانکا' وہاں محبت ہی محبت تھی۔

"آپ نے مجھے معاف تو کردیا نا اسید۔" وہی لفظ دوبارہ لبوں پہ آگئے اور وہ جو یقین دلا دلا کے تھکنے لگا تھا' مسکرادیا۔

"میرے دل پہ بھی بہار دستک دے چکی ہے' سویٹ ہارٹ وائف' تو میں اپنے دل کا دروازہ بھلا کیوں بند کروں گا۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اسے خود سے لگالیا۔

صفا کھل کے مسکرادی تھی۔

☆

کمرے سے اب تک دبی دبی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ کمرے کے باہر ہاجرہ اب بھی اسی کرسی پہ بیٹھی خود کو اتنا ہی بے بس محسوس کر رہی تھی' جتنا کچھ دیر پہلے' فقط اب اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں تھے۔ چاہ کر بھی اپنے آپ میں آرزہ کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں لا پائی تھی۔ اس کی دل خراش چیخیں اب تک اس کے کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح گھول رہی تھیں۔ آرزہ کی سسکیاں اس کی بے بسی میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔ بوجھل قدموں سے آرزہ کے کمرے کی طرف بڑھتی اپنے ذہن میں ان لفظوں کا چناؤ کر رہی تھی' جن سے وہ آرزہ کو تسلی دے سکے۔ صبر' حوصلہ' ہمت' یہ سب لفظ کتنے بے معنی ہو گئے تھے۔

فرخ کہتا تھا' آپ کی باتوں میں بہت اثر ہے۔ اپنی ہر پریشانی میں اسے ہاجرہ کے مشورہ' اس کی تسلی کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس نے ہر موڑ پہ اپنے لفظوں سے فرخ کی رہنمائی کی تھی۔ ہر مشکل گھڑی میں سچائی اور ثابت قدمی کی تلقین کی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کی باتیں فرخ کی زندگی میں اصول کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ انہیں اپنی زندگی میں ترقی اور کامیابی کا رہبر مانتا ہے۔ مگر کیا آج اس کے لفظوں میں وہ تاثیر ہوگی جن سے آرزہ کے غم کا مداوا ہو سکے۔ ایسا کیا کہے وہ آرزہ سے جو اس کی زندگی میں آئی ان سیاہ لمحوں کی تاریکی کم کر دے۔

کانپتے ہاتھوں سے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ آرزہ کے کمرے میں آئی۔ بیڈ کی پائینتی سے ٹیک لگائے آرزہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اس کا لرزتا وجود اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ اب بھی بے آواز رو رہی ہے۔ قدموں کی آہٹ پہ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ مسلسل رونے سے اس کی خوب صورت آنکھیں سوج چکی تھیں۔

"امی۔!" ہاجرہ کو دیکھتے ہی اس کے تھمے ہوئے آنسو دوبارہ بہنے لگے تھے۔ ہاجرہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ خود بھی فرش پہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ اس کی ویران آنکھیں اور مرجھایا ہوا چہرہ اس کے غم کی داستان کہہ رہا تھا۔ بات بے بات مسکرانے والی معصوم سی آرزہ جو ہاجرہ کے گھر کی خوشی تھی آج درد کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔

صرف چھ ماہ ہی تو گزرے تھے اس کی شادی کو اور ان چھ ماہ میں وہ ہاجرہ کے لیے فرخ سے بڑھ کے ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے رشتے میں ساس بہو کا روایتی پن تو دور کی بات ماں بیٹی والی نوک جھونک بھی نہ تھی بلکہ وہ دونوں تو ایک دوسرے کی بہترین دوست تھیں۔ کتنا ڈرایا تھا' لوگوں نے اسے بیٹے کی من پسند لڑکی کو بہو بنانے سے۔ ہاجرہ کے دل میں اندیشے ہی اندیشے تھے۔ وہ جو بیوگی میں اکلوتے بیٹے کی بہترین تعلیم و تربیت کرنے' ایک قابل انسان بنانے کے بعد اسے کسی اور کے سپرد کرتے ہوئے ہر ماں کے دل میں ہوتے ہیں۔ مگر آرزہ نے بہت جلد ان تمام خدشات کی نفی کر دی تھی۔ ان دونوں کی خوشیوں کے لیے ہاجرہ اٹھتے بیٹھتے دعائیں کرتی تھی۔ پتا نہیں کیوں سب دعائیں بے اثر چلی گئیں۔

کچھ بھی تو مختلف نہیں تھا آج۔ جون کی گرمی' تپتی

دوپہر، ویران گلیاں اور گھر کے کام۔ فرخ تو صبح ہی اسلام آباد کے لیے نکل چکا تھا اور اس کی واپسی کل صبح ہونی تھی۔ ایسے میں آنزہ نے کھانا آج دوپہر میں ہی بنالیا تھا۔ ہاجرہ ظہر کی نماز سے فارغ ہوئی تو آنزہ نے کھانا میز پہ لگا دیا۔ دونوں ساس، بہو نے ڈھیر ساری مزے دار باتوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ آنزہ برتن سمیٹنے ہی لگی تھی کہ دروازے پہ گھنٹی بجی۔ کسی کی بے وقت آمد پہ تعجب کا اظہار کرتی ہاجرہ مین گیٹ کی طرف چل دی۔

آج گرمی بھی کل سے زیادہ تھی۔ گلی میں بندہ بشر تو دور کی بات، چرند پرند بھی کسی سایہ دار جگہ پہ چھپے بیٹھے تھے۔ دروازے پہ بوریوالے کی آمد کا سن کر ہاجرہ نے

اطمینان سے دروازہ کھولا کیونکہ فرخ کے کوریر اکثر گھر آتے رہتے تھے۔ کنڈی کھلتے ہی پچیس چھبیس سال کے دو لڑکے دروازے کو سختی سے دھکیلتے اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھی، جبکہ

دوسرے نے تیزی سے آگے بڑھ کر باجرہ کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور خوف سے نکلتی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔ پستول والا لڑکا پھرتی سے کنڈی چڑھا کر گھر کے اندر گھس گیا۔ ایک کے ہاتھ میں پستول اور دوسرے کی گرفت میں باجرہ۔۔۔

منظر دیکھ کر آئزہ کی تو جان ہی نکل گئی۔ چور اور سانپ کی دہشت ہی بہت ہوتی ہے۔ باجرہ نے ان کے کہنے پہ اپنا زیور اور نقدی ان کے حوالے کردی اور آئزہ کو بھی اس کا زیور لانے کی تلقین کی۔ باجرہ کا حکم ملتے ہی آئزہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ پستول والے لڑکے نے اب بھی باجرہ پہ پستول تانا ہوا تھا، جبکہ دوسرا لڑکا آئزہ کے ساتھ اس کے کمرے میں گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے آئزہ اپنی الماری کھول کے جلدی جلدی اپنا زیور نکال رہی تھی کہ اچانک دروازہ بند ہونے کی آواز پہ سہم کر اس نے پیچھے دیکھا۔ وہ لڑکا آنکھوں میں شیطانیت لیے آئزہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

تمام زیورات اس کے ہاتھ سے گر گئے اور اس نے چلانا شروع کیا۔ باجرہ نے باہر احتجاج کی کوشش کی تو پستول والے لڑکے نے تیزی سے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے کرسی کے ساتھ باندھ دیا۔ آئزہ کی بے بسی میں لپٹی چیخیں اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ اس درندے سے رحم کی درخواست کررہی تھی۔ باجرہ کی آنکھوں کے بہتے آنسو اس سے خاموش منت کررہے تھے۔ لیکن چہرے پہ شیطانی مسکراہٹ لیے وہ آئزہ کے تڑپنے سے لطف اٹھا رہا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے آئزہ کی چیخیں دم توڑتی گئیں۔ رونا، بلکنا، سسکیاں بنتا گیا۔ سنسان دوپہر میں کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا جو اس لمحے مدد کو آپہنچتا۔ اگلے چند منٹوں میں وہ دونوں شیطان سارا زیور اور روپیہ سمیٹ کر رفوچکر ہوگئے۔ جانے سے پہلے وہ باجرہ کی رسیاں کھول گئے تھے اور جاتے جاتے وہ اس گھر کی عزت کو دو کوڑی کا کرگئے تھے۔ آئزہ کو بے آبرو کرگئے تھے۔

نہ آسمان گرا تھا اور نہ زمین پھٹی تھی۔ ایک قیامت تھی جو آکر گزر گئی تھی۔ بہت دیر تک باجرہ

اسے سینے سے لگائے چپ چاپ کمرے کے فرش پہ بیٹھی رہی۔ دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ ایک طوفان تھا جو ان کی زندگیوں میں آکر گزر گیا تھا اور جاتے ہوئے نہ ختم ہونے والا سناٹا ان دونوں کے درمیان چھوڑ گیا تھا۔

"امی۔۔۔ فرخ!" بہت دیر کے بعد فقط یہ دو لفظ آئزہ کی زبان سے نکلے تھے اور باجرہ جانتی تھی ان دو لفظوں کو ادا کرنے کے لیے اس نے اپنے وجود کی ساری ہمت اکٹھی کی ہوگی۔

"آئزہ! میری بات غور سے سنو۔" آئزہ کی لرزتی آواز نے باجرہ کی بوڑھی روح میں اچانک توانائی بھردی تھی۔ یہ وقت خاموش رہنے کا نہیں تھا، فیصلے کا تھا۔

"اس بات کو آج ابھی اور اسی وقت اس کمرے میں دفن کردو۔" اپنے سینے سے جدا کرتے ہوئے اس نے آئزہ کے دونوں بازو جھنجوڑے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں امی؟" آئزہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے باجرہ کو دیکھ رہی تھی۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ آج جو کچھ بھی ہوا اس کی خبر کسی کو بھی ہونے نہ پائے۔ فرخ کو بھی نہیں۔" باجرہ نے اپنی آخری بات پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن اتنی بڑی بات میں فرخ سے کیسے چھپاؤں گی؟ آپ چاہتی ہیں میں فرخ سے جھوٹ بولوں؟" آئزہ نے ناقابل یقین حیرت سے پوچھا۔

"ایسا سچ جس سے سب کی زندگی خراب ہوجائے۔ اس سے تو جھوٹ ہی بہتر ہے۔ کیا بھلا کرپائے گا تمہارا سچ؟ کیا تمہیں یقین ہے، ساری بات جاننے کے بعد فرخ تم سے پہلے جیسا تعلق قائم رکھ پائے گا؟ اور یہ

دنیا۔ یہ دنیا تمہیں چین سے جینے دے گی؟" ہاجرہ نے بے بسی سے کہا۔

"لیکن امی! فرخ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جب آپ ان کی ماں ہو کر میرے ساتھ ہیں تو..." ہاجرہ نے آرزو کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔

"میں فرخ کی ماں ضرور ہوں آرزو! لیکن ایک عورت بھی ہوں۔ میں نہ صرف تمہارے اس درد سے واقف ہوں، بلکہ ان مصائب کو بھی سمجھ سکتی ہوں جو آنے والے دنوں میں تمہیں ملنے والے ہیں۔ مجبور اور بے بس عورت کے ساتھ ہمارا معاشرہ کیا سلوک کرتا ہے، میں اس کی زندہ مثال ہوں۔ میں ہونی کو نہیں روک سکی۔ لیکن آگے کچھ برا ہوا تو میں خود کو معاف نہیں کر پاؤں گی۔" ہاجرہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"اور جہاں تک فرخ کی محبت کی بات ہے تو یہ مت بھولو، مرد محبت آسانی سے کر لیتا ہے، مگر اسے نبھانے کی آزمائش نہیں سہہ پاتا۔ بہت کمزور ہوتے ہیں یہ مرد۔ جذبات میں آکر جنہیں سر پہ تاج کی طرح سجا لیتے ہیں، تب انہیں ٹھوکر پہ لے آئیں پتا ہی نہیں چلتا۔ ان میں معاف کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ آج اپنی محبت سے مجبور ہو کر وہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر بھی لے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ اپنے اس فیصلے پہ وہ قائم رہ پائے گا۔ اگر وہ بدل گیا تو پھر کیا تم اس کا بدنما سہہ پاؤ گی؟ مان جاؤ میری بچی۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ تم خود کو سنبھالو اور اس بات کو کسی سے مت کہنا۔" ہاجرہ کی باتوں نے آرزو پہ ایک نیا انکشاف کیا تھا۔

"کیسے سامنا کروں گی فرخ کا اس داغ دار دامن کے ساتھ؟" آرزو روہانسی ہو کر بولی۔

"تمہیں کرنا پڑے گا۔ اتنا حوصلہ لانا پڑے گا خود میں۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔ تمہارے پاس کل صبح تک کا وقت ہے۔ میری جان! خود کو اس اذیت سے نکالنے کے لیے۔ خود کو سنبھالو، کچھ دیر تک میں فرخ کو فون کرتی ہوں اور اسے گھر میں ہونے والی ڈکیتی کا بتاتی ہوں۔" آرزو کا ماتھا چومتے ہوئے ہاجرہ نے کہا۔

"امی! میں تھانے کا چکر لگا کے آتا ہوں۔ ڈکیتی کی رپورٹ درج کروا آؤں۔" فرخ صبح ہی پہنچ گیا تھا اور اب تھانے کے لیے نکل رہا تھا۔ آرزو کافی حد تک سنبھل چکی تھی، جو صرف ہاجرہ کی کوشش تھی اور اس کی خاموشی سے فرخ نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ ڈکیتی کے اس واقعے اور اپنے زیور کے چلے جانے سے خوف زدہ بھی ہے اور پریشان بھی۔

"ہاں بیٹا جاؤ لکھوا آؤ رپورٹ۔ آگے پولیس جانے اور اس کا کام ہمارا تو جو نقصان ہونا تھا ہو چکا۔" ہاجرہ نے فرخ کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ویسے امی! آپ لوگوں نے بڑی سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے کسی مزاحمت کے بغیر زیور اور نقدی پکڑا دی۔ ورنہ آج کل تو دو چار ہزار کے موبائل فون کے لیے بندہ قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتے ہیں یہ لوگ۔ پستول ہاتھ میں ہو تو گولی چلتے کیا دیر لگتی ہے اور پھر مال، جان سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔"

فرخ نے جاتے جاتے ہاجرہ سے کہا۔ اس کے انداز میں فکر مندی بھی تھی اور تسلی بھی۔

"ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا! عزت اور جان سلامت رہے مال کا کیا ہے، پھر بن جائے گا۔ جاؤ اللہ کے حوالے۔" یہ کہتے ہوئے ہاجرہ نے مین گیٹ بند کیا اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

ایمل رضا

السائی ہوئی دھوپ میں خوابیدہ انگڑائی کا خمار تھا۔ تاجدار سورج اپنی تمام تر تابانی سمیت نصف النہار کے زاویے سے آگے کی اور سرک چکا تھا۔ اور ہوا میں نووارد شام کی خنکی عود آئی تھی۔

خزاں آلود اشوک کے درخت اپنے باقی ماندہ اثاثے بھی ابھی ناراض ہوا کے سپرد کرنے لگے تھے۔

پگھلی ہوئی برف کی نمی کے باعث تارکول چڑھی سڑک کچھ مزید کالی دکھتی تھی۔

اس نم آلود کالی اور چمکتی سڑک پر تیزی سے آتی وائٹ لیموزین کے سیاہ ٹائر چرچرا کر رکے تھے اور پھر اتنی ہی تیزی اور کسی قدر عجلت سے گاڑی کی پچھلی طرف کا دروازہ باہر کو دھکیلا گیا تھا۔ درمیانی ہیل والے سنگ جراحت کے سے سفید جوتے جن میں نفرئی پن کی جھلک تھی نے سڑک سے برف اور برف سے اوک (OAK) بلڈنگ کے دروازے تک کی سیڑھیوں تک کا سفر بھی اسی عجلت میں طے کیا تھا۔

دروازے کے اندر داخل ہو کر وہ غائب ہو گئی تھی۔

لیکن اپنے روشن سراپے کی پرچھائی اس نے کہیں پیچھے ہی چھوڑ دی تھی۔ اس کے سفید قیمتی برائیڈل (عروسی) گاؤن کا دامن جو پیروں کو چھوتا تھا اس سے کچھ اور میلا پن جھلکتا تھا۔ دامن پر گرد اور نمی کے باعث بنی ہوئی بے ڈھنگی مصوری کے خشک و تر شاہکار ثبت تھے۔ اس جگہ آنے سے پہلے وہ مزید دو جگہوں پر جا چکی تھی۔

ایک سینٹرل پارک... جو اس کی محبت کا ماخذ تھا۔

اور ایک "قانی" ریسٹورنٹ۔

مکمل ناول

جہاں کے شیف کبابوں کو سینکنے کے لیے مہل کی سوکھی لکڑی کا استعمال کرتے تھے اور مہل کی لکڑی پر پکے ہوئے وہ کباب شہرام کی مرغوب ڈش تھے' وہ اکثر اوقات اسی ریسٹورنٹ یا اس کے اردگرد ہی کہیں پایا جاتا تھا۔

آج وہ اسے ان دونوں جگہوں پر کہیں نہیں ملا تھا۔ یہ تیسری جگہ تھی۔ ایک طرح سے آخری بھی... وہ جانتی تھی کہ پھر اس کے بعد کیا تھا... صرف دربدر کی خاک... لامتناہی تنہائی... اور خود ساختہ عذاب کی اذیت۔

شہرام کے کمرے کا دروازہ بند تھا' اسے اس کی توقع نہیں تھی اگرچہ اس کا دل پہلے ہی اس کی گواہی دے چکا تھا۔

وہ واپس لوٹی تھی۔

لینڈلیڈی کے دروازے تک پہنچ کر اس نے اطلاعی گھنٹی کو دبایا نہیں تھا' بلکہ دبائے ہی رکھا تھا' وہ اتنی عجلت اور اتنی بے قراری کی حالت میں تھی کہ اسے یقین تھا کہ اگر اب... ہاں اگر اب وہ کہیں بھی کسی غلطی یا کوتاہی کی مرتکب ہوئی تو وہ شہرام کو دوبارہ اپنی پوری زندگی میں کبھی نہ دیکھ سکے گی۔

وہ ٹھیک سوچ رہی تھی لیکن غلطی کرنے کا وقت آنے والا نہیں تھا۔ وہ وقت آکر جا چکا تھا... اور وہ شہرام سمیت بہت کچھ کھو دینے والی تھی۔

دروازہ کھلا اور لینڈلیڈی ایمنڈا گھنٹی کے اس غیر مہذبانہ استعمال پر اپنی ناگواری چھپا نہ سکیں۔

"فرمائیے!" بیانکا کو پہچاننے میں انہیں چند ہی لمحے لگے تھے۔ یہ چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ چند لمحے بھی اس لیے لگے کہ وہ آج حد سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔

بیانکا کو دیکھ کر اور وہ بھی اس حالت میں دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔

"شہرام... شہرام کہاں ہے؟"

وہ تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی تھی اور مایوس واپس آئی تھی۔ اس کے باعث اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ سوال اس نے بمشکل مکمل کیا۔

لیڈی ایمنڈا کا منہ اتر گیا۔ اس سوال کا جواب یقیناً" بیانکا کو مزید پریشان کر دینے والا تھا۔ وہ ایک ٹک اس کا سراپا دیکھے گئیں۔

وہ وائٹ برائیڈل گاؤن میں ملبوس... تازہ کھلے زخم کی مانند گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک اور مہنگے ہیروں سے دمکتے زیورات پہنے ہوئے تھی۔ وہ کہاں سے آرہی تھی... کیا چھوڑ کر آرہی تھی۔ ان سارے سوالوں کے جواب اس کے تن سے لپٹی ایک ایک چیز دے رہی تھی۔ برعکس ہر بات کے اس روپ میں وہ اتنی دلکش اور اتنی حسین لگ رہی تھی کہ اگر اس کے چہرے پر ہوائیاں نہ اڑ رہی ہوتیں تو لیڈی ایمنڈا اسے گلے سے لگا کر بے تحاشہ چوم ڈالتیں۔

"وہ چلا گیا..." انہوں نے سچ بتا دیا۔

"کہاں...؟" زمین اس کے پیروں کے نیچے اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی طرح کانپنے لگی۔

"واپس... اپنے ملک... البانیہ۔" ایمنڈا نے اداسی سے کہا۔

"کب...؟"

"کل صبح... اس نے سارا حساب چکتا کر دیا تھا اور وہ اپنا سارا سامان لے گیا ہے... میں نے خود اس کا ایئر ٹکٹ دیکھا ہے۔"

آخری بات کا اضافہ انہوں نے اس لیے کیا تھا کہ بیانکا یقین کر لے کہ وہ کل صبح چلا گیا ہے۔

وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ وہ واقعی چلا گیا تھا۔ گرنے سے بچنے کے لیے بیانکا نے سیڑھیوں کی ریلنگ کو تھاما تو ایمنڈا کو پتا چل گیا کہ ان کی بات کو سچ ہی مانا گیا ہے۔

دہلیز اور سڑک کے درمیان کی سات سیڑھیوں کو اس نے پشت کی طرف سے طے کیا تھا۔ جیسے واپسی کے سفر میں بھی آگے ہی جانے کی خواہش مند ہو۔ اور چکنی سیڑھیوں پر سے پھسلتے خود کو سنبھالنے کا اس نے

تردد ہی نہیں کیا تھا۔ اب اس سے زیادہ وہ اور کہاں گرے گی۔ خلا میں گرنے والے کے پاس ایک اطمینان تو ہوتا ہے اگرچہ لمحے بھر کے لیے ہی سہی کہ وہ اب اس کے بعد مزید نیچے کہاں جائے گا۔

شاید وہ اس بھاگ دوڑ سے تھک چکی تھی یا خود کو سنبھالتے سنبھالتے ہار گئی تھی۔ برف کی پتلی سی تہہ چڑھے آخری اسٹیپ پر ڈھے سے گئی۔ سارے مشکل امتحانوں کے بعد یہ آسان امتحان اس کی زندگی میں ابھی باقی تھا۔ جس میں وہ پہلے سے ہی فیل ہو چکی تھی۔

اس کا گاؤن مزید گیلا ہونے لگا اور ٹھنڈے ماربل نے برف کی یخ بستگی کو اس کے پورے وجود میں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں اتنا اندھیرا بھر گیا تھا جیسے مدتوں ان آنکھوں نے سورج نہ دیکھا ہو۔

"شہرام...!" اور یہ لفظ اس کے لبوں سے یوں ادا ہوا جیسے اس کی پور پور زخمی ہو۔

گھٹنوں میں منہ دے کر اس نے وہ آسن جما لیا جو کسی کو ابدی طور پر پالینے کے لیے رواں رکھا جاتا ہے۔

"شہرام... اب تم مجھے کیسے ملو گے شہرام...

اب میں تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈوں شہرام..." خلاؤں میں دیکھتے ہوئے اس نے زوال آلود سوچ سے کہا۔

اور موسم نے نہ بدلنے کی جیسے بے شمار قسمیں اٹھالیں۔

☼ ☼ ☼

رات دبیز تھی...

مور کے چندر کی طرح... اور چاروں اور پھیلی ہوئی تخم ریحاں کے پودے سے نکلنے والی کڑوی کسیلی خوشبو کی مانند۔

وہ نیویارک شہر کا ایک پر رونق، پرہجوم اور وسیع چوراہا تھا... ایک طرح سے انجان بھی، بے گانگی سے چلتے چلتے وہ رک گیا تھا۔

اور یہاں کے باسیوں کے خیال کے مطابق اس جگہ سے بے دھیان ہو کر کوئی بدقسمت ہی گزر سکتا تھا۔

وہ بدقسمت تھا۔ بلاشک وشبہ... اس نے دھیان دیا۔ ایسا بے ارادہ ہوا تھا۔ اس کی چندھی آنکھوں کو ایک نیون سائن کی چمک خیرہ کر رہی تھی۔ ایک بلیک سائن بورڈ جس پر سرخ لائٹس سے شائن کلب لکھا تھا۔ اور یہ سرخ لائٹ کسی نیزے کی طرح اس کی سوتی جاگتی آنکھوں میں گھسی چلی جاتی تھی۔ اس تحریر میں ایک پہچان کی چمک بھی تھی۔

ٹھیک چھ ماہ پہلے وہ اپنے یونیورسٹی فیلوز کے ساتھ یہاں سے گزرا تھا تو اس کے ایک دوست ڈیوڈ نے جو اپنے آبائی شہر کی ایک ایک سڑک ایک ایک عمارت کا تعارف ایک اعلانیہ فخر کے جذبات سے مغلوب ہو کر کرواتا تھا، نے اس کلب کے بارے میں بتاتے ہوئے اپنی گفتگو کو خصوصی لفظوں سے سجایا تھا۔

"اس کلب کے پاس بیانکا نامی ایک کمال کا اثاثہ ہے۔ تم اسے نیویارک کی الیکس چنگ (برطانیہ کی مشہور گرل DJ) کہہ سکتے ہو۔ میں ایک ماہ پہلے اس کلب میں گیا تھا اور ان دھنوں کی بازگشت جیسے ابھی بھی میرے کانوں میں قید ہے اور..."

ڈیوڈ شاید ابھی بیانکا کی تعریف میں مزید بولنے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن شہرام نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

"کیوں... DJ (Disco Jocky) کا کام ایسا کون سا مشکل ہوتا ہے۔ محض ریکارڈ شدہ گانوں اور دھنوں کو چلانا..."

"یہاں آنے سے پہلے میرا نظریہ بھی کچھ کچھ تم جیسا ہی تھا۔ بٹ مائی ڈیئر فرینڈ... دنیا میں بہت کم لوگ ہیں، جو میوزک کو جنون کی طرح خود پر طاری کر لیتے ہیں... اور ان سے بھی کم وہ ہیں جو اس جنون میں دوسروں کو بھی کھینچ لاتے ہیں... یہ لڑکی ان ہی میں سے ایک ہے۔ یہ صرف ریکارڈ شدہ میوزک نہیں چلاتی۔ اس کی انگلیوں میں Tishrei cloud (ابر نیساں) قید

ہے۔ وہ جس کے بارے میں داستان گو کہتے ہیں کہ جو جب برستی ہے تو سارے غم بھلا دیتی ہے۔"

شہرام کے علاوہ باقی سب دوست ڈیوڈ کی اس تقریر سے متاثر ہونے لگے تھے۔ شہرام بھی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا' لیکن وہ صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ کلب بند تھا اور کون جانتا تھا کہ شام تک ان کی توجیہات بدل جائیں گی۔

لیکن آج ایسا کچھ بھی نہیں ہونے والا تھا۔ اس کی ساری توجیہات کو زنگ لگ چکا تھا۔

شہرام چند لمحے اس بورڈ کو پڑھتا رہا۔ پھر اس نے خود کو کلب کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے پایا۔

"دیکھتے ہیں یہ ابر نیساں میرے غم پر برستی ہے کہ نہیں۔"

کلب ایک وسیع ہال پر مشتمل تھا۔ جس کی چھت کافی اونچی تھی۔ آدھے سے زیادہ حصے پر ٹرانسپیرنٹ کرسٹل کا ڈانس فلور بچھا تھا۔ داخلی راہداری کے سامنے دائیں بائیں دو لمبے کاؤنٹر تھے۔ جن کے پیچھے بار ٹینڈر اپنے اپنے کرتب دکھانے میں مشغول تھے۔ ان دونوں کاؤنٹرز کے درمیانی خلا کے اوپر تقریباً" سروں سے اونچا اٹالین طرز کا ٹیرس قدرے باہر کو نکلا ہوا تھا۔ جہاں بہت بڑے سائز کا Disk Pioneer Four (چار ڈسک والا سسٹم) اور چھ انسانی قد کے سائز کے ساؤنڈ ڈیک پڑے ہوئے تھے۔ ٹیرس کی پشت پر V.Jing BOARD (ایک بورڈ جس پر میوزک کے ساتھ مختلف رنگ و اشکال آتے اور جاتے ہیں) نصب تھا۔ میوزک کی آواز تیز تھی' لیکن یہ ابتدائی وارم اپ میوزک تھا۔

وہ اپنے لیے کوئی ایسا حصہ تلاش کرنے لگا جہاں اسے کوئی ڈھونڈنے سے بھی کھوج نہ سکے۔ اس کی نظریں بھٹک بھٹک کر تھک گئیں۔ آوازیں۔۔۔ شور۔۔۔ ہنسی مذاق۔۔۔ چھیڑ چھاڑ۔۔۔ خوشبوئیں' قہقہے' ادائیں' نخرے' ڈانس' ڈرنک سب کچھ آپس میں بری طرح مدغم ہو چکا تھا۔ ڈسکو لائٹ اور مختلف سمتوں میں گھومتی مختلف اشکال گھڑتی لیزر لائٹ کا نہ ختم ہونے والا سفر۔۔۔ شہرام کو اپنے اندر داخل ہونے کے فیصلے پر پچھتاوا ہوا تھا' زندگی کی طرف بلانے والی ان چیزوں سے شاید ان لوگوں کو ہی واسطہ ہوتا ہے' جو زندہ ہوں۔۔۔ وہ زندہ تو تھا لیکن صرف ظاہری طور پر۔۔۔ جن کے دل مر جاتے ہیں' وہ عجز کا ایسا ہی روپ خود پر چڑھا لیتے ہیں۔۔۔ یہ وہ دلدغلا لباس ہے جو ستر پوشی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا۔

اپنی پشت پر اسے کسی کی ٹکراؤ کا ہلکا سا احساس ہوا تو وہ پیچھے پلٹا تھا۔ ایک سانولی لڑکی شوخ ادا سے مسکرا رہی تھی۔

"Would you like—" لڑکی اپنا مدعا بیان کرتے کرتے رکی تھی۔ شہرام کو دیکھ کر اس کی اپنی ساری رعنائی اور تہہ شدہ بات کی گرہیں کھل کر بکھر گئی تھیں۔

"ہائی منتھ" (ڈیوڈ یا پاپو کا دوست' بہت خوب صورت) لڑکی چلائی تھی۔

"ڈرنک کی آفر تو مجھے کرنی چاہیے۔" لڑکی اپنے بے تاب دل کی دھڑکنوں پر جیسے قابو پانا چاہتی تھی' لیکن کر نہیں پا رہی تھی۔

"جیسا میں سوچ رہی ہوں اور ویسا ہی ہوا تو میں دعا کروں گی کہ آج کی رات قیامت والے دن ہی ختم ہو' بولو کون سا مشروب پینا پسند کرو گے؟"

شہرام اس بات کا مطلب بخوبی جانتا تھا' اس نے سر کو انتہائی آہستگی سے ہلایا کہ سانولی لڑکی سمجھ نہ سکی کہ وہ ہاں کہہ رہا ہے یا ناں۔۔۔ لیکن اس کے چہرے کے سنجیدہ تاثرات دیکھ کر وہ کچھ مایوس اور کچھ نامرادگی کی سی کیفیت سے مغلوب ہو کر اداس ہو گئی۔

"تمہارا بھی کوئی قصور نہیں۔۔۔ وہاں سے آنے والوں کو ہمیشہ گوری چیزیں ہی مرعوب کرتی ہیں۔" لڑکی کہہ کر آگے چلی گئی تھی۔

شہرام کھڑے کھڑے واپسی کے لیے راستہ کھوجنے لگا۔ تب ہی تیزی سے چلتا میوزک قدرے آہستہ ہوا تھا۔

"Boys and girls and now the night is about to start"

(لڑکے اور لڑکیوں ___ اور اب ___ رات کی شروعات ہوئی چاہتی ہے)

اعلان کرنے والی کی اپنی آواز میں کانچ ٹوٹنے کی سی کھنک تھی۔

"انتظار ختم ہوا چاہتا ہے ___ یانکا ہمارے درمیان ہے ___ جو..."

آگے کے الفاظ کانوں میں نہیں پڑے تھے۔ لڑکے اور لڑکیوں نے یانکا کے نام پر ہی وہ شور اٹھایا تھا جو جنگل کی راتوں میں سیار کسی شکاری کو دیکھ کر اٹھاتے ہیں ___ سب اپنی اپنی سرگرمیاں چھوڑ کر ڈانس فلور پر بھاگے تھے۔ وہ بار کے قریب کسی مجسمے کی طرح ایستادہ رہا۔ کاؤنٹر کی سطح پر تو بھرے اور خالی جاموں کا ڈھیر پڑا رہ گیا تھا۔ اور اس کے سامنے کے سارے بار اسٹول جو پہلے پر تھے۔ اب خالی ہوئے پڑے تھے۔ وہ ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"اورنج جوس ___" بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔

بارٹینڈر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

"دوسرے مشروب بھی زیادہ مہنگے نہیں ہیں ___" وہ کوئی راز بتانے کی سی آواز میں بولا۔

"اورنج جوس ___ پلیز ___" شہرام نے قدرے آنکھیں نکال کر اور اپنے مطالبے پر زور دے کر کہا تو بارٹینڈر نے اپنا چہرہ تاثرات سے خارج کر لیا اور مطلوبہ فرمائش پوری کرنے کے لیے کاؤنٹر کے دوسری طرف چلا گیا۔

وہ ایسے اونچے اسٹول پر بیٹھا تھا جہاں سے سرے اونچا ٹیرس با آسانی نظر آ رہا تھا۔

"سر ___" اس کے سامنے اورنج جوس ٹیوب گلاس میں رکھ دیا گیا اور تب ہی ٹیرس کے بڑے اور چوڑے سانپ نما ستونوں کے پیچھے سے وہ برآمد ہوئی تھی۔

یانکا ___ چہرے پر بھرپور مسکراہٹ سجائے۔

شہرام گلاس کو ہونٹوں سے لگانا بھول گیا ___ اور نظروں کو جھکانا بھی۔

حسن اور ورد ___ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کسی بھی حالت، کسی بھی موسم میں محسوس کرتا ہے۔

ڈانس فلور پر منتظر ہجوم نے مختلف آوازیں نکال کر اس کا استقبال کیا تھا اور یہ آوازیں شروع ہو کر پھر رکتی نہ تھیں۔ ان بے معنی آوازوں میں صرف ایک لفظ کی گردان شہرام کی سمجھ میں آئی تھی۔

Ritual Di Amour (محبت کی رسم ___ رابرٹ تھامس کا مشہور گیت)

پھر جیسے دوسری فرمائشوں نے بھی اس فرمائش کے چاہنے والوں کی بڑی تعداد کے آگے اپنی اپنی فرمائش کے ہتھیار ڈال دیے اور سب مشترکہ طور پر اسی کی

فرمائش کرنے لگے۔

نیرس پر طمطراق سے کھڑی یانکا مسکرائی تھی اور پھر اس نے اپنا بایاں ہاتھ ہوا میں لہرایا تھا۔ یہ اشارہ تھا۔ فرمائش کو قبول کرنے کا۔ پھر اس نے ہیڈ فون کانوں میں لگایا تھا۔

چھ انسانی قد کے برابر کے ڈیک نے Yanni (موسیقار) کی موسیقی کو فضا میں بکھیرنا شروع کیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اور سنتے ہی سنتے اس گوشے میں بہت سے انجان رنگوں اور بدن کی دھنوں نے بھی آ بسیرا کیا تھا۔

رقص کرو میرے ساتھ... بغیر رکے
بن جاؤ ایک طوفان۔ میرے سمندر کا
ٹھہر گئے والوں نے نہ رکنے کا جیسے عزم کر لیا تھا۔

پانچ منٹ... دس منٹ... پندرہ منٹ...
وقت گزرا اور۔
کوئی چیز ٹوٹ کر شہرام کے آس پاس بکھر گئی... وہ اٹھنا چاہتا تھا لیکن اٹھ نہ سکا تمہید بھی نہ باندھ سکا۔ ڈانس فلور اس کی نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی دور بہت دور... دسترس سے باہر ہو گیا۔

اسے ناچنا نہیں آتا تھا۔ پر یہاں اس کے ناچ کے رموز پر دھیان دینے والا تھا ہی کون پتا نہیں اس کی سماعت بھی اس کی طرح ناچار اور کمزور ہو چکی تھی یا یانکا واقعی اس کی اندرونی درد کو مرتب کر رہی تھی۔ کم از کم شہرام کو ایسا ہی محسوس ہوا۔

گردن اٹھا کر اس نے نیرس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ حسن جس کی صرف ایک بوند پورے سمندر کے پانی کا رنگ بدل دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اپنی آمد کے وقت سے یکسر مختلف عکس دے رہی تھی۔

Owen smith (مصور) کی پینٹنگ ابوالہول کا عکس۔

ابوالہول۔ جس میں ایک لڑکی پریشان چہرہ لیے ابوالہول کے پیچھے کھڑی ہے۔ اس کا سہارا لیے۔ اس کو پناہ بنائے۔ جس کی بھنوؤں میں پریشانی کے باعث گڑھے پڑ چکے ہیں۔

یہ لڑکی تو خود پناہوں کی تلاش میں بھٹکتی لگتی ہے۔ یہ مجھے کیا سہارا دے گی۔

شہرام کو اس کے بند ہونٹوں، نیم وا آنکھوں، کشادہ پیشانی اور دہکتے رخساروں کے نیچے کسی پوشیدہ کرب کا عکس نظر آیا۔ وہ کرب جسے وہی سمجھ سکتا ہے جو خود کسی کرب سے گزرا ہو۔

"ابر نیساں۔"

اسے ڈیوڈ کا یانکا کی تعریف میں بولا گیا لفظ یاد آیا اور ڈیوڈ سمیت ڈانس فلور پر ناچتے ان سب کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔

شاید ان سب پر etc کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ اس لڑکی کی انگلیوں میں تو چھوا قید ہے۔ جو پرانے زخم بھی جگا دیتی ہے۔ یہ انگلیاں نئے زخم مندمل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ شہرام نے فیصلہ کن سوچا۔

وہ یہاں اپنا غم غلط کرنے آیا تھا۔ لیکن شاید قلب کے کمال کے اتاشے کے پاس بھی اس کا علاج نہیں تھا۔ یہاں بھی وہی نوحہ ساز کی تان پر کستا تھا جس نے البانیہ سے یہاں تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ماتم کر لیتا تو شاید راحت پا لیتا... لیکن اسے خود کو سنبھل رکھنے کا سودا ہو گیا تھا۔

بے دل اور بے روح کی طرح شہرام نے ایک اچٹتی سی نگاہ دوبارہ یانکا پر ڈالی تھی۔

سرخ رِبن میں قید اس کے تمام ترشے اور سیاہ بال عروبہ کے استوائی جنگلوں کی عکاسی کر رہے تھے۔

"مجھے خود میں قید کر لو۔ ہنسو، رقص کرو اور بانوں کو لہرا دو۔"

دفعتاً "یانکا نے ربن میں انگلی ڈال کر بالوں کو بڑے پیار سے اس سے آزاد کروایا تھا۔

لہریے دار بال کھلے تھے... لہرائے تھے... جھٹکا دے کر بے ترتیب کیے گئے تھے۔

اور عروبہ کے استوائی جنگلوں میں جیسے زلزلہ آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"رات کی شروعات ہوتی ہے... انتظار رخصت

ہوا چاہتا ہے۔ بیا نگا ہمارے درمیان ہے۔"

مارتا نے اس کی آمد کا اعلان کانچ ٹوٹنے کی سی کھنک سے کیا تو وہ بے دلی اور سست روی سے سیٹرھیوں کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"تو دن کا وہ وقت دوبارہ آگیا ہے جب مجھے خود کو خود اذیتی کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ہے۔" اس نے سوچا اور سانپ نما ڈیزائن والے ستونوں کے پیچھے سے نکلنے سے پہلے اپنے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ۔ نیچے ایک ہجوم اس کا منتظر تھا۔

"Ritual Di Amour" سب نے چلا چلا کر فرمائش کا اظہار کیا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر ان کی فرمائش کو قبول کیا اور Yanni کی موسیقی کو آن کیا تھا۔

"ایک گیت اور اندھیرا ماضی۔ اور اس اندھیرے کا خوف۔ کہ جس میں آنکھیں کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی اور جو کھو جو کچھ نظر نہیں آتا۔" اس نے خود کلامی کی تھی اور دوسری طرف وائلن کی دھنوں والی بینڈ والا گیا تھا۔

مجھے اس اندھیرے ماضی کو یاد رکھنا ہے۔ اس اندھیرے میں ایک چیز چمکتی تھی۔ حیض ماں کی آنکھوں میں سے آنسو۔ جن کی یاد مجھے آگ کی طرح جلاتی ہے۔ مجھے اس آگ کی۔ آبیاری کرنی ہے۔ دنوں سالوں کے گزرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ صدیوں کی لگاتار بارش بھی اس آگ کو ٹھنڈی نہیں کر پائے گی۔ یہاں تک کہ یہ آگ ایک تناور درخت بن جائے گی۔ ایک زہریلا درخت پھر اس درخت پر ایک سیب اگے گا۔ اور وہ زہریلا سیب گناہ گاروں کو چکھنا پڑے گا۔

گانے کے بول

میرے ساتھ رقص کرو۔ بغیر رکے

طوفان بن جاؤ۔ میرے سمندر کا

اس نے سازوں کی دھنوں کو ملا کر انہیں اعلیٰ سے اعلیٰ کرنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو مصروف کر لیا تھا۔

"ہنسو۔ رقص کرو۔ اپنے بالوں کو لہرا دو۔" زمین میں انگلی ڈال کر اس نے بالوں کو آزاد کر کے لہرا دیا تھا۔

چچا جلال نے اسے انہیں بالوں سے پکڑ کر ایک زوردار قسم کا جھٹکا دیا تھا۔

"حرام زادی کرو دستخط۔" وہ نفرت سے چلائے تھے۔

اسے حرام زادی کا مطلب نہیں پتا تھا۔ اس کی ماں پانچ وقت کی نمازی تھی اگر اسے حرام زادی کا مطلب پتا ہوتا تو وہ اسی وقت مر جانا پسند کرتی۔

"الو کی پٹھی کرو دستخط۔"

وہ "سی" کے بٹن کو اوپر کرتی چلی گئی تھی۔

"کرو دستخط۔ کرو دستخط۔ کر کر۔ کر کر۔" دراز نے ان لہروں پہ سفر کیا تھا جو کسی صورت ہموار نہیں تھیں۔

"طوفان بن جاؤ۔ طوفان بن جاؤ۔ طوفان بن جاؤ۔"

"یہ ایسے نہیں مانے گی۔ اپنی ماں پر گئی ہے۔ ڈھیٹ کمینی مکار حرافہ۔" شہناز تائی نے کہا تھا۔

"ڈھیٹ کمینی مکار حرافہ۔"

چاروں ڈسک اس کے دونوں ہاتھوں کے نیچے Scratching (ایک ایفکٹ) سے گزرنے لگیں۔

"مکار مکار مکار۔"

B اور VolumeD کو اس نے اس قدر شدت سے تیز کیا تھا کہ وہ Pioneer کسی اچھی کمپنی کا نہ ہوتا تو دونوں بٹن یقیناً ٹوٹ گئے ہوتے۔

گانے کے بول۔

تمام بصارتیں تم پہ مرتکز ہو جائیں

اور دعا دیں۔ اپنی وارفتگی

Keytar اور Lira کی دھنیں ہال پر چھا گئیں تو رابرٹ کی آواز مدھم ہوتے ہوتے گم ہونے لگی۔

اپنی ذات محبت کی اس رسم کے حوالے کر دو

ارائی Arpa نے اپنے میم جادو کا آغاز کیا تھا۔

نیچے لڑکے لڑکیاں اگر پاگل نہیں ہوئے تھے تو ہو جانے کے قریب ضرور تھے۔

"ایک جوتی مارو اس کے منہ پر۔ کیسے نہیں مانے گی یہ" اسے فیروزہ چاچی کے الفاظ یاد آئے تھے۔

پہلی ڈسک نکال کر اس نے اس طرح پرے پھینکی تھی جیسے وہاں فیروزہ چاچی کھڑی ہوں اور وہ ان پر بارود کا گولہ پھینک رہی ہو' بیانکا کی اس حالت میں مارتا کو اپنے فرائض کا بخوبی علم ہوتا تھا۔

"تیل چھڑک کر زندہ جلادو... اس کو اور اس کی بل کو۔" ان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ پھر انہوں نے ایسا کیا کیوں نہیں... وہ تب ہی مرجاتی تو اس طرح روز روز تو جل جل کر نہ مرتی۔

لیکن موسیقی جلنے لگی تھی... کسی چڑیل کے لیے ناخنوں کی کھرچ کی سی آواز پیدا کر رہے تھے اور رابرٹ کی آواز "صور" کی صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔

اجنتا کے غاروں میں چھپی چمگادڑوں کا چنگھاڑنا بھی ان آوازوں سے کہیں زیادہ بھلا تھا۔ بیانکا کے کان ان کراہوں کے عادی ہو چکے تھے۔ پھر بھی ہر روز ٹیرس پر بے حسی سے اپنی ڈیوٹی انجام دینا اسے اندر تک بھگو دیتا تھا۔

نیچے e.x.c کے نشے میں چور ہو کر سب ناچتے جاتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اس کی انگلیوں سے نکلتی دکھ کی تحریر کو پڑھ سکتا۔ کسی کے پاس وہ آنکھ نہیں تھی' جو اپنی ہی مردہ سلطنت پر خود کو ختم کردینے کے ارادے باندھنے والی قلوپطرہ کے بھید تک جان سکتی۔

بیانکا کو ان سب کی بے حسی پر رونا سا آگیا' لیکن وہ اسی طمطراق سے کھڑی رہی۔ جیسے اس کے لیے آنے والا ارجن (کانچ کا گھوڑا) اس کی آنکھوں کے آگے ہی جل رہا ہو۔

ڈیڈ الیاس کہتے تھے... "اپنے اپنے درجے اور حیثیت کی بات ہے' بچی... اوس تر تو کر سکتی ہے' لیکن پیٹ نہیں۔"

"آپ نے یہ کیوں نہ بتایا ڈیڈ کہ اپنی اپنی نظر اور تصورات کی بھی بات ہوتی ہے۔ کچھ لوگ آتش فشاں کے پھٹنے کو بھی نظارہ سمجھ لیتے ہیں... جبکہ کچھ کو اس کی حدت کا خوف ہی بھسم کر دیتا ہے۔"

اس نے ڈیڈ الیاس کی روح کو جواب دیا اور نیچے ڈانس فلور پر نظر ڈالی۔

"میرا دکھ ان سب کے لیے نظارہ ہے۔ ہے کوئی جو اس نظارے سے مبہوت نہ ہو....؟"

وہ مزید جوش سے اسکریچنگ کرنے لگی اور اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

"نہیں کوئی نہیں..."

ڈانس فلور کے ارد گرد کی ساری جگہ خالی تھی۔ لوگ آرہے تھے... جانے والا کوئی نہیں تھا... یہ اطراف کی دیواریں اگر اتنی مضبوط نہ ہوتیں تو شاید یہ بھی جھوم اٹھتیں... نہیں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی انگلیوں کی فسوں کاری کے حملوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو پاتا۔

چاروں سمت کا موازنہ کرتی اس کی نظر اچانک کہیں اٹکی تھی... ایک چیز تھی جو ساکت تھی۔ گہرے منجمد پانی میں مدتوں سے پڑی بند صدف کی طرح ایک دو انچ کی لکڑی کا ٹکڑا۔

فقط ایک دو انچ کی لکڑی کا ٹکڑا...

* * *

جس بے دلی سے اس نے ٹیرس کی سیڑھیاں طے کی تھیں۔ واپسی پر اس سے کہیں زیادہ شکست خوردگی نے اس کے گرد حصار قائم کر دیا تھا' خلاف معمول آج اس کے قدم ڈریسنگ روم میں جانے کے بجائے بار کاؤنٹر کی طرف اٹھے تھے۔

اس کی آٹھ ماہ کی جاب میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ وہ ٹیرس سے اتر کر سیدھا ڈریسنگ روم میں نہیں گئی تھی۔ آج کے دن کی طرح پچھلے آٹھ ماہ میں کوئی چیز گہرے منجمد پانی میں مدتوں سے پڑی بند صدف کی طرح ساکت بھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ اس ٹکڑے کے مالک کے بالکل مدمقابل آبیٹھی تھی۔

اس ساکت ٹکڑے نے اسے ٹیرس پر ہی بڑی

بھیانک پریشانی سے دوچار کردیا تھا "ہے کوئی جو اس نظارے سے مبہوت نہ ہو۔"

اس نے تفاخر سے سوچا اور تب ہی چاروں طرف کا موازنہ کرتی اس کی نظر کہیں اٹک کر بھٹک گئی تھی۔

یہ ایسا عجیب' انوکھا اور توقع سے برعکس تھا کہ بڑی دیر تک وہ اسے فریب نظری سمجھتی رہی تھی۔

فوروسک Pioneer اس کی انگلیوں کے نیچے جیسے پتھر کا ہو گیا۔ ہیڈ فون اس کی گردن میں جھولنے لگا اور آگ پکڑتی تانوں پر گویا قطب شمالی کی سرد ہواؤں نے قابض ہو جانے کی ٹھان لی۔

اور بیانکا کی آنکھوں میں بے قراری کی سیاہی بھر گئی۔

ڈسکو لائٹ کی کبھی مدھم اور کبھی تیز ہوتی روشنی میں اس نے ناچتے کودتے ہر ایک لڑکے اور ہر ایک لڑکی کو بہت غور سے دیکھا۔ "وہ" ان میں نہیں تھا۔ اس نے قریب کھڑی مارتا اور سیڑھیوں پر ایستادہ دو حبشی باڈی گارڈز کو دیکھا۔ وہ ٹکڑا ان کی دسترس میں بھی نہیں تھا۔ پھر۔۔۔ پھر اس نے اپنی شکست کو کہاں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہنسی میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح مچلنے لگی۔

دائیں طرف بار کاؤنٹر کے چھ بار اسٹول خالی تھے۔ بائیں طرف بار کے چھ۔۔۔ نہیں وہ پانچ خالی تھے۔ اور ایک پر وہ۔۔۔ وہ بیٹھا تھا۔۔۔ شہرام زلاری۔۔۔

دور کہیں طبل بجا۔۔۔ اور ایک جنگ سی چھڑ گئی۔

ایک مقابل۔۔۔ ایک ضد۔۔۔

پندرہ منٹ کی مزید زور آزمائی نے اسے نڈھال کر دیا۔ بیانکا کو کھیل کے اس حصے کی مہارت نہیں تھی۔ اس نے اپنی شکست تسلیم کرلی۔

جنگ ختم کرکے اس نے ہیڈ فون مارتا کو تھمایا تھا۔ تو مارتا نے اسے اچنبھے سے دیکھا تھا۔ بیانکا عموماً" یا کم از کم دو گھنٹے تو ضرور ہی میز پر اپنی ڈیوٹی مکمل کرتی تھی۔

بیانکا نے مارتا کے چہرے کے بدلتے تاثرات پر توجہ نہیں دی تھی۔ ڈانس فلور سے آتی دنس مور ونس مور کی صداؤں کو بھی اس نے نظر انداز کردیا تھا اور نیچے اتر کر وہ شہرام زلاری کے بالکل مدمقابل آبیٹھی تھی۔

وہ یہاں اس کی اپالو دیوتا جیسی خوب صورتی کو سراہنے نہیں آئی تھی۔ وہ تو وجہ کھوجنے آئی تھی۔ خود پر فتح ہو جانے والی اس کی مجسم طبیعت کی۔ بار اسٹول پر بیٹھتے ساتھ ہی اس نے یہ کام پوری ایمان داری سے کرنا شروع کردیا۔

اس ٹکڑے پر یقیناً" کچھ کندہ بھی تھا۔ لیکن فاصلے نے حد نظر کو محدود کر رکھا تھا۔ وہ چوکور ٹکڑا ایک کونے سے موٹی کالی ڈوری میں پرویا ہوا اس کی ہنسلی کی ہڈی کے جوڑ پر دھرا تھا اور وہ موٹی کالی ڈوری ایک متناسب اور خوب صورت گردن کے گرد ایسے لپٹی دکھتی تھی جیسے وہاں کوئی باریک کالا سانپ براجمان ہے اور سانپ کے اس آسن کے نیچے "ناگ منی" ہے۔

جو ایسا تھا تو غلط نہیں تھا۔ وہ۔۔۔ وہ واقعی ناگ منی تھا۔

وہ اورنج جوس کو کسی ایک خاص انداز سے پی رہا تھا اور جب وہ ٹھہرے ہوئے انداز سے گھونٹ بھرتا تو اس کی گردن کا کنٹھ نیچے آتے اور گم ہونے سے پہلے اس ٹکڑے کو چھونے کی ناتمام کوشش کرتا تھا۔

بیانکا نے رولنگ اسٹول کو موڑ لیا اور وہ مزید براہ راست ہو گئی۔

اس کی شیو بنا اسٹائل کے بڑھی ہوئی تھی اور سات آٹھ دنوں کی بڑھی شیو کے بال اس کے سرخی مائل گالوں کے نیچے کان کی لو کے قریب دو دائرے بناتے تھے' بیانکا نے ان دائروں کو کھوجا اور خود کہیں کھو کر رہ گئی۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اسے یاد آیا تھا کہ وہ ایسے ہی پرکشش دائروں کو پہلے کہاں دیکھ چکی ہے۔ وہ ان دائروں کو بچپن سے دیکھتی چلی آرہی تھی اور ساری زندگی دیکھتے رہنے کی خواہش مند تھی۔

وہ اس کے زیڈ انیاس کے گالوں پر پڑتے تھے۔

اور زیڈ انیاس کو یاد کرکے بیانکا نے فیصلہ کیا کہ وہ اس انجان لڑکے سے اجنبی نہ رہے۔ اس کے ارادے اور

سوچ میں شہرام کی جامد خاموشی حائل تھی۔ جو بار اسٹول پر بیٹھا اس قدر ٹھہراؤ اور طوالت کا شکار تھا کہ اس حالت میں وہ بیانکا کو اگستے روڈن (Auguste Rodin) کے مجسمے The thinker (سوچنے والا) لگا جس میں قدرت نے وقتی طور پر لمحوں کی جان ڈال دی ہو اور مجسمہ اس لمحے کی جان کو طول دے رہا ہو۔ وہ ٹیوب گلاس میں مشروب پی رہا تھا اور گلاس کے اندر کا سیال کسی جیلی کی طرح جما ہوا محسوس ہوتا تھا۔

کلب کا دستور تھا کہ مارگریٹ، مارٹینی اور کاک ٹیل گلاسز کے اسٹینڈ میں چارمز (charms) کی لڑی والا چھلا ڈالتے تھے۔ چارمز کرسٹل کے ہوتے تھے اور ان پر Power of love (محبت کی طاقت) کی مہر کندہ ہوتی تھی۔ ہوا نے جلانے پر یہ چارمز بڑی دلکش جھنکار پیدا کرتے تھے۔

بیانکا سوچنے لگی کہ کلب انتظامیہ اگر کسی طرح ٹیوب گلاس میں چارمز والا چھلا ڈالنے میں کامیاب ہو بھی گئی تو اس لڑکے کی ہاتھوں کی جنبش کرم کے باعث ان چارمز نے جھنکار تو دور حرکت بھی نہیں کرنی تھی۔

کلب کی ایک اور روایت بھی تھی کہ کلب میں داخلے کے وقت ہر ایک کو کالی روشنائی والی Power of love کی مہر اپنے جسم پر کہیں بھی لگوانی پڑتی تھی، بیانکا کو آج تک اس روایت سے اختلاف نہ ہوا تھا۔ اکثر کلبوں کے ایسے ہی الٹے سیدھے رواج تھے۔ لیکن شہرام کی کلائی پر کالی روشنائی والی مہر دیکھ کر بیانکا کو ناگواری کا احساس ہوا اور ساتھ ہی اسے داخلی دروازے پر کھڑے کسی سانڈ جیسے تنومند حبشیوں کی بینائی پر بھی شبہ ہوا۔

اس لڑکے کو یہ مہر لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ دیکھ نہ سکتے تھے کہ یہ تو خود سراپا طاقت محبت ہے۔

"سنو!" بہت سوچ کر بیانکا نے اسے پکارا تھا۔ جسے شہرام شاید سن ہی نہیں پایا تھا۔

"تو بس صرف اتنی سی وجہ تھی۔" بیانکا کو اپنی سوچ پر شرمندگی ہوئی اور شہرام کے قوت سماعت سے محروم ہونے پر دکھ بھی۔۔۔ وہ پرے ہو گئی۔۔۔ اور مطمئن بھی۔

قریب بیٹھا شہرام بیانکا کی نظروں کی تلب سے دور ہو گیا۔ وہ پہلے بھی دور ہی تھا بہت دور اس کی سوچ کے دھاگے البانیہ کی سرزمین میں گڑے تھے اور ان دھاگوں میں وہ الجھتا جا رہا تھا۔

بابا زلاری نے کہا تھا۔

"ادھورا علم اور کند چھری۔۔۔۔ دونوں ایک سا تڑپاتے ہیں۔"

"آپ یہ کیوں نہ سمجھ سکے بابا کہ ادھورا راز اور پشت کا وار بھی صیقل ہوئے خنجر سے کم خطرناک نہیں ہوتا۔"

دفعتاً" شہرام کو ٹھوکر لگی۔ اپنی ہر سوچ کے دھاگوں سے وہ بھول گیا کہ یہاں کوئی اس کے دوست طامیر جیسا نہیں ہے۔ جس نے البانیہ میں اسے ٹرک کی زد میں آنے سے بچا لیا تھا۔

بے بس غصے اور آپے سے بڑھتے رنج کی ایک لہر اس کے سینے سے اٹھی، اور اس کے ست دماغ پر آکر حاوی ہو گئی۔ ٹیوب گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے ہی قدموں میں گر کر چور چور ہو گیا۔

وہ اپنے حواس میں نہیں تھا، ورنہ یقیناً" اس چھناکے کی آواز پر ہی ضرور چونکتا۔۔۔ اپنے ڈولتے جسم کو سنبھالنے کے لیے اس نے ایک آخری بار کوشش کی تھی اور ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر بار ٹینڈر کی طرف اور ایک بیانکا کی طرف بڑھایا تھا۔ دونوں کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی وہ بلوری فرش پر بیانکا کے قدموں میں گر کر ڈھیر ہو گیا تھا۔

ایک ویٹر جلدی سے ہاتھ میں پکڑا تھال بار کی سطح پر رکھ کر شہرام کی طرف بڑھا تھا۔

اور حیرت سے جامد ہوئی بیانکا سوچنے لگی تھی۔

"کیا اورنج جوس پینے سے بھی کسی پر مدہوشی طاری ہو جاتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

اپنے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں کسی قدر تیزی سے چڑھ کر اور دروازے کو تقریباً" دھکیلتے ہوئے وہ اندر

داخل ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے آج وہ خلاف عادت دوسرے کمرے میں گئی تھی۔ جہاں ٹیپ لگے ایک دوجے کے اوپر تلے رکھے بہت سے بند کارٹنز میں اس کے پرانے گھر کا سامان پڑا ہوا تھا۔

جب سے وہ اپارٹمنٹ میں منتقل ہوئی تھی' اس کمرے میں تنے اور اس پرانے سامان کو استعمال کرنے کی اسے ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ لیکن آج جیسے اس کے سینے میں کسی نے دہکتی ہوئی سلاخ اتار دی تھی۔

ایک کارٹن پر سے ٹیپ کو کھینچ کر اتارتے ہوئے وہ اندر موجود چیزوں کو باہر نکال نکال کر فرش پر ڈھیر بنانے لگی تھی۔ دیکھتے دیکھتے سارا کارٹن تقریباً" خالی ہو گیا۔ وہ دوسرے کارٹن کی طرف بڑھی۔ پھر تیسرے کی طرف۔

چوتھا کارٹن کھولنے سے پہلے تک کمرے کا سارا فرش مختلف چیزوں سے ڈھک چکا تھا اور اس برق رفتاری سے یہ کام سرانجام دیتے دیتے اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ تب کہیں جاکر اسے اپنی مطلوبہ چیز ملی تھی۔۔۔۔ تصویروں کا البم۔

کاؤچ پر بیٹھ کر وہ ایک ایک تصویر کو بڑے غور سے دیکھنے لگی تھی۔ جیسے اپنی زندگی میں پہلی بار ان چہروں کو دیکھ رہی ہو۔ آنسو اس کے اندر ہی اندر کہیں دفن ہونے لگے تھے۔

فوٹو البم میں ان گنت تصویریں ایسی تھیں جن میں ڈیڈ الیاس کی شیو بڑھی ہوئی تھی' لیکن بالوں کے وہ دائرے۔۔۔۔ وہ دلکش دائرے شاید کیمرے کا عدسہ فوکس نہیں کر سکا تھا۔

بیانکا نے خود کو پھر سے یاد دلایا کہ اسے رونا نہیں ہے۔۔۔۔ وہ بہت رو سکتی تھی۔ بہت پہلے رو چکی تھی۔۔۔۔ اب اسے صرف ایک آخری بار رونا تھا۔۔۔۔ اور وہ وقت ابھی دور تھا۔

اسی وقت کے لیے وہ دن رات منصوبے بنا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

بیانکا کی موجودہ زندگی کی کتاب میں سے اگر کلب کی ہنگامہ خیز جاب کے صفحے کو پھاڑ کر پھینک دیا جاتا تو یہ زندگی ایک بوڑھی تنھا بیوہ کی سی زندگی تھی۔ ایسی بوڑھی بیوہ جس کے پانچ جوان بیٹے پانچ مختلف براعظموں میں رہائش پذیر ہوں اور وہ روز بلاناغہ گھر سجا کر ان کی آمد کا انتظار کرتی ہو۔

انتظار جو دل کی بے قراری اور آس سے جنم لیتا ہے۔ طویل ہو جائے تو آنکھیں پتھرا جاتی ہیں اور طویل تر ہو جائے تو دل چٹان بن جاتا ہے۔

وہ پچھلے آٹھ ماہ سے انتظار کی اس چوکھٹ میں کھڑی تھی جس میں دل کی حرکت ہر بار دق کے مریض کی طرح خطرے کی گھنٹی بجاتی تھی۔ پیچھے جانا اسے منظور نہیں تھا اور آگے کے تمام راستے اندھے کنویں کو جاتے تھے۔ اس کے باوجود اس نے خود کو زندہ رکھنے کی ہر کوشش پر عمل کیا اور اس کوشش نے اسے اندر تک سے توڑ دیا۔ اس طرح کہ دنیا کا کوئی واقعہ اب اسے حیران نہیں کرتا تھا۔

کل رات بڑے عرصے بعد اس نے بلوری فرش پر لڑکھڑا کر گرتے شہرام کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کیا تھا اور اسے خود پر حیرت ہوئی تھی۔ اگر سب اسی طرح معمول پر آتا رہا تو پھر اس کی بربادی کا نظارہ ایسا ہی ہونے والا تھا جیسے روم کے جلنے کا۔

شام میں وہ سارے خیالات جھٹک کر کلب گئی تھی تو اتفاقیہ طور پر ڈینیئل اور جوڈتھ بھی اس لڑکے (شہرام) کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔

"اس کے دائیں بازو کی ہڈی میں بہت زیادہ فریکچر آیا ہے۔"

ڈینیئل خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنی "بو" درست کر رہا تھا۔ دوسرے آئینے کے سامنے کھڑا جوڈتھ اپنی گردن پر بنے "بیوٹی اینڈ دی بیسٹ" کے ٹیٹوز کو رنگنے میں مصروف تھا۔ وہ ہر روز یہ عمل بڑے شوق سے پورا کرتا تھا۔ اس کا خیال نہیں بلکہ یقین تھا

کہ یہ چیز اس کی ہولناکی کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ جبکہ حقیقت میں لوگ اسے دیکھ کر سوچتے تھے کہ یہ شخص دن بدن بیسٹ (درندہ) کیوں بنتا جا رہا ہے۔

دونوں کی گفتگو کو غیر دانستہ سنتے اپنے ہونٹوں پر اورنج رنگ کی لپ اسٹک لگاتی بیانکا کے ہاتھ نجانے کیوں خود بخود رک گئے تھے۔

"اس کی جیب سے کوئی آئی ڈی' وزیٹنگ کارڈ یا ایڈریس نہیں ملا۔۔۔ اس کا پرس بھی تقریباً" خالی تھا اور اس کے پاس سیل فون بھی نہیں تھا۔ گرین روم میں پڑے اس کے سفری بیگ میں بھی پاسپورٹ اور چند معمولی کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔"

"حیرت ہے۔۔۔ کیا وہ ایئرپورٹ سے سیدھا کلب ہی آ رہا تھا۔" جوڈتھ گردن کو آتشی رنگ میں پینٹ کرنے کے بعد جھک کر شوز کے تسمے کسنے لگا تھا۔

"اور منحوس منیجر کہنے لگا کہ میں صلہ رحمی کے تحت ہسپتال جا کر اس کے لیے فنڈ سے علاج کا فارم فل کر دوں۔۔۔"

"بدبخت شخص اگر اسے انسانی ہمدردی کا اتنا ہی بخار چڑھ رہا ہے تو وہ خود کیوں نہ چلا گیا۔۔۔ ہماری ٹپ میں سے بھی دسواں حصہ فضول میں ہی کھرا کر لیتا ہے۔"

جوڈتھ کو منیجر کے اگلے پچھلے سارے غصے یاد آ گئے تھے۔

"وہ کس ہسپتال میں ہے۔۔۔؟" مز کربیانکا نے بلا سوچے سمجھے پوچھنا چاہا تھا۔

ڈینئل اور جوڈتھ وہاں سے جا چکے تھے' ورنہ وہ واقعی یہ سوال پوچھ ڈالتی۔

"مجھے اس سارے معاملے سے کیا سروکار۔۔۔؟"

لپ اسٹک لگانے کے رکے ہوئے عمل کو پورا کرتے ہوئے وہ ٹیرس کی طرف بڑھی تھی۔ مارتا نے اس کی آمد کا اعلان کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

رامش گر ہوائیں بڑے بھید بھرے گیت قید تھے۔

وہ خود جو سنگیت کی ماہر تھی ہوا کے ان پرنور گیتوں کے آگے اس نے دنیا کے تمام نغموں' گیتوں' الاپوں اور بہروں کو بے ضرر اور بے اثر جانا۔

سرسوں کے پھولوں سے رنگی ہوئی صبح درختوں پر جھپتی چلی آتی تھی اور سونے رنگ کا پارہ کھرا ہوتے ہوتے ہر سو بکھرنے لگا تھا۔

اس نے ٹھنڈی اوس کی نمی والی راحت کو اپنے پیروں کے نیچے رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوئے محسوس کیا اور قریب پڑے جوتوں کو واپس پہن لیا۔

وہ کافی دیر سے یہاں موجود تھی۔ آج صبح اٹھتے ساتھ ہی وہ اس پارک میں چلی آئی تھی۔ تب جوگنگ کرنے والوں کا بہت رش تھا۔ لیکن پھر جوں جوں دن چڑھنے لگا رش بھی کم ہو گیا۔

جوتے پہن لینے کے بعد وہ تھوڑی دیر مصنوعی جھیل کی ناسپاس لہروں میں سرائیت کرتی سورج کی شعاعوں کو دیکھتی رہی تھی۔ دھوپ روز والا جوبن حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

چمکیلی دھوپ کے سحر کو اپنی بانہیں کھول کر اس نے اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا اور ایک بار پھر اللہ سے اپنی کامیابی کے لیے دعا مانگی تھی۔ وہ بڑی دیر تک اسی حالت میں رہی۔ آج بڑے دنوں کے بعد اس نے خود کو خوش کرنے کے لیے وقت نکالا تھا۔

"آرائشی پیاز" کی جامنی باڑ کو کسی تتلی کی طرح چھوتے ہوئے وہ واپسی کے لیے گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔۔۔ جب اس کی نظر مخالف سمت میں بنے کینٹین کے کاؤنٹر پر اسے مڑ کر دیکھ کر دوبارہ پیچھے پلٹی تھی۔

اس کی نظر رکی تو وہ خود بھی محو سفر نہ رہ سکی۔

وہ بلاشک وشبہ وہ ہی تھا۔ جس کے سرہانے وہ ایک ہفتہ پہلے وائلٹ کا گلدستہ رکھ آئی تھی۔

اس دن سے پچھلی رات اس نے ٹیرس سے اتر کر ڈینئل کو تقریباً" جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"اس ہسپتال کا نام کیا ہے۔ جس میں وہ لڑکا ایڈمٹ ہے؟" ڈینئل کے تھال میں چھ جام پڑے ہوئے تھے اور بیانکا کے اس بری طرح اسے ہلانے سے وہ چھ کے

چہ جام چھلکے تھے۔

"کون سا لڑکا۔۔؟" خود کو کسی حد تک غصے کی حالت میں ظاہر کرتے ہوئے ڈینئل نے بھونچکا ہو کر پوچھا تھا۔

"جو کل رات یہاں پر گر گیا تھا۔۔۔۔"

بیانکا نے بار اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ اسے ڈینیل کے تاثرات کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی۔ ڈینئل نے اسے ہسپتال کا نام بتا دیا تھا۔

اگلے دن وہ صبح جلدی اٹھ کر ہسپتال گئی تھی۔ شہرام کو تلاش کرنے میں اسے چند منٹ ہی لگے تھے۔ اگرچہ اس کا نام بھی اسے یہاں آکر ہی معلوم ہوا تھا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اپنے یہاں آنے کی چھوٹی کچی وجوہات گھڑتے ہوئے الفاظ کو ترتیب دینے لگی تھی، لیکن اسے کچھ بھی بولنا نہیں پڑا تھا۔ شہرام میٹھی اور گہری نیند سو رہا تھا۔ اس طرح کے اس کی طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے بیانکا کو اپنے دل پر خون کی گردش تیز تر ہوتی محسوس ہوئی۔

اس کے سرہانے کے پاس وہ واٹر للی کے پھولوں کا ایک چھوٹا گلدستہ رکھ کر باہر آگئی تھی۔

"مجھے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔۔۔ نجانے کیوں بعض اوقات میں بہت بے وقوفی والی حرکتیں کرتی ہوں۔۔۔" باہر نکل کر وہ سوچنے لگی تھی۔

ایک ہفتہ وہ نہ چاہتے ہوئے کلب میں اس کی آمد کا انتظار کرتی رہی تھی۔ کل رات ہی وہ اس انتظار سے کچھ غافل ہوئی تھی اور کل رات ہی اسے پتا چلا تھا کہ شہرام گرین روم سے اپنا شولڈر سفری بیگ لے کر جا چکا ہے۔ جس میں اس کے پاسپورٹ کے علاوہ چند کپڑے بھی موجود تھے۔

اور آج وہ اسے پھر نظر آیا تھا۔ بلو جینز اور وائٹ ہاف بازو کی ٹی شرٹ میں۔۔۔ ایسے کہ اس کا دایاں ہاتھ مکمل طور پر سفید پٹیوں سے کسا ہوا تھا۔ اپنے قدموں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے کے لیے بیانکا نے کوئی کوشش بھی نہیں کی۔

اس کا دایاں بازو ساکن تھا اور بائیں ہاتھ سے وہ اپنی ہپ پاکٹ میں سے شاید والٹ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ہاٹ ڈاگ اس کے ہاتھ میں تھا اور دکان دار اس کی اس دیر پر بڑی کوفت کا شکار لگ رہا تھا۔

"اس میں سے ان کے ہاٹ ڈاگ کے پیسے کاٹ لیں۔"

بیانکا نے اپنے پرس میں سے پیسے نکال کر دکان دار کی طرف بڑھائے تھے۔

یک لخت شہرام نے گردن اٹھا کر بیانکا کی طرف دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں پہچان کی ہلکی سی چمک آکر گزر گئی تھی۔

"نہیں، میں پیسے خود ادا کر سکتا ہوں۔" وہ گویا ہوا اور حیرت سے بیانکا کی آنکھیں پھیل گئیں۔۔۔ تو وہ سن سکتا تھا۔۔۔ اور بول بھی سکتا تھا۔۔۔ ایک انجانی خوشی کا احساس اس کے چہرے سے جھلکنے لگا۔

"تکلف میں مت پڑو۔۔۔ ہاٹ ڈاگ کی پرائس کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں ہے۔ میں نے پارک میں اکثر بوڑھوں کو اسے توڑ کر پرندوں کو کھلاتے دیکھا ہے۔" بقایا پیسے لے کر وہ اپنے پرس میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"تمہارا بازو اب کیسا ہے۔۔۔ مجھے افسوس رہے گا کہ میں تمہیں بروقت سہارا نہ دے سکی۔" قریبی بینچ کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا اور جتایا بھی تھا۔

"یہ بہتر ہے۔۔۔"

وہ مسلسل بائیں ہاتھ سے اپنی ہپ پاکٹ کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ بینچ تک پہنچنے پر وہ اپنا والٹ نکالنے میں کامیاب ہو گیا تو بیانکا اور اپنے درمیان اس نے اس والٹ کو رکھ دیا تھا۔

"میں نے کہا نا اس کی ضرورت نہیں۔" بیانکا نے والٹ کو دوبارہ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"تمہیں اتنی جلدی گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ میرا نہیں خیال کہ یہ اتنا ہی بہتر ہو گیا ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔۔۔ کیا تمہاری فیملی میں سے کسی نے تمہیں اس طرح باہر نکلنے سے نہیں روکا۔" وہ خود کو ہر بات سے لاعلم ظاہر کرنے لگی۔

شہرام چند لمحے خاموش رہا تھا۔

"میں یہاں پر اکیلا ہوں۔۔۔"

وہ زیادہ حیران نہیں ہوئی ایک تو اس وجہ سے کہ وہ ہر بات پہلے سے جانتی تھی اور دوسرا اس وجہ سے کہ وہ خود اکیلی تھی۔

"ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ پر اکیلے ہیں۔۔۔ پھر بھی اپنا خیال ہمیں کسی کی نصیحت کے بغیر بھی رکھنا چاہیے۔"

کچھ توقف اور ایک طرح کا فیصلہ کر لینے کے بعد اس نے سلسلہ کلام دوبارہ جوڑا تھا۔

"نرس نے مجھے بتایا تھا کہ تمہیں ٹھیک ہونے میں کم از کم ایک ماہ لگے گا۔"

وہ بات جسے وہ خود سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتی تھی وہ بات اس کی نوک زبان سے انجانے میں نہیں پھسلی تھی۔ بلکہ وہ خود اس بات کو بتا دینا چاہتی تھی۔

شہرام چونکا تھا۔۔۔ اور پھر دوبارہ اپنے قدموں تلے کی زمردی گھاس کو دیکھنے لگا تھا۔

اس کی جھکی آنکھوں میں "بدھا" کی بند آنکھوں کے اسرار و کشف کی الوہیت تھی۔

"پھولوں کا شکریہ۔۔۔"

بڑی دیر بعد اس نے کہا تو بیانکا کو اس کی آواز زمین کے کسی دوسرے خطے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"ایک بات پوچھوں۔۔۔ ویسے اگر تم اجازت نہیں بھی دو گے میں تب بھی پوچھ ہی لوں گی۔۔۔ تم اس دن ڈرنک تو نہیں۔۔۔ تھے۔۔۔ تو پھر۔۔۔؟"

ریپر ہٹا کر ہاٹ ڈاگ کھاتے شہرام نے رک کر ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"اس دن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

وہ بات کو ختم کرنے کے انداز میں بولا تھا۔

بیانکا نے واضح طور پر نوٹ کیا کہ وہ ہاٹ ڈاگ کو ایسے کھا رہا تھا جیسے یا تو اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا یا پھر وہ آج سارا دن اسی ہاٹ ڈاگ پر گزارہ کرنے والا تھا۔

اپنے اور اس کے درمیان میں پڑے ہوئے اس نے اس کے وانٹ کو دیکھا تھا۔ جس کی بیرونی حالت اندر کے کل اثاثے کی غماز تھی۔ وہ یقیناً" سارا دن اسی ہاٹ ڈاگ پر گزارہ کرنے والا تھا۔

خاموش بیٹھا جیسے وہ مزید گفتگو کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اور بیانکا اس تجسس کو اپنے ساتھ گھر لے کر جانا نہیں چاہتی تھی۔

"ڈینئل نے بتایا کہ تمہارے پاس کوئی سیل فون، کارڈ، ایڈریس وغیرہ بھی برآمد نہیں ہوا۔ کیا تم اس ملک میں بالکل ہی نئے آئے ہو۔ کیا تمہارا یہاں کوئی نہیں ہے یا وہ اب تمہیں ایکسپٹ نہیں کر رہے۔ جیسا کہ یہاں اکثر ایشیائیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمہاری رہائش کہاں ہے؟"

اس کے لیے اس میں سے کسی ایک سوال کا جواب بھی بہت تھا۔

شہرام ہاٹ ڈاگ کھانا جیسے بھول گیا اور بیانکا کی طرف دیکھتے ہوئے وہ قدرے تیز آواز میں بولا تھا۔

"آخر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔؟"

یہ تیز آواز کسی پرندے کی چہکار سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ براہ راست بیانکا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ لمحے بھر میں وہ لاتعلقی کی تصویر بن گیا۔

بیانکا نے اس سوال اور اس انداز کو اپنی بے عزتی محسوس کیا اور اپنے دماغ کو سنسناتے ہوئے پایا۔ وہ ایک تک شہرام کے چہرے کے پیچھے آئے جو ن چڑھے سورج کو دیکھنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی یا کچھ اور۔۔۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

پھر وہ ایک جھٹکے سے بینچ سے اٹھ کر کھڑی تھی۔

بیانکا کے اس طرح اٹھنے سے شہرام کو احساس ہوا تھا کہ اس نے بلاوجہ تلخی بھرا رویہ اپنایا۔۔۔ قصور اس کا تو نہیں تھا۔

"غلطی میری ہے۔۔۔ میرا دماغ ازل سے ہی خراب ہے۔۔۔" بینچ کے پیچھے کی کالی اینٹوں والی روش پر آتے ہوئے بیانکا نے خود سے کہا تھا اور تیز تیز چلنے لگی تھی۔

"میں اسپانیہ سے ہوں۔" اپنی پشت پر اسے خوب صورت پرندے کی گونج دار آواز سنائی دی تھی اور اس کے قدم رک گئے تھے۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔

"Princeton یونیورسٹی (نیو جرسی) کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ لیکن اب میں نیو جرسی جانا نہیں چاہتا۔ اصل میں میں اب کہیں بھی جانا نہیں چاہتا۔ اس شہر میں میری کوئی رہائش نہیں ہے اور میں کوئی رہائش رکھنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا۔ رات کو یہ بینچ ہی میرے لیے بستر کا کام کرتا ہے اور یہ پارک میرا ابدی گھر ہے۔"

وہ اس کے سارے سوالوں کے جواب دے کر خاموش ہو گیا تھا اور بیانکا روش کی سیدھ میں نصب باغ کے آہنی جنگلوں والے وکٹورین طرز کے بنے ہوئے بڑے گیٹ کو دیکھنے لگی تھی۔

فضا میں کچھ طباشیر کی بو پھیلی تھی۔ سادہ صفت گلابی راج ہنسوں کا غول ندی کے پانی کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرنے لگا تھا۔ ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے اڑتے ندی کے باسی پانی کے چھینٹے ہوا کی روش پر سوار ہو کر بیانکا کو شرابور اور سرشار کرنے لگے تھے۔

(روش کے اطراف سیدھ میں آگے دور تک گئے چیری کے درختوں پر جیسے ایک دم سے بہار آگئی تھی۔ اور سارے درخت گلابی رنگ کے پھولوں سے ڈھک گئے تھے۔

بیانکا نے گھر جانا تھا۔ اسے تیاری کرنی تھی۔ پھر ایئرپورٹ کے لیے نکلنا تھا۔ اور اس کے پیچھے وہ خوش مزاج شہزادہ بیٹھا تھا جو شاید اپنا سب ہی کچھ لٹا چکا تھا۔

اسے یاد آیا جیفر مام کوئی بھی اہم کام کرنے سے پہلے کسی کی مدد کرنے کے عقیدے پر بہت سختی سے کاربند رہا کرتی تھیں۔

"میرے ساتھ چلو گے۔۔؟" پلٹ کر بیانکا نے پوچھا تھا۔

"کہاں۔۔؟" توقف کے بعد وہ چوبی بینچ کے تختے پر تھوڑی رکھے حیرت سے گویا ہوا۔

"گھبراؤ نہیں۔۔ تمہیں اغوا نہیں کروں گی۔۔" وہ مسکرائی۔

"الہٰ نیہ سے تاوان دینے بھلا آئے گا بھی کون۔۔"

اور اب کے وہ بے اختیار ہنسی تو ایک لمحے کے لیے شہرام کے ہونٹوں کے کونوں میں بھی مسکراہٹ پھیلتی

چلی گئی تھی اور اس مسکراہٹ میں ققنس (ایک پرندہ جس کی چونچ سے 320 سر نکلتے ہیں) کے سارے سر شامل تھے۔

بیانکا اس کے لیے وہ ہی کر رہی تھی جو کسی وقت میں رچرڈ ہاؤس کے بوڑھے راہن اور اس کی بیوی نے اس کے لیے کیا تھا۔

✵ ✵ ✵

وہ ایک ماہ شکاگو میں رہی تھی۔

اسپیڈا جوف یانی وائنس کا شاگرد تھا اور انتہائی قابل بھی۔

اس سے میش اپ (مختلف گانوں کے ردھم سے تیار کیا گیا گانا) تیار کروانے کے لیے بیانکا نے اپنی باقی ماندہ دولت بھی خرچ کر ڈالی تھی اور فیصلہ قسمت اور وقت کے سپرد کر دیا تھا۔ ان دنوں وہ تقدیر کے پل صراط پر چل رہی تھی اور یہ پل صراط اسے ہر صورت طے کرنا تھا۔ تاہم کامیابی تک پہنچنے کے ممکنہ خدشوں کے باعث ابھی یہ نتیجہ زیادہ واضح نہیں تھا کہ اس نے اپنی باقی ماندہ دولت بہتر جگہ پر خرچ کی ہے یا آگ میں جھونک دی ہے۔

کچھ اس کی پچھلی آٹھ ماہ کی جاب کی مہارت تھی۔ کچھ اس مہارت پر ملنے والے کمنٹس اور کچھ اسپیڈا جوف کی بڑھتی ہوئی شہرت وہ قدرے مطمئن تھی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کو لے کر پرامید بھی۔

اس کے خیال میں میش اپ کے لیے 2014ء کے جن پانچ گانوں کا انتخاب اس نے کیا تھا اس کے بارے میں امریکہ کا کوئی ڈی جے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے سولو اور سیڈ گانوں کا انتخاب کیا تھا۔ اپنی جاب کے دوران بھی وہ زیادہ تر افسردہ گانے چلانے میں ہی مہارت رکھتی تھی۔ پھر اس نے لبنانی سازوں کی نئی اور پرانی دھنوں کو بھی چنا تھا۔

اسپیڈا جوف کو اس کے سارے انتخاب پر اختلاف تھا۔

"ہر چیز میں افسردگی کا رنگ غالب ہے۔۔ میں اس

کے ساتھ ایسا کیا کروں کہ سب ناچنے پر مجبور ہو جائیں ـــ"

"تم اس بات کی فکر نہ کرو۔۔۔ یہ میرا آٹھ ماہ کا تجربہ ہے۔"

"اور میرا دس سالہ۔۔۔ گیت کو بہت زیادہ دھیما کر بھی دیا گیا تو اصل روح تو وہ ہی رہے گی۔"

اسپیڈا جوف کی بات میں دم اور تجربہ تھا۔۔۔ لیکن یانکا پھر بھی ماننے کو تیار نہیں تھی۔

"دھنوں کے حوالے سے تم جو چاہے کر سکتے ہو۔۔۔ لیکن گانے یہ ہی رہیں گے۔" اس نے دو ٹوک اپنا فیصلہ سنا دیا۔

ایک ماہ لگاتار اس میش اپ پر کام ہوتا رہا تھا۔ وہ سازوں کے بارے میں اسپیڈا جوف سے زیادہ نہیں جانتی تھی۔ پھر بھی وہ تقریباً" ہر روز اس کے اسٹوڈیو میں پہنچ جاتی تھی۔ تاہم یہ اس کی مہربانی ہوتی تھی کہ وہ صرف رائے ہی دیتی تھی۔۔۔ مداخلت نہیں کرتی تھی۔

میش اپ تیار ہو چکا تھا۔ صرف ویڈیو مکسنگ کا کام ہو رہا تھا۔ یانکا اسے کلب کی اینیورسری پر ریلیز کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

ساتھ ساتھ اس کی نظر ان جشنوں پر بھی تھی کہ میش اپ اعلیٰ سے اعلیٰ ہی کیوں نہ ہو، وہ ایکدم سے شہرت کی بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا۔ ایسا کسی سنگر کے ساتھ تو ہو سکتا ہے لیکن کسی ڈی جے کے ساتھ نہیں۔

ہاں البتہ یہ ضرور تھا کہ کوئی میوزک کمپنی اسے بڑی آفر کر سکتی تھی۔ کسی بڑے سیون اسٹار ہوٹل کے کلب میں جگہ پانے میں آسانی ہو سکتی تھی یا وہ سیول ورلڈ ڈی جے فیسٹول میں جانے کی لمبی لائن میں کھڑے ہونے کے لیے اپنے پاس ایک ٹکٹ رکھتی تھی۔

اس کے اب تک پیچھے رہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ دوسری ڈی جے لڑکیوں کی طرح جھومتی ناچتی نہیں تھی۔ ایسے غیر اخلاقی کام کی سوچ بھی اس کی تربیت میں شامل نہیں تھی۔ مارنا میں کسی حد تک دوسری ڈی جے لڑکیوں کے سے اثرات پائے جاتے تھے، لیکن یانکا نے جاب اسی شرط پر کی تھی وہ صرف میوزک چلائے گی۔۔۔ اپنی جگہ ساکت رہ کر۔۔۔ کلب انتظامیہ اس سے دوسری ڈی جے لڑکیوں کی طرح کا رویہ اپنانے کا مطالبہ نہیں کرے گی۔

کلب بہت زیادہ معروف نہیں تھا اور یانکا کی شرائط بھی ایسی نامعقول نہیں تھیں۔

اس کے ان سخت اصولوں کے باوجود بھی اسے ادھر ادھر سے چھوٹی بڑی آفرز تو آتی ہی رہتی تھیں۔۔۔ کسی ہوٹل یا کلب کی۔۔۔ اور جن کو سن کر مارنا اپنے چہرے کے بدلتے رنگوں پر قدرت نہ رکھ پاتی تھی۔

"تم چاہتی کیا ہو یانکا۔۔۔ آخر تم اس آفر کو قبول کیوں نہیں کر لیتیں۔۔۔ وہ تمہیں یہاں کی نسبت دوگنی تنخواہ دے رہے ہیں۔"

"مجھے ایک ہی بار میں بڑی چھلانگ لگانی ہے مارنا ۔۔۔ تیراکی میں بتدریج طریقہ مجھے شروع سے ہی ناپسند رہا ہے۔ انسان جلدی تھک جاتا ہے۔ مجھے ڈائیونگ (Diving) کا شوق ہے۔۔۔ اونچی ڈائیونگ کا۔۔۔ سمر سلٹ کا۔۔۔ اور اس کا ابھی وقت نہیں آیا۔" مارنا اس کی باتیں سن کر لاجواب ہو جاتی تھی۔

اور اب شاید وقت آگیا تھا بڑی چھلانگ لگانے کا۔

اس بڑی چھلانگ کی متوقع خوشی کو وہ کسی کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی۔ کسی کو اپنی بے تابی کا رازدار بنانا چاہتی تھی۔ کوئی ایک ایسا جو اسے بالکل اپنا لگے اور آنے والے وقت کے سہانے خواب اس کی آنکھوں میں پڑھ لے۔

تب وہ نہیں جانتی تھی کہ پڑھنے والا کوئی اور تحریر پڑھ لے گا اور بتانے والا بھی کچھ اور بتا دے گا۔

پتا نہیں یہ وجوہات اس کے ذہن میں تھیں یا شہرام کا نام یاد آتے ہی اس نے ان بہانوں کو گھڑ لیا تھا جو کچھ بھی تھا۔ آج وہ بلا ارادہ اوک بلڈنگ تک نہیں جا رہی تھی۔ جہاں کے ایک نیم اندھیرے کمرے میں شہرام رہتا تھا۔

شکاگو جانے سے پہلے وہ اسی نیک کام کو کر کے گئی

تھی۔ اس نے ایک ماہ کا ایڈوانس کرایہ دیا تھا جس میں دو وقت کے کھانے کے چارجز بھی شامل تھے۔

"جب تم حالات کو اپنے لیے بہتر کر پاؤ تو ان پیسوں کو لوٹا دینا۔۔۔ نہ بھی دو گے تو کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ وہ بہت زیادہ پر جوش ہو رہی تھی۔

اس ایک ماہ کی غیر حاضری کے دوران اسے ٹوٹ کر یہ احساس ہوا تھا کہ شہرام کے پاس ایک سیل فون تو ہونا ہی چاہیے۔۔۔ وہ میک اپ کی تیاری کے سلسلے کی ہر بات اسے بتانا چاہتی تھی۔

"نجانے وہ اب تک اس بلڈنگ میں رہائش پذیر ہو گا یا کہیں اور جا چکا ہو گا۔" بیانکا کو یہ سوچ کر ایک خوف سا محسوس ہوا تھا۔

ٹیکسی بڑی سڑکوں کو ناپنے لگی تھی اور بیانکا کی نظریں افق کی دھار پر ٹکی ہوئی تھیں۔

دور۔۔۔ اونچی بلڈنگ کے نیم اندھیرے کمرے میں بیٹھا ہوا شہرام بھی اسی طرح کی لایعنی سوچوں میں غرق تھا۔

"اس کمرے میں تو کوئی روزن بھی نہیں ہے۔۔۔ اور وہ لڑکی مجھے یہاں داخل کروا کر خود نجانے کہاں جا چھپی ہے۔"

وہ دو ایک بار شائن کلب بھی گیا تھا جہاں سے اسے صرف یہ ہی پتا چل سکا کہ بیانکا غیر معینہ مدت کے لیے کلب سے چھٹی لے چکی ہے۔

"تو کیا وہ لڑکی صرف ایک لمحے کی مدد تھی جو آیا اور چلا گیا۔"

وہ مایوسی سے سوچنے لگا تھا۔

دونوں نہیں جانتے تھے کہ دونوں آج ملیں گے تو ایک دوجے کو اپنے اپنے ماضی کی وہ پرتیں بھی دکھا دیں گے جن سے آپ ابھی تک لاعلم ہیں۔

☆ ☆ ☆

مغرب کی طرف کا شہیدی رنگ آسمان کسی قتل کی واردات کی کہانی سناتا لگتا تھا۔

کھڑکی سے نظر آتی نیویارک شہر کی روشنیاں رفتہ رفتہ شباب کو پہنچنے والے جگنوؤں کی طرح دن ڈھل کے بیماری کے باعث گاڑھے ہوتے اندھیرے میں اپنی اپنی جگہ تلاش کر کے ٹمٹمانے لگی تھیں۔ دور سے یہ منظر کسی گڑھے میں پڑی پسی ہوئی چاندی کی طرح نظر آ رہا تھا۔

بیانکا نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے برابر کر دیے۔

حیفہ مام بڑی دیر سے باہر ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایسے کہ ان کی آنکھیں جیسے اسی رخ پتھرا گئی ہوں۔ بیانکا نے ایک دوبار انہیں ٹوکا بھی تھا لیکن وہ دوبارہ آنکھیں مسل کر باہر کے نظارے میں کھو جاتی تھیں۔ بیانکا کو ان کی اس حالت سے بڑا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے برابر کر دیے لیکن حیفہ موم کی نظریں نہیں پھری تھیں۔ وہ باہر دیکھ رہی ہوتیں تو چونکتیں۔

"آج ڈیڈی کو زیادہ دیر نہیں ہو گئی۔۔۔"

کارنس پر دھرے کرسٹل گلدان میں پڑے نقلی پھولوں سے پھیر جھاڑ کرتے ہوئے اس نے مام سے کہا تھا۔ کسی حد تک خود سے۔۔۔

"دعا کرو انہیں صرف دیر ہی ہوئی ہو۔۔۔ دیر سے ہی سہی وہ آج گھر واپس آ جائیں۔" حیفہ مام نے رندھی ہوئی آواز سے کہا تو پھولوں کی ایک ڈنڈی بیانکا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے فرش پر گر گئی۔ وہ حیفہ مام کی بات سے زیادہ ان کی غلافی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کو دیکھ کر چونکی تھی۔ آج صبح سے ہی حیفہ مام کا انداز بہت عجیب اور نیا سا تھا۔ نمی نے ان کی آنکھوں کے کناروں کو اکیلا نہیں ہونے دیا تھا اور وہ ضرورت سے زیادہ خاموش تھیں۔۔۔ اور کئی گھنٹوں سے اسی کرسی پر بیٹھی تھیں۔

آج انہوں نے بیانکا کو تیز آواز میں میوزک سننے سے بھی منع نہیں کیا تھا۔ آج نہ ہی وہ اپنی دوستوں کے ساتھ گھر سے باہر گئیں۔ اور نہ ہی ان کو اپنے گھر بلایا تھا۔

"ماما... سب خیریت تو ہے ناں..." وہ ایک بار پھر حیفہ موم کے قریب چلی آئی تھی۔

"خیریت...؟" وہ افسردگی سے چونکیں۔ "اسی کے لیے تو دعا کر رہی ہوں۔" ایک خاکستری آنسو ان کی آنکھ سے بہہ کر گال تک آگیا۔

"آپ نے کبھی ایسا رویہ نہیں اپنایا ماما... آپ کبھی مجھے اتنی کمزور دل نہیں لگیں۔" فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا تھا۔

حیفہ ماما اس کا سر سہلانے لگی تھیں۔

"کچھ واقعات زندگی میں پہلی بار ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں بیانکا..." انہوں نے دونوں آنکھوں کو باری باری اپنی شال سے صاف کیا تھا۔

"آپ جذباتی ہو رہی ہیں ماما... ڈیڈ آٹھ بجے تک آتے ہیں... اور ابھی صرف آدھا گھنٹہ ہی تو زیادہ ہوا ہے۔"

"تو بج جائیں... دس بج جائیں... رات گزر جائے... لیکن میرے دل کے خوف... خدا کرے بس یہ پورے نہ ہوں۔"

"آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں... میں ڈیڈ کا فون پھر ٹرائی کرتی ہوں... کسی وجہ سے ہی بند ہوگا... ورنہ تایا غفار کو کرلیتی ہوں... وہ بتادیں گے کہ ڈیڈ وہاں سے کب نکلے تھے۔"

وہ اٹھنے لگی تو حیفہ موم نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے دوبارہ نیچے بٹھا دیا تھا۔

"خدا کے لیے یہ مت کرو بیانکا... کیا میں ایسا نہیں کرسکتی... میں اپنی دعاؤں کو اور وقت کو مزید مہلت دینا چاہتی ہوں... اگر فون تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا یا تمہاری آنکھوں کی پتلیاں ذرا سی بھی پھیلیں تو... تو میرا دل اسی وقت بند ہو جائے گا۔"

حیفہ موم نے لرزش زدہ آواز سے کہا اور پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی تھیں۔ بیانکا کا دل نتھی میں آگیا تھا۔

"ان سے پہلے ان کی خوشبو مجھ تک پہنچ جائے گی... جو آج... جو آج انہوں نے یہاں پہنچنا ہوا تو..." وہ روتے ہوئے گویا ہوئیں تو بیانکا نے چونک کر پتھرائی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔

تب ہی نجانے کہاں سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اندر آیا تھا۔ جس کے انگ انگ میں کافور کی بو رچی بسی ہوئی تھی۔

الیاس کریم پچیس سال پہلے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں چھوٹی پوسٹ پر تعینات ہو کر پاکستان سے امریکہ آیا تھا۔ پاکستان کے شہر خانیوال میں اس کے خاندان میں دو بوڑھے ماں باپ ایک بڑے اور ایک چھوٹے بھائی کے علاوہ اس کی بچپن کی منگیتر شہناز بھی موجود تھی۔ شہناز الیاس کی چچازاد تھی۔ جو چچا چچی کے انتقال کے بعد سے ان کے گھر ہی رہ رہی تھی۔ دونوں کی شادی دو سال بعد ہونا متوقع تھی۔ لیکن کون جانتا تھا کہ قسمت اور خود الیاس کریم کا منظور نظر کچھ اور ہی ہونے والا تھا۔

جس کمپنی میں الیاس کام کرتا تھا اسی کمپنی میں ایک سال پہلے حیفہ یازر بھی اپنی تعلیمی قابلیت اور ذہانت کی بنا پر ملازمت اختیار کیے ہوئے تھی۔

حیفہ یازر کا تعلق لبنان سے تھا۔ وہ بچپن سے ہی غربت اور بہت برے حالات میں پلی بڑھی تھی اور باپ کی وفات کے بعد ماں کو رشتے داروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آئی تھی۔

الیاس کریم سے یہ ساری باتیں کرنے تک... دونوں بہت اچھے دوست بن چکے تھے۔

حیفہ نوجوان تھی... پرکشش بھی اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں بیشتر لبنانی لڑکیوں کی طرح قدرتی کاجل کی دہک نصب تھی۔ اور یہ قدرتی کاجل کی دہک وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الیاس کو دن کے علاوہ راتوں کو بھی پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ بھول گئے تھے کہ پاکستان میں ان کی نسبت شہناز سے طے ہے۔

حیفہ یازر کے متعلق سوچنے کی اخلاقی چوری نے رفتہ رفتہ الیاس کریم کا احساس جرم اتنا بڑھا دیا کہ پھر جلد ہی انہوں نے اس پریشانی کا مقابلہ کرلینے کی ٹھان لی۔

حیفہ یازر الیاس کے جذبات سے بہت دنوں تک غافل نہیں رہی۔ خود اس کے جذبات بھی کچھ اسی نوعیت کے تھے۔ لبنان میں بوڑھی ماں کی وفات کی خبر نے اسے مزید بے آسرا اور اکیلا کر دیا تھا۔ اس نے الیاس کو مشورہ دیا کہ وہ جلد ہی اپنے والدین کو دونوں کے فیصلے کے بارے میں آگاہ کریں۔

الیاس نے ایک دن ہمت کر کے اپنے والدین سے بات کی تھی اور انہیں حیفہ یازر کے متعلق بتایا تھا۔ اس بات چیت کا جو نتیجہ نکلا تھا وہ الیاس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ دونوں نے انہیں خود سر' باغی اور نافرمان کا خطاب دیا تھا اور ان پر پاکستان واپس آنے کے لیے دباؤ ڈالا تھا۔

اس دن کے بعد الیاس نے وقفے وقفے سے ان کو منانے کی کوشش کی تھی اور فائدہ صرف اتنا ہوا تھا کہ ان کو ملنے والے خطابات روز بروز بڑھنے لگے تھے۔

حیفہ اس ساری صورت حال سے الگ پریشان تھی۔

پھر ایک دن الیاس نے پاکستان جا کر والدین کو منانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ فون پر وہ شاید اس کی مجبوری اور محبت کو صحیح طرح سمجھ نہیں پا رہے۔ شاید روبرو بات کرنے اور بھائیوں کے ساتھ کے بعد حالات مناسب رخ اختیار کر لیں' لیکن یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔

پاکستان آنے کے بعد انہیں غضب ناک آواز کے ساتھ ساتھ نفرت انگیز تاثرات بھی دیکھنے کو ملے تھے۔ دونوں الیاس کے بچپن سے اب تک کے سارے احسانوں کی فہرست مرتب کیے بیٹھے تھے۔ اور انہیں جذباتی بلیک میل کرنے کا آخری حربہ آزما رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اس بات پر بھی بضد تھے کہ الیاس شہناز سے ابھی کہ ابھی شادی کر کے ہی واپس امریکہ جائیں۔

شہناز میں کوئی برائی نہیں تھی' لیکن یہاں معاملہ دل کا تھا جو پوری طرح حیفہ کی محبت میں ڈوب چکا تھا۔ الیاس نے اسی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ کیا جو ایسے موقعوں پر عموماً لڑکے کرتے ہیں۔

رات کے ایک پہر انہوں نے اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

امریکہ واپس آ کر انہوں نے حیفہ سے شادی کر لی۔ پاکستان سے ان کا ہر کسی سے ناتا ٹوٹ گیا تھا۔ سوائے سب سے چھوٹے بھائی جلال کے۔

دو سال بعد دونوں کے گھر بیٹی پیدا ہوئی تھی جس کا نام انہوں نے بیانکا (خالص سفید) رکھا تھا۔

تین سال بعد وہ دونوں اپنا گھر خریدنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور بہت خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔

اپنے آفس میں کام کے دوران الیاس کی نظروں سے زراعت کے شعبے میں حکومت کی غیر معمولی اور بڑھتی ہوئی دلچسپیوں کے منصوبے کے خاکے گزرے تو اسے اپنے چھوٹے بھائی جلال کریم کا خیال آیا تھا۔ جلال کی تعلیمی قابلیت اگرچہ الیاس جتنی نہیں تھی۔ لیکن زراعت میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی۔ خصوصاً" دھان اور سورج مکھی کی فصلوں میں وہ کسی حکیم کا سا درجہ رکھتا تھا۔

الیاس نے جلال سے بات کی کہ وہ یہاں آ کر اپنی قسمت آزمائے اور جلال دو ماہ بعد ہی امریکہ چلا آیا۔ یہاں جلد ہی اس کا کام بن گیا اور نیویارک سے تقریباً" چار گھنٹے کی مسافت پر (کنیکٹی کٹ) میں اسے ایک جاب مل گئی۔

ایک سال بعد جلال نے اپنے بڑے بھائی غفار اور اپنی بیوی فیروزہ کو بھی پاکستان سے امریکہ بلا لیا تھا۔ غفار کی شادی الیاس کے گھر چھوڑ کر جانے کے بعد شہناز سے کر دی گئی تھی۔ الیاس ان دنوں بہت خوش تھے۔ ناراضگی اور لاتعلقی کی برف رفتہ رفتہ پگھلنے لگی تھی۔

دو سال بعد شہناز اپنے بڑے بیٹے احمد کے ساتھ اکیلی امریکہ نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس کے ساتھ الیاس کے والدین بھی تھے۔ الیاس نے ان سے معافی مانگنے میں پھر دیر نہیں کی۔ دونوں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اور تعلقات کافی استوار ہو چکے تھے۔

پھر باپ کی وفات کے چند ماہ بعد ہی ماں کی وفات

نے گویا ہر طرح کی رنجش ہی ختم کردی۔

تب سے الیاس کا یہ معمول تھا کہ وہ ہفتے دو ہفتے بعد ایک دو دن اپنے بھائیوں اور بھابھیوں کے ساتھ گزارہ کرتے تھے' کنیکٹی کٹ کے مضافات میں سورج مکھی کے کھیتوں کے درمیان ایگریکلچر اتھارٹی کی طرف سے ملا ہوا ایک بہت بڑا گھر تھا جہاں اس کے بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ غفار اور شہناز کا صرف ایک بیٹا تھا۔ احمد جبکہ جلال اور فیروزہ شادی کے بائیس سال بعد تک بے اولاد تھے۔

حیفہ بھی اکثر الیاس کے ساتھ وہاں جاتی تھی' لیکن نجانے کیا بات تھی حیفہ ان سے زیادہ بے تکلفی پیدا نہیں کر سکی تھی اور اس معاملے میں وہ ان لوگوں کو ہی مورد الزام ٹھہراتی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے قیمتی مشورے سے جلال اور فیروزہ کو بارہا نواز چکی تھی کہ وہ کوئی بے بی اڈاپٹ کرلیں' لیکن اس معاملے میں ان کی پرانی قدریں آڑے آجاتی تھیں۔

الیاس کا آج کا بھائیوں کی طرف جانا بھی اس کے پرانے معمول کا ہی حصہ تھا۔ سیل فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور حیفہ بم اپنی جگہ سے مس سے مس نہیں ہو رہی تھیں۔ انہیں اطلاعی گھنٹی کے بجنے کا انتظار تھا اور سیل فون کی بجتی گھنٹی نے ان کے ٹوٹ چکے اعصاب پر گویا گورکن کا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ان کی چھٹی حس بھی گھنٹی کے ساتھ ساتھ بڑے خطرناک انداز میں جھنجھنا رہی تھی۔

بیانکا نے ہی فون ریسیو کیا تھا۔

"ہیلو۔ حیفہ بھابھی۔" چچا جلال کی آواز آئی تھی۔

"نہیں چچا۔ میں بیانکا بات کر رہی ہوں۔"

"بیانکا! حیفہ کہاں ہے؟۔ رہنے دو۔ اسے نہ بلاؤ۔ میں' میں بیانکا میری بات غور سے سنو بیٹی' ذرا تحمل اور حوصلے کے ساتھ۔"

"کیا بات ہے چچا۔؟"

بیانکا کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس نے اپنی آواز کو دھیما کر لیا تاکہ حیفہ مام نہ سن پائیں۔ اور رخ بدل لیا کہ وہ اسے دیکھ بھی نہ سکیں۔

"بیانکا۔ بیانکا بیٹی۔ دراصل۔ خدا کے لیے پہلے تم کہیں بیٹھ جاؤ۔ دراصل بات یہ ہے کہ الیاس بھائی کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ تم پریشان مت ہونا۔ غفار بھائی اور احمد انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں۔ تم ایسا کرو۔ تم اور حیفہ بھابھی یہاں ہی آجاؤ۔ الیاس بھائی کی صحت کے بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہم تو بس دعا ہی کرسکتے ہیں۔ تم سن رہی ہو نا بیانکا۔ تم دونوں جلدی یہاں پہنچو۔ بیانکا تم مجھے سن رہی ہو نا بیانکا۔ بیانکا۔ بیانکا۔"

اوندھے ہوئے موبائل سے نکلتی چچا جلال کی آواز چوبی فرش سے ٹکرا کر بڑی وحشت ناک صورت حال اختیار کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

البانیہ کا شہر ارجیر۔

ارجیر کی جنگلی درختوں والی پہاڑی سرد ہواؤں نے اسے کسی بچے کی طرح گود میں اٹھا کر بھرپور بوسہ دیا تھا۔ ساڑھے تین سال کی لمبی غیر حاضری کے عرصہ نے اس بوسے کو بے پناہ منتظر اور طویل کر دیا تھا۔

وہ یجنسٹن یونیورسٹی (نیوجرسی) میں قیام کے ساڑھے تین سال بعد ارجیر واپس لوٹا تھا۔ اس کے مستقل طور پر امریکہ سے البانیہ آجانے میں ابھی مزید چھ ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی پندرہ روزہ ہنگامی چھٹیوں نے اسے اچانک البانیہ کا دورہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نجانے اسے اماں نتوبیہ کی یاد یہاں کھینچ لائی تھی' یا بابا زلاری کی 'میرین' طامیہ حسنی کی۔ اس بات کا فیصلہ کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ لیکن سارے عوامل نے مل کر اس کے ذہن پر دباؤ ڈالا تھا اور وہ سب کو حیران اور خود کو خوش کرنے البانیہ پہنچ گیا تھا۔

ٹیکسی سے اتر کر اس نے ایک طویل اور خوشگوار سانس اندر کھینچا تھا۔ جنگلی درختوں سے ٹکرا کر آتی ہوا میں خون کو مستی۔ کر دینے کی طاقت تھی۔ اس

گہرے سانس نے اس کی سفر کی ساری تھکن کو پلک جھپکتے میں دور کر دیا۔ وہ ہر ہر درخت اور پتے کی خوشبو کو اپنے اندر کھینچ لینا چاہتا تھا۔ درختوں سے محبت کرنا اسے بابا زلاری نے سکھایا تھا اور وہ اس شاگردی میں اتنا طاق رہا تھا کہ درختوں سمیت انسانی تعلق کے ہر معاملے میں بھی محبوب بننے کو ترجیح دیا کرتا تھا۔

ٹیکسی اس نے اپنے گھر سے بہت پیچھے اور نیچے ہی رکوائی تھی۔ راستے میں اسے بہت سے لوگوں سے ملنا تھا۔ اپنے دیرینہ دوست طامیر سے 'منگیتر میرین سے اور... اور "کدام" کے درخت سے بھی...

مسکراہٹ اس کے لبوں پر گل صد برگ کی طرح کھلی ہوئی تھی۔

اس نے تینوں منزلوں کو ملانے والی پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا۔ یہاں سے ارجیریال (فوڈ سٹریٹ) تک کا راستہ تقریباً" دو کلو میٹر تھا اور دو کلو میٹر کی یہ چڑھائی آج کسی صورت اسے تھکا نہیں سکتی تھی۔ اس نے زمین کی کشش کی ہم نوائی اور میزبانی کو قبول کیا اور چڑھنا شروع کر دیا۔

ساڑھے تین سالوں نے ارجیر پر زیادہ نمایاں اثرات مرتب نہ کیے تھے۔ کچھ تعمیرات نئی ہوئی تھیں۔ کچھ ہوٹل 'گھر اور درخت مزید اونچے ہو گئے تھے۔ چند ایک نئی پگڈنڈیوں نے جنم لیا تھا۔ اور راہ میں پڑنے والے جھرنے سکڑاؤ کا شکار ہوئے تھے۔

اوپر چڑھتے چڑھتے وہ سوچنے لگا کہ ان گم شدہ سالوں نے اس کے چاہنے والوں پر کیا کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے۔

طامیر کی داڑھی کے بال یقیناً مکمل طور پر آ چکے ہوں گے۔ عالم شباب سے ہی اس کے چہرے پر بالوں کی تعداد خاصی کم تھی۔ اسی وجہ سے دونوں کے مشترکہ دوست اسے لڑکی لڑکی کہہ کر چھیڑتے تھے۔ تنگ آکر طامیر نے چپکے چپکے بہت سے ٹوٹکوں کو آزمانا شروع کر دیا تھا۔ خصوصاً" چہرے پر انڈے کی زردی لگانے والے عمل کو تو وہ تقریباً" روز ہی کیا کرتا تھا۔

اور میرین... اس کی چھیتنی ہرن کی سی کرنجی آنکھوں میں بھسم کر دینے کی طاقت کیا" بیانہ تھا ٹھیں ماری ہوگی اور اس کے گال جو پہلے ہی دہکتے ہوئے لگتے تھے۔ اب تو انہوں نے آگ ہی پکڑ لی ہوگی۔

اپنے تخیل میں کچھ سوچ کر وہ مسکرایا اور اس طرح مسکرایا کہ پرواز کرنے والے پرندے رک کر اسے دیکھنے لگے اور والائی (طرز مخاطب) حسنی۔ سنجیدہ۔ بردبار اور کم گو۔ شاید ان کے چہرے کے چوب دار تاثرات میں کچھ لچک آگئی ہو۔

اس کے پیروں کے نیچے مرجھائے سوکھے پتوں کے ڈھیر آکر چرمرانے لگے تھے۔

اماں زنتوبیہ... اور بابا زلاری... جو ہر وقت "سان" اور "سکی" کے لقب کو لے کر نوک جھونک کیا کرتے تھے یا تو یہ القاب بھول گئے ہوں گے یا ان کو لے کر دونوں میں باقاعدہ زبردست قسم کی لڑائی ہوتی ہوگی۔

اس نے پشت پر لٹکتے سفری بیگ کو دائیں کندھے سے اتار کر بائیں کندھے پر ڈالا۔ بوجھ زیادہ تھا اور اس کی تمام تر خوشی کے آگے ہیچ بھی۔ اس نے رک کر اوپر تک جاتی پگڈنڈی پر نظر ڈالی۔ دھوپ میں بدلتی چھاؤں سارے راستے کو خنک کرنے لگی تھی۔

شہرام کے والدین کا ارجیریال پر ایک وسیع و عریض ریسٹورنٹ تھا۔ جس کا کافی حصہ اس باغ پر مشتمل تھا جس سے قلعہ (پہاڑ کی چوٹی) اور جھرنے کی خوب صورتی کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

لیکن یہ ریسٹورنٹ صرف اپنی خوب صورتی کی وجہ سے مشہور نہیں تھا' بلکہ اس کے کھانوں کی شہرت اس کی خوب صورتی سے کہیں زیادہ جاہ کن تھی۔ ریسٹورنٹ میں باربی کیو تو تقریباً" ہر ہی قسم فراہم کی جاتی تھی۔

اماں زنتوبیہ اپنے رعب' قابلیت اور تجربے کی بنا پر اس ریسٹورنٹ کی ہیڈ تھیں۔ باقی معاملات میں کچھ لچک سہی' لیکن گرل (بھٹی) پر کھڑے ہونے کی اجازت کسی ملازم کو کیا خود بابا زلاری تک کو نہیں تھی۔ وہ پچھلے بیس سالوں سے باربی کیو کر رہی تھیں

اور صرف وہ ہی کر رہی تھیں۔ ان کے پکائے کبابوں، بنا تیل کے بنی مچھلی اور تندور میں پکی چانپوں کی شہرت ارجیر کی فضاؤں کو پار کر کے البانیہ کے دوسرے شہروں تک پھیلی ہوئی تھی۔

تھکاوٹ اور بیماری کو تو کوئی اہمیت ہی نہ دی جاتی اور اگر کوئی خاص مجبوری آ بھی جاتی تو گرل کسی ملازم یا بابا زلاری کے حوالے کرنے کے بجائے ریسٹورنٹ کو ہی بند کر دیا جاتا۔ اماں نتھوبیہ اپنے اصولوں میں کھجور کے درخت کی طرح سخت اور ضروری تھیں۔ وہ اس معاملے میں بابا زلاری پر بھی اعتماد نہ کرتی تھیں۔

"جس سان (بڑے اوزار تیز کرنے کا پتھر) پر تم نوکے چھریاں تیز کرتے ہو، اس کا وار میری محنت پر کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارا کام مسالے پیسنا، گوشت کاٹنا اور میزبانی کرنا ہے۔ کیا میں نے کبھی تمہارے کاموں میں دخل دیا۔ میرے ہوتے ہوئے گرل پر کوئی کھڑا نہیں ہو گا۔" اماں نتھوبیہ فیصلہ کن لہجے میں کہہ دیتیں۔

بابا زلاری اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی چٹان کو تو کھسکایا جا سکتا ہے، لیکن اماں نتھوبیہ کو ان کے فیصلے سے ہرگز نہیں۔۔۔ لیکن پھر بھی انہیں اماں نتھوبیہ کو چڑانے میں ایک خاص لطف آتا تھا۔

"تم سمجھتی ہو، تم کامل ہو۔۔۔ دنیا میں ہزاروں، لاکھوں جگہ پر گرلنگ ہو رہی ہے اور وہ سب تم سے کہیں زیادہ بہتر کر رہے ہوں گے۔۔۔ تمہیں گھمنڈ ہے کہ کوئی تمہارے جیسی کر ہی نہیں سکتا۔"

"ہاں۔۔۔ مجھے یہ ہی گھمنڈ ہے۔۔۔ میں لمحے بھر کے لیے رسک نہیں لے سکتی۔ کوئی اور یا تو کبابوں کو جلا دے گا یا کچا رہنے دے گا۔ میری برسوں کی محنت رائیگاں چلی جائے گی اور برسوں کے خوش باش گاہک ناراض ہونے لگیں گے۔ ہم میں سے میرے علاوہ کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔ خاص کر تم زلاری۔۔۔"

اماں نتھوبیہ بھی بابا کو چڑاتیں۔۔۔ وہ طنز کرنے کے لیے ہر وقت موقع کی تاک میں رہا کرتی تھیں۔

پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے بابا زلاری کو گویا نہال ہی کر دیا۔

مال کو پر رونق اور سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنانے کے لیے حکومت نے کچھ ترقیاتی کاموں کا آغاز کیا تھا۔ وسیع مال پر اپنے اپنے نام کے جھنڈے گاڑنے کے لیے دو مشروب ساز کمپنیوں میں کھینچا تانی چل رہی تھی۔ اماں نتھوبیہ نے ایک کمپنی کی آفر کو رد کر کے دوسری کمپنی سے دوگنی قیمت پر پانچ سال کا کنٹریکٹ کیا تھا۔ نادانی اور کسی حد تک بے وقوفی میں کیا گیا یہ کنٹریکٹ ایک ایسی غلطی ثابت ہوا جس کا اندازہ انہیں وقت گزرنے کے ساتھ ہوا تھا۔ نیون سائن کو روشن رکھنے کے علاوہ پہلی کمپنی ریسٹورنٹ کے پینٹ کے لیے بھی ہر چھ ماہ بعد معقول رقم دینے والی تھی اور ان کا کنٹریکٹ رقبے کے لحاظ سے تھا۔ دوسری کمپنی سے ملی دوگنی قیمت پہلی کمپنی کی مجموعی رقم کا چوتھا حصہ بھی نہ تھی۔

شرمندہ شرمندہ اماں نتھوبیہ چاہتی تھیں کہ یہ باتیں کسی بھی طرح بابا زلاری تک نہ پہنچیں پر ایسا ہو کر رہا۔

اماں نتھوبیہ کے علاوہ گھر کے باقی افراد اس دن ساری رات ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔

"قصور اس کا بھی نہیں۔۔۔ یہ سلی (اوزار تیز کرنے کی چھوٹی پتھری) ہے نا۔۔۔ چھوٹے وار کرنے والی۔۔۔ عورت بڑے وار کرنے کا سوچ تو سکتی ہے، لیکن بے چاری کر نہیں سکتی۔۔۔ اس کی حیثیت ہی ادنیٰ ہوتی ہے۔۔۔ دنیا کی ساری عورتیں ہی سلیاں ہیں۔۔۔ بے وقوفی کی انتہا پر پہنچی ہوئی۔ صرف مرد ہی سان ہوتا ہے۔ بڑے وار کرنے والا، ایک ہی وار میں چت کر جانے والا۔"

"اچھا۔۔۔ اب بس کرو۔"

بابا زلاری کے ہاتھ قسمت سے جو موقع آیا تھا، وہ اس کا بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے اور اماں نتھوبیہ کی برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔

"عورت کسی قابل ہوتی تو دنیا کی جنگوں میں اس کا بھی نام ہوتا۔۔۔ لیکن تمہاری ماں کو کیا ہوا۔۔۔ یہ تو خود کو

سارے جہان کے مردوں سے زیادہ عقل مند اور ذہین و فطین سمجھتی تھی۔"

بابا زلاری کا لیکچر ختم نہیں ہو رہا تھا۔ غصے سے اماں نتوسیہ کا چہرہ لال ٹماٹر ہو گیا تھا۔ جسے دیکھ دیکھ کر شہرام اور ولائی جنسی کی ہنسی نہ تھمنے میں آتی تھی۔

اس دن سے بعد دونوں کے لقب "سان اور سلی" ہو کر رہ گئے تھے۔

اور ان القاب پر جس جس طرح کی لڑائی ہوئی تھی، وہ کچھ کچھ صلیبی جنگوں سے ملتی جلتی تھی۔

چلتے چلتے شہرام کدام کے گھنے سایہ دار درخت کے قریب آ گیا تھا۔

یہ درخت اسے اپنے بچپن سے ہی دیودار اور صنوبر کے درختوں کے جھرمٹ میں کھڑا بڑا عجیب فسوں خیز لگتا تھا۔ جیسے اس کی قلم کسی چٹان سے آئی ہو یا اس کی آبیاری کسی برگزیدہ ہستی نے کی ہو۔

شہرام اور سیرین کے بیشتر موسم اسی درخت کے حدود اربعہ میں گزرے تھے۔

بیضوی شکل ٹیلے پر چڑھ کر وہ شاخ تلاش کرنے میں شہرام کو زیادہ وقت نہیں لگا جس پر اس نے چار گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد ایک گلاب کا پھول ابھارا تھا۔ پھول ابھی بھی ویسا ہی تھا۔ کوئی پتی چھلی ہوئی یا ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔ البتہ رنگ پر کائی کی دبیز تہہ چڑھ گئی تھی جو نکھرے ہوئے رنگوں کا مقدر رہتی ہے۔

پھول کو جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔

بابا زلاری اپنے روز مرہ کے کاموں کے علاوہ لکڑی پر مصوری کرنے کا شوق بھی رکھتے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر یہ شوق کسی حد تک شہرام میں بھی منتقل ہو گیا تھا۔

ایک دوپہر وہ گھر سے بابا زلاری کے سارے اوزار اٹھا لایا تھا اور کدام کی ایک موٹی شاخ پر گلاب کا پھول کاڑھنے کے لیے اس نے اپنی ساری توانائی اور تخلیقی قوت صرف کر دی تھی۔ وہ محض لکیریں نہیں تھیں۔ بلکہ شاخ سے پھوٹتا کوئی اصلی پھول معلوم ہوتا تھا۔

قریب ہی سیرین بھی کچھ بنانے میں مشغول رہی تھی۔

جب شہرام کا پھول ابھر آیا تو اس نے سیرن کی بنائی شبیہ پر توجہ دی تھی۔ وہ لالے کا پھول تھا۔ ناگواری کا ایک احساس شہرام کو چھو کر گزر گیا۔

"مانا کہ میں تمہارے جتنی ماہر نہیں ہوں۔ مگر پھول اتنا بھی برا نہیں بنا کہ تم میری حوصلہ افزائی نہ کر سکو۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ایسے میں اس کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو جاتی تھی اور شہرام اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ اور دیکھنا بھول جاتا تھا۔

"تم نے لالے کا پھول کیوں بنایا؟"

"کیونکہ یہ مجھے پسند ہے۔"

"کیا تمہیں نہیں پتا کہ لالہ گلاب کا رقیب ہے؟"

شہرام نے سنجیدہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا تھا اور سیرن قہقہہ لگا کر ہنسی تھی۔ شہرام سب کچھ بھول کر وقتی طور پر خود کو اس دنیا کا بادشاہ سمجھنے لگا تھا۔

"یہ باتیں شاعری اور افسانوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ سائنس اور حقیقت پر بھروسا کرنا سیکھو۔"

"پھر بھی تمہیں کچھ اور بنانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔"

"اگلی بار تمہاری نصیحت پر عمل کروں گی۔ اب چلو کافی دیر ہو گئی ہے۔" وہ شہرام کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگی۔ شہرام تھکے قدموں سے اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ نظر انداز کر دینے کے باوجود گلاب کے پھول کے ساتھ لالے کے پھول کا منظر اس کی شعور کی آنکھ سے ہٹا ہی نہیں تھا۔ اس نے اس منظر کو برا شگون جانا تھا۔

دو ماہ بعد جب دونوں کی منگنی اس دھوم دھام سے ہوئی کہ پورا ارخیر حیران رہ گیا تو اس کے تمام منفی خیالات اور وسوسے خود بخود ہی ختم ہو گئے تھے۔

پگڈنڈی نے ایک جگہ کھلے احاطے کی صورت اختیار کر لی تو وہ رک گیا۔ طامیر کے گھر کا کھلا دروازہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ اس نے کھلے دروازے کے ایک پٹ میں منہ ڈال کر اندر دیکھا۔

مخملی رو میں دار سفید پروں والے رومانی کبوتروں کا غول تھا جو دلیر کے آگے سے صحن میں چاروں طرف

بکھرے دانے کو چگتے ہوئے غٹرغوں غٹرغوں کر رہا تھا۔ معاً چند کبوتروں نے شہرام کے چہرے کو دیکھ لیا اور ایک اجنبی کو دیکھ کر خوف سے ان کی غٹرغوں مزید بلند ہو گئی۔

طامیر وسیع صحن کے درمیان اسٹول پر بیٹھا کبوتروں کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ شہرام نے ایک قدم اندر رکھا تو دہلیز کے قریب بیٹھے کبوتر اڑ کر دور چلے گئے۔ طامیر نے سر اٹھایا تھا۔

"شہرام...!" شہرام کو دیکھ کر طامیر گویا سکتے میں جا کر بری طرح چونکا تھا۔ "شہرام میرے دوست... اس طرح اچانک۔"

وہ اس بے خودی سے اٹھا کہ گود میں دھری باجرے کی تھالی زمین پر لڑھک گئی اور اس کے تیز قدموں کے باعث کبوتروں کا سارا غول اڑ کر آسمان کی طرف نکل گیا۔

طامیر نے دیوانہ ہو کر شہرام کو چوم ڈالا اور بازوؤں میں کس کے پتھ اس طرح پکڑا کہ شہرام زمین سے دو انچ اوپر اٹھ گیا۔

"اے... بائے۔" شہرام کے منہ سے آہ نکل گئی تو طامیر ہنسنے لگا۔ اس نے اسے واپس زمین پر چھوڑا۔

"مجھے پہلے کیوں نہ اطلاع کی... اتنی دور سے آمد کا پروگرام اچانک نہیں بن سکتا... میں تجھے لینے ایئر پورٹ آتا۔"

"میں بتا کر آتا تو یہ منظر بھلا کب دیکھنے کو ملتا۔" شہرام نے گرے ہوئے باجرے کی طرف اشارہ کیا تو طامیر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

"سامان تو اتار کندھے سے... اندر بیٹھ... کتنے دنوں کے لیے آیا ہے۔ خدایا کتنی باتیں ہیں تجھ سے کرنے والی... نہ جانے ان دنوں میں ہو بھی سکیں گی کہ نہیں۔" وہ اس کے کندھے سے سامان اتارنے لگا۔

"بیٹھوں گا مگر ابھی نہیں... ابھی مجھے اوپر (پہاڑ کے اوپر) جانا ہے... امی ابو سے ملنا ہے... یہ بیگ بھی پکڑنے... میرے تو ہاتھ درد کرنے لگے ہیں... امی کہاں ہیں۔"

"امی بازار گئی ہیں... تو تھک گیا ہو گا... تھوڑی دیر بیٹھ جا... کبوتروں کے واپس آنے کا انتظار کر لیتے ہیں۔"

"نہیں میں بالکل نہیں تھکا... بیٹھ گیا تو یقیناً آرام کرنے کا دل کرے۔"

"اچھا... پھر مجھے تالا ڈھونڈنے دے... اماں پتا نہیں ایسی چیزوں کو کہاں رکھتی ہیں۔"

"نہیں مل رہا تو رہنے دے... تالے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں یار... ارجیر میں پچھلے کئی ماہ سے بہت سی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔ کیا خالہ زہتو سیہ کو بھی نہیں پتا تیرے آنے کا۔"

"نہیں انہیں بھی نہیں پتا... کیسی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

واپس باہر آتے ہوئے شہرام نے پوچھا تھا۔ طامیر لمحے بھر کو چپ ہو گیا تھا۔

"بس ویسی ہی جیسی دنیا کے باقی حصوں میں ہوتی ہیں۔ کچھ دستوری... کچھ قلبی... ان وارداتوں پر زیادہ حیران نہیں ہونا چاہیے... تجھے ایک فون تو کرنا چاہیے تھا۔" طامیر نے بات کا موضوع بدلا۔

پشت پر طامیر کا گھر ایک دھبے کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ دونوں کافی آگے بڑھ گئے تو پگڈنڈی کے ایک ایسے موڑ پر جہاں پگڈنڈی دو شاخہ ہو جاتی تھی۔ شہرام نے طامیر کو کراس کیا تھا۔

"یہاں کہاں... ہمیں تو اوپر جانا ہے۔" طامیر نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ہاں... پر پہلے مجھے میرین سے ملنا ہے۔"

"بعد میں مل لینا۔"

"حرج ہی کیا ہے... صرف چند منٹ ہی تو زیادہ کا سفر ہے۔"

شہرام چلنے لگا اور ایک بات اس نے واضح طور پر نوٹ کی کہ میرین کا نام لینے پر طامیر کے چہرے پر بڑی تنفور سی سختی در آئی تھی۔ اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ طامیر نے اس تنفور سختی کو چھپانے کی کوشش

بھی نہیں کی تھی۔ شہرام نے اسے وقتی رویہ جان کر نظرانداز کر دیا تھا۔ ورنہ طامیر یہ بات بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ دنیا میں اگر شہرام کے لیے کوئی جنت تھی تو اس جنت کا نام بلاشبہ سیرین ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے پر رفتہ رفتہ سلگنے لگے تھے اور دھواں تھا کہ سارے منظروں کو اودی پرچھائیوں سے ڈھکتا جا رہا تھا۔

وقت کی سانسوں میں بند قبر کی سی وحشت تھی۔ چیزیں اپنے وجود کے ساتھ موجود تو نظر آتی تھیں، لیکن نزع کے کرب میں مبتلا لمحہ بہ لمحہ مرتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

وہ چار گھنٹوں کا سفر مختصر نہیں ہوتا تھا۔ اس چار گھنٹے کے سفر میں چار صدیاں سرایت کر گئی تھیں اور بیانکا کی عمر اتنی نہیں تھی۔ اس لیے وہ مر مر کر دوبارہ زندہ ہو رہی تھی۔ اس بار بار مرن جیون کے کھیل نے اسے ہلکان کر کے ادھ موا کر دیا تھا۔

دعا مانگنے کے لیے وقت بہت زیادہ تھا، لیکن قبولیت کے لیے شاید بہت کم۔ کچھ فضا میں موت کی باس اس طور پھیلی تھی کہ دعا صرف ہونٹوں سے ادا ہوتی تھی۔ دل اس دعا کے ساتھ نہیں دھڑکتا تھا۔

پھر سفر کے اختتام پر جو منظر ان کے سامنے تھا وہ تخیلاتی طور پر ناقابل یقین سہی۔ لیکن تصوراتی حس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

بیانکا کو یاد نہیں تھا کہ وہ اپنے بچپن سے لے کر اب تک کبھی روئی بھی تھی۔ اسے تو صحیح طرح سے رونا بھی نہیں آتا تھا، لیکن رونے کا عمل اچانک پھوٹ پڑنے والے آتش فشاں کی طرح ہوتا ہے۔ اسے سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے لیے کوئی استعارہ درکار نہیں ہوتا۔ ماں کی کوکھ میں ہی یہ ہیرا انسان کے وجود میں شامل کر دیا جاتا ہے۔

وہ غم زدہ ہو کر اتنا روئی تھی اور شوریدہ سری میں اتنا چلائی تھی کہ حیفہ مام اپنا غم بھول کر اسے سنبھالنے لگی تھیں۔ اسے کسی طور یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اب کبھی اپنے ڈیڈ الیاس کو نہیں دیکھ سکے گی۔ لمحوں میں پہلی بار وہ بچی سے بڑی ہوئی تھی اور جب اسے اس بات کا یقین ہو گیا تو وہ تڑپ تڑپ کر یہ دعا کرنے لگی کہ یہ آخری دیدار اس کی پوری زندگی پر اپنی وسعتیں پھیلا دے۔ وہ ساری زندگی اس تخت کے سرہانے بیٹھی رہنے کو تیار تھی جس پر ڈیڈ الیاس کی میت پڑی ہوئی تھی۔ وہ وہیں مجسم ہو جاتی۔ وہیں بیٹھی جاتی اگر میت اٹھانے کے لیے لوگ نہ اندر آ جاتے۔

حیفہ مام اپنے ساتھ ساتھ اس کے آنسو بھی صاف کر رہی تھیں۔ انہیں خود کے ساتھ اسے بھی سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ وہ دوہرے غم سے گزر رہی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ بیانکا کی آنکھوں میں آنسوؤں کے علاوہ ایک سنگریزہ بھی قید ہے۔ جو اس کی آنکھوں میں کب سے بری طرح چبھ رہا ہے۔

ڈیڈ الیاس کی گردن کے نیچے ایک گہرے سرخ ابھار کی لمبی سی دھار تھی۔ جو بالکل تازہ لگتی تھی۔ یہ دھار کسی چوٹ کی نہیں تھی۔ بلکہ کسی پوشیدہ خفیہ بیماری کی طرف اشارہ کرتی تھی۔

شاید انہیں علم ہو گیا تھا کہ وہ اب زیادہ دیر زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ تب ہی چند ماہ پہلے انہوں نے اپنے سارے اثاثے بیانکا کے نام منتقل کر دیے تھے۔ وہ اس پریشانی کے عذاب میں خود کیوں جلتے رہے۔ انہوں نے ہمیں کیوں نہ بتایا۔

روتے ہوئے بیانکا کو اپنے ڈیڈ الیاس سے شکوہ ہوا تھا۔ حیفہ مام کے آنسوؤں کا بند قبرستان سے واپسی پر ٹوٹا تھا۔ پچیس سال بعد وہ ایک بار پھر کسی مہاجر کی طرح لق و دق صحرا میں اکیلی رہ گئی تھیں۔ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی بانگ درا کو انہوں نے نہیں سنا تھا اور نقش پا ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے تھے۔

اب کوئی الیاس ان کی رہنمائی کرنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ چچا جلال نے انہیں اپنے گھر مزید کچھ وقت گزارنے کے لیے کہا تھا، لیکن دونوں تین چار دن بعد نیویارک واپس آ گئی تھیں۔

زندگی کے کچھ زخم ایور گرین پودے کی طرح ہوتے ہیں۔ ہمارے دکھ' رنج' سوچوں اور مردہ جذبوں کے پانی کی آبشار ہمیشہ انہیں بھگوئے رکھتی ہے اور زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔

یہ زخم جو رستے رہتے ہیں اور کبھی نہیں بھرتے۔ ان زخموں پر وقت کا دیوہیکل گھڑیال بھی شرمسار ہوتا ہے۔

"اب ہم جلد ہی اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائیں گے بیانکا۔ اس گھر کی وسعت میں اب میرا دل گھبرائے گا۔" گھر آتے ساتھ ہی حیفہ مام نے بیانکا سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے مام۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

آنے والے وقت میں حیفہ مام نے اپنے بازوؤں کے حصار کو چھوٹا ہوتا پایا۔ ہر چیز ان کے ہاتھوں سے نکلنے لگی تھی۔ ان میں اب اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ ہر معاملے کی الیاس کی طرح دیکھ بھال کریں۔ کچھ پراپرٹی تھی جس کا رینٹ ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ الیاس کے بعد زندگی ویسی ہی پر آسائش ضرور تھی' لیکن تنہائی کا شکار بھی ہو چکی تھی۔

وہ الیاس کریم کی وفات کے تقریباً" ایک ماہ بعد کا دن تھا۔ جب ان دونوں نے اپنا سارا سامان بند کارٹنوں میں پیک کر کے اپارٹمنٹ منتقل کیا تھا اور اسی دن چچا جان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے اپنے گھر آنے کے لیے کہا تھا۔

"حیفہ! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ بیانکا کو بھی ساتھ لے آنا۔"

"ٹھیک ہے بھائی صاحب! ہم کل آجائیں گے۔"

فون رکھنے کے بعد حیفہ موم نے بیانکا کو کنگسٹن جانے کے بارے میں بتایا تھا۔

دونوں نہیں جانتی تھیں کہ کل وہاں جا کر وہ اپنی زندگی کی کتنی بھیانک غلطی کرنے والی ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

سیرن کے گھر کا دروازہ مقفل تھا۔ شہرام بڑی دیر اس مقفل دروازے کو گھورتا رہا' جبکہ طامیر کو ایک گونا تسلی ہوئی تھی۔

"یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟" قریب کھیلتے بچوں میں سے اس نے ایک سے پوچھا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے نیچے کی طرف۔ شاید بڑے بازار۔" لڑکے نے اپنی عمر کے مطابق جواب دیا تھا۔

"چلو اب۔ کیا رات تک یہاں ہی کھڑے رہنے کا ارادہ ہے۔" طامیر نے اسے ٹہوکا دیا تھا۔

"ہاں۔ چلتے ہیں۔" وہ افسردگی کے عالم میں آگے بڑھنے لگا۔

اوپر تک پہنچنے کے باقی سارے سفر کے دوران شہرام' طامیر کو پرنسٹن یونیورسٹی کی باتیں بتاتا رہا تھا۔ باتیں اور قصے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح بڑے پر پیچ اندر ہی اندر بل کھاتے ہوئے اور ایک دوجے کے ساتھ جڑ کر بندھے تھے۔ باتیں بہت تھیں اور زبان صرف ایک۔ شہرام کی آواز میں چھپی ہوئی عجلت در آئی تھی۔ وہ لمحوں میں سالوں کی کہانیاں سنانا چاہتا تھا۔ خود طامیر کے پاس شہرام کو بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس تہی دامنی کے احساس نے اس کی زبان کو گنگ ہی کیے رکھا۔

وہ دونوں گھر جانے کے بجائے ریسٹورنٹ کی طرف چل پڑے تھے۔ شام ہونے والی تھی اور اماں زنتوسیہ اور بابا زلدری عموماً" اس وقت تک ریسٹورنٹ آجاتے تھے۔ دونوں کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

بھاری بھرکم جسم والی اماں زنتوسیہ سفید قصابہ (عورتوں کا سر پر باندھنے کا رومال) اور سفید ایپرن باندھے شہرام کو دور سے ہی نظر آگئی تھیں۔ ایپرن کے معاملوں میں اماں زنتوسیہ بڑی نفیس اور ایک طرح سے بدقسمت واقع ہوئی تھیں۔ بازار میں ملنے والا کوئی بھی بڑے سے بڑے سائز کا ایپرن بھی ان کے سارے جسم کو ڈھانپنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ مجبوراً" اماں زنتوسیہ کو اپنے لیے خود ہی ایپرن سلوانے پڑتے تھے اور اس کام میں باوجود بے انتہا محنت کے بھی وہ دلکشی نظر نہ آتی تھی' جو فیکٹری سے نکلنے والے ایپرنز کا خاصا

ہوتی ہے۔

"ماماجی۔" اندر داخل ہو کر شہرام نے اماں زیتوبیہ کو دور سے ہی پکارا۔ تو انگیٹھی میں کوئلوں کو آہنی سلاخ سے ترتیب دیتے ہوئے انہوں نے آواز کی سمت میں دیکھا تھا اور جیسے لمحے میں ان کے دل کی دھڑکن بے انتہا تیز ہو گئی تھی۔

شہرام خود آگے بڑھ کر ان کے گلے سے لگ گیا تھا اور اماں زیتوبیہ اسے بے تحاشا چومنے لگی تھیں۔

"او میرے بیٹے۔ اللہ نے کیسا زبردست تحفہ دیا ہے مجھے آج۔"

بانہوں میں بھینچ لینے کے باوجود بھی جیسے انہیں شہرام کے آنے کا یقین نہیں ہو رہا تھا۔

"رات ہی مجھے خواب آیا۔ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ دیکھو عید کا چاند نظر آ گیا۔ اور میں خواب میں ہی سوچتی رہی کہ ابھی تو عید آنے میں چھ مہینے باقی ہیں۔ مجھے نہ جانے کیوں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ چاند تیری آمد کا اشارہ تھا۔"

"کوئی اور بھی آیا ہے ساتھ خالہ۔ چاند نہ کہے۔ دمدار ستارہ ہی کہہ لیں۔"

خامیر نے دروازے سے ہی بانگ لگائی تھی۔ جواباً تینوں ہنسنے لگے تھے۔ اماں زیتوبیہ نے آگے بڑھ کر اسے بھی گلے سے لگا لیا تھا۔

"بابا کہاں ہیں؟"

"وہ اسٹور میں ہیں۔ اوزار تیز کر رہے ہیں۔"

"کس پہ۔" اسٹور کی طرف بڑھتے ہوئے شہرام نے کسی قدر شوخی سے پوچھا تھا۔ جواباً اماں زیتوبیہ بوکھلا گئی تھیں۔

"کرو۔ کرو۔ اپنے باپ کی طرح تم بھی تنگ کر لو مجھے۔ ہاں "سان" پہ۔ اور یہ دیکھ۔" وہ انگیٹھی کی طرف بڑھی تھیں۔ پھر وہاں سے ایک چھوٹی سی چیز اٹھا کر انہوں نے شہرام کو دکھائی تھی۔ شہرام اس چیز کو پہچانتا تھا۔ وہ "سلی" تھی۔

"تیرے بابا زلاری نے دی مجھے۔ میری سالگرہ پہ۔ مجھے تنگ کرنے کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

"کیسا شور ہے یہ بابا۔ البانیہ کا وزیر تو نہیں آ گیا؟" ٹوکے کی دھار کو دیکھتے ہوئے بابا زلاری اسٹور روم سے باہر نکلے تھے۔ پھر ان کی نظر چاروں طرف گھومی تھی۔

"بابا۔!" شہرام کی آواز میں پیار کا لوچ تھا۔ بابا زلاری کا رویہ بھی تقریباً" تقریباً" اماں زیتوبیہ جیسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کل رات ان کو کوئی خواب نہیں آیا تھا۔ شہرام کو چھٹیوں میں اپنے ملک آنے کے فیصلے پر طمانیت بخش احساس ہوا۔ جو خوشی اسے یہاں آ کر ہوئی تھی وہ دنیا کے کسی کونے میں جا کر حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

لیکن پھر اگلے ہی دن اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔

✿ ✿ ✿
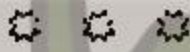
بڑے ہال نما کمرے میں حیفہ، مام اور بیانکا کے علاوہ وہ پانچ بھی تھے۔ تایا غفار، چچا جلال، تائی شہناز، چاچی فیروزہ اور تایا غفار کا بیٹا احمد۔

تایا غفار اور چچا جلال قدرے بوڑھے ہو گئے تھے۔ ان کے مقابلے میں الیاس اپنے آخری وقت تک فٹ رہا تھا۔ شہناز اور چاچی فیروزہ بھی میک اپ کے سہارے جینے والی خواتین تھیں۔ جبکہ احمد شاہ اپنی پڑھائی کی وجہ سے ان سب سے میچ نہ کھاتا تھا۔ وہ کسی حد تک بیانکا کو پرکشش لگا تھا۔

بڑے ہال نما کمرے میں خاموشی کا راج تھا۔ وہ چھ لوگ صوفوں پر بیٹھے تھے اور احمد دروازے کے پاس کارنس پر ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ان چاروں کی نظریں قالین کے ڈیزائن میں الجھی ہوئی تھیں اور ہونٹ بند تھے۔

کھانے کا بہت پرتکلف اہتمام کیا گیا تھا اور بیانکا کو آج ان سب کا رویہ بھی معمول سے زیادہ خوش گوار محسوس ہوا تھا۔

"آپ نے کیا ضروری بات کرنی تھی۔ بھائی

صاحب!" حیفہ مام یہ بات کوئی پانچویں دفعہ پوچھ رہی تھیں۔ لیکن اب تک انہیں ٹھیک سے اس بات کا جواب نہیں دیا گیا تھا۔

اب شاید اس بات کے لیے ہی خاموش رہ کر باقاعدہ تمہید باندھی جا رہی تھی اور بیانکا کو نہ جانے کیوں اس خاموشی سے وحشت محسوس ہو رہی تھی۔

"الیاس تم سے بہت پیار کرتا تھا حیفہ!" بالآخر چچا جلال نے اپنا جھریوں زدہ چہرہ ہلاتے ہوئے بات کا آغاز کیا تھا۔

"اور یقیناً" تم بھی کرتی ہو۔ اسی لیے مجھے یقین ہے کہ الیاس کی کوئی بھی بات تمہارے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔"

"آپ بیان کریں میں سن رہی ہوں۔" حیفہ مام نرم لہجے میں بولی تھیں۔

"یقیناً" اس نے تم سے بات کی ہوگی' لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو میں بتا دیتا ہوں۔" چچا جلال پھر خاموش ہو گئے تھے۔ چاروں کے چہروں پر مصنوعی جھجک جھلک رہی تھی۔

"دراصل الیاس بھائی اس بات کا اکثر ذکر کرتے تھے کہ بیانکا اور احمر کی شادی ہو جائے؟" بڑا ہال نما کمرہ بیانکا کی نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ اس خاموشی سے وحشت کی وجہ اسے اب سمجھ میں آئی تھی۔

اس نے حیفہ مام کی طرف دیکھا۔ ان کی صرف آنکھیں ہی پھیلی تھیں۔

"الیاس نے کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔" وہ اسی نرم گوئی سے گویا ہوئی تھیں "اور اگر انہوں نے یہ بات آپ سے کی ہے تو مجھے حیرت ہے۔ انہوں نے بیانکا کے لیے احمر کی خواہش کا اظہار کیسے کر دیا۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا حیفہ! ہم سب اس بات کے گواہ ہیں۔"

"الیاس بڑی اچھی طرح یہ بات جانتے تھے کہ بیانکا آریز کو پسند کرتی ہے اور جلد ہی دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔"

پورا ہال گویا دوبارہ سناٹے میں چلا گیا تھا۔ بیانکا "آریز" کو پسند کرتی ہے کہ الفاظ کسی نشتر کی طرح سب کے چہروں پر پڑے تھے۔ شہناز اور فیروزہ نے منہ بسورا تھا۔

"بیانکا ہمارے بھائی کی آخری نشانی ہے۔ تمہیں اس رشتے پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے حیفہ!"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بھائی صاحب۔ لیکن اس معاملے میں' میں سارے اختیارات اپنے پاس نہیں رکھتی۔"

"بیانکا کم عمر ہے۔ نادان ہے۔ اپنا اچھا برا نہیں سمجھ سکتی۔ تم اسے سمجھا سکتی ہو۔"

"بیانکا اتنی بھی کم عمر اور نادان نہیں ہے۔ آریز اس کا کلاس فیلو ہے۔ میں اس رشتے سے مطمئن ہوں۔"

"اپنے ہمیشہ غیروں کی نسبت بہتر ثابت ہوتے ہیں حیفہ!"

"آپ کی اس بات سے میں اتفاق نہیں کرتی بھائی صاحب۔ جب الیاس مجھے ملے تو وہ میرے لیے بالکل اجنبی اور غیر تھے۔ لیکن پھر وہ ہی میرے لیے مکمل ثابت ہوئے' جبکہ لبنان میں میرے اپنے رشتے دار اتنے برے نکلے کہ میں اپنی ماں کی وفات پر بھی وہاں نہ جا سکی۔"

"تمہاری تو کیا بات ہے حیفہ۔"

جیسے بھرے بازار میں کوئی کسی کو فحش گالی دے دے یہ فقرہ اس طرح ادا ہوا تھا۔ حیفہ مام کے چہرے پر کالے بادلوں کا سایہ آ کر گزرا تھا۔

چچا جلال اب گردن جھکائے جیسے اپنے کسی اندرونی جذبے کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شہناز اور فیروزہ بھی جلال کے رویے کی ہی تقلید کر رہی تھیں۔ پھر تایا غفار صوفے پر آگے کو کھسکے تھے۔

"بیانکا ہمارے بھائی کی اولاد ہے۔ کیا ہمارا اس پر کوئی حق نہیں۔ ہمارے بھی کئی ارمان ہیں۔" اب کے جذباتی وار کیا گیا تھا جس میں یہ خاندان پیڑھی در پیڑھی مہارت حاصل کر چکا تھا۔

"آپ کے ارمانوں کی میں دل سے قدر کرتی ہوں۔

آپ چاہیں تو یہ شادی اس گھر سے بھی ہو سکتی ہے' لیکن احمد۔۔۔"

"احمد میں آخر کمی کیا ہے؟"

"بات کمی بیشی کی نہیں۔۔۔ بات پسند کی ہے' بیانکا۔۔۔"

"ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو اتنی آزادی دینے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ اپنے لیے خود رشتے تلاش کرتی پھریں۔" تایا غفار کی آواز بھی کسی دبے ہوئے غصے کے باعث قدرے تیز ہو گئی تھی۔

"افسوس یہ آپ کا خاندان نہیں ہے۔"

حیفضہ مام نے اپنی نرم مزاجی سے یہ ثابت کر دیا کہ انہیں زندگی میں آج پہلی بار اس طرح کے رویوں کا سامنا کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔

"یہ الیاس کا خاندان ہے۔" وہ دو ٹوک گویا ہوئیں۔

"تمہارا خاندان ہے۔" سر اٹھا کر چچا جلال پھر بولے تھے۔ ان کے لہجے سے نخوت کے بیج پھوٹتے تھے اور طنز ستار پر تنی تار کی طرح خوب کس کر نکلا تھا۔ حیفضہ مام ان کی شکل دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ میرا خاندان۔۔۔"

انہیں ان سب کے خوش نما چہروں کے پیچھے اپنے لیے نفرت دیکھ کر دکھ ہوا تھا اور یہ دکھ ان کی آواز سے جھلکنے لگا تھا۔

"اس ضمن میں تو پھر ساری بات چیت ہی لاحاصل ہے' اٹھو بیانکا۔" حیفضہ مام اٹھی تھیں۔ بیانکا نے بھی اٹھنا چاہا تھا۔

"بیٹھو حیفضہ! خدا کے لیے دو منٹ بیٹھو۔" تایا غفار نے منت کی تھی۔

"تم چپ ہو جاؤ خبیث۔۔۔ میں بات کر تو رہا ہوں۔" وہ اپنے سے چھوٹے جلال پر گرجے تھے۔

"حیفضہ! تم اس سارے معاملے کو اس رخ سے نہیں دیکھ رہیں' جس رخ سے ہم دیکھ رہے ہیں۔۔۔ بات سنو۔۔۔ اگر تم بیانکا کی شادی غیروں میں کرو گی تو بیانکا کے ساتھ الیاس کی محنت سے کمائی ہوئی ساری دولت بھی غیروں کو چلی جائے گی۔۔۔ اور۔۔۔"

بیانکا اور حیفضہ مام۔۔۔ دونوں سناٹے میں آ گئی تھیں۔ ان لوگوں کی سوچ اس حد تک گر سکتی ہے۔ دونوں کو اس بات کا گمان تک نہ تھا۔

"دولت میری بیٹی کی خوشیاں نگل لے۔۔۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ مفلس ہو جائے۔"

"ہمارا یہ مطلب نہیں۔"

آپ کا مطلب جاننے کی مجھے کوئی ضرورت بھی نہیں' کیونکہ آپ کا مقصد مجھ پر واضح ہو گیا ہے۔ یہ دولت صرف الیاس کی محنت سے اکٹھی نہیں ہوئی۔ اس میں میری محنت کی حصہ داری بھی شامل ہے۔۔۔ اور اگر آپ اس بات کو نہیں بھی مانتے تو مجھے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ دولت کل بھی بیانکا کی ہے اور آج بھی اسی کی ہے۔"

"لیکن ہمارے بھائی کے اثاثوں پر ہمارا بھی کچھ حق ہے حیفضہ!"

"یہ حق قانونی طور پر آپ کا نہیں ہو سکتا' کیونکہ الیاس کی بیٹی اور بیوہ ابھی زندہ ہیں۔"

"کہیں تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے حیفضہ۔۔۔ مخالفت میں کیے گئے فیصلے اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں۔" وہ لڑکا نہ جانے کیسا نکلے۔

"کم از کم آپ الیاس کی اولاد کے بارے میں تو اچھا سوچ سکتے ہیں۔۔۔ اور الیاس نہ صرف اس لڑکے کو جانتے تھے۔۔۔ بلکہ پسند بھی کرتے تھے۔"

"یہ فیصلہ کرنے کے بعد تم ایک بار پھر اکیلی ہو جاؤ گی حیفضہ۔"

"یہ امریکا ہے۔۔۔ غفار بھائی۔۔۔ یہاں ہر دوسرا شخص اکیلا ہے۔"

"زندگی کے بہت سے موڑ ہیں جہاں تمہیں ہماری ضرورت پڑے گی۔"

"اگر آپ کو الیاس کی اولاد سے واقعی محبت ہو گی تو آپ میرا ساتھ ضرور دیں گے ورنہ صبر کرنے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہو گا۔"

"تمہیں بھی اس محبت کا ثبوت دینا چاہیے حیفضہ۔۔۔

احمد "الیاس کا بھتیجا۔"

"اب میں آپ کو جواب نہیں دوں گی۔ آپ دائرے کی صورت میں بحث کررہے ہیں۔ گھوم پھر کر بار بار وہی بات 'وہی سوال' وہی التجا۔"

"سنو حفصہ!" یہ چاچی فیروزہ کی آواز تھی۔

"تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ اگر تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ بیانکا اپنی محبت میں حد سے گزر چکی ہے تو یقین کرو ہمیں اور احمد کو تب بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہاں کا ماحول۔"

فیروزہ نے کہا اور لمحے بھر میں حفصہ مام نے خود کو ہواؤں میں معلق پایا۔ بیانکا کو سانس لینے کا طریقہ یاد کرنے میں لگا کہ زمانے بیت گئے۔

"آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" حفصہ مام چلائی تھیں۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ "آپ کی ہمت کیسے ہوئی اتنی گھٹیا بات کرنے کی۔" چاچی فیروزہ چپ کر گئی تھیں۔

"اٹھیے مام۔ اب گھر چلتے ہیں۔ بس بہت ہوگئی۔"

"تم بیٹھو۔" تایا غفار دھاڑے تھے اور کچھ اس طرح دھاڑے تھے کہ چچا جلال کو بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ "تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ جب بڑے بات کررہے ہوں تو چھوٹے نہیں بولا کرتے۔"

بیانکا نے حیرت سے تایا غفار کی طرف دیکھا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کا دماغ بھی درست کام نہیں کررہا تھا۔ روپے پانی کی طرح سر سے اوپر ہوگئے تھے۔

"اس کے والدین نے اسے خوداعتمادی سکھائی ہے۔ کیا اچھا ہے کیا برا۔ یہ جانتی ہے۔" حفصہ مام نے شال کھول کر کندھوں پر ڈالی تھی۔ بیانکا نے ان کا ہینڈ بیگ پکڑ لیا تھا۔

"والدین نے تو اسے اور بھی بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ جیسی ماں ویسی بیٹی، تم نے الیاس کو پھانسا تھا۔ اب بیانکا نے نہ جانے کس کو پھانس رکھا ہوگا۔"

"آپ شروع سے ہی مجھے ناپسند کرتی ہیں۔ اس بات کا مجھے اندازہ تھا، لیکن آپ مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

حفصہ مام کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔ چاروں اپنی جگہوں پر دم سادھے بیٹھے رہے تھے۔ کسی نے انہیں نہیں روکا تھا۔ اب روکنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ حفصہ مام یہاں دوبارہ کبھی نہ آنے کا عزم کرچکی تھیں۔

دروازے کے قریب پہنچ کر حفصہ مام نے ہینڈل گھمایا تھا۔ دروازہ لاک تھا۔

"احمد۔ دروازہ کھولو۔" حفصہ مام نے قریب کھڑے احمد سے کہا تھا۔ کارنس سے پشت ہٹا کر احمد نے صوفے پر بیٹھے اپنے خاندان کی طرف دیکھا تھا۔ سوالیہ نظروں سے۔ جواب نہ جانے کیا آیا تھا۔ احمد اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔

"دروازہ کھولیے۔" پیچھے پلٹ کر حفصہ مام نے سب سے کہا تھا۔ سب یک دم کھڑے ہوئے تھے۔

اور تب ہی۔ تب ہی۔ شیر کے پنجوں کی کھرچ۔ بیانکا نے اس کمرے کی فضا میں سنی تھی۔ یک لخت ان سب کی صورتیں اس قدر بگڑ گئی تھیں کہ بیانکا کو خود پر خوف کی پھونکیں پڑتی محسوس ہوئی تھیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا اور دھڑکن پورے وجود پر چھا گئی تھی۔ گدروں کے دل سے۔ اس نے ان سب کی کالی سیاہ آنکھوں میں آکر بیٹھتے دیکھے تھے۔

حفصہ مام کو پیچھے ہٹا کر وہ خود دروازے کا ہینڈل کسی قدر تیزی سے گھمانے لگی تھی۔ ایسے جیسے کسی کھائی والے کنوئیں کی چرخی کھینچ رہی ہو۔ دروازہ اپنی جگہ سے سرکا تک نہیں تھا۔

مایوس ہو کر اس نے مضبوط دروازے کو دیکھا تھا۔

"دروازہ کھولیے۔" حفصہ مام چلائی تھیں۔

"یہ دروازہ اتنے آرام سے نہیں کھلے گا۔" تایا غفار نے کہا تھا۔ ان کے چہرے پر بڑی زہر خند مسکراہٹ چمک رہی تھی۔

ان چاروں میں ایک پانچواں احمد بھی شامل ہوگیا تھا اور ان پانچوں کا گھیرا تنگ ہوتے ہوتے ان کے قریب آنے لگا تھا۔

حیفضہ ماں کے کندھے کے پیچھے سے اس نے ان سب کو دیکھا تھا۔ جیسے بھیڑیے شکار کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہیں۔ ان کے گرد بھی گھیرا تنگ ہونے لگا تھا۔ حیفضہ ماں ہیانا کے آگے کسی ڈھال کی طرح تن گئی تھیں۔

”کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟“

حیفضہ ماں نے کانپتی آواز سے پوچھا تھا۔

وہ پانچوں کچھ نہیں بولے تھے، لیکن ان کے خطرناک ارادے ان کے چہروں سے عیاں تھے۔ تب ہی ہال نما کمرے کی دیواریں جیسے پھٹ گئی تھیں، اور ان کی درزوں سے کسم کا رنگ ٹپکنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

”کانسی رنگ کے بیل بوٹوں والے سنہری مصری مٹی کے سفید لشک والے چھوٹے فنجان (پیالے) تھے۔ جن میں گاڑھا لالہی سیال بھاپ اڑا تا تھا ایسے کہ اس سیال پر جائفل کے کاٹھ کے ریشے بکھرے ہوئے اور سرخ رنگ تچھٹ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔

لال نتعویہ نے گھر پر ایک چھوٹے سے جشن کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں سیرین اپنی والدہ کے ساتھ کافی دیر سے شامل ہوئی تھی۔

وہ xhubleta (ایک روایتی لباس) زیب تن کیے ہوئے تھی اور پیاری لگنے کی ساری حدوں کو پھلانگ کر آئی تھی۔ اس نے ماتھے پر سوکے (سرمے کی لکیر) کے تین خط اس احتیاط سے کھینچے تھے کہ تینوں لکیروں کے درمیانی فاصلے میں بالشت بھر کر فرق بھی نہیں آیا تھا اور ان کے اوپر ”سر سری“ (ماتھے کا زیور) اپنی جھالر پھیلا رہا تھا۔

خود شہرام opinga (مکیشن سے بچے البانی چمڑے کے جوتے) qeleshe (ٹوپی) اور fustanella (روایتی لباس) میں بائرن (شاعر) کے پورٹریٹ کی عکاسی کر رہا تھا۔

ننھی پہنتی اماں نتعویہ آج خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ ان کی نظریں رقص کے بجائے باری باری شہرام اور سیرین کا طواف کر رہی تھیں۔

طامیر کی منگیتر راحانہ دائرے کی صورت میں مشہور روایتی رقص کر رہی تھی اور اسی گول دائرے میں گھس گھسا کر طامیر بھی راحانہ کی سہیلیوں کے ساتھ پروبا ہوا محو رقص تھا۔

بڑے کمرے سرخ قالین پر شہرام اور سیرین ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے بالکل سامنے ولائی حسنی اپنی چوب دار آنکھوں سے سارے منظر کو بنا تاثرات کے گھور رہا تھا۔ شہرام کو حسنی کے رویے میں بڑی سرد مہری نظر آئی تھی۔ وہ پہلے سے ہی کم گو تھا لیکن اتنا زیادہ نہیں۔ ساڑھے تین سال پہلے تیرانا (شہر) میں مدر ٹریسا ایئرپورٹ پر شہرام کو الوداع کہتے ہوئے انہوں نے کسی قدر شوخی سے شہرام کی کمر پر دھپ مارتے ہوئے کہا تھا۔

”یار واپس آکر بتانا ضرور کہ یہ انگریزنیاں واقعی میں خوب صورت ہوتی ہیں یا صرف کہانیاں ہی بنی ہوئی ہیں۔“ حسنی ہنسا تھا اور شہرام کے کان کی لو میں سرخ ہو گئی تھیں۔

اب پندرہ دن کے ٹور پر آتے وقت وہ اپنی یونی ورسٹی کے چھوٹے بڑے کتنے ہی قصے اکٹھے کر کے لایا تھا۔ ولائی حسنی کو سنانے کے لیے۔

لیکن ساڑھے تین سال کے اس عرصے نے دونوں میں وہ تکلف قائم کر دیا تھا، جسے ختم کرنے میں اگلے دس سال بھی ناکافی تھے۔

”ولائی۔“ شہرام حسنی کو دوبارہ بلا رہا تھا۔

”ہاں۔ بولو۔“ وہ بنا چونکے بولا۔

”آپ کا قہوہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

”میں ٹھنڈا ہی پیتا ہوں۔ تم اپنے قہوے کی فکر کرو۔“ وہ سرد مہری سے بولا۔

”کمال ہے۔ قہوہ تو گرم پینے میں ہی مزا آتا ہے۔ آپ نے ٹھنڈا کر کے پینے کا اصول کہاں سے اپنایا؟“

”تم۔ اب تم مجھے بتاؤ گے اصول۔“

”میں نے تو ویسے ہی کہا ہے ولائی۔“

”تم اپنے کام سے کام رکھا کرو شہرام۔ اپنی پڑھائی

کا رعب مجھ پر ڈالنے کی کوشش مت کرنا۔" اس کی آواز کافی تیز ہو گئی تھی۔ اماں زنتوبیہ تالی بجانا بھول گئی تھیں۔ رقص کرتے کرتے طامیر بھی نہ جانے کیوں ساکت ہو گیا تھا۔ شہرام کے چہرے پر سیاہ رنگ آ کر ٹھہر گئے تھے۔

"گانے کی آواز تھوڑی تیز کرو شہرام۔" بابا زلاری درمیان میں بولے تو سب کی توجہ بٹ گئی۔

"دیکھو تمہارا دوست کیسا لطف لے رہا ہے۔ اور تم کب سے یہاں ہی بیٹھے ہو۔" اماں زنتوبیہ نے جیسے اسے ترغیب دی تھی۔

"آؤ سیرین! ہم بھی ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔" شہرام اٹھا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ سیرین کی طرف بڑھایا تھا۔

سیرین اپنی جگہ سے نہیں اٹھی تھی۔

"واپس بیٹھ جاؤ شہرام! میرا رقص کرنے کا بالکل بھی ارادہ نہیں ہے۔" سیرین اپنی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ "میں ابھی پیچھے سے آ رہی ہوں۔ اور کافی تھک چکی ہوں۔"

"راحافہ کا گھر تمہارے گھر سے بھی کافی دور ہے سیرین۔ لیکن اسے۔"

"مجھے مزید بھوک نہیں ہے۔ میں اپنے کمرے میں آرام کرنے جا رہا ہوں۔"

شہرام کی بات مکمل ہونے سے پہلے اور سیرین کے جواب دینے سے پہلے حسنی کسی کل دار پرزے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔

"بھوک نہیں ہے تو ویسے ہی بیٹھ جائیں والائی۔"

"جشن کا اہتمام تمہارے لیے کیا گیا ہے شہرام" اس کے لہجے سے طنز کا عنصر پھوٹتا تھا۔ "میرے لیے نہیں۔ کھل کر انجوائے کرو۔"

رومال سے اپنے ہونٹوں کے کونے صاف کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔ اور ارادتاً" اس کی نظر شہرام کے دائیں طرف جا کر ساکت ہو گئی تھی پھر وہ اسی طرح اپنے ہونٹ صاف کرتا کمرے میں چلا گیا تھا شہرام کے

دائیں طرف سیرین بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے ماتھے پر سونے کی تینوں لکیریں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔

شہرام واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور دائیں طرف سیرین کے کان کے قریب چہرہ لاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

"والائی حسنی کو تم سے شرم آتی ہے شاید۔ پتا نہیں ہماری شادی کے بعد ان کا کیا حال ہوا کرے گا۔"

سیرین کا رنگ ایک دم پیلا پڑا تھا۔ شہرام جھینپ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سیرین کافی سے زیادہ شرمیلی ہے۔ اور ایسے میں "ہماری شادی" کے الفاظ نے اس پر کیسے اثر کیا تھا۔ اس بات کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

طامیر اپنی منگیتر کے پاس تھک کر بیٹھ گیا تھا اور میوزک ہلکا کر دیا گیا تھا۔

"اب جلد ہی حسنی کی بھی شادی کر دینی چاہیے۔"

"وہ مانے بھی تب نا۔" اماں زنتوبیہ نے جواب دیا تھا۔

"سیرین! بھائی کے لیے تم کوئی لڑکی ڈھونڈو نا۔ بالکل اپنے جیسی۔ تمہاری پسند کو وہ انکار نہیں کریں گے۔" شہرام نے سیرین سے کہا تھا اور تب ہی بے اختیار شہرام کی نظر سیرین کی گردن پر پڑی تھی۔ وہاں سے نظر ہٹا کر بری طرح سے پھر اس نے سیرین کے ہاتھوں کو ٹٹولا تھا اور جیسے رات کے اکلوتے راجا چاند کا سنگھاسن بھی اختتام پذیر ہو گیا تھا۔

بابا زلاری بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے اور اماں زنتوبیہ سیرین کی والدہ کے ساتھ کچن میں گم ہو گئیں۔

"تم نے ہماری منگنی کی انگوٹھی نہیں پہنی سیرین۔"

اکیلے ہونے پر بہت دیر کی رکی ہوئی بات کو شہرام نے ادا کیا تھا۔ اس کے لہجے میں سرسری پن نہیں تھا بلکہ ایک طرح کی جواب طلبی تھی۔

"وہ ذرا ڈھیلی تھی۔ میں نے سوچا کہیں گر ہی نہ جائے۔"

"تمہیں اس پر دھاگہ باندھ لینا چاہیے تھا۔ آج کے دن کے لیے تم اتنا بھی تردد نہ کر سکیں۔"

"تم اس طرح اچانک آئے ہو شہرام کہ کسی بھی چیز کے اہتمام کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔"

"اور وہ تعویز جو میں نے اپنی محبت کی نشانی کے طور پر تمہیں پہنایا تھا۔ وہ بھی تمہارے گلے میں نہیں ہے۔ کہیں تم اسے کھو تو نہیں چکیں۔"

"نہیں۔ وہ میرے پاس ہے، لیکن میں اسے ہر وقت نہیں پہن سکتی۔ میں لیٹتے وقت الجھن کا شکار ہو جاتی تھی۔ گلے پر باقاعدہ ایک زخم سا بن گیا تھا۔"

ان دونوں جوابوں نے شہرام کو افسردہ کر دیا تھا۔

وہ تعویز امریکہ جانے سے پہلے اس نے سیرین کو دیا تھا۔

صندل کی لکڑی کا وہ دو انچ کا ٹکڑا آدھ انچ موٹا تھا اور اس ٹکڑے کے ایک آدھے کونے میں سوراخ کر کے موٹی کالی ڈوری اس طرح ڈالی گئی تھی کہ سامنے اور پشت سے ڈوری نظر نہیں آتی تھی۔ اور یہ ڈوری ساکن لکڑی میں سے درخت کی شاخ کی طرح پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

بابا زلاری نے تعویز کو بڑے دنوں کی خاص توجہ اور دلی محبت کے بعد تکمیل تک پہنچایا تھا۔

ndoc Martini (البانی مصور) کا ایک گمنام اور بے ہم پورٹریٹ جو بابا زلاری کو بے انتہا پسند تھا اور جسے وہ اتنی بار بنا چکے تھے کہ اس کی ایک ایک لکیر حاشیہ انہیں ازبر ہو چکا تھا۔ کو تعویز کے سامنے کی طرف کندہ کیا گیا تھا۔

ایک آٹھ نو سال کی بچی جو اپنے ننھے ہاتھ کے کپّے کے اوپر تھوڑی ٹکائے اپنی آب دار آنکھوں میں کسی اجنبی جذبے کا انتظار لیے نجانے کس طرح دیکھتی نظر آتی ہے۔

"بابا! اس تعویز کے پیچھے ایک تحریر بھی ابھر دیں۔"

شہرام نے چھوٹی ریتی لیے تعویز پر جھکے بابا زلاری سے کہا تھا۔

"کیا۔؟"

"یہ۔ یہ کہ۔" اس نے تھوڑی دیر توقف کیا۔

"یہ کہ۔ تم سے جدائی ہوئی تو میں مر جاؤں گا۔"

کام کرتے بابا زلاری نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگے تھے۔

شہرام شرمندہ ہو گیا تھا۔

"آپ نہیں لکھیے۔ میں خود ہی لکھ لوں گا۔"

شہرام کی خفگی سے پر شکل دیکھ کر وہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"تم ابھی بچے ہو شہرام۔ ورنہ یہ بات جان چکے ہوتے کہ کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا۔ سب جیتے ہیں۔ زندگی بڑی ٹھوس اور ڈھیٹ ہے۔ یہ ہر حالت میں گھسٹتی ہے۔ اور دوسری بات۔ ہم جن کے بغیر جی نہیں سکتے ان کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر وہ ہم سے محبت کرتے ہیں تو اس بات کو بخوبی جانتے ہیں۔" بابا زلاری نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

تعویز مکمل ہوا تو وہ کتنی ہی دیر اس پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا سکا تھا۔ وہ تعویز لکڑی کا تھا لیکن سونے کی طرح چمکتا تھا۔ "لاکھ" نے اس میں دھوپ کی سی لشک پیدا کر دی تھی۔ پورٹریٹ اس قدر مہارت سے بنایا گیا تھا کہ صرف دھڑکنوں کی کمی رہ گئی تھی۔ اور آج سیرین کے دونوں جوابوں نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔

اگر واقعی ایسا ہی تھا جیسا وہ کہہ رہی تھی تو پھر اس کے چہرے کے تاثرات نے اس کی بات کا ساتھ کیوں نہیں دیا تھا۔

گھر سے باہر سیرین کو الوداع کرتے وقت اسے اپنی بات کا جواب مل گیا تھا۔

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں شہرام! نجانے تم اسے کس تناظر میں پرکھو، لیکن ٹالنے کا اب کیا فائدہ۔ تم اچانک آ ہی گئے ہو تو میں بھی بتانے کے لیے پھر تمہید نہیں باندھوں گی۔"

سیرین اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوجے میں پھنسائے تذبذب کا شکار تھی۔ اس کا سارا حسن ایک دم ہی ماند پڑ گیا تھا۔

"میں آج بھی یہاں آنا نہیں چاہتی تھی، لیکن ایک بار تو آنا ہی تھا۔ ایک بار تو تم سے ملنا ہی تھا۔"

"کیا بات ہے سیرین۔ کہہ دو جو کہنا ہے۔"

شہرام نے کہا تو نظریں اٹھا کر سیرین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"تمہاری پسنائی انگوٹھی اس قدر ڈھیلی ہوچکی ہے کہ اب وقت کا کوئی بھی دھاگہ اسے ٹھیک نہیں کر سکتا۔"

"کیا مطلب سیرین۔ اس بات کا آخر کیا مطلب ہے؟" شہرام حیران ہوا تھا۔

"وہی مطلب شہرام جو تم سمجھ چکے ہو۔ لیکن ماننا نہیں چاہ رہے۔"

"نہیں میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ خدارا مجھے سمجھاؤ سیرین۔"

"سیرین بیٹا! جلدی آجاؤ۔" خالہ فیرن کی آواز آئی تھی۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھی سیرین کا انتظار کر رہی تھیں۔

"ہو سکے تو مجھے بھول جانا شہرام۔!" سیرین نے کہہ کر شہرام کے فق چہرے کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔

❋ ❋ ❋

خاموشی اور اندھیرے میں سماعت وہ آشنا ہو چکی تھی۔ فون در فون (سانپ کی پھنکاروں) کو بیانکا نے اپنے کانوں میں چنگھاڑتے سنا تھا۔ ضیاویز (روشنی دینے والا) کی کرم نوازیاں کہیں جا چھپی تھیں اور سبت سرگ (چھ اطراف) سیاہ چادریں اوڑھے ماتم کناں تھے۔

وہ پکی سیڑھی پر ایسے بیٹھی تھی جیسے بگڑے بیل کے مات کے پنڈے میں بیٹھی ہو اور اس کے بارے میں غلط افواہیں بس پھیلنے ہی والی ہوں۔

تہہ خانے کے دروازے سے ہاتھ ہٹا کر اس نے سارے واقعے کو از سر نو یاد کیا تھا۔ ان کاغذات پر دستخط کر دو۔ اور باقی کے سارے بروسیجو تک ہماری مہمان بن کے رہو۔ دروازہ نہیں کھلے گا۔"

حنیفہ مام کے کندھے کے پیچھے سے وہ ان پانچوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب تایا غفار نے ان کے آگے تین چار کاغذوں کو لہرایا تھا۔

بنا پڑھے ہی وہ جان گئی تھیں کہ وہ کس طرح کے کاغذات تھے۔ وہ جائیداد کی منتقلی کے کاغذات تھے۔

بیانکا کا دل چاہا ان پانچوں کے منہ پر تھوک دے۔ یہ لوگ کس قدر ہیچ ہو چکے تھے۔

"خود کو مت تھکاؤ۔ یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔ نہ ہی ٹوٹے گا۔"

"آپ نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا کہ میری بیٹی ان کاغذات پر دستخط کر دے گی۔"

"یہ ہمارے بھائی کی جائیداد ہے جو اس نے بہت محنت سے بنائی ہے۔ اس جائیداد پر تم دونوں ماں بیٹی کو ہم ہرگز قابض نہیں ہونے دیں گے۔"

"یہ میری بھی جائیداد ہے۔"

حنیفہ مام چلائی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان سب کے چہرے نوچ لیں۔

"تمہارے نام والے اپارٹمنٹ کی تو ہم بات ہی نہیں کر رہے۔ نہ ہی تمہارے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے دس ہزار ڈالر کی۔"

حنیفہ مام ان کی درست معلومات پر دنگ رہ گئی تھیں۔ اتنے درست اعداد و شمار۔ وہ لوگ یقیناً کافی عرصے سے اس چیز کے منصوبے بنا رہے تھے۔

"جو کچھ بیانکا کے نام منتقل ہوا ہے۔ ہم صرف وہ چاہتے ہیں۔"

"آپ سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" بیانکا بھی چلائی تھی۔

"چلو ایسا ہی سمجھ لو۔ اب جلدی سے ان سب کاغذات پر دستخط کر دو۔ آج کرو گی تو مزید پندرہ دن تمہیں اور یہاں رکنا پڑے گا۔ جتنے دن انتظار کرواؤ گی۔ تمہارا ہی نقصان ہو گا۔"

"میں ان پر سائن نہیں کروں گی۔"

"یہ تمہاری بھول ہے۔ تم ہمیں نہیں جانتیں۔"

چچا جلال نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ مزید حنیفہ موم کے وجود میں سمٹ گئی تھی۔

"الیاس کو اندازہ بھی نہیں ہو گا کہ اس کے بھائی

کیسے سانپ ہیں اور ان کی بیویاں۔"

"پھر تم اس بات کو جلد ہی قبول کر لو۔ اور ہم کچھ برا نہیں کر رہے۔ اپنے بھائی کی جائیداد ہی تو مانگ رہے ہیں۔"

"اس بھائی کی بیٹی ابھی زندہ ہے۔"

حیفہ مام نے چلا کر پھر وہی بات کی تھی جو وہ پہلے بھی کہہ چکی تھیں۔ اور جس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"وہ بیٹی خود سر ہو چکی ہے۔ اپنی ماں کی طرح۔ تب ہی تو ہمیں یہ طریقہ کار اپنانا پڑ رہا ہے۔"

"آپ سب کس خام خیالی میں ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ چاہے ہم دونوں کی جان ہی کیوں نہ چھن جائے۔"

"اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔" تایا غفار کی بات میں گھمنڈ تھا۔ بیانکا کو ان کے گھمنڈ پر ہنسی آئی تھی۔

"آخری بار پیار سے کہہ رہا ہوں۔ ان کاغذات پر دستخط کر دو۔ ورنہ۔"

"ورنہ۔ کیا۔ کیا کریں گے آپ۔" حیفہ موم نے چلا کر پوچھا تھا۔

پانچوں خاموش ہو گئے تھے۔ یہ خاموشی پاتال کے اس زلزلے کی طرف اشارہ کرتی تھی جس کا بہاؤ رفتہ رفتہ زمینی سطح تک آ رہا ہو۔

حیفہ مام کی آنکھوں میں اپنے ارادے کی پختگی تھی اور ان سب کے چہروں پر کچھ کر گزرنے کی جرات چمکتی تھی۔

پھر دھماکے دار گرج کے ساتھ آتش فشاں پھٹ پڑا اور ہر چیز پر پشورائی (چولہے کی جلی ہوئی مٹی والا) رنگ چھا گیا۔

پانچوں نے ان دونوں کو پکڑ کر گھسیٹا تھا نجانے کس سمت۔ وہ اپنا آپ بچانے لگیں لیکن پانچوں کے مضبوط ارادوں اور زور آزما ہاتھوں کی گرفت کسی آہنی شکنجوں کی طرح تھی۔

بے اختیار ہو کر بیانکا نے چلانا شروع کر دیا۔ اور تایا غفار نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے سفید گالوں پر جڑ دیا تھا۔

"چپ کر . . . . !" اسے اس لفظ کا مطلب نہیں پتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اسے کوئی غلیظ گالی دی گئی ہے۔

شہناز اور فیروزہ نے دونوں کے پرس چھین لیے تھے اور اس چھینا جھپٹی میں حیفہ مام کی شال بھی اتر گئی تھی۔

چچا جلال نے اسے بالوں سے پکڑ کر تہہ خانے کے اندر دھکیلا تھا۔ ان کا چلانا، کراہنا، التجا کرنا۔ انہیں شرم دلانا اور خدا کے واسطے دینا سب بے کار ثابت ہوا تھا۔

"اب یہاں بیٹھ کر تسلی سے سوچو کہ تمہیں دستخط کرنے ہیں کہ نہیں۔" تہہ خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے جلال نے کہا تھا۔

تیز روشنی سے اندر آنے کے باعث پہلے پہل تو اسے کچھ نظر ہی نہیں آیا تھا۔ پھر جب رفتہ رفتہ بصیرت نے کام کرنا شروع کیا تو وہاں تاریک در و دیوار کے علاوہ اسے کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔

اس اندھیرے میں ایک چیز چمکتی تھی۔ اور وہ حیفہ مام کی آنکھوں میں آئے آنسو تھے۔

☼ ☼ ☼
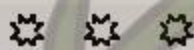
چوبی دروازے کو پیٹتے پیٹتے اس کے اپنے ہاتھ ساگوان کی لکڑی کی طرح سن اور ٹھوس ہو چکے تھے۔ اور ان میں خون کی گردش اپنی سرسراہٹ تک محسوس نہ کرواتی تھی۔

وہ تھک چکی تھی، لیکن پھر بھی دروازہ پیٹتی رہی اور اول فول بکتی رہی۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ انہیں۔ انہیں امریکہ جیسے ملک میں۔ کسی تہہ خانے میں بند کر دیا گیا ہے۔ تمسخرانہ ہنسی ان لوگوں کے انجام کو تصور میں لاتے ہی اس کے اندر کہیں دبی ہوئی تھی۔

"یہ لوگ نہیں جانتے کہ انہوں نے کتنی بڑی بے وقوفی کی ہے۔ اس قبیح حرکت کا سنگین خمیازہ انہیں

جلد ہی بھگتنا پڑے گا۔ یہ امریکہ کو پاکستان سمجھ بیٹھے ہیں۔" اس کا دل کیا کہ وہ ان لوگوں کی کم عقلی پر ماتم کرے۔

"یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس طرح یہ اپنی بات منوائیں گے۔"

غصے سے اس کی نسیں تن گئی اور وہ مزید زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔

"تمہارے باہر جانے پر پولیس ان کا کیا حشر کرے گی۔ یہ لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" بیانکا کو ان سب کی آنے والی حالت پر ترس آنے لگا۔

"الیاس۔! الیاس ان لوگوں سے کتنا پیار کرتا تھا۔ اور یہ سب کیسے ابلیس صفت۔ کیسے کریہہ نکلے۔"

حیفہ مام نے رندھی ہوئی آواز میں خود سے کہا تھا۔ وہ چوکور تہہ خانے کے کونے میں ایک لحاف کے اوپر بیٹھی تھیں۔ اور ان کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔ بیانکا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ انہیں چپ کروائے' دلاسا دے۔ وہ گھنٹوں دروازہ پیٹنے سے فارغ ہونے والی نہیں تھی۔

پھر دروازہ ایک بار پھر کھل گیا۔

اندھیرے تہہ خانے میں روشن چچا جلال کا چہرہ نظر آیا۔ ان کے پیچھے دوسرے بھی سب کھڑے تھے۔ چچا جلال نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔

"جلد ہی عقل آئے گی۔" انہوں نے کہا۔

بیانکا کو وہ چہرے تیزاب سے جھلسے ہوئے نظر آئے تھے۔

تایا غفار نے دوبارہ اس کے آگے کاغذات کیے تھے۔ بیانکا نے وہ کاغذات پکڑے تھے۔ غفار نے اسے پین پکڑانا چاہا تھا' لیکن تب تک بیانکا کاغذوں کو دو ٹکڑوں میں پھاڑ چکی تھی۔ اور وہ چار ٹکڑوں میں بٹے کل سولہ پرزے اس نے تایا غفار کے منہ پر دے مارے تھے۔

"تھو۔!" تایا غفار نے پہلے زینے پر دروازے کی دہلیز کے پار تھوکا تھا۔ اور دروازہ دھڑام سے دوبارہ بند کر دیا گیا تھا۔

وہ بڑی دیر تک وہیں بیٹھی اس تھوک کو گھورتی رہی تھی۔

حیفہ مام کے رونے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔

بیانکا نے اب دوسرے رخ پر سوچنا شروع کیا تھا۔ یہ بات ہضم کرنے اور ماننے میں تو اسے بہت دیر ہو گئی کہ وہ حیفہ مام کے ساتھ کسی تہہ خانے میں قید کر دی گئی ہے' وہ اس حرکت کو ان لوگوں کا بچپنا تصور کر رہی تھی' اور جب اسے اپنے اور حیفہ موم کے تہہ خانے میں بند ہو جانے کا یقین ہو گیا تو اس نے نئی نئی خام خیالیاں پالنی شروع کر دی۔

جیسے ابھی کوئی ہاتھ معجزاتی طور پر انہیں یہاں سے نکال لے گا۔ پولیس کو اپنے آپ ہی خبر ہو جائے گی۔ اور وہ برق رفتاری سے دونوں کی مدد کرنے یہاں پہنچ جائے گی۔ ارد گرد کے دور نزدیک کے مکان والوں کو غفار' جلال' شہناز' فیروزہ' احمد کے ظلم کا علم ہو جائے گا اور سب مل کر بیانکا اور حیفہ مام کی خاطر تہہ خانے کی دیواریں تک توڑ ڈالیں گے۔

اس نے سیڑھی سے اتر کر پہلی بار تہہ خانے کا جائزہ لینا شروع کیا تھا۔ وہ ایسے رعب سے تہہ خانے میں چل رہی تھی جیسے جلد ہی کسی بادشاہی کرسی پر بیٹھ کر اوپر والوں کے لیے دار پر لٹکانے کا حکم صادر کرنے والی ہو۔

اس تہہ خانے میں ان سے پہلے یقیناً" لکڑیاں یا کوئلہ رکھا جاتا تھا۔ چھت دیواریں اور فرش بری طرح کالے ہوئے پڑے تھے۔ اور وہاں جیسے برسوں سے صفائی نہیں کی گئی تھی۔ سمبل لکڑی کے چھوٹے بڑے ریشے سارے فرش پر جابجا بکھرے ہوئے تھے کونے میں ایک غسل خانہ نو تعمیر شدہ تھا' کیونکہ اس کی دیواروں کا پلستر ابھی تازہ تھا اور دوسری دیواروں سے مختلف بھی۔

"تو ان حبشیوں نے انہیں قید کرنے کا منصوبہ یہاں بلانے سے پہلے ہی بنا رکھا تھا۔" اس نے سوچا اور ان کے انجام پر ہنسی۔

"یہ لوگ وہ گناہ کر رہے ہیں جس کا کفارہ ان کی

آنے والی کئی نسلیں ادا کرتی رہیں گی۔" وہ دوبارہ ہنسی۔
غسل خانے کی دیوار میں چھت کے بالکل قریب ایک گول روزن تھا۔ بیانکا ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی۔

روزن کو دیکھ کر سوچتے ہوئے وہ جس غلط فہمی میں تھی، وہ غلط فہمی اگلے دن دور ہوئی تھی۔ پوری طرح سے۔

☆ ☆ ☆

صنوبر اور دیودار کے دیو قامت درختوں کی ڈالیوں اور پتوں سے چھن کر آتی دھوپ دھرتی کے پر پیچ سینے پر بڑے بے ڈھنگے نقش و نگار بنا رہی تھی، لمحوں میں پہاڑی گستاخ ہوا کی ہلکی سی لرزش ان نقوش کو بگاڑ کر دوبارہ ایک نئی طرز پر مرتب کرنے پر ٹھن جاتی تھی۔ ڈیزائن کے جوڑوں پر آروہی (راگ میں رائج ایک طریقہ) کی گانٹھیں کسی تھیں۔ اور جھرنے کی پھوار اس ملہاری دھن کو اپنے ہمراہ لیے قریب سے گزرتے سست اور خاموش اوس سے بھی زیادہ نزاکت سے بہتی اور ابھرتی جا رہی تھی۔

"بولو سیرین! کیا میں بدل گیا ہوں۔"

شہرام نے ندام کے واحد پیڑ کی چھاؤں تلے پڑے پتھر پر سر جھکائے بیٹھی سیرین سے پوچھا تھا۔

ارچیر کی جامد سرد ہوائیں جنہوں نے اسے کسی بچے کی طرح اپنی گود میں اٹھا کر بھرپور بوسہ دیا تھا انہیں ہواؤں نے اسے منہ کے بل گرانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

جشن کی رات سے اگلے ہی دن وہ سیرین کے گھر گیا تھا۔۔۔ پھر اس سے اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی۔۔۔ وہ جاتا رہا تھا روز بلاناغہ۔۔۔ مسلسل دس دن۔۔۔ اس سے تو جشن والی وہ رات گزارنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔۔۔ اور ان دس دنوں نے تو اسے بالکل ہی پاگل کر دیا تھا۔

"وہ گھر پر نہیں ہے۔۔۔ شکودرا (ایک شہر) جا چکی ہے۔۔۔ اپنے ماموں کے پاس۔۔۔ صبح ہی وہاں سے فون آیا۔۔۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔" سیرین کی والدہ فیرن نے اسے بتایا تھا۔

"مجھے وہاں کا نمبر چاہیے۔"

"فون ان کے گھر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔۔۔ وہ ایک دو دن تک آجائے گی۔"

وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اسے کس چیز کی فکر کھائے جا رہی ہے۔۔۔ وہ ہر روز سیرین کے گھر جاتا رہا تھا۔

"نہیں، وہ آج بھی نہیں آئی۔۔۔"

"آج بھی نہیں۔۔۔ آج بھی نہیں۔"

وہ کہیں گئی ہوتی تو واپس آتی۔۔۔

شہرام کو دیکھ کر خالہ فیرن کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی تھی اور خود بخود ہی ان کی آنکھیں جھپکنے پر آجاتی تھیں۔

شہرام سوالات کرنے لگتا تھا کہ اسے روز روز کے ان بہانوں پر یقین نہیں آتا تھا اس کا دماغ پھٹنے پر آگیا تھا۔

"کیا وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی؟"

"ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ جو میں نے بتایا وہ ہی اصل بات ہے۔۔۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آتا۔۔۔" وہ منہ پرے پھیر لیتیں۔ جیسے اپنے آنسو اس کے سامنے بہانے سے ڈرتی ہوں۔

شہرام جواب میں کچھ نہیں کہتا تھا، لیکن آج وہ خالہ فیرن کو پرے ہٹا کر اندر جانا چاہتا تھا۔

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔۔۔ وہ اندر ہے۔۔۔ طامیر نے خود اسے اندر آتے دیکھا ہے۔" اب خالہ فیرن باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

"ہاں، وہ اندر ہے۔۔۔ پر تم سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"میں اس سے خود مل لوں گا۔"

"ٹھہرو۔۔۔ میں اسے بلا کر لاتی ہوں۔"

خالہ فیرن اندر چلی گئی تھیں۔ جب وہ باہر آئیں تو ان کے ساتھ سیرین بھی تھی۔ حد درجہ مطمئن جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

"تم میرے ساتھ آخر کیا کر رہی ہو سیرین؟" اسے دیکھتے ہی شہرام پھٹ پڑا تھا۔ اور وہ ایسے خاموش رہی تھی جیسے کسی کی لاش پر صبر کر کے بیٹھی ہو۔

ندام پیڑ کی ایک موٹی شاخ، چھاؤں کی تاریکی میں

ہونے کے باوجود بھی شہرام کی آنکھوں میں کھٹکتی تھی۔

نظر اندازی، ناسپاسی، کراہت یا شاید بے وفائی، وہ سیرین کے رویے کو کس چیز کا نام دیتا۔

اس نے گلاب اور لالے کے ایک ساتھ گندھے پھولوں کو دیکھا۔

محبت اور رقیب۔۔۔

پانچ سال پہلے اس نے اس منظر کو برا شگون جانا تھا اور پھر تب ہی اس نے اپنے خیالات جھٹک بھی دیے تھے۔ آج اسے پھر اس شاخ کے سائے سے خوف محسوس ہوتا تھا۔ سیرین اسی پیڑ کے نیچے ایک بیضوی پتھر پر بیٹھی اپنے پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے چیڑ کی زکونوں اور خشک سوئیاں پتوں کا ڈھیر لگا تھا۔

چمکیلی دھوپ کے ذرے شہرام کے سر پر برس رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی یا سیرین کا رویہ۔۔۔ شہرام کا سر لمحہ بہ لمحہ پھٹتا ہی جارہا تھا۔

"بولو سیرین! کیا میں بدل گیا ہوں۔۔۔ کیا میں اب پہلے جیسا نہیں رہا۔"

"نہیں شہرام۔۔۔ قدرت اور زندگی نے ابھی تمہیں نہیں آزمایا۔۔۔ خوش قسمتی سے تم ویسے ہی ہو۔"

"تو پھر کیا تم بدل گئی ہو سیرین؟" سیرین کی آنکھیں چمک کر بجھی تھیں۔

"بدقسمتی میرے ساتھ تھی۔۔۔ میں آزمائی گئی اور آزمائش پر پوری نہ اتر سکی۔"

"میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا سیرین۔۔۔ ایسا رویہ نہ اپناؤ کہ مجھے کہنا پڑے کہ یہ محبت مجھے لے ڈوبی۔"

"میں کیا کروں شہرام! میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے سکتا تھا۔ میں بھٹک گئی۔"

"تم ادھیر میں تھیں اور مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تھیں۔۔۔ تم نے شکور دا جانے کا جھوٹا جواز کیوں گھڑا۔۔۔؟"

"میں چاہتی تھی کہ تم مجھ سے دوبارہ ملے بغیر ہی امریکہ واپس چلے جاؤ۔۔۔ تم واپس چلے جاتے تو یہ سوال دہ جواب نہ کرتے۔ بس اس لیے۔"

"تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے بات کیے بنا امریکہ چلا جاؤں گا۔" شہرام نے پوچھا تھا اور سیرین دھوپ میں کھلتی زکونوں کو دیکھنے لگی تھی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے سیرین۔۔۔ تم ایسا بھیانک مذاق کیسے کر سکتی ہو میرے ساتھ۔۔۔ ہماری محبت تو بچپن کی ہے۔"

"بچپن کی محبت کتاب کے پہلے ایڈیشن کی طرح ہوتی ہے شہرام۔۔۔ اس میں الفاظ کی بہت ساری غلطیاں نکلنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔۔۔ یہ کتاب پرانی تو ہو سکتی ہے مگر مستند نہیں۔"

"کیا تمہیں وقت چاہیے۔۔۔؟"

"وقت؟ کس لیے؟"

"سوچنے کے لیے۔۔۔ ہمارے بارے۔۔۔ ہمارے تعلق کے بارے۔۔۔ ہماری پرانی محبت کے بارے۔"

"تم وقت دینے پر بضد ہو تو میں لے لیتی ہوں۔۔۔ اگرچہ اب حاجت کسی بھی چیز کی نہیں میری التجا وہی رہے گی۔"

"وہ کیا۔۔۔؟"

"تمہیں بتا تو دیا ہے۔۔۔ پھر کیوں بار بار پوچھ کر مجھے اور خود کو تکلیف دے رہے ہو۔"

"تم التجا بتاتی ہو۔۔۔ لیکن وجہ نہیں۔"

"بے وجہ ہی سمجھ لو۔۔۔ لیکن کیا تم مجھے بھول نہیں سکتے شہرام۔۔۔ آسانی سے ہمیشہ کے لیے اس تعلق کو ہماری محبت کو منگنی کو جیسے سرے سے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔۔۔ کیا ہم دوبارہ صرف دوست نہیں بن سکتے۔ اچھے دوست بچپن کے۔"

سیرین کہتی چلی گئی اور شہرام کی آنکھوں کے کونوں نے گویا آگ پکڑلی۔

"ان تین سالوں میں ایسا کیا ہو گیا سیرین؟"

"ہونے کے لیے تو ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے شہرام۔۔۔"

"پہاڑوں کی برف بھی ایک دن میں نہیں پگھلتی۔۔۔ یہ بدلاؤ اتنا بڑا ہے کہ لمحوں کی دین نہیں ہو سکتا۔"

"بہت سارے لمحے مل کر اکٹھے ہو گئے تھے۔"

"دو ہفتے پہلے جب میں یہاں آنے والا تھا تو سوچتا تھا کہ ارجیر میں کیا کچھ بدل گیا ہو گا۔ مجھے کچھ بھی بڑا بدلاؤ نظر نہ آیا۔ ساری تبدیلیاں اپنی پرانی بنیادوں پر ہی ہوئی تھیں۔"

میں سوچنے لگا ارجیر تو ویسا کا ویسا ہی ہے۔ میں کتنا غلط تھا۔ اب دیکھتا ہوں تو اپنے مشاہدے کی کجی نظر آتی ہے۔ کتنا تو بدل گیا ہے ارجیر۔ انسانوں کے دل بدل گئے ہیں۔"

بڑی دیر تک وہ سستی سے بہتے ہوئے پانی کو جس میں سورج کی کرنیں اپنا مقام تلاش کرتی تھیں، دیکھتا رہا تھا۔ اور سوچتا رہا تھا۔

اس بات سے بے خبر کہ اس کی پشت پر بیضوی پتھر پر بیٹھی سیرین اٹھ کر واپس جا چکی ہے۔

❁ ❁ ❁
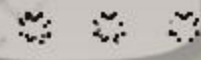
مایوسی سانسوں کے ساتھ بدن کو بار بار ہوا کے دوش پر اچھالنے کے عمل سے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگا تھا۔ وہ سب اتنا خوفناک تھا کہ اس کے جھوٹ ہونے کا اسے مسلم یقین تھا۔ سویدا (آسمان کا کبھی سیاہ نقطہ) سرنگوں کا ایک مہا جال بچھا تھا۔ یہ سرنگیں دائروں میں کھودی گئی تھیں۔ ان کی شروعات اور اختتام ایک ساتھ چل رہے تھے۔ اور وہ اس مہا جال میں پھنسی سیب کی طرح تڑپ رہی تھی۔

اس گول روزن پر چاند کی روشنی اپنا وقت پورا کر چکی تھی۔

پر وہ تب زرد سانپ کی طرح چھچھورا تھا۔ سورج کی بنفشی شعاعیں شیشے سے ٹکرا کر واپس پرے لوٹ جاتی تھیں۔ ان شعاعوں کی بہت پتلی دھار تہہ خانے کے اندر اتر رہی تھی۔ یہ روشنی براہ راست نہیں تھی۔ ترچھی اور پھر ترچھی۔ اس روشنی میں کم مائیگی کا احساس غالب تھا۔

حیفہ مام کی آنکھیں تہہ خانے کے مٹیالے فرش پر اس تھوڑی سی روشنی کے گول دائرے پر جمی ہوئی تھیں۔

اڑتی چیل کا سا ایک سایہ تھا جو وقفے وقفے سے اس گول دائرے سے ٹکراتا تھا اور پھر واپس پرے ہو جاتا تھا۔ چیل کے ٹکرانے سے شیشے پر ٹھک کی آواز پیدا ہوئی تھی اور یہ آواز اس تہہ خانے میں فنا ہوتی کسی چڑیل کی کریہہ کی طرح گونجتی تھی۔

کل رات کا بیشتر حصہ وہ اس روزن کی طرف منہ کیے مدد کے لیے پکارتی رہی تھی اس بات سے انجان کہ صدا الصحرا کی آواز جتنی مرضی گونج دار ہو وہ لاحاصل ہوتی ہے۔ جب چلا چلا کر اس کا گلا بیٹھ گیا تو اسے اندازہ ہوا کہ روزن موٹے بلوری تختے سے ڈھکا ہوا ہے۔

پھر بھی وہ اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔

اس نے تہہ خانے میں چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔ کل شام سے وہ یہ کام کافی بار کر چکی تھی۔ اور ہر بار اسے مایوسی ہی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں کھڑے ہو کر اس پر کمرے کا خالی پن واضح ہو گیا تھا۔ تہہ خانہ کسی بانجھ عورت کی طرح بنجر تھا۔ بستروں، لکڑی کے جا بجا بکھرے بھوسے اور ان دونوں کے علاوہ اور کوئی چیز اس کی کوکھ میں موجود نہیں تھی۔ اور شیشے پر مارنے کے لیے کوئی ٹھوس چیز درکار تھی۔

وہ بے چینی سے تہہ خانے میں ٹہلنے لگی۔ ایسے میں اسے حیفہ مام کا اطمینان کھٹکنے لگا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ جس پر صبر کر لیا جائے۔ یہ وید الیاس کی موت کی طرح کا حادثہ نہیں تھا جس پر رونے، آنسو بہانے کے علاوہ انسان بے بس ہوتا ہے۔ وہ ایک دم سے اتنی صابر اور شاکر کیسے ہوئی تھیں۔ انہیں ہرگز رونا نہیں چاہیے تھا۔ بلکہ کوشش کرنی چاہیے تھی۔ آخر وہ اتنی جلدی پست کیسے ہو گئیں۔ یانکا کے لیے حیفہ مام کا یہ رویہ بالکل نیا تھا۔ اس نے آج تک حیفہ مام کو اتنا جھکا ہوا محسوس نہ کیا تھا۔

کونے میں دو دیواروں کا سہارا لیے حیفہ مام آدھی باتیں یانکا سے اور آدھی خود سے کر رہی تھیں۔ اور ان کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

"دشمن ہے۔" الیاس کی زندگی میں اس کا اپنے بھائیوں پر سے مان نہیں ٹوٹا۔ ورنہ۔ ورنہ اس نے تو دکھ سے ہی۔" حیفہ ماہ کہتے ہوئے پھر دکھی ہو گئیں اور لحاف میں منہ چھپا کر رونے لگیں۔

تہ خانے میں چلتے چلتے یمانکا کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ اس نے اسٹریپ کھول کر اپنے دونوں پاؤں جوتوں سے آزاد کیے تھے اور انہیں لکڑی کے بھوسے پر رکھ دیا تھا۔ وہ نازک مزاج بے شک نہیں تھی پھر بھی بہت ساری چھلتر دل کو اس نے ایک ساتھ اپنے پیروں میں گھستے محسوس کیا تھا۔ کچھ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا منکا بنکا یقین تھا اور کچھ ان ریشوں کی چبھن۔ وہ سراپا آنسو ضبط کرنے کی علامت بن گئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ یمانکا۔ تمہاری بے چینی مجھے اور پریشان کر رہی ہے۔ میں صبح ان لوگوں کی پھر سے منت کروں گی۔"

اس نے حیفہ ماہ کی بات نہیں سنی تھی۔ اس کی نظر اپنی اونچی ہیل والے جوتوں پر تھی۔ روزن کافی اونچا تھا۔ لیکن اس نے پھینکنے سے پہلے مارنے کا نہیں سوچا تھا۔

اس نے اپنے خیال کو فوری عملی جامہ پہنایا تھا۔ اور اونچی ہیل والے سینڈل کو روزن کے شیشے پر دے مارا تھا۔ پانچویں چھٹی دفعہ کے بعد اس کا نشانہ بالکل ٹھیک ٹھیک سہی جگہ پر لگنے لگا تھا۔

اس نے اپنی ساری طاقتوں کو یکجا کر لیا۔ اسے تھکنا نہیں تھا۔ بوجھل نہیں ہونا تھا۔ جاگتے اعصاب کو مرنے نہیں دینا تھا۔ اس کی ہمت لاجواب رہی تھی۔ ساری رات۔

ساتھ ساتھ وہ دوسرے عوامل پر بھی سوچنے لگی تھی۔

کینی نے اسے کل فون کیا ہو گا یا آج کرے گی۔ جیسے وہ ہر وقت ہر بات بتانے کے لیے کرتی رہتی ہے۔ اسے فون بند ملے گا۔ حیفہ ماہ کا بھی۔ وہ پریشان ہو جائے گی۔ گھر آئے گی۔ گھر لاک ملے گا۔ وہ پولیس کو انفارم کرے گی اور پولیس فوراً یہاں پہنچ جائے گی۔

فرش پر کسی مردہ چیل کی طرح ٹکرا کر گرے ہوئے سینڈل کو واپس اٹھاتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

لیکن کینی کو اس گھر کا پتا کیسے چلے گا۔ اس گھر کا ایڈریس تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ ڈیڈ الیاس کی وفات پر بھی سب لوگ قبرستان ہی آئے تھے۔

سینڈل ایک بار پھر روزن کے شیشے سے ٹکرایا تھا۔ ناکام۔

حیفہ ماہ کی سہیلیاں۔ ڈیڈ کے فرینڈز "ہمارے اناربی" آریز۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے لوگ نظر انداز کر دیں۔ ایک عورت کا اپنی جوان بیٹی کے ساتھ غائب ہو جانا۔ نہیں پولیس ضرور حرکت میں آئے گی اور جلد ہی یہاں پہنچ جائے گی۔

شیشے پر سینڈل کی ضرب نے دوبارہ بڑی گونج دار آواز پیدا کی تھی۔ دونوں نے ضد باندھ رکھی تھی۔ کوئی ٹوٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"اور اگر ان لوگوں نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا تو۔ نجانے ان لوگوں نے یہاں تک کی اور کب تک کی منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔"

پولیس کو حرکت میں لانے کے لیے کم از کم ہفتہ دس دن کا تو انتظار کیا ہی جاتا ہے۔ اور میں۔ میں یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ جلد ہی نکال لوں گی۔ یقیناً" ان لوگوں نے اس چیز کا تصور نہیں کیا ہو گا۔ ان کا خیال ہو گا کہ یہ ہمیں بند کر دیں گے اور ہم بے بس اور لاچار ہو کر ان کی بات مان لیں گے۔ یہ سب منہ کے بل گریں گے۔"

سوچتے ہوئے یمانکا کی اپنی شکل کرخت ہو گئی تھی۔

وہ دیواریں نہیں توڑ سکتی تھی۔ کسی بھی قیمت پر۔ توڑ بھی سکتی تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دیواروں کے پیچھے مٹی تھی۔ اور مٹی میں سرنگ کھودنے کا اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔

اس کا دایاں کندھا درد کرنے لگا تھا۔ سینڈل اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا جو دیوار کے ہی کسی حصے سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔

"خود کو مت ہلکان کرو بیانکا۔"

حیفہ مام نے رندھی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ یہ تھک تھک کل سے ساری رات ان کے دماغ پر بجتی رہی تھی۔

چاند تیرتا تیرتا کہیں بہت دور نکل گیا تھا۔ اور سورج کی اولین کرنوں نے روزن پر دستک دینی شروع کر دی تھی۔

"اس کائنات میں کوئی ایک ایسا بھی ہے جو اس شیشے کے بنا توڑے ہی ہماری پکار کو دنیا کی ساتویں تہہ سے بھی سن سکتا ہے۔ وہ اللہ ہے۔ تم بھی اللہ سے دعا کرو۔ اب وہ ہی ہمیں اس مصیبت سے نکال سکتا ہے۔"

نیم اندھیرے میں اس نے پیچھے مڑ کر حیفہ مام کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر پوری شدت سے سینڈل کھینچ کر شیشے پر دے مارا تھا۔ کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ اگرچہ یہ آواز کانچ ٹوٹنے کی آواز سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی تھی۔

لیکن اس کا دماغ اتنا حاضر ہی کب تھا جو اس بات پر غور کرتا۔ مایوسی میں اس ننھی سی کامیابی نے بیانکا کا چہرہ تمتما دیا تھا۔ کموڈ پر چڑھ کر روزن کی طرف جھانکتے ہوئے بے اختیار ہی اس کی نظر اپنے سینڈل پر گئی تھی۔ سینڈل کو روزن کی روشنی کے آگے کر کے اس نے جانچا تھا۔

چمڑے کے نیچے کا مضبوط سول ٹوٹ چکا تھا۔ وہ آواز بیل ٹوٹنے کی ہی تھی۔ ایک آنسو خود بخود ہی اس کے گال تک بہتا چلا گیا تھا۔

"تم ہاتھ ہلا کر باہر سے کسی کو متوجہ کرنے کی کوشش کرو بیانکا۔"

حیفہ مام نے اس کے کندھے پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر اسے ایک اور راہ دکھائی تھی۔ بیانکا نے اپنی دوسری آنکھ کا آنسو صاف کیا تھا۔

"بستر تہہ کر کے اس کموڈ پر رکھتے ہیں۔"

اس نے کہا تھا اور بستر تہہ کر کے وہ دونوں کموڈ پر رکھنے لگی تھیں۔

نئے کموڈ کے اوپر روئی دار بستروں کا ایک چھوٹا بے ڈھب سا ٹیلہ بن گیا تھا۔ اب اگر وہ اس احتیاط سے چڑھتی کہ ایک بھی بستر نہ گرے تو وہ یقیناً روزن تک اپنا چہرہ لے جا سکتی تھی۔

"احتیاط سے چڑھو اس پر۔"

ساری احتیاطوں کے باوجود بھی بستر دو بار گرے تھے۔

لیکن تیسری بار بالآخر وہ شیشے کے قریب اپنا چہرہ لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ روزن کی دیوار پر ہاتھ ڈال کر وہ اوپر اٹھی تھی۔ حیفہ مام نے نیچے سے اسے ہر وہ سہارا دے رکھا تھا جو وہ اس عمر اور اس حالت میں دے سکتی تھیں۔

کافی لمحے اسی طرح بیت گئے لیکن بیانکا کچھ نہیں بولی تھی۔ سورج کی دھوپ رفتہ رفتہ بڑھتی ہوئی پورے جوبن پر آ گئی تھی۔

"کچھ ہے؟ کوئی ہے باہر بیانکا۔"

حیفہ مام نے پر امید اور کسی قدر نرم آواز سے پوچھا تھا۔

بیانکا کا وجود کسی مجسمے کی طرح ساکت تھا۔

"بولو بیانکا!"

حیفہ مام نے اسے ٹانگوں سے جھنجوڑا تھا۔ مجسمہ بھربھری مٹی ثابت ہوا تھا۔ حیفہ مام ایسا نہ کرتیں تب بھی بیانکا نے نیچے ہی گرنا تھا۔

اس تہہ خانے کا روزن گھر کے پچھلے حصے کی طرف تھا۔

شیشے کے پار دور دور تک بنا پھول والی سورج مکھی کی فصل بچھی ہوئی تھی۔ اور وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہ تھا۔

بیانکا کا دل چاہا کہ وہ اسی طرح گری رہے اور خوب جی بھر کے روئے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ فرش پر پڑی رہی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ واقعی میں قید کر دی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

برشگال کا دغا باز موسم اپنے عروج پر تھا۔ رات میں خوب بارش ہوئی تھی اور بھیگی چمنیاں رات بھر کالا دھواں اگلتی رہی تھیں۔ پھر صبح کھل کر دھوپ نکلی تھی۔

وہ آتش دان کے اوپر چوبی شیلف پر دھری مختلف چیزوں کو گھور رہا تھا۔

آتش دان کی چھت کے اندر رات کی جلتی لکڑیوں کی راکھ اور کوئلے کا ایک ڈھیر سا بن گیا تھا۔ قد آدم کھڑکی سے آتی چھن چھن تیز دھوپ نے فرش پر ایک نئی کھڑکی کو گھڑ دیا تھا۔ اور اس نئی نوزائیدہ کھڑکی کا فریم رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے آتش دان میں پڑی لکڑیوں پر پڑنے لگا تھا۔

وقتی طور پر ادھ جلی لکڑیاں دوبارہ سلگ گئی ہوئی دکھتی تھیں۔ بہت دیر تک کھڑے کھڑے جیسے ایک صدی بیت گئی۔

"یہ وہ ..." تب ہی سیرین نے انگوٹھی اور دو انچ کی لکڑی کا ٹکڑا (تعویذ) شہرام کے ہاتھ پر دے مارا تھا۔

"اب میرے گھر مت آنا۔ اب مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔" اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟"

وہ ان دونوں چیزوں کو پہچانتا تھا۔ صرف سیرین کے ردعمل کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

"انگشتری ... [illegible] تعلق کی۔"

"یہ اچانک تم اتنی بھیانک کیوں ہو؟" وہ اپنے ہاتھ میں موجود ان دونوں چیزوں کو دیکھنے لگا تھا۔

"تمہاری وجہ سے۔ تم میری ایک بات نہ مان سکے۔ دیکھو اب ہم دوست بھی نہیں رہے۔"

"جب کوئی مر جاتا ہے تو پیچھے رہ کر اس کی لاش سے گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ ایک تعلق کو ختم کر کے تم دوسرے تعلق میں جان کیسے ڈال سکتی ہو؟"

سیرین خاموش رہی تھی۔

"مجھے ایسا طریقہ بتاؤ سیرین! جس سے تم راضی ہو جاؤ۔ میری محبت تمہارے دل میں دوبارہ بھر جائے تم پہلے والی سیرین بن جاؤ؟"

"خدا کے لیے بس کرو شہرام!" سیرین کی آواز سارے کمرے میں پھیل کر پلٹی تھی۔

"دیکھو میری محبت، میرا دل اب بھی ویسا ہی ہے۔ اس میں اب بھی تمہارے نام کی دھڑکن ہے۔ ارچیر کی بارشیں بھی ہر بار ایک جیسی نہیں برستی ہوں گی، لیکن میں تمہارے ساتھ ویسا ہی رہوں گا۔"

"ان باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں شہرام۔"

"میں تمہارے لیے خود کو اذیت دینے پر بھی تیار ہو جاؤں گا اگر اس سے تمہاری خوشی منسوب ہوگی تو۔"

"میری خوشی۔ کیا یہ بات تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ میری خوشی اب تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔"

"کیا میری محبت اتنی بے معنی اور کمزور تھی کہ تین سال کی جدائی اس پر اثر انداز ہو گئی۔"

"تم مجھ پر ہر طرح کا الزام دھر سکتے ہو شہرام مگر اب ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں واپسی کے راستے کھو بیٹھی ہوں۔"

"تمہاری زندگی میں کوئی اور کیسے آگیا سیرین؟"

"مجھے بھی پتا نہیں چلا۔"

"اگر میں ایسا کرتا تو تمہیں کیسا لگتا؟"

"میں... میں تم سے کوئی سوال جواب نہ کرتی۔ تمہاری خوشی میں خوش ہو جاتی۔"

"یہ تجربہ بہت بھیانک ہے۔ تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"اور میں کر چکی ہوں۔ اور مجھے کوئی پچھتاوا بھی نہیں۔" اس کے انداز نے باغیانہ پن اختیار کر لیا تھا۔

شیلف کے اوپر لگی Agim Suloj (البانی مصور) کی پینٹنگ "غنی پاشا" کی نقل کو وہ گھورنے لگا تھا۔ تصویر میں جا بجا بکھرے مختلف رنگ لمحہ بہ لمحہ سمندری لہروں کی صورت اختیار کرتے جا رہے تھے اور شہرام خود کو اس سمندری طوفان میں غرق ہوتا محسوس کر رہا تھا۔

"کیا نام ہے اس لڑکے کا؟" بڑی دیر بعد وہ گویا ہوا تھا۔

"وقت آنے پر تم جان جاؤ گے۔"

"کیا تم بھول گئی تھیں کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔ یا تم مجھے بھول گئی تھیں۔ میری محبت کو۔"

سیرین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب دنیا کے کسی بے وفا کے پاس نہیں ہوتا شہرام کو سیرین کی اس خاموشی نے طیش دلایا تھا۔

"بولو۔ جواب دو۔" اس نے سیرین کا بازو اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھام لیا تھا۔

"چھوڑو مجھے شہرام۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔" وہ غصے سے تیز ہو کر بولی تھی۔

"ہاں میں پاگل ہو گیا ہوں۔ اور میرے پاگل پن کی وجہ صرف تم ہو۔" شہرام نے اس کے بازو کو جھٹکے لیے تھے۔

"سمجھو میں مر گئی ہوں۔" شہرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے وہ بولی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے یہ سب؟"

اماں زیتونیہ نجانے کہاں سے نمودار ہوئی تھیں۔ ان کے آگے جو منظر تھا اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ شہرام نے سیرین کا بازو چھوڑ دیا۔ سیرین نے وہاں رکنے میں ایک لمحے کو بھی گنوا جانا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔ جو کام وہ کرنے آئی تھی وہ ہو چکا تھا پھر اب رکنے کا کوئی جواز بھی تو نہیں رہا تھا۔

اماں زیتونیہ شہرام کی شکل دیکھنے لگی تھیں اور وہ چوبی شیلف پر دھری مختلف چیزوں کو۔۔۔ پھر اماں زیتونیہ جیسے نمودار ہوئی تھیں ویسے ہی غائب بھی ہو گئیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ ان دونوں کا آپس کا مسئلہ ہے۔

"اگر یہ ایک دوجے سے بے تحاشا محبت کر سکتے ہیں تو لڑ بھی سکتے ہیں۔" وہ زیادہ دن تک اس غلط فہمی کی حقیقت سے انجان نہیں رہنے والی تھیں۔

شہرام وہیں کھڑا رہا تھا۔ دھوپ کھڑکی کا فریم بڑھتے بڑھتے شیلف کو جا لگا تھا۔ شہرام آج یہیں رات کر دینے والا تھا۔ شیلف پر دھری مختلف چیزیں دھوپ کی زد میں آنے لگی تھیں۔

شیشم کی لکڑی کا ایک گولڈن ایگل (البانی علامت) بابا ذلاری کے ہاتھ کا بنا ہوا جس کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ اطراف میں دو یونانی گلدان تھے جو بنا پھولوں کے بھی بہت خوب صورت دکھتے تھے۔ اور چند خاندانی تصویروں کے فریم۔

ان ہی چیزوں کے درمیان ایک خنجر بھی پڑا ہوا تھا۔ پندرہویں صدی کے دور کا اور جس کا اسٹینڈ سنگ یشب کا تھا۔ شہرام نے شیلف سے وہ خنجر اٹھا لیا اور اسے میان میں سے نکال کر غور سے اس طرح دیکھا جیسے وہ آج یہیں اچانک سے اس گھر میں آ گیا ہو۔

کھڑے کھڑے فیصلہ کر لینے کے بعد شہرام نے اس خنجر کو اپنی نبض پر چلایا تھا۔ خنجر کی دھار تیز نہیں تھی۔ ایک سرخ لکیر اس کی کلائی پر بنی تھی جو فوراً" ہی معدوم بھی ہو گئی تھی۔ بددل اور مایوس سا ہو کر اس نے خنجر کو دوبارہ میان میں ڈالنا چاہا تھا۔

خنجر پرانا تھا یا میان کے اندر کوئی زنگ تھا۔ خنجر نے میان میں جانے سے جیسے انکار کر دیا تھا۔ وہ بڑی دیر اس کے ساتھ زور آزمائی کرتا رہا۔ پھر اسے سالوں پہلے سنی ایک روایتی بات یاد آ گئی تھی۔

"خنجر میان میں سے نکل تو اپنی مرضی سے آتا ہے۔ لیکن پھر یہ شب خون مارے بغیر واپس میان میں نہیں جاتا۔"

یہ بات یاد آتے ہی اس نے خنجر کو اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔

آنکھوں میں کسی خوفناک ارادے کی پختگی لیے وہ وہاں سے باہر نکلتے ہوئے سوچنے لگا تھا کہ یہ خنجر "سان" پر تیز ہو گا یا "سلی" پر۔؟

☼ ☼ ☼

مالکوس (رات کے راگ) میں بہا کے عیاں راز

دفن تھے۔ دور و نزدیک میں موجود ہلکی لرزشیں بھی بلند بانگ صدائیں بن گئی تھیں۔ پشت در پشت سے چلی آرہی زمین کے اندر لاکھوں کروڑوں کہانیاں حنوط تھیں۔ ظلم کی کہانیاں۔ ناانصافی کی داستانیں۔ ہوا میں گھوڑوں کے سموں اور تیر کے پیہم کی آواز تھی۔ اس نے کسی تیر سے بچنے کے لیے خود کو نہیں بچایا تھا۔ وہ بے خوف ہو چکی تھی اور پست بھی۔

وہ بستر پر چت لیٹی تھی۔ اور راکھ زدہ فرش پر پڑے لکڑی کے ریشوں سے کھیلنے میں مصروف تھی۔ وہ کبھی بھوسے کو چن چن کر اٹھا کرتی۔ کبھی انگلی سے گول دائرے بناتے بناتے انہیں دوبارہ بگاڑ کر رکھ دیتی۔

حیفہ مام کب سے اس کا یہ کھیل دیکھ رہی تھیں۔

پورا کمرہ باتھ روم کے تعفن سے بھرا ہوا تھا۔ بدبو کی نکاسی کے لیے سیڑھیوں کے ساتھ درز کے علاوہ اور کوئی درز نہیں تھی۔ بیانکا کی گھٹن رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ اپنے چہرے سے کسی طرح کا تاثر نہیں دے رہی تھی۔ حیفہ مام بھی بری طرح کھانسنے لگی تھیں۔ یہ کھانسی انہیں تہ خانے میں دوسرے دن سے شروع ہوئی تھی اور آج چھٹا دن تھا۔ ان کی کھانسی اب انہیں لمحوں میں نڈھال کر دیتی تھی۔ اس کے باوجود ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے ہوئے بیانکا پر پھونکتی رہتی تھیں۔ انہیں بہت سے ورد یاد تھے۔ مصیبت سے نکالنے والے۔ مشکل دور کرنے والے۔ وہ ان وردوں کو پڑھنے کے علاوہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ بیانکا نے بھی فرار کی ساری راہیں تلاش کرنا چھوڑ دی تھیں۔ ان کو بند کرنے کے لیے اس قدر منصوبہ بندی کی گئی تھی کہ اب باہر والوں کو کوئی جادو گر ہی ان ماں بیٹی کی اس تہ خانے میں موجودگی کے بارے میں بتا سکتا تھا۔

"بیانکا اٹھو۔ کھانا اٹھاؤ وہاں سے۔" حیفہ مام نے بیانکا کو بلایا تھا۔ وہ کب سے ایسے ہی دونوں ہاتھ کھول کر بنا لحاف اوڑھے لیٹی تھی۔ حیفہ مام کا دل بند ہونے لگا تھا۔ ان دنوں کی سختی اس کی ساری زندگی گھما سکتی تھی۔

بیانکا نے سنا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی۔

حیفہ مام کھانستے ہوئے خود ہی اپنے بستر سے باہر نکلی تھیں۔

ہر چیز کو بہت ترتیب سے چلایا جا رہا تھا۔

کھانا رکھنے کے لیے بھی تہ خانے کے دروازے کو پورا نہیں کھولا جاتا تھا۔ بلکہ نچلی تختی ہٹا کر کھانا سیڑھی کے پہلے زینے پر رکھ دیا جاتا تھا۔ کھانے کے لیے برتن بھی ڈسپوزیبل تھے تاکہ دھاتی یا کسی بھی طرح کے دوسرے برتنوں سے وہ کوئی کارروائی نہ کر سکیں۔

شروع کے دنوں میں بیانکا نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ لیکن یہ اذیت اپنے ہی خلاف جنگ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھی اگر انہیں اس کی یا حیفہ مام کی ذرا سی بھی پروا ہوتی یا وہ ان دونوں کے لیے ترس، رحم کا جذبہ رکھتے تو نوبت یہاں تک آتی ہی نہ۔

لیکن ساری بازیاں ہار جانے کے باوجود بیانکا کھانے کو حرام تصور کر کے کھاتی تھی۔ احمد کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے اور وہ ایسی دوائیوں کے بارے میں بھی جانتی تھی جن کے روزانہ کے استعمال سے انسانی اعصاب بالکل ست اور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اکثر پولیس اور خفیہ انویسٹی گیشن والے ان ادویات کا استعمال قیدیوں پر کرتے ہیں۔ اور ان سے انہیں "یقیناً" کافی مدد ملتی ہے۔

بیانکا کو شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ ان کے کھانے میں بھی ایسی ہی دوائیں شامل کی جاتی ہوں گی۔ تاکہ جلد ہی وہ ان کے آگے سرنڈر کر دیں یا وہ مزید مضبوط نہ رہ سکے۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

آئینہ نچہ

مگر یہ ہار جاتی ہے

محبت کے دربار میں جیت ہمیشہ حسن کی ہوتی ہے اور حسن ہمیشہ دیکھنے والے کی آنکھ میں نہیں ہوتا اکثر یہ منظور نظر کی قسمت میں ہوتا ہے۔

ہم دونوں بچپن سے ساتھ تھے اور کیوں نہ ہوتے' وہ میرے تایا ابا کا پہلا بیٹا اور میں اس گھر کی سب سے بڑی اور اس کے منجھلے چچا کی اکلوتی بیٹی۔ ہاں تو ہم بچپن سے ساتھ تھے' ہر کھیل میں پارٹنر' ہمارا گھر ایک تھا' ہمارا اسکول ایک تھا' ہمارے کمرے ساتھ ساتھ تھے۔ جب اس نے سائیکل چلانا سیکھی تو اس کی پہلی سواری میں تھی' اور جب میں نے روٹی بنانا سیکھی تو سب سے پہلا مہمان وہ تھا۔ ہم دونوں گھر کے بڑوں کے لاڈلے اور چھوٹوں کے سردار تھے۔ وہ بہت حسین سال تھے یا صرف وہی حسین سال تھے' میں کبھی فیصلہ نہیں کر پائی۔ میں کبھی محبت اور دوستی میں فرق بھی نہیں سمجھ پائی' اور وہ جسے سمجھنا چاہیے تھا' وہ سمجھا بھی تو صرف محبت اور وہ بھی کسی اور سے' کسی اور کی' کسی اور کے لیے۔

☼ ☼ ☼

میں صدمے سے نڈھال تو کب سے بیٹھی تھی' عاشر کو دیکھتے ہی رو پڑی۔

"مانو! میری بچی کیوں رو رہی ہو؟"

وہ بہت پریشان ہو کر مجھے چپ کروانے لگا' مگر میں اور زیادہ رونے لگی' اس وقت وہ بارہ سال کا' اور میں دس سال کی تھی نا سمجھ۔ پر اپنے رونے کی وجہ بہت اچھی طرح میری سمجھ میں آرہی تھی' اور وہ تب بھی اتنا ہی انجان اور بے خبر تھا جتنا کہ آج۔ وہ لوگ تایا ابا کی جاب' "بلکہ حقیقتاً" تائی اماں کے میکہ کی وجہ سے لاہور شفٹ ہو رہے تھے۔ جب سے جائیداد کا بٹوارہ ہوا تھا' تایا ابا الگ گھر کی تلاش میں تھے۔ یہ گھر انہیں لاہور میں ملے گا کسی کے سان و گمان میں نہ تھا۔ ایسے میں آکر اپنے تایا ابا' تائی امی' تھے سے کزنز اور عزیز از جان دوست کی جدائی مجھے رلا رہی تھی تو کیا غلط تھا؟ بہرحال' تایا ابا دادو سے اور وہ شرمجھ سے یاد رہتے اور بار بار آنے کے بہت سے وعدے کر کے لاہور چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

کئی موسم بیتے' کتنے سال گزرے' کتنی ہی دفعہ ہم لاہور گئے اور کتنی ہی دفعہ وہ یہاں آئے۔ دوری نے ہماری دوستی پہ کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔ بس اب ہمارے کھیل بدل گئے تھے۔ پارٹنرز ہم اب بھی تھے' کچھ عمروں نے فاصلہ ڈالا۔ پر وہ بھی زیادہ اثر انداز نہ ہو سکیں۔ مجھے یاد ہے' جب وہ دادو کی وفات سے پہلے آخری بار حویلی آئے تھے' تب ہم دونوں نے ساری ٹیمز کو بیڈ منٹن میں ہرا دیا تھا اور سنگل' سنگل کھیل کر ایک دوسرے کو ہرانے کے لیے ہم دونوں میں سے کوئی تیار نہ تھا۔

پھر دادو کی وفات ہو گئی' چھوٹے چچا بھی اپنے سسرال کی فرمائش پر لاہور شفٹ کر گئے۔ اس پر ابا جی دونوں بھائیوں سے ناراض ہو گئے۔ پرانے رشتوں کی وقتی دراڑیں نئے رشتوں کے لیے اتنی بڑی ثابت ہوں گی یہ میرے بابا جان کو پتا نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اب گاؤں کی اس بڑی سی حویلی میں' میں اور میرے اماں' بابا ہی رہ گئے۔ در و دیوار سے ٹپکتی تنہائی

مجھے وحشت زدہ کر دیتی۔ اپنے جب بہت زیادہ یاد آتے تو چھپ کر رو دیتی۔ اب میں سارا وقت اپنی کتابوں میں گمن رہتی۔ میں پوزیشن ہولڈر تھی۔ زندگی کے ہر میدان میں اول۔ جیت گویا میرے لیے لکھ دی گئی تھی اور میں اسے اپنا حق سمجھ کر اور فرض ادا کر کے (محنت کر کے) حاصل کر ہی لیتی تھی۔

میرے اماں ' بابا مجھ سے بہت خوش تھے اور ان دنوں مجھے بھی میرے اماں ' بابا ' کالج ' کتابوں ' ٹرافیوں ' مقابلوں ' مباحثوں کے علاوہ کسی سے سروکار نہ تھا۔ حالانکہ یہ تتلیاں پکڑنے اور رنگوں سے کھیلنے کے دن تھے۔ کبھی سہیلیاں شادی کا ذکر لگی کا پوچھتیں تو میں آرام سے کہتی ابھی تو بہت وقت ہے۔ تین سال ایسے ہی بیت گئے ' نہ ان میں سے کوئی یہاں آیا نہ ہم وہاں گئے۔

☆ ☆ ☆

میں بی اے کے دوسرے سال میں تھی جب عید پر تایا ابا اور چچی جان آ گئے۔ بہنوں کو راضی کیا ' بابا سے گلے شکوے ہوئے اور سب کچھ معمول پر آ گیا یوں جیسے کبھی کوئی تلخی آئی ہی نہ تھی۔ اماں جی نے تائی امی اور چچی کے لیے ایسے تحائف بھیجے جیسے وہ ان دو سگی بہنوں کی تیرہ ' بچھڑی بہن ہوں۔

☼ ☼ ☼

اس مرتبہ جب تایا ابا آئے تو پتا چلا عاشر اور مہو کا رشتہ ہونے والا ہے، یہ بات ایک اور ـــ طوفان لے آئی تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری اور عاشر کی بات بچپن سے طے تھی۔ مطلب وہ میرے بچپن کا منگیتر تھا اور اب اس کی بات مہو سے پکی ہونے جارہی تھی۔

میرے اماں، بابا تو چپ کر گئے مگر پھوپھوں نے بڑے بھائی کا بھی لحاظ نہ کیا اور انہیں خوب سنائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ضرور یہ تائی جان اور چچی جان کا کارنامہ ہے۔ دونوں بہنیں ایک ہونا چاہتی ہوں گی اور نام بچوں کا کررہی ہیں۔

کوئی پوچھ بھی کہتا میں خوش تھی اور حیران بھی کہ عاشر اور مہو کی منگنی اور وہ بھی ایک عدد دھماکہ دار اینو کے بعد۔ میں رہ رہ کر اس بات پر ہنستی رہی تب مجھے پتا نہ تھا کہ بعد میں یہی بات مجھے چھپ چھپ کر رلائے گی۔

☼ ☼ ☼

مہو میرے چھوٹے چچا کی بے حد حسین بیٹی ہے۔ وہ چھوٹے چچا کی پہلی، مگر اس گھر کی دوسری بیٹی تھی۔ اسی لیے اس کے آنے سے میرے لاڈ پیار میں کوئی کمی نہ آئی۔ میں بڑی تھی، لاڈلی اور اکلوتی بھی، سو ہر چیز پہلے اور زیادہ میرے حصے میں آتی تھی۔ میں مہو سے دو سال بڑی تھی، ہمیشہ اسے ننھی بچی کی طرح ٹریٹ کرتی، جب بھی وہ ضد کرتی تو میں بڑی بہنوں کی طرح ہی اس کی ضد کو پورا کرنے کی کوشش کرتی۔ اکثر وہ عاشر کی پارٹنر بننے کے لیے ضد کرتی جو وہ میری سفارش پر ناک چڑھا کر قبول کرلیتا اور اپنی زندگی کا ساتھی بنانے سے پہلے اس نے مجھ سے مشورہ تک نہ کیا۔ حیرانی سی حیرانی تھی۔

☼ ☼ ☼

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں تین سال بعد لاہور پہنچ ہی گئی۔ وہاں جاکر جو میں نے دیکھا وہ بہت حیران کن تھا۔ عاشر کی پسند ناپسند معیار حتیٰ کہ عادات بھی بدل چکی تھیں۔ مہو بڑی ہو کر مزید حسین ہوگئی تھی۔ وہ ہر چیز میں عاشر کی پسند ناپسند کا خیال رکھتی، بھنورے کی طرح اس کے گرد منڈلاتی رہتی۔ وہ دونوں مکمل طور پر ایک دوسرے کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے ننھے منے کزنز سے (جو کہ اب خاصے بڑے ہوچکے تھے) حالات دریافت کیے تو ان کے اینو کے ایسے ایسے دلچسپ واقعات سننے کو ملے کہ ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔

☼ ☼ ☼

وہاں سب ویسا ہی تھا۔ تائی امی اور چچی کا اتفاق، کزنز کی نوک جھونک اور مجھے تایا ابا اور چچا جان کی طرف سے ملنے والا پروٹوکول، مگر کچھ تھا جو مسنگ تھا۔ وہ عاشر کی توجہ تھی۔ عاشر صبح جاب پر چلا جاتا اور واپس آنے کے بعد بھی اسے میری قطعاً پروا نہ ہوتی۔ رسمی سا حال چال، سلام دعا اور ہماری گفتگو ختم۔ میں بچپن سے ہر کھیل میں اس کی پارٹنر بننے کی عادی تھی اور اس سے الگ ہونے کے بعد کھیلنا ہی ترک کرچکی تھی مگر اس نے مہو کو اپنا پارٹنر بنالیا تھا۔ اب اگر ہم کھیلتے بھی تو جیت ان کی ہوتی۔ میں جو ہر میدان میں اول تھی، ان دونوں سے ہارنے لگی۔ وہ اپنی جیت کا خوب جشن مناتے اور میں کمرے میں جاکر ڈھیر سارا روتی۔ اپنی ہار کا غم مناتی۔ اس دفعہ مجھے وہاں بالکل مزانہ آیا۔

☼ ☼ ☼

واپس حویلی آکر میں دوبارہ اپنی روٹین میں مست ہوگئی۔ میں پہلے جیسی ہی تھی۔ اپنے حال میں مگن، کتابوں میں گم، صرف جیت کے خوابوں کے ہمراہ، مگر میرے اندر بے چینی بڑھ گئی تھی۔ امتحانات کے بعد میں کتنا ہی وقت، حویلی کے لانوں، پر آمدوں اور باغیچوں میں گھومتے، اپنا بچپن یاد کیے جاتی اور میرے بچپن میں میرے پاس یاد کرنے کے لیے صرف عاشر تھا، میں تھی، ہمارا خیالی گھر اور فلسفیانہ کھیل

تھے۔

اماں' بابا خوش تھے کہ میں اپنی کتابوں کی دنیا سے باہر نکلی۔ انہیں کیا پتا تھا کہ اب میں جس دنیا میں کھونے جارہی تھی اس سے نکلنے کا کوئی دروازہ نہ تھا۔ ہاں تو میں اپنا بچپن یاد کیے جاتی' جہاں کبھی کھیل کھیل میں' میں کھانا بناتی اور وہ کھا کر نقص نکالتا' تو کبھی وہ اپنی چھوٹی سی سائیکل کو پگڈنڈی پر گھماتے ہوئے مجھے سیر کے لیے لے جاتا۔ حیرت کی بات یہ کہ مجھے صرف عاشر اور میں یاد تھے اور کوئی بھی یاد نہ تھا۔ کیوں کہ ہم منظر کا صرف وہ حصہ اپنی یادداشت میں محفوظ کرتے ہیں' جس میں ہمیں دلچسپی ہو اور باقی ہر حصے کو فراموش کردیتے ہیں۔ میرے بچپن کے تمام مناظر میں دلچسپ حصہ صرف عاشر تھا۔ سو صرف وہ ہی مجھے یاد رہا۔

میری بے چینی تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ میں سارا وقت لاہور والوں کو یاد کیے جاتی۔ عاشر اور مہو کی منگنی پھوپھوؤں کی ناراضی کے باوجود ہوگئی تھی۔ میں نے ایم اے میں داخلہ بھی لے لیا تھا اور بی اے میں پوزیشن بھی' مگر میرے اندر کی شورش میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

میں اپنا تساویر کا البم دیکھ رہی تھی۔ یہ ہمارے بچپن کی تصاویر تھیں جن کی ایک کاپی' یہاں سے جاتے وقت تایا جان اپنے ساتھ لے گئے تھے' میں ہمیشہ سے یہ تصاویر دیکھتی آرہی تھی۔ ایک تصویر جس

میں میں' مہو اور عاشر تھے پر میری نظریں جم گئیں۔ اس میں سے اپنا اور عاشر کا حصہ الگ کرکے مہو اپنے پاس رکھتی تھی اور میں اس بات کو اس کی محبت کی ادا اور بچپنا جان کر مسکرا دیتی تھی۔

حیرانی کی بات یہ نہ تھی' حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ اس میں مجھے آج تک مہو دکھائی ہی نہ دی تھی۔ یعنی جو ٹکڑا مہو نے تایا ابا کے البم سے اپنے پاس کاٹ رکھا ہے' وہ میری اور عاشر کی اس تصویر کا ہے' مجھے اس دن پتا چلا۔ اور ساتھ ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں بھی عاشر سے محبت کرتی ہوں' مگر میری محبت اتنی چھوٹی نہیں کہ وہ مجھے تصویریں کاٹنے پر مجبور کردے' بلکہ میری محبت تو اتنی بڑی ہے کہ اس کے سامنے باقی سب خود ہی غائب اور بے معنی ہوجاتا ہے۔

مہو کی قسمت کا حسن' اسے دربار محبت میں فتح یاب کر گیا اور میں کسی ظالم سماج' کڑے اصولوں' نام نہاد لنا کے درمیان میں نہ ہوتے ہوئے بھی ہار گئی۔ کیوں کہ محبت ہار جاتی ہے۔ اور اکثر اسے ہارنے کے لیے کوئی خاص وجہ درکار نہیں ہوتی۔ کسی کی جیت کسی کی ہار بن جاتی ہے اور کہانی جاری رہتی ہے۔

محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے۔

☼

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ "پچھتاؤ گی۔" ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

مدیحہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔ مدیحہ کو بہت دکھ ہوتا ہے تب پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

عبداللہ پابند صوم و صلوٰۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے۔ مدیحہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ مدیحہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

ناولٹ

مدیحہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے۔ مونا اس کی کزن ہے۔ وہ دونیوں شہرت قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آتی ہے۔

مدیحہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔

شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔

ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل ڈاکٹر حماد کا انتقال ہو چکا ہے۔

نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جہانزیب اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا، بیران کے پاس لندن میں ہے۔

اوریدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے۔ جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔

عبداللہ مدیحہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔

سعد اپنے دوست کے ہمراہ فیشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے دے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کو دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ نے

کسی مذہبی جنونی نے قتل کردیا۔ شازے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑدی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اوریدا ارحم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارحم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کردے دیتے ہیں۔ آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہوکر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔

ارحم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتی ہے۔

مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً شادی کرلے۔ عبداللہ نے فوراً شادی سے انکار کردیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہوجاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔

تیسویں قسط

عدینہ کو پورے چار گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔ اگلے تین دن بھی اس نے نشہ آور ادویات کے زیر اثر گزارے تھے۔ سوتے جاگتے میں بھی بے بے کا فقرہ اسے اپنے وجود کو کاٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس ایک فقرے میں صدیوں کا کرب اور سمندروں کی گہرائی سے بھی زیادہ اذیت تھی۔ تکلیف کا ایک احساس تھا جو کسی تند چھری کی طرح اس کا گلا کاٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"عبداللہ کا جہاز گر گیا۔" عدینہ کو لگا کہ ایفل ٹاور یا برج خلیفہ اس کے اوپر آن گرا ہو۔

"عبداللہ مر گیا۔" عدینہ کو لگا کسی نے اس کے جسم کو کانٹوں پر گھسیٹا ہو۔ ہر طرف اذیت ہی اذیت تھی۔

عدینہ کے لیے زندگی کا مفہوم اسی شام بدل گیا تھا۔ وہ گھنٹوں خلا میں تکتی رہتی۔ اس نے بڑے آرام سے خاموشی کو اوڑھ لیا۔ مونا اس کے سامنے کھانا لا کر رکھ دیتی تو وہ چند لقمے زبردستی کھا لیتی اور کبھی زیادہ دیر خالی پیٹ رہنے سے اسے ابکائی آجاتی۔ دنوں میں اس کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے کی تازگی میں پیلاہٹ کا عنصر غالب آگیا تھا۔ بے بے اور آپا صالحہ اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی تھیں۔

عبداللہ کی ڈیڈ باڈی نہیں ملی' بلکہ اس بدقسمت جہاز کے سارے ہی مسافر لاپتا ہوگئے تھے۔ ان بے شمار لوگوں کے ساتھ بہت سے لوگ جیتے جی مر گئے تھے۔ کسی اپنے کی میت کو دیکھ کر اسے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار کر انسان جب وقت گزارتا ہے تو کسی نہ کسی طرح انسان کا دل سنبھل ہی جاتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے صبر آہی جاتا ہے۔

لیکن یہ کیسی موت تھی جس میں اتنے سارے لوگ اچانک ہی زندگی کے مدار سے نکل گئے اور ان کے پیارے دنیا کے نقشوں میں ان جگہوں کو دیکھ دیکھ کر روتے رہے کہ شاید کسی اپنے کے جسم کا کوئی حصہ یہیں کہیں گرا ہوگا۔

"اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" اس دن وہ صحن میں لگے جامن کے درخت کے نیچے بیٹھی تھی اور بے مقصد ایک بڑے سے تنکے کے ساتھ زمین پر

بے معنی لکیریں کھینچ رہی تھی' جب آپا صالحہ اس کے پاس آن بیٹھیں۔ انہوں نے ہاتھ میں تسبیح پکڑ رکھی تھی جس کے دانے بالکل ساکت تھے۔ وہ شاید اس پر کچھ پڑھنا بھول گئی تھیں۔

عدینہ نے چونک کر آپا صالحہ کا چہرہ دیکھا' ان کے چہرے پر ایک دم ہی جھریوں کا ایک جہان آباد ہو گیا تھا۔ وہ پتا نہیں کیوں اچانک ہی بوڑھی لگنے لگی تھیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں ایسی نرمی تھی جو عدینہ نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ہاتھ سے پکڑے تنکے سے زمین پر کچھ لکھنے لگی۔

"انسان بہت سے معاملات میں بے بس ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ کی مصلحت وہی جانتا ہے۔" وہ آہستگی سے بڑبڑائیں۔ عدینہ پھر بھی خاموش رہی۔

آپا صالحہ نے غور سے دیکھا وہ زمین پر تنکے کے ساتھ عبداللہ کا نام لکھ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے اللہ کو دو نام بہت پسند ہیں' عبداللہ اور عبدالرحمن۔" آپا صالحہ کی بات پر اس نے ناسمجھ انداز سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی ان کی بات کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔

"یہ نام تم زمین پر مت لکھو۔ بے حرمتی ہوتی ہے۔" آپا صالحہ کے سنجیدہ انداز پر اس نے بوکھلا کر ہاتھ میں پکڑا تنکا نیچے پھینک دیا۔ وہ اب خوفزدہ نظروں سے آپا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھی۔

"جو نام دل پر لکھا ہو' اس کا میں کیا کروں۔۔۔؟" لیکن وہ یہ بات مر کر بھی اپنی ماں سے نہیں پوچھ سکتی تھی۔

"عبداللہ کے ماموں اور چچا نے بہت بھاگ دوڑ کی' لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔" آپا صالحہ پتا نہیں کیوں آج اس سے بے معنی باتیں کر رہی تھیں۔

"اس کی والدہ کی طبیعت بہت خراب ہے' اس کے بڑے ماموں انہیں پنڈی لے گئے ہیں۔" عدینہ سمجھ سکتی تھی کہ اس ماں کی کیا حالت ہو سکتی ہے' جس کا جوان بیٹا بھری جوانی میں اس طرح اچانک گزر جائے۔

"خیر مغرب کی اذان ہو رہی ہے' اٹھو اور وضو کرو' اللہ سے دعا کرو' وہی ذات تمہیں صبر دے سکتی ہے۔" آپا صالحہ کا لہجہ اب بھی سنجیدہ تھا۔ عدینہ نے کان لگا کر اذان کے الفاظ سنے' شاید عبداللہ کے کسی شاگرد نے اس کی جگہ سنبھال لی تھی۔ فضا میں اذان کی آواز پہلی دفعہ عدینہ کے کانوں کو اجنبی سی لگی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اس مدرسے کے لاؤڈ اسپیکر سے عبداللہ کے علاوہ بھی کسی کی آواز گونجے گی۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ وضو کرتے ہوئے بے آواز رو رہی تھی۔

اسے پتا ہی نہیں چلا مونا کب اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔

"وضو کے دوران روتے نہیں ہیں۔۔۔" مونا نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو عدینہ بے اختیار اٹھ کر اس کے گلے لگ گئی۔ وہ دونوں ہی اب باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

وہ نماز عدینہ کی زندگی کی سب سے مشکل نماز تھی' وہ التحیات پڑھتے پڑھتے بھول جاتی اور کبھی ایک دفعہ سجدہ کر کے سوچنے لگتی کہ یہ پہلا تھا یا دوسرا' اور کبھی سلام پھیرنے کے بجائے پھر اٹھ کھڑی ہو جاتی۔ سورت اخلاص' سورت کوثر جیسی مختصر سورتیں وہ بار بار بھول رہی تھی۔ تنگ آ کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ لفظ سارے گونگے ہو گئے تھے' وہ اس خدا کے سامنے اپنی قوت گویائی سے محروم ہو گئی تھی جو دلوں کے حال خوب جانتا تھا۔

"شکر ہے بے بے' میں نے عدینہ کا نکاح نہیں کر دیا تھا۔" وہ جائے نماز لپیٹ کر برآمدے کے تخت پر آن بیٹھی۔ بے بے کے کمرے کی کھلی کھڑکی سے آپا کی سنجیدہ آواز باہر آ رہی تھی۔

"تم نے تو پوری کوشش کی تھی' وہ تو عبداللہ ہی نہیں مانا تھا۔" بے بے نے لاپروا انداز سے یاد دلایا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" صالحہ آپا کی آواز میں جھنجھلاہٹ کا عنصر غالب آیا۔ "لیکن اب

سوچتی ہوں کہ ٹھیک ہی نہیں مانا' ورنہ عدینہ پر یہ وہ کا ٹھپہ لگ جاتا۔" آپا صالحہ کی خود غرضانہ سوچ پر عدینہ کو باہر بیٹھے غصہ آیا۔

"کاش آپ نکاح کر ہی دیتیں' تاکہ میں کھل کر سوگ تو منا سکتی۔۔" وہ دل ہی دل میں ناراضی سے انداز سے سوچ کر رہ گئی۔ اسے نہ جانے کیوں آپا پر آج کل ضرورت سے زیادہ ہی غصہ آنے لگا تھا۔ عبداللہ کی ناگہانی موت نے اس الاؤ کو مزید بھڑکا دیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ آپا کے ساتھ ساتھ اس سے بھی خفا ہو کر گیا تھا اور یہ ہی سوچ اسے بے سکون کرنے کو کافی تھی۔

"مجھے تو عدینہ کی حالت دیکھ کر ہول اٹھ رہے ہیں۔" بے بے کے لہجے میں پریشانی ہی پریشانی تھی۔

"ٹھیک ہو جائے گی' میڈیکل کی ٹف تعلیم میں کہاں کچھ یاد رہتا ہے۔" آپا صالحہ نے ان کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"لیکن میری عدینہ ایسی نہیں ہے۔" بے بے اس کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ "اس کے ذہن سے اتنی آسانی سے چیزیں نہیں نکلتیں۔" بے بے کا افسردہ انداز باہر بیٹھی عدینہ کو اور زیادہ مضطرب کر گیا۔ وہ سنجیدگی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ڈائری اٹھائی اور جو جو اس کے دل میں آیا ———— وہ لکھتی گئی۔

"اور عبداللہ مر گیا' جس سے میں نے کبھی ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ جس کے ہونے سے میری سانس چلا کرتی تھی' اور جس کی طرف دیکھ کر مجھے دنیا خوب صورت لگتی تھی۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا' ہمیں جن سے محبت ہو' ان کی موت کے ساتھ چاہت کا احساس بھی ختم ہو جائے۔ ہم اپنے پیارے کو قبر کی گہرائیوں میں اتارتے ہوئے محبت کی پوٹلی وہیں کہیں دفن کیوں نہیں کر آتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے لوگ بظاہر زندگیوں سے چلے جاتے ہیں' لیکن ان کے کہے لفظ' جملے اور باتیں ہمیں جیتے جی مار دیتی ہیں۔ ہم زندہ ہوتے ہیں' بظاہر سانس بھی لیتے ہیں' لیکن اندر ہی اندر کہیں اس قبر میں دفن ہو چکے ہوتے ہیں جس میں ہمارا کوئی پیارا ابدی نیند سو رہا ہوتا ہے۔"

اس نے پورا پیراگراف لکھا اور ڈائری بند کر دی۔ بہت سے رکے ہوئے آنسو ایک دم ہی آنکھوں کی منڈیر پر گر گئے۔ کمرے میں اندر داخل ہوتی مونا نے یہ منظر بڑے دکھ بھرے انداز سے دیکھا۔ وہ اس کے جذبات کو سمجھ سکتی تھی۔

"رونے سے کوئی واپس تھوڑی آجاتا ہے۔" مونا نے قریب آکر اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے۔ عدینہ کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ ہو چکی تھیں۔

"مجھے ایک بات کا دکھ ساری زندگی رہے گا مونا۔" وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کاش میں اس دن عبداللہ کی بات سن لیتی۔" عدینہ کا دل ایک دم ہی بھر آیا۔

"میں نے کتنا کہا تھا آپ کو لیکن ۔۔" مونا پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

"مجھے کیا پتا تھا وہ اپنی زندگی کی آخری بات کرنے کے لیے مجھے بلا رہا ہے۔" عدینہ کے چہرے پر دنیا جہاں کے پچھتاوے تحریر ہونے لگے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے عدینہ! عبداللہ بھائی زندہ ہوں۔" مونا کی بات پر عدینہ کے چہرے کا رنگ بدلا۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔" وہ بوکھلائی۔

"انسان کبھی کبھی ایسے حادثوں سے بچ بھی تو جاتا ہے۔" اس کی بات پر عدینہ بے بس انداز سے مسکرائی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مونا نے محض اسے دلاسا دینے کے لیے یہ بات کی ہے۔

"ہم لوگ کتنے نادان ہیں' خوش فہمیوں کی ڈور تھام کر اپنی ڈوبتی ابھرتی نبضوں کو سہارا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہو گا' لیکن پھر بھی ہم خود کو ویسا سوچنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ جو ہمارا دل چاہتا ہے۔"

عدینہ نے اٹھ کر اپنی ڈائری اٹھائی اور الماری میں رکھ دی۔ آج کے دن کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس کا

سر درد کے گہرے احساس سے پھٹ رہا تھا۔ اس نے چھوٹی میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور پیناڈول کی دو گولیاں ایک ساتھ نگل لیں۔ وہ آنکھیں بند کرکے اس تلخ دنیا سے دور اس خیالی دنیا میں جانا چاہتی تھی، جہاں وہ اور عبداللہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کچھ بتاؤ تو سہی یہ سب ہوا کیسے؟" رباب، شانزے کے ماتھے پر بندھی پٹی دیکھ کر سخت بوکھلائی۔ پٹی پر تازہ تازہ خون نمایاں تھا، وہ ڈاکٹر کے کلینک سے ہوسٹل واپس آچکی تھی۔ اس کی روم میٹ کو اسے دیکھتے ہی شاک لگا۔ وہ گھنٹے پہلے وہ پرستان کی کوئی پری لگ رہی تھی جو راستہ بھول کر زمین پر آگئی ہو لیکن اس وقت وہ بالکل مختلف حلیے میں تھی۔

"اوہ میرے خدایا، یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔" وہ اب گھوم گھوم کر شانزے کا سفید نیٹ کا ڈریس دیکھ رہی تھی۔ جس کا بازو پھٹ چکا تھا اور ماتھے سے بہنے والے خون کے کئی دھبے سفید کپڑوں پر نمایاں تھے۔

شانزے لگتا تھا سخت صدمے کی حالت میں تھی۔ وہ جوتوں سمیت اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ رباب نے جذبۂ ہمدردی سے مغلوب ہو کر اس کے شوز اتارنے شروع کر دیے، شانزے نے اس چیز پر کوئی احتجاج نہیں کیا۔ ویسے بھی وہ اس وقت اپنے حواسوں میں کہاں تھی بھلا۔ وہ ابھی تک اسی سڑک پر اوندھے منہ گری ہوئی تھی، جہاں سے ایک نیک اور ہمدرد انسان اسے اٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا اور وہی اسے ہوسٹل میں بھی ڈراپ کرکے گیا تھا۔

"میں نے کہا تھا ناں چاروں قل پڑھ کر خود پر پھونک لو، نظر لگ گئی ناں۔" رباب واقعی پریشان تھی شانزے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک پٹی اس کے ماتھے پر اور ایک اس کے ہونٹوں پر کسی نے لگا دی ہو۔ اسی وجہ سے وہ بالکل خاموش تھی۔

"خبردار اگر تم دوبارہ تیار ہو کر اس طرح باہر

نکلیں۔" وہ اب پریشانی سے اس کے پاس تن بیٹھی۔

"میرا تو تمہیں دیکھ دیکھ کر دل خراب ہو رہا ہے۔"

رباب کی بات پر شانزے کا چہرہ متغیر ہوا۔ وہ جھٹکے سے اٹھی اور جلدی سے کمرے میں لگے شیشے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی' وہ اب خوفزدہ نظروں سے اپنی ناک اور ٹھوڑی پر لگی خراشوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنا چہرہ دیکھ کر ایک دم تکلیف کا احساس ہوا۔

"رباب' میرے فیس پر نشان تو نہیں رہ جائیں گے؟"

وہ ایک دم حواس باختہ ہوئی۔

"نہیں نہیں یار' ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" رباب نے گھبرا کر اسے تسلی دی۔

"یہ دیکھو میری ناک پر کتنی بڑی رگڑ کا نشان ہے' جلد تک پھٹ گئی ہے۔" شانزے روہانسی ہوئی۔

"ٹھیک ہو جائے گا انشاءاللہ' کیوں پریشان ہو رہی ہو یار۔" رباب اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر لے آئی اور اسے آہستگی سے وہاں بٹھا دیا۔

"بہت برا ہوا ہے میرے ساتھ۔" اس کی آنکھوں سے آنسو پھیلے۔ وہ آہستہ آہستہ حقیقت کی دنیا میں واپس آ رہی تھی۔

"لیکن یہ سب کیسے ہوا؟" رباب نے فکرمندی سے شانزے کو دیکھا' جو اپنے بازو کی پشت سے رگڑ کر آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ آنسو تھے کہ چھلکتے ہی آ رہے تھے۔

"بتاؤ تو سہی میری جان؟ کیسے ہو گیا سب؟" رباب نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

"بدقسمتی جس انسان کا سایے کی طرح پیچھا کرتی ہو' اس سے ایسے سوال نہیں پوچھا کرتے۔ اس کے ساتھ کہیں پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" وہ خود سے خفا لگ رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑے ٹشو کا گولہ سا بنا کر اس نے ڈسٹ بن میں ڈالا اور تکیے پر سر رکھ دیا۔

"پہلے ڈریس چینج کر لو' پھر ریسٹ کرنا۔" رباب نے اس کی الماری سے ایک سوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"میرا دل نہیں کر رہا۔" اس نے سستی سے جواب دیا اور رخ موڑ لیا۔

"شانزے' کبھی تو میری بات مان لیا کرو' مجھے تمہارے سفید کپڑوں پر لگے خون کے داغ دیکھ دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔" رباب کے توجہ دلانے پر اس نے چونک کر اپنی میکسی کو دیکھا جو بری طرح سے برباد ہو چکی تھی اور اب دوبارہ پہننے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔

"اور جو داغ میرے دل پر لگ چکے ہیں وہ تمہیں کیسے دکھاؤں۔" وہ سخت افسردہ تھی۔ "ایسا لگتا ہے جیسے میرے کپڑوں پر خون کا نہیں میرے ارمانوں کا رنگ لگا ہوا ہے۔ میرا سب کچھ ایک لمحے میں ختم ہو گیا۔"

"یہ باتیں بعد میں کرنا' پہلے چینج کر کے آؤ۔" رباب نے نرمی سے اسے ٹوکا۔

"ادھر دو کپڑے۔" اس نے بیزاری سے کہا تو رباب نے فوراً سوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پانچ منٹ کے بعد وہ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور ٹی شرٹ میں بالکل ایسے معصوم بچے کی طرح لگ رہی تھی جس سے اس کا من پسند کھلونا چھین لیا ہو اور وہ اب احتجاجاً منہ بسور کر بیٹھا ہوا ہو۔

"تمہارے ایڈ کی شوٹنگ کب تھی۔" رباب نے خاصے غلط موقعے پر یہ سوال کر لیا۔

"وہ تو ہاتھ سے نکل گیا۔" شانزے کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو پھر آ گئے۔ جسے دیکھ کر رباب گھبرا سی گئی۔

"دفع کرو' میں تو ویسے ہی ان چیزوں کے خلاف ہوں۔" اس نے روانی سے شانزے کو تسلی دینے کے لیے کہا' لیکن یہ ہی بات اس کے گلے پڑ گئی۔

"کہیں تم نے تو مجھے کوئی ایسی بددعا نہیں دی تھی۔۔۔؟" شانزے فوراً بدگمان ہوئی تو وہ بوکھلا سی گئی اس الزام کی اسے کہاں توقع تھی۔

"کچھ خدا کا خوف کرو شانزے۔" وہ جلدی سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ "میں ایسا کیوں کروں گی بھلا؟"

"پھر میرے ساتھ ایسے کیوں ہو رہا ہے؟ پہلے

ریمپ سے گرنا اور اب میرا ایکسیڈنٹ۔ ایسا لگتا ہے جیسے واقعی کسی نے مجھے بددعا دے رکھی ہو۔" اس کے پاس الزامات کی کمی تو کبھی بھی نہیں رہی تھی۔

"اب جو میں بات کروں گی' وہ شاید تمہیں اچھی نہ لگے۔" رباب کے محتاط انداز پر وہ چونکی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔؟" وہ سنجیدہ ہوئی۔

"چھوڑو اس بات کو' چائے پیو گی۔" رباب نے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کروانے کی کوشش کی۔

"میں نہیں چھوڑ سکتی اس بات کو' تمہیں اندازہ نہیں ہے شوبز میں نام کمانا میری زندگی کا واحد خواب ہے' اور میں اپنے واحد خواب سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔" وہ بری طرح سے جھنجلاہٹ کا شکار ہوئی۔

"لیکن بعض حادثے انسان کو اس لیے پیش آتے ہیں کہ اللہ اسے کسی چیز سے روکنا چاہتا ہے۔" رباب ہلکا سا جھجک کر بولی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ اللہ کو میرا شوبز میں کام کرنا پسند نہیں۔" وہ ناراضی سے انداز سے اٹھ بیٹھی۔

"مجھے بس اتنا پتا ہے' اللہ کو کچھ لوگ بہت عزیز ہوتے ہیں' وہ ان کو بہت سی چیزوں سے بچانا چاہتا ہے۔" رباب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔" وہ زور دے کر بولی۔

"بعض خواہشیں' بعض تمنائیں انسان کے لیے اپنے دامن میں ہلاکت کا سامان لیے ہوتی ہیں۔ اللہ اگر کوئی چیز آپ کو نہیں دے رہا ہوتا تو اس میں اس کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔" رباب نے سنجیدگی سے اس نادان لڑکی کو دیکھا۔

"اللہ کے اختیار میں تو سب کچھ ہے' وہ اس خواہش کو میرے حق میں بہتر بھی تو کر سکتا ہے۔" وہ اس وقت اس ضدی بچے کی طرح لگ رہی تھی' جو چاند کو اپنی مٹھی میں پکڑ کر دیکھنا چاہتا ہو اور اپنی اس خواہش سے کسی بھی قیمت پر دستبردار نہ ہونا چاہتا ہو۔

"وہ بے نیاز ہے' جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے دے کر واپس لے لیتا ہے۔ اس کے ساتھ ضد مت لگاؤ' اس کی رضا میں راضی ہو جاؤ گی تو وہ سب کچھ تمہیں دے گا' جو تم چاہتی ہو۔" رباب نے اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔

"مجھے معلوم ہے' وہ مجھے کچھ نہیں دے گا۔" وہ باقاعدہ منہ بنا کر بیٹھ گئی' ایسے جیسے وہ ساری دنیا سے خفا ہو گئی ہو۔

"اگر ایسا گمان رکھو گی تو وہ تمہیں ایسا ہی دے گا۔" رباب نے اسے دھمکایا' لیکن آگے سے بھی شانزے تھی' جو ضد کی پکی تھی۔ اس نے اس بات کا کوئی بھی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے لیٹ گئی۔ منہ پر چادر تان لی' رباب کو معلوم تھا وہ اس واقعے کا باقاعدہ سوگ کئی ہفتوں تک منائے گی اور اس سلسلے میں اس کی ایک بھی نہیں سنے گی۔ رباب نے بھی تنگ آ کر اپنی فائل کھولی اور اسائنمنٹ بنانے لگی' کیونکہ اسے اب مزید سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا اور وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اوریدا نے آہستگی سے پچھلے صحن کا دروازہ کھولا اور آسمان کی طرف دیکھا۔ پورا آسمان کالے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بادلوں نے کالے رنگ کی چنریاں اوڑھ رکھی ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے آنے والی آندھی کی وجہ سے درختوں کے پتے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ برآمدے میں بڑی اماں گھر کی ملازماؤں کو ساتھ لیے اپنی نگرانی میں اچار کے لیے کیریاں کٹوا رہی تھیں۔ ان کا آدھا دھیان کام کرنے والیوں کی طرف اور باقی آسمان پر آئے ہوئے گہرے سیاہ بادلوں کی طرف تھا۔

"جلدی ہاتھ چلاؤ' تم لوگوں نے ابھی تک موسم کے تیور نہیں دیکھے کیا۔" بڑی اماں دوسروں کو کم اور خود کو زیادہ ہلکان کر رہی تھیں۔

"شہناز ہلدی تھوڑی اور ڈالو۔" بڑی اماں کا بس

نہیں چل رہا تھا کہ دونوں ملازماؤں کے ہاتھ سے چیزیں پکڑ کر خود ملس کرنا شروع کردیتیں۔

اوریدا اس سارے ہنگامے سے بے نیاز آم کے درخت کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ بارش کی چند بوندیں درختوں کے پتوں سے اس کے اوپر آن گریں' دور کہیں بجلی چمکی تھی۔ پچھلے صحن کے درختوں پر گھومتی ہوئی ایک گلہری بھی دبک کر ایک جگہ بیٹھ گئی تھی۔

"سب کچھ جلدی جلدی سمیٹو اور کچن میں لے جاؤ۔" بڑی اماں نے بارش کی آمد کے ساتھ ہی شور مچادیا' حالانکہ وہ جس جگہ پر بیٹھی کام کروا رہی تھیں' وہاں بارش کسی صورت نہیں پہنچ سکتی تھی' لیکن بڑی اماں کے سامنے یہ بات کہنے کی جرأت کون کرسکتا تھا۔

"یہ تم کیا بھٹکی ہوئی روح کی طرح درختوں کے نیچے گھوم رہی ہو۔" بڑی اماں فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئیں' جو سفید رنگ کے سوٹ میں اداس اور دلگرفتہ انداز سے ادھر ادھر پھر رہی تھی۔

"ویسے ہی ـــ" اس نے افسردگی سے مختصراً جواب دیا۔

"کہیں تیمور نے پھر کوئی بھاڑ پڑی تو نہیں کردی ـــ" بڑی اماں کا بات کرنے کا اپنا مخصوص اسٹائل تھا' جس سے اکثر اوریدا الجھ جاتی۔

"آپ نے پیٹو کو کیا اپنی طرح سمجھ رکھا ہے؟" اس نے ٹھیک ٹھاک برا مانا' جسے بڑی اماں نے صاف نظر انداز کردیا۔

"ظاہر ہے' میرا بیٹا ہے' میرے اوپر ہی جائے گا ناں۔" اوریدا نے ان کی بات پر کوئی جواب نہیں دیا۔

"یہ ارحم دو دن سے نظر نہیں آرہا' تمہاری اس کے ساتھ کوئی لڑائی تو نہیں ہوئی۔" بڑی اماں نے بالکل درست اندازہ لگایا۔ اس ڈنر کے بعد ان دونوں کی بات چیت مستقل طور پر بند تھی ارحم نے بھی ان کے پورشن کا چکر نہیں لگایا' جبکہ دوسری طرف اوریدا بینش آنٹی کی وجہ سے جانے سے کتراتی تھی۔

"آپ کا کیا خیال ہے' مجھے لڑنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں آتا؟" وہ کہیں کا غصہ کہیں نکال رہی تھی۔

"مرچوں کا اچار تو میں نے مرتبان میں ڈالا ہے' یہ تمہیں کیوں لگ رہی ہیں؟" بڑی اماں نے ہنس کر اپنی پوتی کو دیکھا جو ان کو عزیز بھی بہت تھی۔

"بڑی اماں' آپ غلط بات نہ کیا کریں۔" ان کے ہنسنے پر وہ بھی کچھ نرم ہوئی۔

"یہ ارحم آج کل ہے کہاں پر ـــ؟" انہوں نے آسمان سے برستی بوندوں کو دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں پوچھا۔ اوریدا بارش کی وجہ سے انہی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

"پتا نہیں ـــ" اس نے بالکل سچ بولا تھا لیکن بڑی اماں کو شاید یقین نہیں آیا۔ "ہر وقت تو تمہارا سایہ بنا گھومتا تھا' اب تم ہی کہہ رہی ہو کہ تمہیں پتا نہیں' جاؤ بھاگ کر اسے بلا کر لاؤ۔ میں نے اس کے لیے آم کا مربہ بنایا ہے۔"

بینش آنٹی کے ساتھ ان کے لاکھ اختلافات سہی لیکن اوریدا کو پتا تھا کہ ارحم پر وہ جان دیتی تھیں۔ وہ بھی ان کے آگے پیچھے پھرتا تھا خصوصاً "بڑے ابا" کا تو وہ بہت ہی لاڈلا تھا۔

"میں ہرگز نہیں جاؤں گی' مجھے بینش آنٹی سے ڈر لگتا ہے۔" اس نے صاف انکار کیا۔

"وہ کھا تھوڑی جائے گی تمہیں۔ ویسے بھی تو ہر وقت وہیں گھسی رہتی ہو' بینش کی باتوں کا کہاں تم پر اثر ہوتا ہے۔" بڑی اماں نے ذرا جو اس کی بات کو اہمیت دی ہو۔ جب کہ اوریدا کو اچھی طرح سے پتا تھا کہ وہ اس جھگڑے کی وجہ سے ان کی طرف نہیں آرہا۔

"میں پکوڑے بھی بنوا رہی ہوں پودینے کی چٹنی کے ساتھ' جاکر اسے بلا لاؤ۔" بڑی اماں بھی آج اس کے پیچھے ہی پڑ گئی تھیں۔

"کیوں اس کی ممی بھی تو ہیں' اپنے بیٹے کے لیے ایسی چیزیں خود بنائیں۔ ہم نے ٹھیکہ تھوڑی اٹھا رکھا ہے۔" وہ چڑ کر بولی۔

"بینش کے پاس اتنا وقت کہاں' ویسے بھی شروع سے میرے اور بوا رحمت کے ہاتھوں میں پلا ہے۔"

بڑی اماں نے محبت بھرے انداز سے وضاحت کی۔

"ہاں آپ ہی لوگوں نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"ہائیں ہائیں۔۔۔ یہ تم آج کس چینل پر بول رہی ہو' ویسے تو تمہارے اس کے بغیر پانچ منٹ نہیں گزرتے اور آج تمہیں اس کا ذکر بھی ناگوار گزر رہا ہے۔" بڑی اماں نے ناک پر انگلی رکھ کر تعجب سے اسے دیکھا وہ خاموش رہی۔

"اس کا مطلب ہے' تم نے اس کے ساتھ بھی کوئی پنگا کر لیا ہے' تبھی تو اسے بلانے نہیں جا رہی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔" اس نے نظریں چرائیں۔ "جا رہی ہوں نواب صاحب کو بلانے کے لیے۔"

"جلدی واپس آنا' وہیں جا کر بیٹھ مت جانا۔" بڑی اماں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

وہ بڑی اماں کی بات پر پاؤں پٹختی ہوئی لاؤنج کی طرف بڑھ گئی' وہاں سے گزرتے ہوئے تیزی سے جیسے ہی اس نے لان کا دروازہ کھولا' بڑے ابا کے ساتھ اس کی بڑی زبردست ٹکر ہوئی۔ دونوں کو ہی دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ بڑے ابا نے ہاتھ میں جو سیل فون پکڑا تھا وہ اس زوردار ٹکر کے نتیجے میں ہاتھ سے چھوٹ کر ماربل کے فرش پر جا گرا' اور اگلے ہی لمحے اس آئی فون کی اسکرین ٹوٹ گئی' ساتھ ہی بڑے ابا کا پارہ ہائی ہو گیا۔

"تمہیں چلنے کی تمیز نہیں ہے کیا۔۔۔" بڑے ابا ایک دم بھڑک کر بولے۔ اوریدا خوفزدہ انداز سے ان کے ٹوٹے ہوئے سیل فون کی طرف دیکھتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"جاہل لڑکی' میرے سیل فون کا بیڑا غرق کر دیا۔ پتا نہیں ساری زندگی کچھ سیکھا بھی تھا کہ نہیں۔" بڑے ابا نے سیل فون اٹھاتے ہوئے ایک دفعہ پھر اس کی طبیعت صاف کی' اوریدا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل بری طرح سے کانپ رہا تھا۔

"آئی ایم سوری بڑے ابا۔۔۔" وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولی' اسی وقت بڑی اماں بھی لاؤنج میں داخل ہوئیں' انہوں نے حیرانگی سے سامنے کا منظر دیکھا۔ ڈاکٹر جلال کی شعلہ اگلتی آنکھوں اور ضبط سے لال ہوتے چہرے کو دیکھتے ہی وہ بھی بری طرح گھبرا گئیں۔

"کیا ہوا۔۔۔" وہ لپک کر ان دونوں کے پاس آئیں۔ بڑے ابا سیل فون کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے اور تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑی اوریدا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی تو ویسے ہی بڑے ابا کو دیکھ کر روح فنا ہو جاتی تھی۔

"اس کی ماں نے تو اسے کچھ نہیں سکھایا' آپ ہی کچھ تھوڑی بہت تربیت کر دیں' کم از کم اسے چلنا' پھرنا اور بولنا ہی سکھا دیں۔" بڑے ابا بولے نہیں بلکہ پھنکارے تھے۔ اوریدا کا رنگ فق ہوا اور اسے لگا جیسے کسی نے اسے شرمندگی کے گہرے گڑھے میں دھکا دے دیا ہو۔

بڑے ابا ناراض سے انداز سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے اور بڑی اماں نے گلہ آمیز نگاہوں سے اپنی پوتی کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ تم بار بار ایسی حرکتیں کیوں کرتی ہو۔ اوریدا صدمے بھرے انداز سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

وہ ایک روبوٹ کے سے انداز سے چلتی ہوئی لان کی طرف بڑھ گئی۔ بارش پوری شدت کے ساتھ برس رہی تھی' لیکن اس کے ذہن میں تو بڑے ابا کی باتیں ژالہ باری کی صورت میں برس رہی تھیں۔ پانچ ہی منٹ میں وہ بری طرح سے بھیگ گئی تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ گرمیوں کی بارش تھی۔

لان میں لگے جامن کے درخت سے ٹیک لگا کر وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کہیں فضا میں معلق ہو گئی ہو۔ بڑے ابا کے جملے سے زیادہ ان کے تلخ لہجے نے اسے شرمندگی کی ایسی دلدل میں دھنسا دیا تھا کہ' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نیچے سے نیچے دھنستی چلی جا رہی تھی۔ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ وہ اس سے کتنی سخت نفرت کرتے تھے۔ پتا ہی نہیں چلا کب وہ گھٹنوں میں بازو رکھے اپنا منہ چھپائے زار و قطار رو رہی تھی۔

ارحم نے ان کے پورشن کی طرف آتے ہوئے حیرانگی سے اوریدا کو دیکھا۔ تیز بارش میں وہ درخت کے نیچے دنیا ومافیہا سے بے نیاز بیٹھی تھی' جبکہ ارحم اتنے خراب موسم میں خود چھتری لے کر باہر نکلا تھا۔

"اوریدا! ایسے کیوں بیٹھی ہو۔۔۔" وہ چھتری کھول کر بالکل اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اوریدا کو اس کی آواز اپنی سماعتوں کا دھوکا محسوس ہوئی۔

"میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں یار۔" ارحم نے گھبرا کر اس کا کندھا ہلا دیا۔ اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور رونے کے شغل میں مصروف رہی۔

"اوریدا! کیا ہوا ہے۔۔۔؟" وہ حقیقتاً" پریشان ہوا۔ اوریدا نے روتے ہوئے سر اٹھایا۔ بھیگتے موسم میں اس کی آنکھوں میں ہونے والی بارش دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ' غم' ناراضی اور کیا کچھ نہیں تھا۔ آنکھیں سرخ انگارہ بنی ہوئی تھیں۔

"کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟" وہ ہمدردی سے اس سے پوچھ رہا تھا۔ اوریدا جھٹکے سے اٹھی اور اس کی طرف ایک ناراض نگاہ ڈالی اور گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"واٹس رانگ ود یو اوریدا۔۔۔؟" وہ اس کے پیچھے لپکا' لیکن اوریدا نے بھی آج اس کی کچھ نہ سننے کی قسم کھا رکھی تھی۔

اوریدا گندے کیچڑ والے جوتوں سمیت اندر داخل ہوئی اور لاؤنج کے فرش پر بننے والے کیچڑ کے نشانات کو بڑے ابا نے بڑے کوفت بھرے انداز سے دیکھا اور جتاتی ہوئی ایک نگاہ اپنی بیگم پر ڈالی' جو خود بھی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ اوریدا تب تک سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔ ارحم جو اس کے پیچھے تھا' وہ بڑے ابا کو لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر خفت بھرے انداز میں رک گیا۔ بڑے ابا بڑی فرصت سے وہیں اخبار پھیلائے بیٹھے تھے۔ ان کو سلام کر کے وہ وہیں بیٹھ گیا تھا۔ اوریدا کے پیچھے جانے کا ارادہ اس نے فی الحال ملتوی کر دیا تھا۔

"ارحم بیٹا دو دن سے کہاں گم تھے۔۔۔؟" بڑی اماں کو اچانک ہی یاد آیا۔

"میں لاہور گیا ہوا تھا۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا ان کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"بڑے ابا کو تو پتا تھا میں یہاں نہیں ہوں۔" اس نے مزید وضاحت دی۔

"یہ کہاں ایسی باتیں کسی کو بتاتے ہیں' خیر چائے پیو گے؟" انہوں نے کچن کی طرف بڑھتے ہوئے لاپروائی سے پوچھا۔

"میں تو کھانا کھانے آیا تھا یہاں۔" وہ بے تکلفی سے ان کے پیچھے ہی کچن میں آگیا اور اب ڈھکن اٹھا اٹھا کر چیک کر رہا تھا کہ کیا بنا ہے۔

"بیٹھو کرسی پر' میں گرم کر کے دیتی ہوں۔۔۔" بڑی اماں نے سالن ڈونگے میں نکال کر اوون میں رکھا۔ وہ کچن میں رکھی چھوٹی میز اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اب دونوں کہنیاں میز پر رکھے بڑی اماں کا اداس سا چہرہ غور سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ اوریدا کو کیا ہوا ہے بڑی اماں۔۔۔؟" اس کے دانستہ اپنائے ہوئے لاپروا انداز پر وہ چونکیں۔ "تمہیں کچھ کہا ہے اس نے؟"

"نہیں' ابھی لان میں دھواں دھار رونے کا سیشن چل رہا تھا۔" اس نے ہاٹ پاٹ سے روٹی نکالتے ہوئے عام سے انداز سے بتایا۔

"میں تو اس لڑکی کی بے وقوفیوں سے سخت تنگ آ گئی ہوں۔ پتا نہیں کیا بنے گا اس کا۔" بڑی اماں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں' پریشانی ان کے انگ انگ سے نمایاں تھی۔

"اب کیا' کیا اس نے۔۔۔؟" ارحم نے آلو قیمے کا سالن پلیٹ میں نکالا۔

"تمہیں بلانے کے لیے بھیجا تھا۔ منہ اٹھائے اپنی دھن میں دروازہ کھول کر باہر نکل رہی تھی اور تمہارے بڑے ابا سے ٹکرا گئی۔۔۔"

"اوہ پھر۔۔۔" وہ سوچ سکتا تھا کہ آگے کیا ہوا ہوگا۔

"ان کا اتنا مہنگا سیل فون ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور

ٹوٹ گیا۔" بڑی اماں کو اچانک یاد آیا کہ وہ میز پر پانی کی بوتل رکھنا تو بھول گئیں۔

"پھر تو بہت ڈانٹ پڑی ہو گی اسے۔" ارحم فکر مند ہوا۔

"ایسی ویسی، تمہیں پتا تو ہے اپنے بڑے ابا کا، کسی کا لحاظ تھوڑی کرتے ہیں۔" بڑی اماں نے اس کے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے منہ بنایا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ بھی فوراً متفق ہوا۔ دونوں کے درمیان میں ایک خاموشی کا وقفہ آیا تھا۔

"سنا ہے بینش تمہاری پوزیشن کی خوشی میں کوئی فنکشن کر رہی ہے۔" انہیں اچانک ہی یاد آیا کہ آج کل دوسرے پورشن میں خوب گہما گہمی ہے۔

"جی میں نے تو منع کیا تھا لیکن وہ مانیں نہیں، اسی اتوار کو ہے۔" وہ اب ٹشو سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

"لو ہاں ہے تمہاری، اگر کوئی خوشی منانا چاہتی ہے تو منع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" بڑی اماں نے فوراً حمایت کی تو وہ مسکرا دیا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کی ممی اور بڑی اماں کے درمیان کبھی بھی تعلقات خوشگوار نہیں رہے، لیکن بڑی اماں کی سادگی اسے ہمیشہ متاثر کرتی تھی۔

"اب تم کہاں جا رہے ہو، چائے نہیں پیو گے کیا۔۔۔؟" بڑی اماں نے اسے اٹھتے دیکھ کر فوراً ٹوکا۔

"آپ چائے بنائیں، میں ذرا اوریدا سے مل کر آتا ہوں۔" وہ جاتے جاتے لاپروائی سے بولا تھا۔ کچن سے نکلتے ہی اس نے لاؤنج میں بیٹھے بڑے ابا کو دیکھا جو کوئی آرٹیکل پڑھنے میں مگن تھے۔

دوسری جانب اوریدا اپنے کمرے میں سیل فون کان کے ساتھ لگائے دھواں دھار روتے ہوئے اپنے باپ کو سخت پریشان کر رہی تھی۔ سات سمندر پار بیٹھے تیمور کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بیٹی کو فوراً واپس بلوا لیتے۔

"بڑے ابا کا سیل فون ٹوٹنا اتنی بڑی بات نہیں ہے اوریدا۔" وہ اسے سمجھانے کی مکمل کوشش کر رہے تھے۔

"نہیں پاپا، وہ بہت مہنگا تھا۔" وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔

"کیا ایک ملین کا تھا۔۔۔؟" وہ ہلکا سا چڑ گئے۔

"بس آپ ان کو نیا بھیج دیں، وہ بہت غصے میں تھے، انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا ہے۔" اس کی باتیں تیمور کا دل خراب کر رہی تھیں۔

"اچھا تم ٹینشن مت لو، میں ایک کے بجائے دو بھیج دیتا ہوں، ایک تمہارے لیے بھی۔" تیمور نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی، کچھ بھی تھا، اوریدا میں ان کی جان تھی اور وہ سمجھ سکتے تھے کہ ان کے والد کس طرح سے ان کی بیٹی کو ٹف ٹائم دے رہے ہوں گے۔

"نیا سیل فون کب بھیجیں گے آپ۔۔۔؟" اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی، تیمور بے بسی سے ایک لمبی سانس لے کر رہ گئے۔

"آپ انکل شہروز سے کہیں ناں۔۔۔؟" اس نے ساتھ ہی انہیں مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی کال کر کے کہہ دیتا ہوں اسے، لیکن تم پلیز اب یہ رونا بند کرو۔" تیمور کی بات پر اس نے فوراً بازو کی پشت سے رگڑ کر آنکھیں صاف کیں۔ جیسے ہی وہ فون بند کر کے مڑی، اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ارحم بالکل اس کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اس کا تو دل جلا کر رہ گئی۔ اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا اپنا سیل فون بیڈ پر اچھالا۔

"کسی کے روم میں بغیر ناک کیے آنا ایٹی کیٹس کے خلاف ہے۔" وہ ہلکی سی ناگواری سے گویا ہوئی۔

"چاہے وہ آپ کی کزن یا بیسٹ فرینڈ ہو تب بھی۔" وہ اپنے دونوں بازو سینے پر باندھے بالکل اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"میں کسی کی بیسٹ فرینڈ نہیں ہوں۔" اس نے فوراً تصحیح کی۔

"چلو کزن تو ہو ناں۔" اس نے جان کر اسے چھیڑا، جو سرخ ناک کو بار بار اوپر چڑھاتے ہوئے بہت کیوٹ لگ رہی تھی۔ اس سوال کا جواب وہ نفی میں نہیں

دے سکتی تھی اس لیے چپ رہی۔

"تم نے انکل تیمور کو شکایت لگادی۔۔۔؟" وہ اب کتابوں کے ریک کی طرف بڑھتے ہوئے یونہی لاپروائی سے بولا' حالانکہ اس نے اوریدا کا صرف آخری جملہ سن کر اندازہ لگایا تھا۔

"کسی کی باتیں چھپ چھپ کر سننا ایتھکس کے خلاف ہے۔" وہ جھنجلا کر گویا ہوئی۔

"تو اتنا تو اونچا تمہارا الیوم تھا' اوپر سے دروازہ بھی کھلا ہوا تھا' مجھے تو یقین ہے نیچے لاؤنج میں بیٹھے بڑے ابا نے بھی ساری گفتگو سن لی ہوگی۔" ارصم کی بات پر اوریدا کی روح فنا ہوئی' وہ گھبرا کر کھلے دروازے سے باہر نکلی اور گیلری کے پاس لگی گرل سے نیچے جھانک کر دیکھا' بڑے ابا بڑے اطمینان سے بیٹھے کوئی انگلش نیوز پیپر پڑھ رہے تھے' وہ انہی قدموں کے ساتھ واپس لوٹ آئی۔ ارصم مزے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا واقعی بڑے ابا نے سن لیا ہوگا۔۔۔؟" اس کو ایک نئی پریشانی لاحق ہوگئی۔

"ظاہر ہے۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"لیکن میں اتنا اونچا تو نہیں بول رہی تھی۔" اس نے خود کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کی۔ ایک دفعہ پھر وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔

"ارے بابا نہیں سنا' میں تو ویسے ہی تمہیں تنگ کر رہا تھا۔" ارصم نے اس کی شکل دیکھ کر سچ بات بتائی۔

"ہاں اب آپ کی ہی تو کسر رہ گئی تھی' باقی ساری دنیا تھوڑا ستاتی ہے مجھے' آپ بھی ستائیں۔" وہ ہنکا سا چڑ کر بولی۔

"اور جو تم نے دو دن پہلے میرے ڈنر پر کیا تھا' وہ کیا تھا۔۔۔؟" ارصم کے سنجیدہ انداز پر اوریدا نے فوراً اس سے نظریں چرائیں۔

"سخت زہر لگتی ہے مجھے وہ زرش بی بی' سمجھتی کیا ہے خود کو۔" اس کے بے ساختہ انداز پر ارصم نے اپنے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔

"آخر اس بیچاری نے تمہارا بگاڑا کیا ہے۔۔۔؟"

"اس کی وجہ سے تم مجھ سے دو دن خفا رہے ہو۔" اس کے پاس اسے ناپسند کرنے کا ایک مضبوط جواز تھا۔

"میں۔۔۔؟" وہ حیران ہوا۔ "تمہیں کس پاگل نے کہا کہ میں تم سے ناراض تھا۔۔۔؟" وہ اب بڑے اطمینان سے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

"پھر دو دن ہماری طرف کیوں نہیں آئے۔۔۔؟" وہ تپ کر بولی۔ ناراضی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"وہ تو میں لاہور گیا ہوا تھا' ورنہ ایسا کیسے ممکن ہے کہ میں یہاں ہوں اور بڑے ابا کو سلام کرنے نہ آؤں۔" اوریدا کو پتا تھا کہ یہ اس کا معمول تھا۔ وہ کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہوتا۔ بڑے ابا سے اسے بے تحاشا محبت تھی۔ وہ خود بھی اس کا بے تابی سے انتظار کرتے تھے۔

"لیکن ناراض تو تھے ناں۔۔۔؟" وہ اس کے بالکل سامنے آن کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں خفگی' لبوں پر سنجیدگی اور ماتھے پر پڑا گہرا بل اس کے اندرونی جذبات کی عکاسی کر رہا تھا۔

"تم سے خفا ہو سکتا ہوں۔۔۔؟" وہ زیر لب مسکرایا تو وہ جھنجلا اٹھی۔ "بتاؤ ناں۔۔۔"

"ایک تم ہی سے تو خفا نہیں ہو سکتا' پگلی لڑکی' بات کو سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔" اس کا لہجہ سادہ لیکن الفاظ کا چناؤ ایسا تھا کہ اوریدا کا خوش فہم دل پوری رفتار سے دھڑکا۔

وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی جو بڑے مزے سے اب اپنے سیل فون پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کے درمیان کوئی جھگڑا کبھی ہوا ہی نہ ہو۔ اوریدا بھی لاپروائی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"دیکھیں شانزے' آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں پلیز۔۔۔" تیسرے ہی دن وہ اس پروڈکشن ہاؤس کے ایڈورٹائزنگ ڈیپارٹمنٹ میں تھی۔ مگر حلیہ کچھ اس طرح سے تھا کہ ماتھے پر پٹی' بازوؤں پر خراشیں اور

ناک پر بھی زخم کا نشان نمایاں تھا۔ ارسل تاسف بھرے انداز سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اس سے ضد کر رہی تھی کہ اسے اپنے اشتہار میں کام کرنا ہے۔

"یہ سب چیزیں تو میک اپ سے بھی کور ہو سکتی ہیں۔" وہ کسی صورت میں بھی یہ ایڈ اپنے ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ارسل کو وہ ساری تجاویز دے رہی تھی' جو اس کے ذہن میں تھیں۔

"یہ ممکن نہیں ہے شانزے! آپ کے ماتھے پر پورے تین ٹانکے لگے ہیں' ہمارے پاس اتنے ایکسپرٹ میک اپ آرٹسٹ نہیں ہوتے۔" ارسل سمجھ نہیں آ پا رہا تھا کہ وہ کس طرح سے اس لڑکی کو سمجھائے' جس نے نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔" وہ روہانسی ہوئی تو ارسل بے بس سے انداز سے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

"دیکھیں' آپ پریکٹیکل ہو کر سوچیں' جس کمپنی کا ایڈ ہے وہ کسی زخمی ماڈل کو لینے پر کیسے راضی ہوں گے' ان لوگوں سے آپ کی میٹنگ کروائی ہو گی۔" ارسل اسے کاروباری اسرار و رموز بتا رہا تھا' جن کو شانزے کسی صورت بھی سمجھنے پر راضی نہیں ہو رہی تھی۔

"آپ ان سے بات کر کے تو دیکھیں۔۔۔" شانزے نے ایک دفعہ پھر اصرار کیا۔

"میں اگر ایسا کروں گا تو میری اپنی ساکھ خراب ہو جائے گی۔۔۔" ارسل نے دو ٹوک انداز اپنایا' وہ اب مزید مروت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

"لیکن کیوں۔۔۔؟" اس نے استعجابیہ انداز میں پوچھا۔

"وہ سمجھیں گے کہ میں اپنی کسی جاننے والی کو پروموٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" ارسل نے جھنجلا کر کہا تو شانزے کے چہرے پر مایوسی کے رنگ تیزی سے پھیلے۔ اسے کسی نہ کسی طرح ارسل کا پوائنٹ سمجھ میں آ ہی گیا تھا۔

"پھر میں کیا کروں۔۔۔؟" اس نے آخر کار ہتھیار ڈال دیے۔ ارسل اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ بالکل کسی معصوم بچے کی طرح خفا ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔

"ابھی تو آپ اپنے مکمل ٹھیک ہونے کا انتظار کریں' اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔" اس نے امید کی ڈور اس کے ہاتھ میں تھمائی۔

"اور اگر ایسا نہ ہوا تو۔۔۔؟" وہ حد درجہ بے یقین تھی۔

"ان شاء اللہ ایسا نہیں ہو گا' مایوس نہیں ہوتے۔" ارسل خاصا پر امید تھا' لیکن اس کے سامنے وہ لڑکی بیٹھی تھی جس کی قسمت کی بساط پر ہر دفعہ اسی کا مہرہ پٹ جاتا تھا۔ اس لیے وہ اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہو رہی تھی۔

"جیسے ہی آپ کا فیس ٹھیک ہو گا' انشاء اللہ کوئی نیا کام نکل آئے گا۔" اس نے مزید تسلی دی۔

"لیکن ایسا نہ ہو کہ آپ وہ کام کسی اور کو دے دیں۔" وہ اب ارسل کی طرف سے مطمئن ہونا چاہ رہی تھی۔

"ایسا کیسے ممکن ہے شانزے! پہلے بھی آپ مجھے یاد نہیں تو میں نے آپ سے کانٹیکٹ کیا تھا۔" ارسل نے اسے یاد دلایا۔ "خیر چھوڑیں یہ بتائیں چائے لیں گی یا کافی۔؟" ارسل نے اپنی طرف سے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔

"نو تھینکس۔" وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے اب چلنا چاہیے۔" وہ خاصی دل گرفتہ سی لگ رہی تھی۔

"چائے تو پی کر جائیں۔" ارسل نے اپنی طرف سے مروت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن شانزے سمجھ گئی تھی کہ وہ جس طرح بار بار رسٹ واچ کی طرف دیکھ رہا تھا' اسے اپنے دوسرے کام کے لیے نکلنا ہے۔ وہ سلام دعا کر کے باہر نکل آئی۔۔۔ اب وہ افسردہ انداز سے فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ ارسل کا یہ پروڈکشن ہاؤس ایک پوش ایریے میں تھا اس لیے یہاں ٹریفک بہت کم تھی۔ چلتے چلتے اسے نہ جانے کیا ہوا وہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔

"میرے ساتھ ہی ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔" اس سوچ نے اسے خود ترسی میں مبتلا کیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دل تو آج کل ویسے ہی بات بات پر رونے کے بہانے ڈھونڈتا تھا اور آج تو اس کے پاس ایک مضبوط قسم کا بہانہ موجود تھا۔

"ساری زندگی ماں باپ کی محبت کو ترستی رہی اور اب دنیا نے مجھے اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا ہے۔" وہ سر جھکائے بری طرح سے رو رہی تھی۔

"ارے شانزے آپ اس طرح فٹ پاتھ پر کیوں بیٹھی ہیں؟" ایک شناسا لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ شانزے نے بھیگی آنکھوں سے سر اٹھا کر دیکھا، سامنے بند اسی گاڑی میں ارسل کا جرنلسٹ دوست سعد بیٹھا اسے حیرانگی سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ آپ کے ماتھے پر کیا ہوا؟ کیا کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے آپ کا؟" وہ جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

شانزے نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا اور سر اٹھا کر دیکھا، وہ جرنلسٹ اس کے سامنے کھڑا تھا، شانزے کو یاد آگیا کہ اس دن ریمپ پر گرنے والا واقعہ اسی نے ارسل کو سنایا تھا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی اس کا خراب موڈ مزید خراب ہو گیا۔

"میں آپ سے بات کر رہا ہوں شانزے۔" وہ اس کی مسلسل چپ کی وجہ سے اکتا کر بولا۔

"آپ سے مطلب۔۔۔؟" وہ اسی طرح فٹ پاتھ پر بیٹھے بیٹھے چڑ کر بولی تو سعد ایک دم پریشان ہو گیا۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟" وہ بوکھلا کر اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔

"مجھے کیا ضرورت پڑی ہے ایروں غیروں سے ناراض ہوتی رہوں۔" اس کے خفگی سے بھرپور انداز پر سعد کھل کر مسکرایا۔

"ہوں اس کا مطلب ہے کہ آپ واقعی مجھ سے خفا ہیں۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر فٹ پاتھ پر ایسے آن بیٹھا، جیسے گھر سے اسی مقصد کے لیے آیا ہو۔ شانزے منہ بنا کر تھوڑا سا اور دور ہو کر بیٹھ گئی، وہ اس کی اس حرکت پر زیر لب مسکرایا۔

"وجہ پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟" سعد نے دانستہ سنجیدہ انداز اپنایا۔

"جب آپ دوسروں کی انسلٹ کے واقعات جگہ جگہ سناتے پھریں گے تو اگلا بندہ آپ سے ناراض ہی ہو گا۔" اس نے چڑ کر اصل بات بتائی لیکن ارسل کو اس وقت واقعی اس بات کا بیک گراؤنڈ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" وہ پتا نہیں اتنا ہی انجان تھا یا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اس دن ارسل کو آپ نے ہی فیشن شو میں میرے گرنے کا واقعہ سنایا تھا ناں۔۔۔؟" اس کے ناک چڑھانے پر سعد کو وہ بات یاد آ ہی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اس سے موڈ خراب کیے بیٹھی تھی۔

"آئی ایم سوری، مجھے اندازہ نہیں تھا، آپ اس طرح مائنڈ کر جائیں گی۔۔۔؟" اس نے سنجیدگی سے وضاحت دی۔ "ایسا سانحہ تو کسی کے ساتھ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔" وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ "آپ اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہیں؟"

"تو آپ کا کیا خیال ہے، مجھے اس بات پر خوشی سے بھنگڑے ڈالنے چاہئیں؟" شانزے کا مزاج ہنوز برہم تھا۔

"میں نے ایسا کب کہا؟" وہ ہلکا سا گھبرایا۔ "میں آپ سے بہت زیادہ معذرت خواہ ہوں۔" اس نے سچے دل سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔

"اٹس اوکے۔" وہ اب بیگ سے ٹشو نکال کر اپنا چہرہ صاف کر رہی تھی۔

"تو آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں، آئیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" سعد کے صلح جو انداز پر وہ ایک لمحے کو سوچ میں پڑ گئی، پھر اسے خیال آیا اس سڑک پر ٹیکسی کا ملنا ممکن نہیں اور مین روڈ پر پیدل جانے کی اس میں ہمت نہیں تھی، تنگ آ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

"اوہ سو سیڈ۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کے ساتھ یہ حادثہ ہوا ہو گا۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے

سعد کے بار بار پوچھنے پر اسے اپنے زخمی ہونے والا واقعہ مختصراً "بتا ہی دیا تھا۔

"پھر تو وہ ایڈ آپ کے ہاتھ سے نکل گیا ہوگا۔" سعد کی بات پر اسے کرنٹ سا لگا۔

"آپ کو کس نے بتایا؟ میں اس ایڈ میں کام کرنے والی تھی۔" شاہزے حیرت بھرے انداز سے سعد کو دیکھ رہی تھی، جو بڑے مزے سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

"اس لیے کہ اس ایڈ میں ماڈل کے لیے میں نے ہی آپ کا نام تجویز کیا تھا۔" سعد کے منہ سے نکلنے والی اس بات نے شاہزے کو ہکا بکا کر دیا' وہ سخت تعجب اور بے یقینی سے اپنے ساتھ بیٹھے لڑکے کو دیکھتی رہ گئی' وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس طرح سے اس کے لیے سفارش کر سکتا ہے۔ احسان کے بوجھ تلے ایک دم ہی اس کی گردن جھک گئی اور وہ کافی دیر تک بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

❁ ❁ ❁
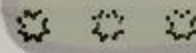
عدینہ کی زندگی میں اچانک ہی اداسی اور وحشت کا موسم چھا گیا تھا۔ عجیب بیزاری سی تھی' وہ کئی کئی گھنٹے سوئی رہتی اور اگر جاگتی بھی تو ایسے ہی محسوس ہوتا جیسے نیند کی کیفیت میں ہے۔ وہ جون کی ایک تپتی سی دوپہر تھی۔ سر پر سورج آگ برسا رہا تھا اور پیروں کے نیچے زمین تپتا ہوا تندور بنی ہوئی تھی۔ وہ یونہی ننگے پاؤں اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ سامنے مونا پائپ لگائے پودوں اور درختوں پر پانی برسا رہی تھی۔ پانی کی بوچھاڑ کے نیچے دو منچلی سی چڑیاں موسم کی شدت سے بے نیاز ایک دوسرے کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے میں مگن تھیں۔

"بچپن کے دن بھی کسی خوشنما خواب کی طرح ہوتے ہیں جب کسی کھلونے کے ٹوٹنے کا غم بس چند گھنٹوں تک محدود ہوتا ہے اور پھر ایک نئے عزم کے ساتھ جگنو کا تعاقب اور تتلی کے پروں پہ کہانیاں لکھنے کی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ ہر چیز اپنی دسترس میں محسوس ہوتی ہے' لیکن افسوس یہ خوشنما خواب کا سفر بہت مختصر ہوتا ہے۔"

"عدینہ باجی! اتنے گرم فرش پر آپ کیسے ننگے پاؤں کھڑی ہیں۔۔؟" مونا بھاگ کر اس کی اندر سے چپل اٹھا لائی۔

"اچھا' موسم گرم ہے کیا۔۔؟" وہ سادہ سے انداز سے بولی تو مونا شدید دکھ کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ عدینہ کی یہ حالت اس کے دل کو تکلیف پہنچاتی تھی۔ اس نے اس لڑکی کو اس حالت میں دیکھا تھا جب اس کے گلاب چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رقصاں ہوتی تھی' نازک مزاج سی وہ لڑکی آج موسموں کی شدت سے بالکل بے نیاز تھی۔

"آج ہمارے شہر کا درجہ حرارت سبی کے گرم موسم کے برابر ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے میں لے آئی اور تخت پر بٹھا کر چھت کا پنکھا فل اسپیڈ میں چلا دیا۔ وہ اب اس کے بالکل سامنے کھڑی اپنے بھیگے کپڑے سکھا رہی تھی۔

"پتا نہیں آپ کو کیوں نہیں گرمی لگ رہی۔" مونا سمجھنے سے قاصر تھی۔

"جب انسان کے اپنے اندر کسی دکھ کا جہنم روشن ہو جائے تو اسے باہر کی جنت بھی محسوس نہیں ہوتی۔" عدینہ اس کی بات پر بے بس انداز سے مسکرائی۔

"عدینہ باجی پلیز بس کر دیں' اب تو پورے پندرہ دن ہو گئے ہیں۔" مونا جھنجلا کر گویا ہوئی۔

"تم مجھے پندرہ سال بعد بھی ملو گی تو میرے دل میں عبداللہ سے محبت کا دیا ایسے ہی روشن ہوگا۔" وہ سنجیدگی سے بولی اور اپنے کمرے سے نکلتی صالحہ آپا نے اس کا یہ جملہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ سنا تھا۔ ناگواری کی ایک لہر ان کے پورے وجود میں دوڑی۔

"تمہارا عبداللہ سے کوئی شرعی رشتہ نہیں تھا۔ اس لیے ایسی باتیں کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔" آپا صالحہ کی بات پر عدینہ کے چہرے پر سخت ناگواری کا تاثر پوری قوت سے ابھرا جو کہ آپا صالحہ کے لیے بالکل نیا

تھا۔

"کسی اپنے کی موت کا سوگ منانا جرم ہے کیا؟ اس بات پر آپ کا اسلام کیا کہتا ہے؟" عدینہ کی بات اتنی سادہ نہیں تھی، لیکن لہجہ اس سے بھی زیادہ گستاخانہ تھا۔ آپا صالحہ کے پیروں کے نیچے سے زمین نکلی۔

"تمہارا اسلام کیا الگ ہے؟" وہ اس کے بالمقابل آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تلخ لہجے میں بولیں۔ عدینہ کا نڈر انداز انہیں اندر ہی اندر سے ہولائے دے رہا تھا۔ "ویسے بھی اسلام میں تین دن سے زیادہ سوگ منانے کا حکم نہیں۔ سمجھیں تم؟"

"میرا دین بغیر کسی ثبوت اور گواہی کے نہ تو کسی کو بد کردار ثابت کرتا ہے اور نہ ہی میرے رب کی رحمت کا سمندر اتنا مختصر ہے۔ جتنا آپ اسے بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔" عدینہ کا یہ انداز اور رنگ ڈھنگ ایک دفعہ تو آپا کی جان ہی نکل گیا۔ وہ جان گئی تھیں کہ وہ اس دن چھت والی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے جب انہوں نے اس کی صفائی میں کہی گئی ایک بھی بات نہیں سنی تھی۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔" وہ تھوڑا نرم پڑیں کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"آپ لوگ خدائی صفات میں صرف قہار اور جبار کی تبلیغ مت کیا کریں، وہ رحمن بھی ہے اور رحیم بھی۔ اس کا بھی بتائیں، ویسے بھی اسلام ہمیشہ محبت اور نرمی سے پھیلا ہے، غصے اور جبر سے نہیں۔" اس نے بڑے آرام سے اپنی بات مکمل کی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آپا صالحہ کے تو گویا تلووں سے لگی اور سر پر بجھی تھی۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا، ابھی زمین سے ڈھنگ سے اگی نہیں اور میرے منہ کو آ رہی ہے۔" وہ غصے سے پورے کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔ انہوں نے ساری بات بے بے کو بھی بتا دی تھی۔

"تمہیں بھی تو ہزار دفعہ سمجھایا ہے، جوان اولاد سے اس طرح بات مت کیا کرو۔" بے بے نے ذرا محتاط انداز سے اپنی بہو کی بھی آج کلاس لی۔

"ایک تو پہلے ہی عبداللہ کے انتقال کے بعد سارے مدرسے کی ذمے داریاں میرے سر پر آن پڑی ہیں، اوپر سے اکلوتی اولاد منہ کو آ رہی ہے۔" آپا صالحہ تپ کر بولیں۔ عبداللہ کے جانے کے بعد انہیں احساس ہوا تھا کہ وہ لڑکوں کی سائیڈ کی ذمے داریاں کتنے احسن طریقے سے سرانجام دے رہا تھا۔ اس کی موجودگی میں انہیں کبھی بھی کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، لیکن اب ایک مہینے میں ہی انہیں دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔

"ابوبکر کو اپنے ساتھ کیوں نہیں ملا لیتی ہو، اسے سمجھاؤ، وہ سب کچھ سنبھال لے گا۔" بے بے نے موتا کے ایک کزن کا حوالہ دیا، جو کچھ عرصے سے وہیں قرآن پاک حفظ کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔

"بے بے! میں کیسے اس پر ساری ذمے داری ڈال سکتی ہوں، وہ ابھی بچہ ہے اور پھر وہ بھی تو عبداللہ سے تفسیر کی تعلیم لے رہا تھا۔ وہ بھی اس کی ادھوری ہے۔" آپا صالحہ کی توجہ اچانک ہی عدینہ سے ہٹ کر مدرسے کی جانب ہو گئی۔ عبداللہ کے بعد وہ واقعی اپنے مدرسے کی وجہ سے بہت سے مسائل کا شکار ہو رہی تھیں۔

"بچہ ہے تو کیا ہوا، جلد ہی سیکھ جائے گا۔" بے بے نے تسلی دی۔

"سوچ رہی ہوں کہ اخبار میں اشتہار دے دوں اور باقاعدہ کسی کو تنخواہ پر رکھ لوں...؟" انہوں نے بے بے سے مشورہ کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن، جو بھی فیصلہ کرو، سوچ سمجھ کر کرنا کیونکہ ہم صرف تین عورتیں ہیں اور دنیا بہت تیز ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کل کو کوئی آ کر سب ہی چیزوں پر قبضہ کر بیٹھے۔" بے بے نے انہیں ڈرایا تو وہ ڈر بھی گئیں۔

"پھر میرا خیال ہے کہ ابوبکر پر ہی زیادہ ٹائم لگاؤں، کچھ بھی سہی، رفیق صاحب کا رشتے میں تو بھتیجا ہے ناں، کچھ تو خیال کرے گا۔" بے بے کا مشورہ اب انہیں خاصا معقول لگنے لگا تھا۔

"اور ہاں یہ عدینہ اپنے ہوسٹل واپس کب جائے گی؟" بے بے نے دوبارہ ان کی توجہ عدینہ کی طرف کروادی، وہ پھر بے چین ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

"پتا نہیں۔" انہوں نے منہ بنایا۔ "پچھلے دنوں تو اس کی طبیعت خاصی خراب تھی اس لیے میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔" انہوں نے سچ بات بتائی۔

"میری مانو، اسے فوراً ہوسٹل بھجواؤ، کہ اس کا ذہن بٹے۔ خالی دماغ تو ویسے بھی شیطان کا گھر ہوتا ہے۔" بے بے نے سنجیدگی سے کہا تو آپا صالحہ فوراً ہی متفق ہو گئیں۔ ویسے بھی عدینہ کے باغیانہ انداز انہیں ہولا رہے تھے۔

"میرا خیال ہے، آپ ہی اس سے اس موضوع پر بات کریں۔ آپ کی تو وہ کافی مانتی ہے۔" آپا صالحہ نے ہلکا سا ہچکچا کر اپنی ساس سے کہا، ویسے بھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی تلخ کلامی کے بعد ان کا بالکل بھی دل نہیں کر رہا تھا کہ وہ فوراً ہی عدینہ سے گفتگو کا سلسلہ قائم کرلیں۔ وہ دل ہی دل میں عدینہ سے ٹھیک ٹھاک خفا ہو چکی تھیں۔

* * *

"بتائیں ناں، بڑی اماں میں ارصم کے ڈنر میں کون سا سوٹ پہنوں۔" اوریدا سخت الجھن کا شکار تھی اور اس وقت بھی بڑی اماں کو زبردستی اپنے کمرے میں پکڑ کر لائی تھی۔ بڑی اماں کے چہرے پر بیزاری اور کوفت کا عنصر نمایاں تھا ان کا تمام تر دھیان اپنے اچار کی طرف تھا جس میں آج تھوڑا تھوڑا تیل اور ڈالنا تھا۔

"یہ پرپل شرٹ، جینز کے ساتھ کیسا رہے گا۔" اوریدا نے ایک ریڈی میڈ سوٹ ان کے سامنے لہرایا۔

"یہ جینز اور شرٹ پہنو گی تم۔" بڑی اماں کا موڈ ایک دم خراب ہوا تو اوریدا نے ہینگر بیڈ پر اچھال دیا۔

"اچھا یہ ریڈ میکسی کیسی ہے۔؟" اس نے اچھا خاصا فینسی سوٹ ان کے سامنے کیا جو اس نے کسی کی شادی پر خریدا تھا۔

"تو ارصم کا ولیمہ تھوڑی ہے۔ جو اتنا لش پش کرتا جوڑا پہنو گی۔" بڑی اماں کے طنزیہ انداز پر اس نے وہ سوٹ بھی بیڈ پر پھینکا۔ جہاں پہلے ہی ریجیکٹ کیے گئے کپڑوں کا ایک ڈھیر لگ چکا تھا۔

"یہ بلیک شیفون کا سوٹ پہن لوں۔؟" اس نے مایوس ہو کر ایک اور سوٹ نکالا۔

"بھئی، خوشی کے موقعے پر یہ سیاہ رنگ مجھے تو بالکل پسند نہیں۔" بڑی اماں کے اس اعتراض پر وہ جھنجلا اٹھی۔

"آپ سے تو مشورہ کرنا ہی فضول ہے۔" اس نے غصے سے وارڈ روب کا دروازہ بند کیا، اندر داخل ہوتے ارصم نے یہ منظر حیرت سے دیکھا۔

"لو بھئی، یہ تمہارا چہیتا آگیا، اسی سے مشورہ کر لو۔" بڑی اماں جو پہلے ہی وہاں سے کھسکنے کا کوئی موقع ڈھونڈ رہی تھیں۔ ارصم کو دیکھ کر کھل اٹھیں۔ ارصم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اوریدا کی طرف دیکھا جو کپڑوں کے ڈھیر پر منہ بنائے بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ لنڈا بازار کس خوشی میں سجایا ہوا ہے۔؟" ارصم نے رنگ برنگی شرٹس اور جینز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"بھئی، یہ تو تم اوریدا ہی سے پوچھو، جسے تمہارے ڈنر میں پہننے کے لیے کوئی جوڑا نہیں مل رہا۔" بڑی اماں نے اٹھتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

"میرے پاس کچھ بھی ڈھنگ کا نہیں ہے۔" اوریدا کے منہ بنانے پر بڑی اماں جاتے جاتے پلٹیں اور تعجب بھرے انداز سے ناک پر انگلی رکھ کر اوریدا کی جانب دیکھا۔ جو اس وقت منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے، پورا کمرہ کپڑوں سے ابل رہا ہے اور صاحبزادی کو کچھ بھی ڈھنگ کا نہیں لگ رہا۔ توبہ توبہ قرب قیامت کی نشانیاں ہیں۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ اوریدا نے ہاتھ میں پکڑی پنک کلر کی شرٹ غصے سے بیڈ پر پھینکی اور اٹھ کر کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ ارصم نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کمرے کی کھڑکی کے پاس آن کھڑا ہوا۔

"اب تم میرے اتنے اہم ڈنر پر پرانا ڈریس پہنو گی

کیا؟" وہ بہت سنجیدہ انداز سے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے...؟" وہ الجھی۔

"چلو کسی اچھے سے مال سے شاپنگ کرکے آتے ہیں' مجھے بھی ایک دو ڈریس شرٹس لینی ہیں۔" ارصم کے مشورے پر وہ فوراً" پرجوش ہو کر کھڑی ہوئی۔

"ارے یہ آئیڈیا میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔" وہ جلدی جلدی کپڑوں کو اٹھا کر باقاعدہ وارڈ روب میں پھینکنے لگی۔

"اوں ہوں... اوریدا! ان کو ترتیب سے رکھو یار..." ارصم اس کے پھوہڑپن پر جھنجلا اٹھا' جبکہ وہ اطمینان سے اپنے کام میں مگن تھی۔

"مجھ سے یہ سب نہیں ہوتا' خود ہی ملازمہ کل سیٹ کردے گی۔" اس نے سب کچھ وارڈ روب میں ٹھونس دیا تھا' اب بڑے اطمینان سے اپنے بالوں میں برش کررہی تھی۔ اگلے ہی پانچ منٹ میں وہ ارصم کے ساتھ لاؤنج کی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ سامنے ہی بڑے ابا غضب ناک انداز میں ٹہل رہے تھے۔ وہ وہیں ٹھٹک کر پہلی سیڑھی پر رک گئی۔ دل ایک دم دہل کر رہ گیا تھا۔

"سمجھ کیا رکھا ہے تمہارے بیٹے نے' ساری دنیا پیسوں سے خرید لے گا..." وہ تیز لہجے میں مزید گویا ہوئے۔ "مجھے پتا ہے بہت بڑا بزنس مین ہے وہ لیکن اپنا پیسہ اپنی اولاد پر خرچ کرے' میرے ساتھ دوبارہ ایسی اوچھی حرکت کی تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"میں فون کرکے پوچھتی ہوں اس سے..." بڑی اماں سخت گھبرائی ہوئی تھیں۔

"اتنی دور فون کرکے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے' اپنی پوتی صاحبہ سے پوچھ لیں۔ جن کو ذرا ذرا سی بات اپنے باپ تک پہنچانے کی عادت ہے۔" انہوں نے انتہائی غضب ناک انداز میں سیڑھیوں پر کھڑی اوریدا کی طرف دیکھا' جس کا رنگ فق ہوگیا تھا۔

"بڑے ابا! انکل تیمور کو اوریدا نے نہیں' میں نے بتایا تھا۔" ارصم فوراً" ہی معاملے کی تہہ تک پہنچا۔ اس کی بات پر بڑے ابا چونکے۔

"بسرحال یہ موبائل فون اسے واپس بھجواؤ' مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے..." وہ تھوڑا سا نرم ہوئے۔

"لیکن میں نے ان کے سامنے یونہی ہلکا سا تذکرہ کیا تھا' مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس طرح آپ کو سیٹ بھجوادیں گے۔" ارصم نے محتاط سے انداز سے مزید وضاحت دی' بڑے ابا کا پارہ ایک دم ہی نیچے آیا اور وہ ایک سرد نگاہ اوریدا پر ڈال کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"کیا واقعی تم نے تیمور کو بتایا تھا کہ اوریدا کی وجہ سے ان کا موبائل ٹوٹ گیا ہے۔" بڑی اماں کو نہ جانے کیوں یقین نہیں آیا اور کچھ اوریدا کا حواس باختہ انداز انہیں اصل بات بتا رہا تھا۔

"ہاں ناں بڑی اماں..." وہ سیڑھیاں اتر کر ان کے کندھے پر بازو پھیلا کر اطمینان سے بولا۔

"لیکن تمہاری تیمور سے کیسے بات ہوگئی؟ وہ تو تمہیں کبھی کال نہیں کرتا۔" بڑی اماں ایک نکتہ نکال ہی لائی تھیں۔

"ہاں تو میں نے کب کہا' مجھے انہوں نے کال کی تھی۔" وہ صاف مکر گیا تو بڑی اماں کی آنکھوں میں شکوک کے رنگ ابھرے۔

"وہ تو اوریدا کو بار بار کال کررہے تھے' یہ محترمہ واش روم میں دروازہ بند کیے رو رہی تھیں' میں نے کال اٹینڈ کرلی اور ان کو اصل بات بتادی۔" ارصم نے مختصراً" لاپروا انداز میں بتایا۔ بڑی اماں کو نہ چاہتے ہوئے بھی یقین آہی گیا تھا۔

"تمہیں پتا تو ہے اپنے بڑے ابا کے مزاج کا' خوامخواہ تیمور سے تذکرہ کردیا۔" بڑی اماں ہلکا سا برامان کر مزید بولیں۔ "باقی تیمور کے پاس جو آج کل پیسے تک نہیں رہے اس کا تو میں علاج کرتی ہوں۔"

"تمہیں کیوں سکتہ ہوگیا ہے؟" گاڑی میں بیٹھتے ہی ارصم نے خوش گوار لہجے میں اوریدا کو چھیڑا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرکے آنسو گرنے لگے۔ ارصم بوکھلا سا گیا۔

"اوہ میرے خدا' اوریدا' تمہیں تو کسی نے کچھ

نہیں کہا تو تم کیوں رو رہی ہو۔" وہ پریشان ہوا۔

"اگر تم نہ ہوتے تو بڑے ابا نے تو آج مجھے کوٹ ہی مار دینی تھی۔" اوریدا نے روتے ہوئے اصل بات بتائی تو وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"او مائی گاڈ اوریدا! اگر کوئی چیز وقوع پذیر نہیں ہوتی تو تم کسی نہ کسی چیز کو فرض کر کے رونے کا بہانا ڈھونڈ ہی لیتی ہو۔ کیا بنے گا تمہارا۔" اس نے ٹشو اس کی جانب بڑھاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"مجھے کیا پتا تھا' وہ اتنا مائنڈ کر جائیں گے۔" اس نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے رنجیدہ انداز میں کہا۔

"اگر تم انکل تیمور سے یہ بات کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کر لیتیں تو میں تمہیں ہرگز یہ بے وقوفی نہ کرنے دیتا۔" ارصم بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔

"میری سمجھ میں تو یہ نہیں آتا' آخر بڑے ابا میرے پاپا سے اتنا چڑتے کیوں ہیں۔" اس نے ناراض سے انداز سے کہا' اسے بڑے ابا کی باتیں بہت بری لگی تھیں۔

"مجھے پتا ہے۔" ارصم کی لاپروائی پر اوریدا کو سخت بے چینی لاحق ہوئی۔

"ریئلی۔۔۔؟ مجھے بھی بتاؤ نا پلیز۔" اس نے فوراً اصرار کیا تو وہ مسکرا دیا۔

"ایک دفعہ آغاجی بتا رہے تھے کہ بڑے ابا کو بہت شوق تھا کہ وہ انکل تیمور کو میڈیکل کی فیلڈ میں بھجواتے' لیکن وہ ضد کر کے زبردستی بزنس پڑھنے باہر چلے گئے' اس کے بعد سے ان کے بڑے ابا کے ساتھ تعلقات سخت کشیدہ ہیں۔" ارصم نے سنجیدہ انداز میں بتایا جسے سنتے ہی اوریدا نے برا سا منہ بنایا۔

"یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں جس پر وہ اپنے اکلوتے بیٹے سے ناراض ہو کر بیٹھ جائیں۔"

"تمہیں پتا تو ہے بڑے ابا کے مزاج کا' جو چیز ان کے ذہن میں سما جائے وہ ساری زندگی نہیں نکلتی۔"

"تمہاری ممی بھی تو ایسی ہی ہیں۔" اوریدا کے یاد دلانے پر وہ بے اختیار ہنسا' اس نے اوریدا کے بے ساختہ انداز کو انجوائے کیا تھا۔

"تو میں نے کب کہا کہ وہ ایسی نہیں ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا جس کا موڈ اب ٹھیک ہو چکا تھا' وہ مزاجاً بالکل بچوں کی طرح تھی' اس کو غصہ جتنی تیزی سے آتا تھا' اتنی ہی تیزی سے اتر بھی جاتا تھا۔ اب بھی وہ بڑے ابا کی بات کو بھول بھال چکی تھی۔

"دھیان سے گاڑی چلاؤ' کہیں ٹھوک مت دینا۔۔۔" اوریدا نے اسے بے ساختہ ٹوکا۔ جس کی توجہ بار بار بائیں جانب بیٹھی اوریدا کی طرف ہو رہی تھی۔

"تمہاری طرح اناڑی ڈرائیور تھوڑا ہوں۔" اس نے اوریدا کو چھیڑا لیکن چھیڑ اس وقت خاصی مہنگی پڑی' کیونکہ اس کے آگے چلنے والی سفید کرولا نے ایک دم ہی بریک لگائی جس کے نتیجے میں ارصم کو بھی فوراً پوری قوت سے بریک لگانا پڑی' اوریدا جو اپنے دھیان میں بیٹھی تھی۔ اس اچانک افتاد پر اپنا توازن سنبھال نہ سکی اور اس کا سر ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا۔

"آئی ایم سوری یار! میرا کوئی قصور نہیں۔۔۔" ارصم جو سیٹ بیلٹ کی وجہ سے محفوظ رہا تھا گھبرا کر اوریدا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اوریدا دائیں ہاتھ سے اپنا ماتھا سہلاتے ہوئے اسے غصے سے گھور رہی تھی۔

"ابھی تو تھوڑی دیر پہلے بڑے ایکسپرٹ ہونے کے دعوے کر رہے تھے۔ دیکھ لیا نا بڑے بول کا انجام۔" اوریدا نے بے زاری سے اسے یاد دلایا۔

"ایکسپرٹ ہی ہوں جو فاسٹ رو میں ایمرجنسی بریک کے بعد گاڑی کو سنبھال لیا' ورنہ اب تک تو اگلی گاڑی کا بمپر اور بتیاں تو ٹوٹ چکی ہوتیں۔" اس نے مسکراہٹ دبا کر فوراً اپنی صفائی دی اور گاڑی اسٹارٹ کی۔

"یہ اگلے والے کو کون سی مصیبت پڑ گئی تھی جو اس طرح اچانک بریک لگا دی؟" اوریدا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اس کی گاڑی کے نیچے بلی کا بچہ آنے لگا تھا۔" ارصم نے مسکرا کر اصل بات بتائی جسے سن کر اسے

اپنی پالتو کیٹی فوراً" ہی یاد آگئی۔

"پتا نہیں کیٹی کو ماہیر ٹائم سے دودھ دیتا ہوگا کہ نہیں۔" اوریدا کو ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔ ارصم نے ایک لمبی سانس بھری۔

"اب یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں اپنی کیٹی کہاں سے یاد آگئی؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"وہ مجھے بھولی ہی کب تھی' کتنا کہا تھا پاپا کو اسے بھی میرے ساتھ پاکستان جانے دیں' لیکن پاپا مانے ہی نہیں۔" اوریدا نے اداس ہونے کے لیے ایک نئی وجہ ڈھونڈ ہی لی تھی۔

"شکر کرو کہ تم اسے لے کر نہیں آگئیں' ورنہ پورے گھر میں ایک طوفان برپا ہو جاتا۔" ارصم نے خوش گوار لہجے میں کہا تو اوریدا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا' کیونکہ وہ واقعی ہی نہیں سمجھی تھی۔

"ارے بابا' بڑی اماں کو ان کتے بلیوں سے سخت چڑ ہے۔" ارصم نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"ایک تو مجھے پاپا کے پیرنٹس سمجھ میں نہیں آتے' ان دونوں کو کوئی چیز اچھی بھی لگتی ہے۔" وہ جھنجلا کر مزید گویا ہوئی۔ "جب سے یہاں آئی ہوں' صبح و شام یہی سننے کو ملتا ہے' بڑے ابا کو یہ پسند نہیں' بڑی اماں کو فلاں چیز سے چڑ ہے' ارے بابا تم لوگ کسی کو جینے بھی دوگے کہ نہیں؟"

"مائی گاڈ اوریدا! تمہاری زبان کتنی لمبی ہے' بڑی اماں نے یہ تمہارے سنہری ارشادات سن لیے تو ایک منٹ میں دماغ ٹھکانے لگا دیں گی۔" ارصم نے گاڑی پارکنگ میں موڑتے ہوئے اسے شرارتی انداز سے ڈرایا۔

"ہونہہ۔۔۔ مائی فٹ۔" وہ حقیقتاً" تپ گئی۔ جھنجلا کر گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ دونوں شاپنگ مال کے سامنے تھے۔ ارصم نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ ایک گھنٹے میں ارصم تو اپنے لیے شرٹس پسند کر کے خرید چکا تھا' لیکن اوریدا کی نظر میں ابھی تک کوئی بھی ڈریس نہیں آ رہا تھا۔ وہ کئی دکانوں کا وزٹ کر چکی تھی۔ اب تو ارصم کو بھی بوریت ہونے لگی تھی۔

"بس فائنل ہو گیا۔" ارصم آگے بڑھا اور رائل بلیو کلر کی لانگ شرٹ جس کے چاکوں پر چھوٹے چھوٹے سلور کلر کے نگ لگے ہوئے تھے اور ساتھ میں چوڑی دار پاجامہ تھا' وہ لے کر کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔

"مجھے کچھ اور بھی تو دیکھنے دو نا۔" اوریدا نے ہلکی سی ضد کی تو ارصم نے ناراض سے انداز سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں میری پسند پر اعتبار نہیں ہے اوریدا؟" اس کے سنجیدہ انداز پر اوریدا گھبرا سی گئی۔

"میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔" اس نے جلدی سے بیان بدلا اور فوراً" کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ ارصم کریڈٹ کارڈ سے پے منٹ کر رہا تھا۔ اس کے خاموش انداز کو ارصم نے فوراً" نوٹ کیا۔

"تم پر رائل بلیو کلر بہت سوٹ کرتا ہے۔" ارصم جیسے ہی شاپ سے باہر نکلا' اس نے سرسری انداز سے اوریدا کو اطلاع دی تھی' جسے سنتے ہی اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ وہ جو پنک کلر کے ایک سوٹ پر نظریں جمائے کھڑی تھی' اس کی نگاہیں اب شاپنگ مال کے وسیلے میں لگے ہوئے کپڑوں میں صرف بلیو کلر پر اٹھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"مدینہ باجی! ایک بات کہوں؟" وہ جو آنکھیں بند کیے اپنی پسندیدہ دنیا میں عبداللہ کے ساتھ گھوم رہی تھی' مونا کی بات پر چونک اٹھی۔ جلدی سے آنکھیں کھول کر سامنے کھڑی مونا کی طرف دیکھا' جو دھلے ہوئے کپڑوں کو تہہ کر رہی تھی۔

"ہاں کہو۔" اس نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ اس پر غنودگی کا غلبہ طاری تھا۔

"آپ نے آج آپ صالحہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" مونا نے محتاط سے انداز سے کہا تو وہ چونک اٹھی' اتنا تو

اسے بھی پتا تھا' مونا کے ساتھ اس کی لاکھ دوستی سہی' لیکن وہ آپا صالحہ کے معاملے میں اسی کی طرح حساس تھی۔

"میں نے ان کے ساتھ کیا' کیا ہے؟" عدینہ کو دوپہر والی بات بالکل بھی یاد نہیں تھی۔

"دوپہر میں جو آپ ان کے ساتھ بدتمیزی کررہی تھیں۔" مونا نے صاف گوئی سے کہا تو عدینہ پھیکے سے انداز سے مسکرادی۔

"سچ پوچھو تو مونا! مجھے آج کل آپا کی طرف دیکھتے ہی نہ جانے کیوں غصہ آنے لگتا ہے۔" عدینہ نے عجیب بات کی' مونا کپڑوں کو تہہ کرنا بھول کر بالکل اس کے پاس آن بیٹھی۔

"وہ کیوں باجی؟" وہ ایک دم پریشان ہوئی' پہلا خیال تو یہی آیا کہ شاید کسی حاسد نے عدینہ پر کوئی تعویذ دھاگا کروادیا ہے۔

"ان کی طرف دیکھ کر مجھے خیال آتا ہے کہ ان کی وجہ سے عبداللہ اتنا پریشان ہوکر یہاں سے گیا تھا۔" اس کی آنکھوں میں بے ساختہ ہی آنسو آگئے۔

"آپ کو تھوڑی پتا تھا کہ وہ کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے۔" مونا نے آپا کی طرف سے اس کا دل صاف کرنا چاہا۔

"لیکن انہوں نے تو اپنی طرف سے معاملہ ختم کرکے ہی بھیجا تھا نا۔" وہ واقعی دل سے آپا سے خفا تھی۔ مونا کو اس کی باتیں پریشان کررہی تھیں۔ وہ جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے بولی۔ "لیکن عدینہ باجی اسی میں اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔"

"مجھے... میری سمجھ میں نہیں آتا مونا' ہم لوگ اپنے غلط فیصلوں کو اللہ کی مصلحتوں کا نام کیوں دینے لگتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت دی ہے' وہ اپنے لیے خود اچھا یا برا فیصلہ کرتا ہے۔ ویسے سچ پوچھو تو آپا کا اس سے اچانک یوں شادی نہ کرنے کا کہنا مجھے بھی بہت عجیب لگا تھا۔" وہ مونا کے سامنے بے دھڑک ہوکر اپنے دل کی بات کہہ دیتی تھی۔

"اب اتنی بھی کوئی انوکھی بات نہیں کہہ دی تھی آپا نے۔" مونا نے ہلکا سا منہ بنایا۔ "اکثر لوگوں کی شادیاں پڑھائی کے دوران ہو ہی جاتی ہیں۔"

"لیکن انہیں کم از کم مجھ سے تو پوچھنا چاہیے تھا۔" عدینہ کی آنکھوں میں شکوہ جھلکا۔

"آپ نے بھی کون سا مان جانا تھا۔" مونا بھی اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

"کہتی تو تم بالکل ٹھیک ہو۔" عدینہ اس کی بات سے فوراً ہی متفق ہوئی تو مونا نے ہلکے سے توقف کے بعد کہا۔ "آپ اپنے آپ کو کیوں سزا دے رہی ہیں' سارا سارا دن کھانا نہیں کھاتیں اور آئینے میں شکل دیکھی ہے اپنی' چہرہ کتنا بے رونق ہوگیا ہے۔"

"میں پہلے کون سا بار سنگھار کرتی تھی۔" عدینہ نے یاد دلایا۔

"آپ کا چہرہ کسی بھی قسم کے ہار سنگھار کے بغیر ہی خوب دمکتا تھا۔" مونا نے مسکرا کر یاد دلایا تو عدینہ افسردہ سے انداز سے گویا ہوئی۔

"جب کوئی لڑکی کسی سے محبت کرتی ہے نا تو اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ کا محتاج نہیں رہتا۔ اپنے محبوب کی چاہت سے بھرپور ایک نظر اس کے چہرے پر گلابی پن' ہونٹوں پر سرخی اور آنکھوں میں حیا کا کاجل لگانے کو کافی ہوتی ہے۔"

"پتا نہیں آپ اتنی مشکل باتیں کیسے کرلیتی ہیں۔" مونا نے فوراً ہی ہار مان لی۔

"عبداللہ کی امی واپس آگئیں ہیں...؟" عدینہ نے ہلکا سا سنبھل کر وہ سوال کیا جو وہ کافی دنوں سے کرنے کا سوچ رہی تھی۔

"وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گی۔" مونا کے لہجے میں رنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔

"بالکل اپنے بیٹے کی طرح' جیسے وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔" عدینہ کا لہجہ بھیگا' اس نے ایک دفعہ پھر آنکھیں بند کرلیں۔ چہرہ کرب کے گہرے احساس سے بجھ گیا تھا۔ اس کا غم کسی طور بھی کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

"مونا! میری ایک بات مانوگی؟" عدینہ کا لہجہ پراسرار ہوا۔ مونا نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا جو آنکھیں موندے لیٹی تھی۔

"عدینہ باجی! آج تک آپ کی کوئی بات ٹالی ہے۔" مونا بے بسی کے احساس سے مسکرائی' اسے واقعی ہی عدینہ سے بڑی گہری محبت تھی۔

"کسی دن جب بچوں کو چھٹی ہوگی' تم اور میں عبداللہ کے کمرے میں جائیں گے۔"

اس کی بات پر مونا حیران ہوئی۔

"تم میرے ساتھ چلوگی نا؟"

"عدیرے والے کمرے میں؟" مونا نے تعجب بھرے انداز سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"کوئی بات نہیں' چلے چلیں گے۔" اس نے فوراً تسلی دی۔

"لیکن آپا کو پتا چل گیا تو۔؟" عدینہ نے اسے ڈرایا تو وہ کچھ سوچ کر مسکرادی۔

"آپا سے اجازت لے کر ہی جائیں گے۔" مونا کی بات پر اس نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی خرابی دماغ کا یقین آگیا ہو۔

"وہ تو قیامت تک اجازت نہیں دیں گی۔" عدینہ نے مایوس ہوکر کروٹ لے لی۔

"ارے عدینہ باجی! آپا پرسوں ہی کہہ رہی تھیں کہ لڑکوں والی سائیڈ کی تفصیلی صفائی کروانی ہے' بس میں انہیں آج ہی مشورہ دیتی ہوں کہ کل بچوں کو دس سے ایک بجے تک چھٹی دے دیں' میں لڑکیوں کو لے کر صفائی کروادوں گی۔" مونا نے اپنے زرخیز دماغ سے ایک ترکیب نکال ہی لی تھی۔ جسے سنتے ہی عدینہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اب آپ پھر سو رہی ہیں کیا۔" وہ ہلکا سا جھنجلائی۔

"ہاں' بہت نیند آرہی ہے۔" عدینہ جو کہ آنکھیں زبردستی کھولنے کی کوشش میں نڈھال ہوگئی تھی۔ اب نیند کے آگے بے بس ہوچکی تھی۔ مونا کچھ دیر تو اسے دیکھتی رہی اور پھر تنگ آکر کمرے سے نکل گئی' جاتے جاتے لائٹ بھی آف کرگئی۔

مغرب کا وقت تھا' جب آپا صالحہ نے اپنے کمرے سے باہر قدم نکالا اور برآمدے میں لگا انرجی سیور روشن کیا۔ وہ اس وقت پورے گھر کی بتیاں جلادیتی تھیں۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے انہوں نے اپنی بچی کے کمرے میں جھانکا' اندر گھپ اندھیرا تھا۔

"ہزار دفعہ سمجھایا ہے مغرب کے وقت گھر میں اندھیرا نہیں کرتے۔" انہوں نے جھنجلا کر عدینہ کے کمرے کی لائٹ روشن کی اور انہیں یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ وہ خاصی گہری نیند میں تھی۔ ان کے بولنے اور لائٹ کے روشن ہونے پر بھی اس کی نیند نہیں ٹوٹی تھی۔

وہ آہستگی سے اس کے پلنگ کے پاس چلی آئیں اور اس کی زمین پر لٹکتی چادر اٹھا کر اس کے اوپر دی۔ ایک چھوٹا کشن زمین پر گرا ہوا تھا' وہ اٹھا کر پلنگ پر رکھا۔ عدینہ کے بیڈ کی سائیڈ میز پر میڈیکل کی کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں جنہیں اس نے پچھلے کئی دنوں سے ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا' پاس ہی چائے کا خالی کپ اور ایک گلاس پانی کا رکھا ہوا تھا۔

آپا صالحہ نے پہلے سوچا کہ وہ عدینہ کو اٹھا کر مغرب کی نماز پڑھنے کی تلقین کریں کیونکہ فضا میں اذانوں کی آوازیں گونج رہی تھیں' پھر نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا۔ میز پر پڑے برتنوں کو اٹھانے کے لیے انہوں نے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا' کتابوں کے درمیان ٹیبلٹس کا ایک چھوٹا سا پیکٹ انہیں نظر آیا۔

"یہ کیا ہے۔؟" انہوں نے حیرانگی سے وہ پیکٹ اٹھایا اور میڈیسن کا نام پڑھتے ہی انہیں کرنٹ سا لگا' وہ سلیپنگ پلز تھیں۔

انہوں نے گھبرا کر عدینہ کی طرف دیکھا جو دنیا و مافیہا سے بے نیاز سو رہی تھی۔ وہ سمجھ گئیں کہ یہ گہری نیند ان ہی ادویات کی بدولت تھی۔ کسی میڈیکل کی اسٹوڈنٹ کے پاس ان ٹیبلٹس کا ہونا اتنی عجیب بات نہیں تھی' عجیب بات تو یہ تھی کہ انہیں اس چیز کی خبر نہیں ہوسکی کہ ان کی بیٹی مصنوعی نیند کی

عادی ہو چکی ہے۔

"قسم اللہ پاک کی آپا! مجھے نہیں پتا' عدینہ باجی نے یہ دوائی کس سے منگوائی تھی؟" مونا نے گھبرا کر آپا صالحہ کو جواب دیا' اس کی بری طرح سے شامت آئی ہوئی تھی۔ آپا صالحہ اور بے بے نے سب سے پہلے اسی کو پکڑا تھا۔

"غضب خدا کا' وہ یہ میڈیسن کھا کر سارا سارا دن ٹن پڑی رہتی ہے اور تم نے ایک دفعہ بھی مجھے نہیں بتایا۔" آپا کا غصہ کسی طور بھی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی ساس کو بھی ساری بات بتادی تھی جو خود بھی تاسف بھرے انداز سے مونا کو دیکھ رہی تھیں۔

"دیکھیں آپا' ایسی میڈیسن یہاں اپنے گاؤں سے تو ملنے سے رہیں۔" مونا نے پریشان انداز سے ان کی توجہ دوسری جانب مبذول کروائی۔

"تمہارا کیا خیال ہے عدینہ یہ شہر سے لے کر آئی ہے۔" وہ فوراً ہی اس کی بات کو سمجھیں۔

"ظاہری سی بات ہے۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔ آپا صالحہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔

"اچھا' تم جاؤ' جا کر عدینہ کو اٹھاؤ اور فریج سے آٹا نکال کر چولہے کے پاس رکھو۔" بے بے نے سب سے پہلے مونا کو منظر سے غائب کیا' جیسے ہی وہ کمرے سے نکلی وہ فوراً آپا صالحہ کی طرف متوجہ ہوئیں جو پریشان سے انداز سے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھی تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تم فوراً عدینہ سے بات کر کے اسے شہر بھجواؤ۔" بے بے نے سنجیدگی سے اپنی بہو کو مخاطب کیا۔

"وہی بات کرنے تو اس کے کمرے میں گئی تھی۔" انہوں نے جلدی سے کہا۔

"اس کا مصروف ہونا بہت ضروری ہو گیا ہے' ورنہ تو وہ اسی طرح آدھا دن رو کر اور آدھا دن سو کر گزارے گی۔" بے بے نے منہ بنا کر سر جھٹکا' عدینہ کی اس حرکت نے انہیں بھی خاصا مایوس کیا تھا۔

"میں آج ہی اس سے صاف صاف بات کرتی ہوں۔" آپا صالحہ بے چین سے انداز سے کمرے میں ٹہلنے لگیں۔

"ذرا نرمی اور پیار سے بات کرنا' جوان اولاد سے سختی اچھی بات نہیں۔" بے بے نے کمرے سے نکلتے ہوئے انہیں نصیحت کی۔ جسے آپا صالحہ نے بہت غور سے سنا تھا' آج کل وہ اپنی ساس کے مشوروں پر خوب عمل کر رہی تھیں۔

ایک گھنٹے بعد وہ پھر سے عدینہ کے کمرے میں تھیں۔ وہ اٹھ چکی تھی اور اس وقت واش روم میں تھی۔ وہ اس کے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ اندر سے پانی گرنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ شاور لے رہی ہو۔ انہوں نے وقت گزاری کے لیے سائیڈ میز پر رکھی اناٹومی کی کتاب اٹھائی' جیسے ہی انہوں نے اسے کھولا' ایک چھوٹی سی پاسپورٹ سائز تصویر اس میں سے نکل کر زمین پر جا گری۔ آپا صالحہ نے حیرانی سے اس تصویر کو دیکھا اور فوراً جھک کر زمین سے اٹھالیا' جیسے ہی انہوں نے تصویر کو سیدھا کیا' انہیں چار سو بیس وات کا کرنٹ لگا۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئیں' اناٹومی کی کتاب جو ان کی گود میں تھی' اچھل کر زمین پر جا گری' وہ خوف زدہ نگاہوں سے ہاتھ میں پکڑی اس بلیک اینڈ وائٹ تصویر کو دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی بہت بڑا بھوت دیکھ لیا ہو۔ وہ اڑتے ہوئے عدینہ کے کمرے سے نکلی تھیں۔ ان کا دماغ بھک کر کے اڑ چکا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ یہ تصویر انہیں عدینہ کی کتابوں سے بھی مل سکتی ہے۔

۞ ۞ ۞

"تم شوبز میں آنے کا ارادہ ملتوی کیوں نہیں کر دیتیں شانزے۔" سعد نے اس دن اسے لنچ کے لیے بلا رکھا تھا۔ شانزے کو ڈراپ کرنے کے بعد دونوں کی اچھی خاصی بے تکلفی اور دوستی ہو گئی تھی' جب سے شانزے کو پتا چلا تھا کہ اسے پہلا ایڈ بھی سعد

کی سفارش سے ملا ہے‘ اس کے دل میں خود بخود اس کے لیے نرم گوشہ بن گیا تھا۔

"یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو سرمد...؟" شانزے کو دھچکا ہی تو لگا تھا۔

"ہاں میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم شوبز کو چھوڑ کر کوئی اور جاب اپنے لیے تلاش کرو‘ میں اس سلسلے میں تمہاری ہیلپ کر سکتا ہوں۔"

"تم نے یہ فضول بات کرنے کے لیے مجھے یہاں بلایا ہے؟" وہ ٹھیک ٹھاک برا مان گئی۔

"یار! میں نے کوئی ایسی بری بات بھی نہیں کہہ دی۔" سرمد نے حیرانی سے اس کا بے زار چہرہ دیکھا۔

"جو بھی ہے‘ میں شوبز کو چھوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" شانزے نے صاف گوئی سے کہا۔

"لیکن تم ابھی اس میں ان ہی کہاں ہوئی ہو...؟" سرمد نے اسے آئینہ دکھایا۔

"کبھی نہ کبھی میرے لیے بھی کوئی راستہ کھل ہی جائے گا۔" وہ ابھی بھی پرامید تھی۔ سرمد نے اس موضوع پر مزید بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

"ڈاکٹر کے پاس دوبارہ گئی تھیں؟" سرمد نے اس کے ماتھے پر لگے ٹانکوں کو دیکھتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا‘ شانزے کا دل ایک دم ہی کھانے سے اچاٹ ہو گیا‘ اس نے ہاتھ میں پکڑا چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔

"ہوں..." وہ افسردہ ہوئی۔ "وہ کہتا ہے کہ کم سے کم بھی دو ماہ لگیں گے پھر جا کر یہ نشانات ختم ہوں گے۔" سرمد اس کی پریشانی اور افسردگی کو سمجھ سکتا تھا۔

"یہ تو واقعی پریشان کن بات ہے۔" وہ سنجیدہ ہوا اور پھر چونک کر اسے دیکھا جو اب کھانا بالکل نہیں کھا رہی تھی۔

"شانزے! تم پلیز کھانا تو کھاؤ..." سرمد نے اسے ٹوکا۔

"پتا نہیں کیوں‘ ایک دم ہی ساری بھوک اڑ گئی ہے۔" اس نے بے بس انداز سے کہا۔

"تم چیزوں کو اپنے سر پر سوار کیوں کر لیتی ہو لڑکی! تمہارے گھر والے تمہیں سمجھاتے نہیں ہیں‘ ایسی حرکتیں چھوڑ دو۔" سرمد نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"میرے گھر والے ہی نہیں ہیں تو مجھے کون سمجھائے گا۔" اس نے استہزائیہ انداز سے اپنا مذاق خود اڑایا۔ سرمد الجھ سا گیا۔

"کیا تم نے شوبز کی خاطر اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا۔" سرمد کو اندازہ تھا کہ لڑکیاں اس جنون میں بہت کچھ چھوڑنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ اس کی بات پر شانزے کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستی ہی گئی۔

"اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے۔" وہ ہلکا سا برا مان گیا۔

"اس لیے کہ میں اکلوتی ہوں اور میری پیدائش کے فوراً بعد میرے والدین کے درمیان علیحدگی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد بابا کی ڈیتھ ہو گئی اور ماما شاید اپنے میکے چلی گئیں اور انہوں نے دوبارہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔" اس نے اپنی زندگی کے دردناک حصے کو اتنے عام اور سرسری سے لہجے میں بتایا کہ سرمد کھانا کھانا بھول کر اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"تو تمہاری پرورش کس نے کی؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"میری پھپھو اور دادی نے‘ لیکن اب دادی کی بھی ڈیتھ ہو چکی ہے۔" شانزے نے چاول اپنی پلیٹ میں نکالے۔ اس کے چہرے پر اس قدر لاپروائی تھی کہ سرمد کو لگا جیسے وہ اپنے بارے میں نہیں بلکہ کسی اور کے بارے میں بتا رہی ہو۔

"اس کا مطلب ہے تمہارے پاس بلڈ ریلیشن کے نام پر کوئی رشتہ نہیں‘ میرا مطلب ہے‘ بہن یا بھائی۔" سرمد کو حقیقتاً اس پیاری سی لڑکی سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ ویسے بھی اس لڑکی میں کوئی ایسی بات تھی جو دیکھنے والے کو اٹریکٹ کرتی تھی۔

"ہاں کہہ سکتے ہیں‘ لیکن سچ پوچھیں تو مجھے ایسی کوئی کمی محسوس بھی نہیں ہوئی۔" سرمد کو اس کے لہجے سے پتا چل گیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے‘ ایسی چیزوں کو ذہن پر

سوار کرنے سے کچھ ملتا بھی نہیں ہے' الٹا دماغ ہی خراب ہوتا ہے۔" سرمد ہم سے دلا سا دیا۔

"اور میرا تو پہلے ہی اچھا خاصا دماغ خراب ہے' یقین نہیں آتا تو سارے ہوسٹل کی لڑکیوں سے پوچھ لیں۔" اس کے شرارتی انداز پر سرمد بے ساختہ ہنس پڑا۔ دونوں کا نیچ بڑے اچھے ماحول میں ہوا تھا۔ سرمد اسے ہوسٹل تک واپس چھوڑنے آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی میں تھی۔

"شانزے! ایک بات کہوں' اگر تم مائنڈ نہ کرو۔" اس نے فوراً" چونک کر سرمد کا چہرہ دیکھا' جس پر ہلکی سی جھجک تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو اور دل ہی دل میں لفظوں کو ترتیب دے رہا ہو۔ شانزے کو ایک لمحے میں محسوس ہوا کہ وہ اس سے کوئی خاص بات کرنے جارہا ہے۔

"جی کہیں۔" اسے اندازہ تھا کہ وہ کیا کہنے جارہا ہے' جو عموماً" اکثر لڑکے اس کی طرف دیکھ کر بے ساختہ کہتے تھے کہ شانزے تم مجھے اچھی لگتی ہو' مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے' وغیرہ وغیرہ' لیکن شانزے کی زندگی میں ایسی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس لیے وہ انہیں اپنے ذہن پر سوار نہیں کرتی تھی۔

"کیا بات ہے سرمد! آپ بول کیوں نہیں رہے؟" شانزے اسے حد درجہ کنفیوز دیکھ کر پریشان ہوئی۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ لے لو۔" وہ الجھن بھرے انداز سے گویا ہوا۔

"ڈونٹ وری ایسا نہیں ہوگا۔" شانزے نے اسے تسلی دی' ویسے بھی یہ لڑکا اسے خاصا پرخلوص اور بے ضرر سا محسوس ہوا تھا۔ اس کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے اسے ایک دفعہ بھی کوفت یا بے زاری کا احساس نہیں ہوا تھا۔

"ایسا ہے شانزے! مجھے نہیں معلوم کہ اللہ نے تمہیں خونی رشتوں سے محروم کیوں رکھا' اس میں اس کی کیا مصلحت تھی؟ لیکن زندگی میں کبھی خود کو مشکل میں محسوس کرو' کسی بھی قسم کی پریشانی ہو تو ہمیشہ یاد رکھنا کہ سرمد نام کا ایک ایسا لڑکا ہے جسے اللہ نے بے شک تمہارا سگا بھائی نہیں بنایا' لیکن وہ کبھی بھی اس سے کم ثابت نہیں ہوگا۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے ایک نئے رشتے سے متعارف کروا رہا تھا۔

"جی۔" شانزے نے بوکھلا کر اسے دیکھا' اس کی آنکھوں میں اس کے لیے اس قدر محبت اور اپنائیت تھی کہ شانزے کو اپنا دل ممنونیت کے گہرے احساس سے بھرتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ سخت حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"مدینہ باجی! آپ کو آپا صالحہ اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔" عشاء کی نماز کے بعد مونا نے اسے آپا کا پیغام دیا تو وہ چونک گئی۔ وہ جو اس وقت اپنی ڈائری کھولے اپنا کتھارسس کرنے میں مصروف تھی۔ اس نے فوراً" ہی ڈائری بند کی۔

"کہاں پر ہیں وہ؟" مدینہ نے سرسری سے انداز سے مونا کا حد درجہ سنجیدہ چہرہ دیکھا۔

"بے بے کے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ لگتا ہے کہ کوئی سیریس بات کرنی ہے۔" مونا نے اسے ساتھ ہی خبردار کیا۔

"عبداللہ کی موت کے بعد اب مجھے کوئی بھی چیز سیریس نہیں لگتی۔" وہ تلخ لہجے میں گویا ہوئی اور ساتھ ہی چپل پہن کر کھڑی ہوگئی۔ مونا نے حیرانی سے اسے دیکھا' آج کل وہ ضرورت سے زیادہ بے دھڑک ہو کر بولنے لگی تھی' اللہ جانے کون سی ایسی چیز تھی جو اسے بولنے پر اکسا رہی تھی۔

"پلیز باجی! آپا کچھ بھی کہیں' خاموشی سے سن لیجئے گا۔" مونا نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے التجائیہ انداز میں درخواست کی۔

"کیا اب بھی کچھ کہنے کو باقی رہ گیا ہے؟" مدینہ نے اسے لاجواب کیا۔ مونا کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ اب بے بے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ آپا صالحہ کے ہاتھ میں تسبیح تھی اور بے بے نے

اسے دیکھ کر قرآن پاک بند کر دیا۔ عدینہ نے دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔ آپا صالحہ کا موڈ خاصا خراب لگ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہی ہوں۔

"یہ میڈیسن تم کب سے استعمال کر رہی ہو....؟" آپا صالحہ نے اپنی طرف سے کمرے میں دھماکا کیا' لیکن عدینہ نے سپاٹ سے چہرے سے ان کو دیکھا تھا۔

"پچھلے ایک ماہ سے لے رہی ہوں۔" عدینہ کے سرسری انداز پر آپا کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"وجہ پوچھ سکتی ہوں....؟" انہوں نے بمشکل خود کو مشتعل ہونے سے روکا۔

"ظاہر ہے' مجھے نیند نہ آنے کا پرابلم ہے' اسی وجہ سے لے رہی ہوں۔" عدینہ نے منہ بنا کر وضاحت کی تو آپا صالحہ نے شکایتی نگاہوں سے بے بے کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں 'آپ نے اپنی لاڈلی کے تازہ انداز دیکھے ہیں۔

"عدینہ پتر! میرے پاس آ کر بیٹھو ذرا۔" بے بے نے شفقت بھرے انداز سے اسے پکارا تو وہ خاموشی سے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"میری دھی رانی کو نیند کیوں نہیں آتی؟" انہوں نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے پوچھا۔

"بیٹے تو پڑھائی کی ٹینشن تھی بے بے ٹینشن....." وہ ہلکا سا جھجک کر بولی۔ آپا صالحہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"لیکن پچھلے پندرہ دن سے تو دل میں عجیب سی بے چینی اور پریشانی ہے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔" عدینہ نے صاف گوئی سے کہا' کمرے میں موجود دونوں خواتین سمجھ سکتی تھیں کہ پندرہ دن پہلے ہونے والا عبداللہ کی موت کا سانحہ اس کے ذہن پر سوار تھا۔ وہ اس سے نکل نہیں پا رہی تھی۔

"موت برحق ہے بیٹا اور ہر انسان کو اپنے وقت پر جانا ہے۔ اللہ کے فیصلوں میں راضی ہونے میں ہی عافیت ہے۔" بے بے نے اسے دلاسا دیا تو عدینہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"تم اپنے میڈیکل کالج کب جا رہی ہو....؟" آپا صالحہ کا مزاج بے بے سے بالکل مختلف تھا' وہ عموماً بات کرتے ہوئے سامنے والے کے احساسات و جذبات کا خیال کم ہی کرتی تھیں' اس وقت بھی ان کا دو ٹوک انداز عدینہ کو آگ ہی لگا گیا۔ وہ غصے سے کھڑی ہوئی۔

"مجھے اب میڈیکل کالج نہیں جانا۔" عدینہ کا لہجہ حتمی اور انداز خاصا باغیانہ تھا۔ آپا صالحہ کے ساتھ ساتھ بے بے کو بھی شاک سا لگا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا....؟" آپا صالحہ بوکھلا سی گئیں۔

"میں فیصلہ کر چکی ہوں' مجھے اب ڈاکٹر نہیں بننا اور میں اس سلسلے میں کسی کی بھی نہیں سنوں گی' اس لیے مجھ سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی جائے۔" عدینہ نے خاصے نڈر' بے باک اور ضدی لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ آپا صالحہ کو لگا جیسے کمرے کی چھت پر لگے سارے گاڈر ایک دم ان کے سر پر تن گرے ہوں۔ وہ مٹی' اینٹوں اور سیمنٹ کے انبار کے نیچے زمین میں دھنستی ہی چلی جا رہی ہوں....

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

آپ لوگوں کے کہے پر ہی اکھڑ جاتے ہیں
لوگ تو جھوٹ بھی سو طرح کے گھڑ جاتے ہیں

آنکھ کس طرح کھلے میری کہ میں جانتا ہوں
آنکھ کھلتے ہی سبھی خواب اُجڑ جاتے ہیں

غم تمہارا نہیں جاناں ہمیں دکھ اپنا ہے
تم بچھڑتے ہو تو ہم خود سے بچھڑ جاتے ہیں

لوگ کہتے ہیں کہ تقدیر اٹل ہوتی ہے
ہم نے دیکھا ہے مقدر بھی بگڑ جاتے ہیں

وہ جو حمیدہ مرے منکر تھے مرے ذکر پہ اب
چونک اُٹھتے ہیں کسی سوچ میں پڑ جاتے ہیں

حمیدہ قریشی

عدم سے جانب ہستی تلاشِ یار میں آئے
کھلی آنکھیں تو دیکھا، وادیٔ پُر خار میں آئے

یقین ہے کچھ نہ کچھ رحمت مزاجِ یار میں آئے
ادب سے ہاتھ باندھے ہم تیرے دربار میں آئے

اگر بخشے زہے رحمت! نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

نہ پوچھو اہلِ محشر ہم سے دیوانہ کی بے تابی
یہاں مجمع ستایاں بھی تلاشِ یار میں آئے

عدم کے جانے والو بزمِ جاناں تک اگر پہنچو
ہمیں بھی یاد رکھنا ذکر جو دربار میں آئے

خواجہ حیدر علی آتش

فیشن

دادی اماں نے فیشن کے شوق میں بال کٹوا دیے۔ انہوں نے بالوں کو سنوارتے ہوئے جھٹکا دیا اور اپنی پوتی سے پوچھا۔

"کیا اب میں تمہاری بوڑھی دادی اماں لگتی ہوں؟"

"ہرگز نہیں' اب تو آپ دادا ابا لگتی ہیں۔" پوتی نے کہا۔

ثمینہ عظمت شاہ۔ میانوالی

بچت

"تمہیں پتا ہے' مہنگائی کس قدر بڑھ گئی ہے۔ ہر چیز میں آگ لگی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟"

"ہاں... وہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو' مگر اس وقت تم مہنگائی کا رونا کیوں رو رہے ہیں۔ میں نے تو تم سے کوئی فرمائش بھی نہیں کی۔" بیوی نے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اگلے مہینے تمہاری سالگرہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس مرتبہ ہم خریداری کچھ کم کریں۔" شوہر نے کہا۔

"ٹھیک ہے' اس مرتبہ ہم جب خریداری کے لیے چلیں گے تو سالگرہ کی موم بتیاں کچھ کم خریدیں گے۔" بیوی نے جواب دیا۔

عائشہ ممتاز صدیقی۔ کراچی

دفتر

ایک سرکاری ملازم ناشتا کرنے کے لیے میز پر بیٹھا تو گھنٹہ بھر تک اخبار ہی پڑھتا رہا۔ پھر اخبار سے نظریں اٹھائے بغیر اس نے آواز دی۔

"چائے لاؤ۔"

"چائے تو میں لے آتی ہوں۔" اس کی بیوی نے جواب دیا۔ "مگر آج آپ کو وقت کا خیال ہے یا نہیں! کیا دفتر نہیں جائیں گے؟"

"دفتر!" وہ چونک کر بولا۔ "یا اللہ! میں تو اپنے دفتر میں چائے منگوا رہا تھا۔ یہ گھر کیسے پہنچ گیا۔"

امریکہ

ایک امریکی لڑکی نے شام اپنے نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ گزارنے کے بعد اپنی سہیلی کو بتایا۔

"اف! کچھ پوچھو نہیں کیسا بور ہے وہ' دو گھنٹے میں نے اس کے ساتھ گزارے اور اس وقفے میں چھ بار مجھے اس کے تھپڑ رسید کرنا پڑے۔"

سہیلی بولی۔ "اوہ! کیا بدتمیزی کی تھی اس نے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "کچھ نہیں' تھپڑ تو میں نے اس کے یہ دیکھنے کے لیے رسید کیے تھے کہ وہ جاگ رہا ہے یا نہیں۔"

شمع حسام۔ سلانوالی

نصیحت

لڑکے کی سولہویں سالگرہ پر باپ نے اسے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔

"وعدہ کرو' اگر تم سگریٹ پینا شروع کرو گے تو سب سے پہلے مجھے بتاؤ گے اور یہ خبر مجھے پڑوسیوں کے ذریعے نہیں ملے گی؟"

لڑکے نے فرماں برداری سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سگریٹ پینا ہرگز شروع نہیں کروں گا۔ دو سال پہلے میں نے بڑی مشکل سے اس سے پیچھا چھڑایا ہے۔"

ندا یوسف۔ کراچی

انتظام

ایک مریض سے اس کے دوست نے پوچھا۔
"یہاں اسپتال میں تمہارے ہائی بلڈ پریشر کی روک تھام کے لیے کیا انتظام کیا گیا ہے؟"
مریض نے جواب دیا۔ "ایک بوڑھی نرس کا۔"

موضوع

تھامس ایڈیسن ایک بار چند دوستوں میں پھنس گیا۔ اسے جلدی بھی تھی کہ وہ اپنی تجربہ گاہ پہنچ سکے اور وہ مسلسل جانے کی کوشش میں تھا کہ کسی نے پوچھا۔
"مسٹر ایڈیسن! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کیا آپ بتائیں گے کہ ان دنوں کس موضوع پر آپ کام کر رہے ہیں؟"
"اپنے باہر جانے پر۔" ایڈیسن نے بے خیالی سے کہا۔

ثبوت

ایک وکیل نے عدالت میں جج سے کہا۔
"جناب! میں آپ سے درخواست کروں گا کہ میرے موکل کے مقدمے کی دوبارہ سماعت شروع کی جائے۔ میرے علم میں ایک نیا ثبوت آیا ہے۔ جس سے اس مقدمے میں جان پڑ سکتی ہے۔"
جج نے پوچھا۔ "کیسا ثبوت؟"
وکیل نے جواب دیا۔ "اس بات کا ثبوت کہ میرے موکل کے پاس ابھی میں ہزار روپے اور ہیں۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

انکوائری

کوئٹہ میں رہنے والے ایک صاحب بلوں کی ادائیگی میں بڑے لاپروا تھے۔ کبھی ان کی بجلی کٹ جاتی، کبھی فون کٹ جاتا، کبھی گیس اور کبھی پانی۔
ایک بار موسم سرما میں انہوں نے پانی کی ٹونٹی کھولی تو پانی نہیں آیا۔ پانی کے محکمے کو فون کر کے بولے۔
"بھائی صاحب! ذرا ریکارڈ چیک کر کے بتائیے گا کہ میرا پانی کٹ گیا ہے یا سردی کی وجہ سے پائپوں میں جم گیا ہے؟"

موقع

ایک صاحب کا کتا بہت سمجھ دار تھا۔ اسے جو کام کہا جاتا، نہایت سعادت مندی سے کرتا۔ ایک مرتبہ دونوں پارک میں بیٹھے تھے کہ مالک کے پاس سگریٹ ختم ہو گئے۔ اس نے سو کا نوٹ کتے کو دے کر سگریٹ لینے بھیج دیا۔ کتا ایک گھنٹے تک واپس نہ آیا تو مالک اس کی تلاش میں نکلا۔ کافی دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد اس نے دیکھا۔ کتا ایک ریستوران میں بیٹھا چکن تکہ کھا رہا تھا اور کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔
مالک نے غم زدہ لہجے میں شکوہ کیا۔ "اس سے پہلے تو تم نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ میں نے جو کام بھی کہا وہ تم نے نہایت ذمے داری سے کیا۔ یہ آج تمہیں کیا ہو گیا؟"
کتا اطمینان سے بولا۔ "اس سے پہلے آپ نے کبھی پیسے میرے ہاتھ میں نہیں دیے تھے نا۔"

دیانت داری

"سنا ہے، افضل صاحب نے بینک سے پچاس کروڑ کا جو قرضہ لیا تھا، وہ واپس کر دیا۔"
"جی ہاں! انہوں نے پچھتر کروڑ مزید قرض کی درخواست دی تھی۔ اس میں سے پچاس کروڑ واپس دے کر صرف پچیس کروڑ دھر لیے گئے۔"

شگفتہ جاوید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن ابو ربیعہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے غزوہ حنین کے موقع پہ تیس ہزار یا چالیس ہزار قرض لیا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم (غزوہ سے واپس) تشریف لائے تو انہیں قرض ادا کر دیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تیرے گھر بار میں اور تیرے مال میں برکت عطا فرمائے۔ اور دعا کا بدلہ (قرض کی) ادائیگی اور شکریہ ادا کرنا ہے۔"

(بخاری)

فوائد و مسائل:۔

ضرورت کے وقت قرض لینا جائز ہے۔ اچھے طریقے سے ادائی کا مطلب یہ ہے کہ بر وقت ادائی کی جائے۔ جیسی چیز لی ہو، اس سے بہتر ادا کرنا بھی حسن اخلاق میں شامل ہے لیکن اگر یہ پہلے سے طے ہو اور قرض خواہ اس کا مطالبہ کرے تو یہ سود ہے جو بہت بڑا گناہ ہے۔ قرض ادا کرتے وقت قرض خواہ کو دعا میں دینا اور اس کا شکریہ ادا کرنا بھی اچھے طریقے سے ادائی میں شامل ہے۔

حضرت عمرؓ کی تواضع اور ہمدردی،

حضرت ہشام بن خالد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب کو (عورتوں سے) یہ کہتے ہوئے سنا۔

"جب تک پانی گرم نہ ہو جائے تم میں سے کوئی عورت آٹا نہ ڈالے اور جب پانی گرم ہو جائے تو تھوڑا تھوڑا کر کے ڈالتی جائے اور ڈوئی سے اس کو ہلاتی جائے اس طرح اچھی طرح مل جائے گا اور ٹکڑے ٹکڑے نہیں بنے گا۔

تسلی،

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے بیٹے کی وفات پر تسلی دی تو فرمایا: اگر (بیٹے کے جانے پر) آپ کو رنج و صدمہ ہے تو یہ رشتہ داری کا تقاضا ہے اب اگر آپ صبر کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کے بیٹے کا بدل عطا فرمائیں گے۔ اور آپ کو اجر و ثواب ملے گا اور اگر شکوہ کریں گے تو بھی تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہے گا لیکن آپ کو گناہ ہو گا۔

چار بادشاہوں کے مقولے،

ابو بکر بن ابا شی نے فرمایا۔

"چار بادشاہوں نے سوچ سمجھ کر بولنے کے متعلق اپنے اپنے زمانے میں یکساں باتیں کیں۔

کسریٰ نے کہا۔ "میں نہ بولنے پر کبھی نادم نہیں ہوتا۔"

شاہ چین نے کہا۔ "جب تک میں نے بات نہ کہی، اس وقت تک میں اس کا مالک ہوں اور کہنے کے بعد اس کا مالک تو ہے۔"

قیصر روم نے کہا۔ "جو بات میں نے کہی نہیں، اس کے لوٹانے پر زیادہ قادر ہوں۔ بمقابلہ اس کے جو کہہ دی۔"

شاہ ہند نے کہا۔ "وہ شخص قابل تعجب ہے جو عجلت کے ساتھ اپنی بات کہہ دے کیونکہ اگر وہ بات پھیل گئی تو نقصان ہو گا۔ نہ پھیلی تو کچھ فائدہ نہیں۔"

نخبہ اکرم۔ گکھڑ گوجرانوالہ

بد گمانی،

جب انسان بد گمانی کا شکار ہوتا ہے تو اسے ہر

شخص چور، بے ایمان، بدفطرت اور بدکردار دکھائی دینے لگتا ہے۔

(اشفاق احمد)

نمرہ، اقراء۔ کراچی

جوتا،

حضرت شیخ جنید بغدادی کا فرمان ہے۔
حسن اخلاق چار چیزوں کا نام ہے۔ سخاوت، الفت، نصیحت اور شفقت۔
آپ نے فرمایا: ”مجھے فصیح و بلیغ جوتے سے بدکار بچے کی صحبت زیادہ پسند ہے۔“

تحریم۔ گوجرہ

اچھا دوست،

اچھا دوست جتنا بھی برا بن جائے اس سے دوستی نہ توڑنا کیونکہ پانی جتنا بھی گندا ہو، آگ بجھانے کے کام آتا ہے۔

(حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

شازیہ گل۔ بہاول نگر

فیصلہ،

فیصلے کا لمحہ بڑا مبارک لمحہ ہوتا ہے۔ زندگی میں بار بار یہ لمحات نہیں آتے۔ صحیح وقت پر مناسب فیصلہ ہی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔
اگر غلطی سے کوئی غلط فیصلہ بھی ہو جائے تو اس کی ذمہ داری سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے فیصلے اپنی اولاد کی طرح ہی ہوتے ہیں، ان کی حفاظت تو کرنا ہوگی۔
دنیا کی تاریخ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ تاریخی فیصلے اکثر غلط فیصلے تھے لیکن تاریخی تھے۔
تقدیر اپنا بیشتر کام انسانوں کے اپنے فیصلے میں ہی مکمل کر لیتی ہے۔ انسان راہ چلتے چلتے دوزخ تک جا پہنچتا ہے یا وہ فیصلے کرتے کرتے بہشت میں داخل ہو جاتا ہے۔ بہشت یا دوزخ انسان کا مقدر ہے۔

لیکن یہ مقصد انسان کے اپنے فیصلے کے اندر ہے۔
(واصف علی واصف)
امبر گل۔ جھڈو (سندھ)

چند باتیں، عظیم لوگوں کی،

- ضرورت بزدل کو بھی بہادر بنا دیتی ہے۔
(سالسٹ)
- آنسوؤں کو بہہ جانے دو، یہ غموں کو مایوسیوں میں تبدیل ہونے سے روک سکتے ہیں۔ (لی ہنٹ)
- طنز وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ (سوئفٹ)
- ہم برف کے گھروندے بناتے ہیں اور جب وہ پگھلتے ہیں تو ہم رونا شروع کر دیتے ہیں۔
(سر والٹر اسکاٹ)
- وہ آدمی عظیم ہے جو اپنا کام چلانے کے لیے دوسروں کے دماغوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (بہاٹ)
- یہ کتنی انوکھی بات ہے کہ چھوٹے بچوں کو پہلے تو ہم بولنے کی ترغیب دیتے ہیں اور پھر ان کو ڈانٹتے ہیں، خاموش ہو جاؤ۔ (جیو ریٹ)
- عقلمند لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ بے وقوف اب کیا کہنے والا ہے۔ (برائٹ)
- فلسفہ چنبیلی کی بیل پر گلاب کا پھول۔
(لارڈ منکیرانٹ)
- بے محل ہنسنا، غیر ضروری گفتگو کرنا اور غلط جگہ بیٹھنا بے وقوفی ہے۔ (بیومانٹ)
- ان کے لیے دنیا ایک طربیہ ہے۔ جو سوچتے ہیں ان کے لیے ایک المیہ ہے جو محسوس کرتے ہیں۔
(اول آف آرفورڈ)
- مغموم اور بوڑھی زمین تم سے صرف ہنسی ہی مستعار لے سکتی ہے۔ غم تو اس کے پاس پہلے ہی بہت ہیں۔
(ولکوکس)
سیدہ نسبت زہرا۔ کبیر والا

خوشی دینے میں ہے،

احتشام اور اس کے ماموں کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ ایک دن وہ کھیت کے قریب سے گزرے تو دیکھا کہ کسی کے غریب کسان کے جوتوں کا جوڑا راستے میں پڑا ہوا ہے۔

احتشام کو شرارت سوجھی۔ اس نے اپنے ماموں سے کہا کہ ہم اس مزدور کے جوتے چھپا دیتے ہیں۔ پھر چھپ کر اس کی پریشانی اور گھبراہٹ کو دیکھتے ہیں۔ مزا آئے گا۔

ماموں نے کہا: "نہیں ہم اس کے جوتوں میں ایک ایک نوٹ رکھ دیتے ہیں پھر چھپ کر اس کا رد عمل دیکھتے ہیں۔"

احتشام نے ایسا ہی کیا۔ اور دونوں جھاڑی میں چھپ کر مزدور کا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد مزدور اپنا کام ختم کر کے آیا۔ اس نے پاؤں جوتے میں ڈالا تو اسے کچھ محسوس ہوا۔ اس نے پاؤں باہر نکال کر دیکھا تو پچاس روپے کا نوٹ پایا۔ وہ بہت حیران ہوا۔ پھر دوسرے جوتے میں پاؤں ڈالا تو مزید حیران و پریشان رہ گیا۔ اس میں بھی پچاس روپے کا نوٹ تھا۔

وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ بے اختیار ہاتھ اٹھا کر اس ان دیکھے محسن کو دعائیں دینے لگا۔

یہ سارا منظر دیکھ کر احتشام کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

ماموں نے کہا: "کیا اس سے زیادہ خوشی تم ابھی اس ترکیب سے حاصل کر سکتے تھے کہ اس کے جوتے چھپا دیتے۔"

احتشام نے کہا۔

"آج مجھے ان الفاظ کے معنی سمجھ میں آتے ہیں جو آج سے پہلے معلوم نہیں تھے کہ جو مزہ اور سکون دوسروں کی مدد کرنے میں ہے وہ ستانے میں نہیں ہے۔"
عذرا ناصر۔ کراچی

نبیلہ گیلانی ——— کہروڑ پکا

زبان پر جو بے ساختہ آ گئے
ان الفاظ میں تاثیر تھی
محبت تھی سچی بھی تو کیا تھی وہ
تمہیں ورغلانے کی تدبیر تھی

نمرہ، اقراء ——— کراچی

رازِ دل نہ سنانا کسی کو ساغر
دُنیا میں سب ہمراز بدل جاتے ہیں
کسی سے بچھڑنے سے کوئی مر تو نہیں جاتا
ہاں مگر جینے کے انداز بدل جاتے ہیں

آسیہ جاوید ——— (بارہ دری، علی پور چٹھہ)

کتنے عجیب دور میں جینا پڑا ہے مجھے
شیشے کے ہیں مکان پتھر کے آدمی

اسماء جمیل ——— لاہور

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہے لیکن بے ذوق نہیں راہی

شازیہ گلزار ——— بھکر

میرے لفظوں کو اتنی شدت سے نہ پڑھا کرو
کچھ یاد رہ گئے تو بھول نہیں پاؤ گے

خزیمہ ریاض ——— گجرات

عجب مرد کی شان بے نیازی ہے کہ
کسی کے اُن سے اطوار نہیں ملتے
تشنہ لب رکھتا ہے شکوہِ دل
کاش ہم اُن سے پہلی بار نہیں ملتے

گیلانی سسٹرز ——— کہروڑ پکا

یاد آتا ہے سکوتِ شب میں اکثر وہ مجھے
کھینچ لاتا ہے میرے اندر سے وہ باہر مجھے
کچھ خبر لے آؤ، فروری کی بارشو
اب بہت سُونا لگے اس کے بنا گھر مجھے

ملائکہ کوثر ——— بسم اللہ پور

میری روح میں جو اُتر سکیں وہ محبتیں مجھے چاہئیں
جو سراب ہوں نہ عذاب ہوں وہ رفاقتیں مجھے چاہئیں
انہیں ساعتوں کی تلاش ہے، جو کیلنڈر سے اُتر گئیں
جو سمے کے ساتھ گزر گئیں وہی فرصتیں مجھے چاہئیں

نسیم انجم ——— قصور

یہ عجیب صورتِ حال ہوتی جاتی ہے
رات کے بعد جہاں رات ہوتی جاتی ہے
وہ تو اب بھی مکمل ہے کسی پتھر کی طرح
ریزہ ریزہ میری ذات ہوتی جاتی ہے

زوباریہ خالد ——— لاہور

تیری یادوں سے بچ نکلوں مجھے ترکیب دے کوئی
میری جانب سے ہر رستہ تیری جانب نکلتا ہے

امبر گل ——— جھڈو (سندھ)

گردشِ دوراں، زمانے کی نظر، آنکھوں کی نیند
کتنے دشمن ایک رسمِ دوستی سے ہو گئے
زندگی آگاہ تھی صیاد کی تدبیر سے
ہم اسیرِ دامِ رنگ اپنی خوشی سے ہو گئے

عائشہ خان ——— ٹنڈو محمد خان

فیصلے کی رات ہے اور لب خاموش ہیں
ایسا بھی کیا ہو گیا، کہ سب خاموش ہیں
اپنی صفائی میں بھی سبھی نے کچھ نہ کچھ کہا
بات مجھ پہ آئی ہے تو سب خاموش ہیں

عنیزہ علوی ——— ہالہ

ہم نے تمہارے بعد نہ رکھی کسی سے آس
اک تجربہ بہت تھا، بڑے کام آ گیا

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں

آپ کی عافیت ' سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط بفدیہ ٹاؤن کراچی سے عائشہ جمیل کا ہے' لکھتی ہیں۔

ماڈل کافی خوش شکل اور پیاری سی تھی مگر۔۔۔ ہاں اگر بالوں کو تکلفے سے نہ سہی پر ہاتھوں سے ہی درست کر لیتی تو مزید پیاری لگتی ۔ فہرست پہ نگاہ دوڑائی تو مدر ڈے کے لحاظ سے کوئی اسپیشل عنوان ہی نظر نہ آیا۔
حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد پیارے نبی کی پیاری باتوں نے ایمان میں مزید اضافہ کیا۔
روبرو میں کیہ احمد کے جوابات بہت اچھے لگے۔
سنجیدہ صورت والی روبینہ اشرف سے بندھن میں ملاقات خوب رہی۔ انہیں اسکرین پر دیکھنے والے بچے بھی اب بڑے ہو گئے مگر سدا بہار روبینہ تب بھی ویسی ہی ہیں اور معروف و سدا بہار شخصیت فیصل قریشی سے بھی مل کر اچھا لگا۔
"تاریخ کے جھروکوں سے" کا سلسلہ غائب۔ کیوں بھئی ؟

ناولٹ "سیاہ حاشیہ" سائمہ اکرم کا بہت ہی دلچسپ ناولٹ لگ رہا ہے۔ "رقص بسمل" انتہائی نازک موڑ پر ہے "خواب تھا کوئی" عنوان کی طرح کہانی کا اینڈ پرفیکٹ لگا۔ "یہ زندگی کتنی حسین" راشدہ رفعت کا مکمل ناول اور "چاند میری پوکھٹ پر" سحرش خان کا مکمل ناول دونوں ہی زبردست تھے اپنی اپنی جگہ ۔ افسانوں میں تمام ہی افسانے بہت اچھے تھے۔ مگر "سانجھ اور دھند" دونوں نے زیادہ متاثر کیا۔
ج : پیاری عائشہ! آپ کا خط شامل اشاعت ہے اور ایک خوش خبری آپ کو سنا دیں۔ آپ کی کہانی "ہمیں" قابل اشاعت ہے۔
سعدیہ ام نعیم ' صبا ' ماریہ اور مائرہ ضلع چنیوٹ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں ؟

میرے گھر میں نہ ٹی وی ہے نہ کمپیوٹر اور نہ ہی موبائل فون۔ نہیں۔ میں چاند پر نہیں رہتی۔ لے دے کر ایک رسالہ کا ہی آسرا ہے اس دفعہ رسالہ پڑھ کر میرا غم و غصے سے برا حال ہو گیا وجہ تاریخ کے جھروکوں سے نہ پڑھ کر روبینہ اشرف سے بندھن کیسے آپ نے ملاقات کرا دی بہت اچھا لگا۔ باقی رسالہ ذرا بھی پسند نہیں آیا۔ خدارا نئی رائٹرز کو لے کر رسالے کا معیار بحال مت کریں۔
فائزہ افتخار ' شمرو بخاری ' ماہا ملک ' راحت جبیں ' سائرہ رضا کو صدا دے کربلا میں وہ جہاں بھی ہیں خدارا لوٹ آؤ ورنہ ورنہ ورنہ۔۔۔ میں کیا کر سکتی ہوں ؟
ج : بہت پیاری اور عزیز دوستو! شعاع کے مئی کے شمارے میں جن مصنفین کی تحریریں شامل ہیں' ان میں رخسانہ نگار عدنان ' نگہت سیما ' راشدہ رفعت ' سائمہ اکرم اور نوشین ناز اختر کا شمار نئی مصنفین میں نہیں کیا جا سکتا۔
اور اس بات سے تو آپ اتفاق کریں گی کہ نئی رائٹرز کی صلاحیتوں کو بھی سامنے آنے کا موقع ملنا چاہیے۔ سائرہ

رضا کا طمس ناول شامل ہے اور دیگر مصنفین کو ہم بھی آپ کے ساتھ صدا دے رہے ہیں کہ وہ لوٹ آئیں ہم انہیں بہت یاد کرتے ہیں۔

شمائلہ شریف نے کھڈیاں خاص قصور سے لکھا ہے

اس مہینے کا ٹائٹل سب سے اچھا لگا۔ سب سے پہلے پیارے نبی کی باتیں پڑھیں۔ روبرو میں سمیرا حمید کو پڑھا۔ کارس کو لاہور میں لانے کا خیال تو بہت ہی اچھا لگا۔ کارل مائی فیورٹ۔

رخسانہ جی "ایک تھی مثال" کو جلدی آگے بڑھائیں، اور قسط بھی بہت کم ہوتی ہے ہر بار۔ قرۃ العین خرم کی "سانجھ" ایک بہترین کاوش تھی۔ مرگ سیاہ پڑھ کے عجیب سی احساسات تھے۔

سائمہ جی آپ ایک بار پھر کمال کرنے والی ہیں۔ مکمل ناول اس مہینے بس وہی روایتی سے لگے۔ بس شہرام کا کردار اچھا لگا۔ نبیلہ عزیز صاحبہ بہت معذرت کے ساتھ "رقص بسمل" بالکل بھی امپریس نہیں کر رہا شروع سے ہی اور قسط بھی انتہائی غیر دلچسپ، غصہ ہی چڑھتا ہے۔ نوشین ناز اختر کی "وحشد" بہت ہلکی پھلکی مگر ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ دلا گئی۔ غزلوں میں ڈاکٹر طاہر مسعود کی "میں کیوں کسی کا نہ ہو سکا" بہت بہت پسند آئی۔

ایک درخواست تھی کہ دستک میں ان فنکاروں کے بجائے رائٹرز یا پھر سیلف میڈ لوگوں کے انٹرویوز کریں جنہوں نے کچھ نام بنایا اپنی محنت سے۔

پیاری شمائلہ! آپ کا تبصرہ اور تجویز دونوں ہی ہمیں بہت پسند آئیں۔ شاہین رشید تک آپ کی تجویز پہنچا رہے ہیں۔ خط لکھنے کا بے حد شکریہ۔

عظمیٰ شفیق نے جڑانوالہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سب سے پہلے پیارے نبی کی پیاری باتوں سے مستفید ہوئے۔ میری فیورٹ راشدہ رفعت نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سحر طاری کیے رکھا۔ "سیاہ حاشیہ" بھی مجھے تو پسند نہیں آیا۔ "رقص بسمل" کو بند کر دیں۔ افسانہ "سانجھ" پڑھ کے آخر میں ایلی، جمیلہ پہ بے حد پیار آیا۔ ایمل رضا اور سحرش خان کی تحریروں نے انسپائر نہیں کیا۔ محبت سیما کا ناول اف فنڈا مینٹل اور امیزنگ۔ دل کو چھو گیا۔ نوشین ناز کا افسانہ وحشد ایک حصہ پڑھ کر چھوڑ دیا بھئی ظاہر ہے اچھا نہیں لگا ذیشان سحر سلیم نے لیے میں کسوں کی فارہ کی موت کے باوجود اس پہ غصہ آیا مجھے تو دونوں بہنیں ہی عقل سے پیدل تھیں۔ فارہ نے فاخر کے شیطانی خیالات اپنی ماں سے کیوں چھپائے؟ اور حاجرہ کا گھر سے ہی نکل جانا مسئلہ کا حل قطعاً نہ تھا۔ ایک لڑکی چاہے کسی بھی ذلت کا شکار کیوں نہ ہو گھر کی چار دیواری ہی میں وہ دنیا کی رسوائی سے بچ سکتی اور پھر والدین کی عزت کی دھجیاں کون سی بچ گئی؟ فارہ کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔

ن: پیاری عظمیٰ! آپ کا خط بہت اچھا لگا اگرچہ کہ تنقید زیادہ ہے اور تعریف کم۔

ہم آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ پرچے کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ "سیاہ حاشیہ" کہانی میں آگے چل کر بہت دلچسپ موڑ ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آئندہ کچھ قسطوں کے بعد آپ کی رائے بدل جائے گی۔

"رقص بسمل" کے ساتھ ایک بڑی بدقسمتی یہ رہی ہے، کہ جب سے نبیلہ نے اس ناول کا آغاز کیا ہے وہ کسی نہ کسی پریشانی کا شکار ہیں۔ پہلے خود بیمار رہیں پھر ان کی بیٹی کی طبیعت خراب رہی اور اب ان کی پھوپھی ہسپتال میں ہیں۔ ان حالات میں وہ ناول پر پوری طرح توجہ نہیں دے پا رہیں۔ آپ دعا کریں کہ نبیلہ حالات کے اس گرداب سے نکل آئیں۔

تہمینہ رؤف نے بنوں سے لکھا ہے

سرورق بہت خوب صورت ماڈل کا آئی شیڈ بہت پیارا، خواب تھا کوئی! واقعی ہمارے لیے بھی خواب تھا کوئی۔ بے زندگی حسین، راشدہ رفعت کا نام ہی کافی تھا بس "چاند میری چوکھٹ پر" سحرش خان کی عمدہ کاوش "ایک تھی مثال" رخسانہ جی مثال اور ہم پر بھی رحم کیجیے! "رقص بسمل" نبیلہ عزیز آپ اتنا بے دلی سے کیوں لکھ رہی ہیں؟ افسانے ہمیشہ کی طرح اچھے رہے۔ ایمل رضا نے بہت جلد ہمارے دلوں میں گھر کر لیا ہے "سانجھ اور وحشد" کا جواب نہیں "بندھن" میں مدیحہ اشرف کے جواب اور انٹرویو بہت اچھے لگے "روبرو تو ہے ہی پسندیدہ اور کیوں ہے۔۔ بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔ سمیرا حمید جو ہیں ہمارے روبرو ہماری اپنی اور بہت ہی پیاری۔ اب آتی ہوں اصل اور اہم بات کی طرف! میں نے سنا ہے کہ ہماری اپنی سائرہ رضا۔۔۔ ہاں جی

ہماری وہی اپنی جنت جان سائرہ رضا والی وی کے لیے لکھ رہی ہیں۔ تو کیا سائرہ جی آپ بھی دوسری رائٹرز کی طرح....؟ نہیں کی نا بی بی جی....؟

اب کچھ اپنے بارے میں بتاتی چلوں خیبر پختون خوا کے ایک خوب صورت گاؤں میں رہتی ہوں۔ ہمارے گاؤں میں ہر طرح کی سہولت موجود ہے۔ اسکول، ڈسپنسری، میڈیکل اسٹور، جنرل اسٹور، بڑے بڑے باغات ہر قسم کے قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ ہمارا گاؤں۔ آپ اپنے خاندان کی میں وہ واحد لڑکی ہوں جس نے باقاعدہ ڈائجسٹ پڑھنے کی ہمت کی ہے اور شکر اللہ کا میرے وہ بابا جو ڈائجسٹ پڑھنا برا سمجھتے تھے۔ اب ان ہی نے پچھلی دفعہ کا خط میرا پوسٹ کروایا تھا۔ کون کہتا ہے کہ تبدیلی نہیں آئی ہے؟

خواتین اور شعاع نے سر سے لے کر پاؤں تک ہمیں بدل کے رکھ دیا ہے۔ شعور کی دنیا میں بٹھایا ہے۔ جس کی بدولت اب ہم بھی زندوں میں شمار ہونے لگے ہیں ورنہ اب تک تو.....

ج: پیاری تہمینہ! آپ کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جی ہاں تبدیلی آ رہی ہے اور بہت خوشگوار تبدیلی آ رہی ہے اور یہ تبدیلی چھوٹے شہروں اور گاؤں دیہات میں زیادہ نظر آتی ہے۔ بڑے شہروں کی نسبت چھوٹے شہروں میں ہمارا پرچا زیادہ پڑھا جاتا ہے اور ہمیں وہاں سے زیادہ اچھے جامع اور خوب صورت تبصرے موصول ہوتے ہیں۔ ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان ہر لحاظ سے مالا مال ہے۔ پاکستانی قوم بہت باصلاحیت اور ذہین ہے اور ہماری خواتین اور ذہین بھی کسی بھی ترقی یافتہ ملک کی خواتین سے کسی بھی لحاظ سے پیچھے نہیں ہیں۔ بس بات مواقع ملنے کی ہے۔ افسوس کہ ہمارے ہاں بااختیار لوگ اس قوم کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ آپ ہماری طرف سے اپنے بابا کا شکریہ ادا کریں۔ کاش ہمارے ہاں سارے والدین اپنی اولاد کی خوشیوں کا اسی طرح خیال رکھیں۔

آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں۔ قابل اشاعت ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔ سائرہ رضا وی کے لیے ضرور لکھ رہی ہیں لیکن وہ ہمیں ذرا فراغت نہیں دیتی ہیں۔

فوزیہ ثمرین اور ام ہانیہ عمران گجرات سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

سب سے پہلے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح معلوماتی تھیں۔ روبرو میں تمام سوالات بہت اچھے اور دلچسپ تھے۔ تیمرا صاحب کے اتنے اچھے ناول لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ سب قارئین نے ہر ایک سے ایک ہی سوال کیا کہ کیا ڈرامہ دوبارہ آئے گا۔ میرا تیمرا جی سے سوال ہے کہ کیا ڈرامہ دوبارہ آئے گا تو کیا آپ کردار کے ساتھ "عمرہ" نادیہ کے ساتھ۔ بیٹھک میں روبینہ اشرف سے ملاقات اچھی تھی۔ خواہش تھی۔ اک عرصے سے ان سے ملنے کی۔ عمرانہ کی ملاقات کا خاصی محنت کی ہیں۔ اپنی ذات سے ایک انچ نہ ہٹنے والی۔ "آرزو کے جھروکوں" میں بھی کسی ماہ حضرت زلیخا اور حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ضرور بیان کریں۔ "ایک تھی مثال" رخسانہ جی نے کچھوے کے ساتھ شرط لگا رکھی ہے کیا؟ مکمل ناول "چاند میری دسترس میں" اچھا لگا۔ ہیروئن کی سادگی اور معصومیت اچھی لگ رہی تھی۔ روحیل کا کردار ایک آنکھ نہیں بھایا ہے۔ زندگی کتنی حسین راشدہ رفعت کی تحریر کچھ خاص تو نہیں لگی۔ "خواب تھا کوئی" نگہت جی کے بارے میں کیا کہوں ہمیشہ اپنے لکھنے کا حق ادا کرتی ہیں۔ "سیاہ حاشیہ" "شازیہ" مجھے لگتا ہے عدینہ کی والدہ صاحبہ ہیں کیا ایسا ہی ہے۔ افسانے اس بار سارے کے سارے مزے کے اور سبق آموز تھے۔ اپریل کے ماہ میں کچھ معصوم سی بھابھیوں کی شان میں گستاخی ہوئی۔ اس کے لیے معذرت طلب کی آپ نے اور میں نے لفظ "تمام" کی تصحیح بھی کی ہے۔ پھر بھی گجرات شہر کی تمام کی تمام بھابھیاں اور ان کے حمایتیوں کو عظیم صدمہ پہنچا ہے۔ اس لیے برائے مہربانی ایک بار آپ یہ فرما دیں کہ نندیں بھی شیطان کی خالہ ہوتی ہیں تو شاید گجرات شہر کی بھابھیوں اور ان کے حمایتیوں کے کلیجوں میں ٹھنڈ پڑ جائے۔

ج۔ فوزیہ! آپ کے کہنے پر ہم نے بھابھیوں سے معذرت شائع کر دی ہے لیکن آپ نے ایک بار پھر غلطی کر دی اور بھابھیوں کے بچوں کو صدمہ پہنچا ہے لکھا تھا۔ ہم نے اس کی تصحیح کرنے بھابھیوں کے حمایتیوں

صائمہ اکرم کا نام ہی کافی ہے۔ اس ناول کی دوسری قسط نے ہی مجھے اپنے حصار میں قید کرلیا۔ شانزے کے ساتھ بار بار جو حادثہ ہو رہا ہے شاید قدرت شانزے کو یہ موقع دے رہی ہے کہ وہ "سیاہ حاشیہ" پار نہ کرے۔ ناول کا ٹاپک بہت ہی پاور فل ہے۔ افسانوں میں "سانجھ" بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔ "دھن" بھی بہت زبردست تحریر تھی۔ سارے ہی مستقل سلسلے پسند آئے۔

ج: پیاری مسرت! آپ نے ہم سے بے رخی اور بے اعتنائی کی شکایت کی ہے' ہم آپ سے بے رخی اور بے اعتنائی برت ہی نہیں سکتے۔ آپ تو شعاع کی ان قارئین میں سے ہیں جو ہر ماہ شعاع پڑھتی ہیں اور ہمیں باقاعدگی سے خط لکھتی ہیں۔ پچھلے ماہ ہم نے آپ کا خط شامل کیا تھا۔ لیکن صفحات کی کمی آڑے آئی اور وہ شامل نہ ہوسکا۔ آپ کو جاب کی مبارک باد۔

یہ خط کراچی سے عروج یوسف کا ہے' لکھتی ہیں

ایک ماہ انتظار کے بعد شعاع آتے ہی خوشی کا وہ احساس دل میں جاگتا ہے۔ جس کا آپ اندازہ نہیں کرسکتیں۔ کاش ایک رات آپ ایسا خواب دیکھیں جس میں آپ ایک عام سی خاتون ہوں جو دن رات اپنی مخصوص روٹین میں رہ رہی ہوں' کرایوں کی ٹینشن' پانی کی ٹینشن' سسرالیوں کی ٹینشن' شہر کے حالات کی ٹینشن۔ اور ایک لمبی فہرست اور ان ہی تھکاوٹ بھرے دنوں میں اچانک "شعاع" آتا ہے تو آپ خوشی سے جھوم جاتی ہیں پھر ٹائٹل کو پیار بھری (اور کبھی تنقید بھری) نظروں سے دیکھ کر جب اندرونی صفحات کھولتی ہیں تو.....؟ وہی تھکاوٹ جو آپ کے اردگرد تھی ان صفحات پہ منہ چڑا رہی ہوتی ہے جو آپ کی نظروں کے سامنے تھے تین' چار سلسلے وار ناولز اور کچھ کہانیاں مگر سب میں ایک بات مشترک ہے۔ تمام رائٹرز نے فلسفے کی ڈگری لے رکھی ہے جتنی باتیں ذرا رکھا ہے اور پھر آپ کی آنکھ کھل جاتی ہے ایک گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ کیسا ہلا دینے والا خواب ہے ناں؟ یہ وہ تکلیف دہ حقیقت ہے جس کا ہر ماہ بے شمار قارئین کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کتنا مشکل کام ہے لکھنا' قلم نکالنا اور پھر لکھنے کی محنت تو پھر میری پیاری رائٹرز اگر آپ محنت کر رہی ہیں تو اپنی صلاحیت کو مزیدار سا لکھنے میں لگائیں ناں وہ "عالیہ بخاری" کے کرم تھے

دنوں میں ٹھنڈک بھرے سکون کا احساس لیے بڑھ دے" وہ رفعت جبیں کی لینزا اور تمام ازاتی چلبلی ہیروئنز' شرارتی کزنز وہ فرحت اشتیاق کے کیئرنگ ہیرو۔ کبھی سسرالیوں کی نوک جھونک' کبھی دیورانی جٹھانی کی احساس بھری اپنائیت وغیرہ وغیرہ تو میری پیاری بہنوں پلیز ہمارے دل' دماغ پہ رحم کھایئے اور ہلکی پھلکی کہانیاں لکھیے تاکہ بیرونی حالات سے لڑنے میں زیادہ تھکاوٹ نہ ہو۔ اگر آپ کو یا میری پیاری ہی رائٹرز کو میری باتیں اچھی نہ لگیں تو معذرت' مگر سچ کچھ بہت زیادہ ادا س ہو رہا ہے۔ مزے مزے کی ... میں بھی کبھی شعر بھی اپنے لیے سوچتی ہوں ایک آپ کو سناؤں' بتایئے گا کیسا ہے؟

بچھ اس قدر حساس ہوگئی ہوں کہ اب تو میں
برف جواب کی تپش سے بھی پگھل جاتی ہوں

سوری لکھنے میں گڑبڑ ہوگئی اصل میں بھی بہت سی اور بھی الجھا پڑھتی ہوں آپ کو جو اچھا لگے پڑھ لیں۔ اب اجازت ہمارے لیے' ہمارے مظلوم شہر کے لیے اور بے چارے ملک کے لیے دعا کی درخواست ہے۔

ج: شہر مظلوم کے لیے تو آج سے نہیں پچھلے ڈھائی عشروں سے دعا کر رہے ہیں۔ شاید ہماری اپنی ہی کوتاہیاں اور غلطیاں ہیں' جو ہماری دعاؤں میں اثر نہیں رہا اور حقیقت بھی یہی ہے دعائیں بھی تب اثر کرتی ہیں جب عمل ساتھ ہو۔ اس شہر کے حالات تب بدلیں گے جب یہاں کے مکین خود بدلیں گے اور حالات کو بدلنا چاہیں گے۔ ورنہ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔

آپ کے خط کے ایک ایک لفظ سے متفق ہیں۔ ہم ہمیشہ اپنی مصنفین سے یہی درخواست کرتے ہیں کہ تصویر کا کوئی روشن پہلو بھی سامنے لائیں۔ کوئی اچھی سی کہانی جسے پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے ہم گرد و پیش سے نکل آئیں۔ اپنے گرد و پیش کو بھول جائیں۔ زندگی کے عذاب اپنی جگہ' زندگی میں خوش نما خواب بھی تو ہیں۔

قسط وار کہانیاں ہمیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ لیکن مجبوری ہے طوالت کی وجہ سے ایک قسط میں شائع کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

نمیو کنول نینی لکھتی ہیں

شعاع کی زیادہ تعریف لفظوں میں نہیں کروں گی بس یہ کہنا چاہوں گی کہ جب سے "جنت کے پتے" اس کے

ذریعے پڑھنے کا موقع ملا۔ نمرہ احمد نے دل و دماغ پر ایسے نقش چھوڑے کہ اس کے بعد لگتا تھا کچھ پڑھوں گی تو وہ نقش مٹ جائیں گے۔

مئی یا جون 2012ء میں جنت کے پتے کی آخری قسط تھی شاید اس کے بعد دو سال گزر گئے اب دو سال بعد جولائی 2012ء کا شعاع بازار سے بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر لائی ہوں کہ "جنت کے پتے" پر لوگوں نے جو رائے دی دیکھوں تو سہی وہ کیسی ہے۔ اور پھر اپنی رائے دینے کا بھی دل کیا۔

ج : نمیرہ! بہت حیران کیا آپ کے خط نے کوئی تحریر اچھی تھی تو آپ نے طے کر لیا کہ اس کے بعد کچھ نہیں پڑھنا بلاشبہ جنت کے پتے بہت اچھی تحریر تھی لیکن اس کے بعد بھی ہمارے ہاں اچھی تحریریں شائع ہوئی ہیں جو بے حد پسند بھی کی گئیں۔ خصوصاً "دیمک زدہ محبت" "من محرم" اور "یارم" ناول بہت پسند کیے گئے۔ خود نمرہ احمد "جنت کے پتے" کے بعد "نمل" لکھ رہی ہیں جو خواتین میں شائع ہو رہا ہے اور جنت کے پتے سے کسی بھی لحاظ سے کم نہیں ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ غزل کی اشاعت کے لیے معذرت۔

ستارہ آمین کومل وہیر محل سے لکھتی ہیں

شعاع سے بہت کچھ سیکھا۔ مسکرانا خوش رہنا۔ زندگی کے طور طریقے کی بات ہے شعاع نے ہی ہمیں ہر دم حوصلہ دیا، پیارا دوست بن گیا چاہے گرمیوں کی جلتی دوپہر ہو یا سردیوں کی یخ بستہ راتیں اس نے ساتھ نبھایا۔ اب بات کریں مئی کے شعاع کی۔ واہ کمال اس ماہ کے سرورق نے دل موہ لیا۔ فہرست پر نظر پڑی تو بلند بانگ چیخ ماری وجہ ہیں ہماری بھابھی نوشین ناز اختر جو بڑے عرصے بعد شعاع

میں آئی ہیں افسانہ لے کر سویٹ ون جیتی رہیں آپ ارے واہ بہن میری پیاری دوست ادی سحرش خان بھی مکمل ناول کے ساتھ تشریف لائی ہیں۔ شاباش زبردست کیپ اٹ اپ۔ "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم چوہدری جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ بہت زبردست تحریر۔ تمام افسانے، ناول بہت زبردست شاندار ہیں۔ نبیلہ عزیز اللہ جی آپ کی پھوپھی کو صحت و تندرستی عطا فرمائیں۔ ان پہ اپنا خاص
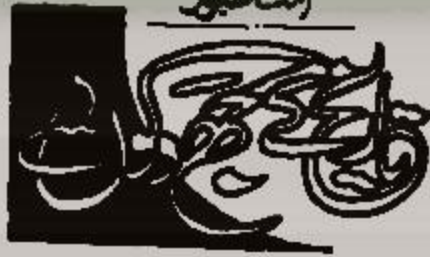
تین شہزادیوں کا حسین انتخاب

ایرانی شہنشاہیت کے خاتمہ کے بعد قیدیوں کو مال غنیمت سمیت مدینہ منورہ لایا گیا۔ لوگ قیدیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور پلک جھپکتے ہی تمام قیدیوں کو خرید لیا۔ صرف ایران کے بادشاہ یزدگرد کی تین بیٹیاں جو حسن و جمال کا پیکر تھیں۔ باقی رہ گئیں۔ جب انہیں فروخت کرنے کے لیے پیش کیا گیا تو ان کی آنکھیں زمین میں گڑ گئیں۔ حسرت و یاس سے ان کی آنکھوں سے آنسو برس نکلے۔ یہ دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں ان کے لیے ترس آگیا۔

حضرت علی رضی اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔

"اے امیر المومنین! بادشاہ کی بیٹیوں سے امتیازی سلوک ہونا چاہیے۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ "آپ سچ کہتے ہیں 'لیکن اس کی صورت کیا ہو؟"

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"ایک تو ان کی قیمت زیادہ لگائیں اور دوسرا ان کو اختیار دے دیں کہ یہ خود اپنی مرضی سے انتخاب کریں، جس پر یہ راضی ہو جائیں، ان کا ہاتھ اسے دے دیا جائے اور ان پر قطعاً "کوئی جبر نہ ہو۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تجویز کو نافذ کر دیا۔

ان میں سے ایک نے حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب کو پسند کیا۔ اس کے بطن سے حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر پیدا ہوئے جو اخلاق و کردار میں اپنے دادا سے مشابہ تھے۔

دوسری نے حضرت محمد بن ابوبکر صدیق کو پسند کیا اور اس سے قاسم بن محمد بن ابوبکر پیدا ہوئے جو سات فقہائے مدینہ میں سے تھے۔

تیسری نے آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے حضرت امام حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ کو پسند کیا اور حضرت امام زین العابدین کو جنم دیا۔

پارسی قوم

ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ بھارت میں پارسی آبادی مسلسل سکڑ رہی ہے اور سوا ارب آبادی والے ملک میں پارسیوں کی تعداد صرف 69 ہزار رہ گئی ہے۔ خبر کے مطابق یہ تعداد ایک فیصد سے بھی کم ہے۔

یقیناً" یہ ایک فیصد سے بھی کم ہے 'کیونکہ ایک ارب کا ایک فیصد ایک کروڑ ہوتا ہے 'جبکہ پارسی بے چارے تو ایک لاکھ سے بھی کم ہیں۔

تقریباً" تمام کے تمام پارسی ممبئی میں مقیم ہیں۔ دوسرے شہروں میں شاید اکا دکا موجود ہوں۔

پارسیوں کو روایتاً" آتش پرست کہا جاتا ہے۔ یعنی آگ کی پوجا کرنے والے اور یہ تصور کتابوں میں اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ عام لوگ اسی کو صحیح مانتے ہیں۔ حالانکہ پارسی ایک توحید پرست مذہب ہے، جو ایک خدا (اہورمزدا یعنی یزداں) کو مانتا ہے۔ اس مذہب کے بانی زرو آستہ زرتشت تھے جن کی تعلیمات کا خلاصہ اچھے خیالات' اچھے الفاظ اور اچھے عمل تھے۔ پارسیوں کی کتاب مقدس اوستا کا ایک حصہ ان ہی کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ وہ پیغمبر تھے۔

آگ کو وہ خدائے واحد کا مظہر مان کر اس کا صرف احترام کرتے ہیں اور ہر پارسی معبد یعنی آتش کدے میں آگ ہمیشہ روشن رہتی ہے۔

منتخب کہانیاں

مصنف: ویکوم محمد بشیر
ترتیب: سعود الحق
تبصرہ: آمنہ زریں

ہر شخص مختلف ہے۔ اور اس کے تجربات' احساسات بھی۔! یہ تنوع ہمیں حسن کہلاتا ہے۔ اور ہمیں ہر اختلاف کی بنا بنتا ہے۔ اس فرق کا تسلیم کرنا' اس کے جاننے سے ہمیں زیادہ مشکل ہے اور اسی مشکل نے دنیا کو بالعموم اور پاکستان کو بالخصوص دارالمشکلات بنا رکھا ہے۔

ہر وجود اپنا زمانہ دیکھنے کا مکلف ہے۔ مگر گزرے زمانے کو دیکھنے کا شرف حاصل کرنا اس کے اختیار اور پسند سے مشروط ہے۔ گزرے زمانے کو ٹائم مشین سے دیکھنے کا تخیل ابھی تک صرف فکشن نگاری اور فلم بنانے کے کام آسکا ہے۔

لیکن گزرے زمانے میں جھانکنے کے لیے خود ہمارا تخیل ٹائم مشین بن سکتا ہے۔! تاریخ اس کا ایک مشکل اور خشک ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور ہمارے ہاں اسے لازمی طور پر جاننے کا رجحان بدقسمتی سے پنپ نہیں سکا اور یہی وجہ ہے کہ ہر خاص موقع پر نیا غم تازہ کرنے سے پہلے' پاکستانی قوم کی بھلا دینے (فراموش کر دینے) اور معاف کرتے رہنے کی عادت پر نکتہ چینی بھی کی جاتی ہے۔

خیر۔ ہر منظر اپنا پس و پیش بھی ساتھ لیے پھرتا ہے۔ اور ان سے آشنائی جہاں منظر کی اہمیت کو بڑھاتی ہے' وہیں ہمارے فہم کو گہرائی' لطف اور نئے امکان بھی عطا کرتی ہے۔ اور ایسا کرنے کے لیے' جو واحد چیز مطلوب و مقصود رہتی ہے۔ توجہ ہے!

"سیرِ دو جہاں" کی شکر گزار ہوں۔ جس کی بدولت نئے نئے مقام دیکھنے کا لطف اور پھر اس میں آپ کو شریک کرنے کی کوشش ممکن ہوئی۔ اس سلسلے کی بدولت انتہائی مختلف چیزوں کے مطالعے کا تجربہ بھی ہوا۔ جن کو پڑھنے سے پہلے اس فرق کو محسوس کرنا ناممکن تھا۔ اور محض مطالعہ ہی اس کو ممکن کرنے کی توانائی فراہم کرتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب اپنی طرز کی انوکھی کتاب ہے۔ "منتخب کہانیاں" ہی کیوں اس کا نام ہوا۔ منتخب افسانے کیوں نہ ہوا؟! کتاب پڑھنے کے بعد آپ کو پتا چلتا ہے کہ کہانی کہنا کس قدر منفرد خوبی ہے!

افسانہ' مختلف احساسات اور واقعات کا بیانیہ ہو سکتا ہے۔ مشکل اور ناقابلِ فہم بھی۔ منفرد ہونے کے شوق تلے دبا ہوا بھی۔ قاری کی سمجھ میں آنے کی صلاحیت سے بے نیاز۔ اپنی ہی کہتا ہوا۔ لکھنے والے کے ذاتی رجحان اور رائے کا اعلانیہ بھی۔ پسند اور ناپسند' مختلف اور متنازع بھی۔!

لیکن کہانی۔!

واللہ کہانی سے محبت کے عالم کو سمجھنے کے لیے ایک بچے کا تخیل چاہیے۔! پھر کیا ہوا؟! جیسا تحیر زدہ سوال۔! اور پھر۔!

تحریر کی طاقت کا اندازہ' لکھنے والوں کی پیدائش اور موت کے وقفے' جس کا نام زندگی ہے' کے بعد گزر جانے والے زمانوں سے لگایا جا سکتا ہے۔! اور مزید یہ کہ ان تحریروں کے تراجم مختلف زبانوں کے ذریعے مختلف' لیکن پڑھنے والوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔

"ویکوم محمد بشیر" کا مختصر تعارف اس کتاب میں

شامل ہے، لیکن وہ اختصار ہی اس قدر بھرپور ہے کہ
آپ کو ان کی تحریر میں موجود سادگی مگر رعنائی۔ قدیم مگر
منفرد، وہی ٹمر۔ انوکھے پن جیسی ندرت کی وجہ سمجھ میں
آجاتی ہے۔

سادگی دراصل ایک ایسی نعمت ہے۔ جو دشواریوں
سے گزرے ہوئے لمحات کی دین ہوتی ہے اور یہی وہ
خوبی ہے جو فقیروں کو بھی سلطانی عطا کرتی ہے اور
سلطانی دراصل ہے کیا؟

بے نیازی!

"ویکوم" دراصل ان کے گاؤں کا نام تھا جسے اپنے
نام کا حصہ بنادیا۔ 1908ء میں پیدا ہونے والے محمد
بشیر نے چوراسی برس کی عمر پائی۔ اس عمر کو زندگی کرنے
میں، مختلف اور انوکھے کے تجربات نے مرحلہ وار ان کی
تخلیقی صلاحیتوں کو متاثر کیا اور یہی وہ اثرات تھے جن
کی بدولت بشیر کے اسلوب کو ندرت اور انفرادیت کا
امتزاج ملا۔ ہر شخص دوسرے سے مختلف ہے، اسی

مختلف ہونے سے دنیا میں تنوع ہے، کہیں پر یہ اختلاف
ہے تو کہیں پر یہ تنازع ہے۔ لیکن بہر حال اور بہت سی
حقیقتوں کی طرح۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا
جاسکتا (منہ البتہ موڑا جاسکتا ہے) کہ ہم سماجی شعور کی
اس سطح سے کافی دوری پر ہیں جہاں موجود حقائق کو
جھٹلانے کے لیے تعصب سے احتیاط برتنے اور
متوازن ہوا نکل دینے کا رجحان پروان چڑھ پاسکے!

کہانی کار، ایک مختلف زمانے کی کہانی کہنے کا اختیار
رکھتا ہے۔ مثلاً "یہ وہ خود اس دور کا حصہ نہ رہا ہو۔
مگر بیانیہ کے لیے مختلف ذرائع کے توسط سے کہانی
کہہ دے۔

مگر اپنے ہی زمانے کے مشاہدات، کردار، واقعات کو
اپنے احساس کی ست رنگی میں ڈھال کر۔ آنے والے
زمانوں کے لیے صورت گری کرنا۔ اپنی نوع کا ایک
منفرد ابلاغ ہے۔ جس کی مدد سے تبدیل شدہ زمانے
میں رہنے والے لوگ مختلف پیمانوں سے موجود اور
گزشتہ کی جانچ کرسکتے ہیں۔ یہ جانچ جہاں لطف کے

نئے معنی بیان کرتی ہے، وہیں کچھ ایسی خصوصیات کو
بھی اجاگر کرتی ہے، جن کی کمی آج کے فرد کو سرسری
رویے اور خالص خوشی سے محرومی سے دوچار کیے
ہوئے ہے!

کہانی کہنے کے انداز میں ایک خاص سلیقہ اور
ترتیب نظر آتی ہے۔ کسی عجلت یا اثر پذیری کے، کسی
شعوری کوشش کے بغیر۔ کہانی تصنع سے پاک۔ اپنے
ہی رنگ میں رنگی جاتی ہے اور یہی وہ بے اسلوب ہے
جس نے محمد بشیر کو ملیالم زبان کا البیلا کہانی کار بنادیا۔

ان کی بے نیازی کسی خاص چلن کی پیروی کرنے
سے بے نیاز رہی۔ اور یوں ان کے انداز کو اس زمانے
میں جدت نگاری کہا گیا اور بعد میں لکھنے والوں کے لیے
متاثر کن تحریک۔!

سوانحی خاکے سے کچھ جھلکیاں۔ ویکوم محمد بشیر
ہندوستانی ریاست کیرالہ میں ویکوم کے قریب ایک
چھوٹے سے گاؤں میں 1908ء میں پیدا ہوئے
تھے۔ اوائل جوانی کے دنوں میں محمد بشیر ہندوستان کی

تحریک آزادی اور گاندھی، ابوالکلام آزاد اور نہرو سے
بہت متاثر تھے۔ انہوں نے کالی کٹ کے ساحل پر
نمک کے ستیہ گرہ (ہڑتال) میں حصہ لیا اور اس کے
سلسلے میں گرفتار ہوکر پہلے حوالات اور پھر کنانور کی
جیل میں پہنچے۔ وہاں انہیں پولیس کے تشدد سے گزرنا
پڑا جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی کئی تحریروں میں کیا
ہے۔ قید سے رہا ہونے تک بشیر کے خیالات میں
ڈرامائی تبدیلی آچکی تھی اور وہ گاندھی کے اہنسا کے
بجائے سیاسی تحریک میں تشدد کے استعمال کے قائل
ہوچکے تھے۔ اب ان کے ہیرو بھگت سنگھ، سکھ دیو اور
راج گرو تھے۔

اگلے سات برسوں میں بشیر نے پولیس سے آنکھ
مچولی کھیلتے ہوئے ہندوستان کے طول و عرض کا سفر کیا۔
اپنے اس سفر میں انہوں نے عرب کے ساحلوں کو بھی
چھوا۔ اپنی اس سات سالہ آوارہ گردی میں انہوں نے
کمائی یورے میں کچھ عرصے قیام کیا جو طوائفوں،

ہیجڑوں اور چوروں کے مسکن کے طور پر معروف تھا۔ انہوں نے ایک ہندو وید کے پاس دوائیں کوٹنے چھاننے کی ملازمت کی۔ سمندر کے سفر کی خواہش کے زیر اثر ایک بحری جہاز پر خلاصی کے طور پر بھرتی ہوگئے جو حاجیوں کو بمبئی سے عدن ہوتا ہوا بحیرہ اسود کے راستے جدہ لے جا رہا تھا۔ بعد میں وہ جہاز کی نوکری چھوڑ کر برصغیر کے اس حصے میں گھومتے پھرے جو اب پاکستان ہے۔ انہوں نے حیدر آباد' پشاور اور لاہور میں وقت گزارا اور کراچی میں بھی رہے۔

اتنے مختصر پس منظر کی روشنی میں اب پیش نظر دیکھیے۔

"مفلسی تھی۔ مستقل مفلسی۔ بھوک ہر چیز کی' پیاس ہر چیز کی۔ ہم کسی سے' کسی نامعلوم چیز سے خفا تھے۔ شدید طور پر خفا۔ اور شر پسندی کی حسین تابناکی میں ہم مست تھے۔ ہر چیز ہماری مرضی کے مطابق ہوگی۔ ہم کائنات کو خون سے دھو کر صاف اور نیا کریں گے! ہم خدا کے لشکر تھے۔ ہم انقلابی تھے۔ میں ایک ایسے گروہ کا لیڈر تھا جسے قتل کرنے میں بھی کوئی تکلف نہیں تھا۔ اے دہشت پسندی اور خنجر و بندوق کی عمر! میں تجھے سلام کرتا ہوں!"

فقط چار صفحات پر مشتمل اس کہانی کا نام "ایک چھوٹی سی پرانی پریم کہانی" ہے۔ ہر زمانے میں زمانے کو تبدیل کرنے کی خواہش نے لوگوں کو اپنا اسیر رکھا ہے۔ ان کے خواب پورے ہوئے یا نہیں' لیکن ان کی نوجوانی' امنگ اور ولولے سے بھرپور گزری۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خواہش ہمارے وقت میں بھی موجود ہے۔ لیکن اور ش؟ ہر نوجوان خفا ہی ہوتا ہے۔ البتہ خفگی کا مرکز' شعور کی سطح سے مشروط ہے۔

تمام تر دنیا سے ناراضی کے باوجود "ور شی" بہر حال سینے میں ایک دل کی مجبوری بھی رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی دلچسپ رومانی واردات کی کہانی ہے' جس کا انجام نہ صرف حیران کن ہے' بلکہ غیر متوقع بھی!

"وہ اتنی محویت سے وہ کیا خواب دیکھ رہی ہے؟ یا وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی؟ وہ میری طرف کیوں نہیں دیکھتی؟"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے کھنکھارا۔ ایک دفعہ نہیں' دس دفعہ بھی نہیں۔ یہ تو کھانسی کا ایک سلسلہ تھا۔ بے سود اس نے سنا بھی نہیں۔ وہ میری کھانسی کی آواز سنتی کیوں نہیں؟ اس کے بعد زندگی کھانسی کا ایک سلسلہ ہو کر رہ گئی۔ جاؤ' جا کر مقدس مقام پر کھڑے ہو جاؤ' دیوار کی دراز سے جھانکو' وہ آس پاس سے کہیں؟ اگر ہوتی تو بس فوراً" کھانسنا شروع کر دیتا۔ میں مختلف اقسام کی کھانسیوں کا ذخیرہ لیے وہاں گزرتا۔

میں جس کی پوجا کرتا تھا وہ ایک نوکرانی تھی۔

چار دن کی چاندنی کی طرح محبت کا واہمہ خمار بن کر طاری رہا۔ اور پڑھنے والا تمام تر محسوسات کی سیڑھیاں ساتھ ساتھ چڑھتا رہا۔ نہر کے کیچڑ اور کرچیوں سے بمشکل گزر کر' دیوار پھاند کر' جب ملاقات کا امکان ظاہر ہوا۔ تو ان تمام سیڑھیوں سے قاری کو بھی ساتھ ہی گزرنا پڑا۔

تو ہوا یہ کہ "تو وہاں کیا کر رہا ہے بدمعاش؟ مجھے پکڑ کر وہ مجھ سے پوچھے گا۔ ایک بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ "ارے یہ اس آتش بیاں اخبار کا ایڈیٹر ہے نا؟"

یا اللہ اب تک میں نے تیرے بارے میں جو کچھ کہا ہے سب غلط ہے' مہربانی کر کے مجھے اس صورت حال سے نکال لے۔ مجھے اس کی نظر سے بچا لے۔ میں نے خنجر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اگر اس نے مجھے پکڑ لیا تو میں اسی خنجر سے اپنا گلا کاٹ لوں گا۔ اے اللہ! اسے اندھا کر دے۔ تھوڑی ہی دیر کے لیے اس کی بینائی چھین لے۔

جادو کی وہ چھڑی جو انسان اپنے زعم میں تھامے رکھتا ہے' جب اپنے ہاتھوں سے نکلتی ہے تو اللہ کو تھمانے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کرتا۔ اور یہاں معصومیت اور سادگی کو خالص روپ میں دیکھ کر رشک بھرا قہقہہ بے اختیار ہے!

اور اللہ تو خالص پکار کی بے حد قدر کرتا ہے نا۔

رات کے اس سناٹے میں ہم نے اس مسکین محبت کو خیرباد کہا۔ اس لیے۔ اور اسی لیے۔ اے پریم کے زمانے' اے محبت کی عمر! تو نے مجھ کو رسوا نہیں کیا' اس لیے میں تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں۔"

آپ نے ہندو پانی اور مسلم پانی تو ضرور سنا ہوگا۔ کیا آپ نے کبھی ہندو مسلم کتوں کی لڑائی بھی سنی؟

تقسیم سے پہلے کی معاشرت میں ہندو مسلم بھائی چارہ اور ہمسائیگی' دوستی کو ایسے مافوق الفطرت عوامل بھی نہیں تھے' ظاہر ہے کہ حق ملکیت ابھی تقسیم نہیں ہوا تھا۔ اس کہانی کا منظر نامہ ایک گلی میں رہنے والے دوست' ہمسائے مگر ایک ہندو اور ایک مسلم گھرانے سے ابھرتا ہے۔ جہاں ایک کتا۔ جو مسلم گھرانے کا پالتو ہے۔ ایک ایسی کتیا کے حصول میں ناکام ہوا جو کہ ہندو گھرانے کی پالتو تھی۔ اب قصہ یہ کھڑا ہو گیا کہ دل برداشتہ کتے نے صرف ہندو عورتوں پر حملے شروع کر دیے۔

ایک ایسی صورت حال میں جب انسان پر ناقابل گرفت آزمائش نازل ہونے لگیں تو بشری کمزوریاں عود کر سامنے آتی ہیں' کتے کی ناراضی اور حملوں سے پریشان حالی کا شکار' عبدالقدیر ایک دن یونہی بیٹھا تھا کہ ہر مسئلے کا حل لیے' ایک تعویذ بردار وہاں آنکلا اور نقد ادائیگی کے ساتھ' دیگر کئی مسائل کے لیے بھی اکسیر تعویذ حاصل کر لیے گئے۔

ایک نہایت دلچسپ کہانی۔ "تعویذ" اپنے وقت کا قصہ۔ تب ابھی دنیا کو کھڑکیاں نہیں لگی تھیں اور نہ ہی تلاش و دریافت انگوٹھوں تلے آئی تھی۔ تب سادگی اور سادہ سوچی بھی عام تھی اور فراڈ کرنے والے قسمت کے دھنی!

تو پھر آج جب ترقی کی برق رفتاری پکڑ میں نہیں آتی۔ معلومات کا حصول اور پھیلاؤ قابل گرفت اختیارات میں شمار ہوتے ہیں۔ تو کیا تعویذ جیسی کہانیاں جنم نہیں لیتیں؟ کچھ چیزیں جبلت سے وابستہ ہوتی ہیں' اور وہ بدلا نہیں کرتیں!

"یہاں کسی کی طبیعت خراب ہے؟" تھنگل نے سوال کیا۔

عبدالعزیز نے معتقدانہ انداز میں جواب دیا۔ "جی' ابھی اس وقت تو یہاں کوئی بیمار نہیں ہے۔"

"کوئی خواہش ہے' جسے تم چاہتے ہو کہ پوری ہو جائے۔"

"اس دنیا میں کون ہے جس کے دل میں خواہشیں نہیں ہیں؟ مگر عبدالعزیز اور ام سلمہ کے دل میں کیا آرزوئیں ہیں؟ کسی کو نہیں معلوم۔"

جب تھنگل نے اپنی اٹیچی کھولی تو عبدالعزیز کی ناک میں بڑی تیز خوشبو سی آئی۔ اٹیچی کے اندر کالے دھاگوں کی بہت سی موٹی پچھی لڑیاں تھیں۔ ہر لڑی تقریباً "ایک فٹ کے برابر لمبی تھی اور ہر لڑی کے ساتھ کاغذ کی ایک پرچی بندھی ہوئی تھی۔ "یہ سب تعویذ ہیں" ہم لوگوں کی مختلف بیماریوں کو اچھا کرنے کے لیے پانی پھونک کر دیتے ہیں' بیماروں کی سفارش کرتے ہیں اور ان کی شفا کے لیے مختلف مسجدوں اور مقدس مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ مگر ایسے مخلص و ڈھونڈ نکالنا جو ایسی معتبر اور موثر دعا کر سکے بہت مشکل ہے۔ اور بسا اوقات تو ایسا شخص ملتا ہی نہیں ہے۔ یہ تعویذ بڑے اثر والے ہیں۔ میں نے ان پر بڑی موثر دعائیں پڑھ کر انہیں انتہائی اثر والا بنا دیا ہے۔"

کیا دھوکہ باز کی پہچان کے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ خود کو تا عمر روزگار کہے؟

اعتذار

پچھلے ماہ تبصرے میں کتاب کا نام "سوا" "پہلی بارش" شائع ہو گیا تھا۔ دراصل کتاب کا نام "پہلی بارش" تھا اس سہو کے لیے معذرت خواہ ہیں۔

تھنگل نے اٹیچی میں سے دھاگے کی ایک لڑی اٹھائی تھنگل بولا "سر کے درد کے لیے ہے۔ چار روپے پچانوے پیسے۔ تمہیں کرنا صرف یہ ہوگا کہ اسے اپنے بازو یا اپنی گردن میں باندھ لو۔ یہ تعویذ تم نے باندھا نہیں کہ تم زندگی بھر کے لیے درد سر سے محفوظ ہوگئے۔" تھنگل نے اٹیچی سے ایک ایک کر کے لڑیاں نکالنی شروع کیں اور ہر لڑی کے ساتھ بتاتا شروع کیا "کھانسی کے لیے' پیٹ کے درد کے لیے' سینے کی جلن کے لیے' دانت کے درد کے لیے' بھوت پریت بھگانے کے لیے' پیٹ میں کیڑوں کے لیے' بدمزاجی اور چڑچڑے پن کے لیے' چار روپے' پچانوے پیسے فی تعویذ۔ اف۔ دعوے اور ان کی قیمت! انسان اور اس کی جبلت! اگر دعوے ہی مسائل کا حل ہوا کرتے۔ تو پاکستانی قوم کو بھی آج تک تعویذ ہی ملتے رہے۔ ترقی کے پنج سالہ منصوبے۔ ایشیا کا ٹائیگر اسلام کا قلعہ اور ایٹمی طاقت۔! ابلہ۔ کھانے کو زہر اور پینے کو لہو۔!

عبدالعزیز کو سنیں! "کتوں کے لیے بھی کوئی تعویذ ہے؟ ادھر کچھ دنوں سے ہمارے کتے نے ہندو عورتوں کو کاٹنا شروع کردیا ہے۔ کیا آپ مجھے کوئی ایسا تعویذ دے سکتے ہیں جو کتے کو ایسا کرنے سے روک سکے؟"

"بیٹی اور پوچھ پوچھ۔" تھنگل کی پٹاری میں سے تمام ناممکنات کا "نا" ہٹادیا گیا اور۔

عزیز کو بڑا جوش و خروش تھا۔ اس خفیہ اور غیر معروف معجزے کی خبر تو حکومت کو دی جانا چاہیے ہزاروں روپے اسپتالوں' دواؤں اور ڈاکٹروں پر خرچ کیے جارہے ہیں۔ ایک زبردست نقصان۔ ان تعویذوں کو ہر جگہ فراہم کیا جانا چاہیے۔ اس کے بعد ان اسپتالوں کو بڑے بڑے پانچ ستارہ ہوٹلوں میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔" یہ تعویذ تو پرچون کی تمام دکانوں پر' پان بیڑی کی ہر دکان پر' بس اڈوں پر' ریلوے اسٹیشنوں پر اور ہوائی اڈوں پر ملنے چاہئیں۔ اتنی ضروری چیز کی تقسیم کے لیے تو مخصوص شعبے کھولے جانے چاہئیں۔ یہ تو برآمد کی جانے والی شے ہوسکتی ہے۔ بمبئی' انگلستان' جرمنی' جاپان' امریکہ۔ اور روس میں اس کی اچھی منڈیاں مل سکتی ہیں' جہاں اسپتالوں اور دواؤں پر زبردست خرچ ہوتا ہے' اور سودے میں ہم کچھ نفع بھی کمالیں گے۔

یہ دور ہے کہ یہ 1930ء کا زمانہ ہے۔ اور چار روپے پچانوے پیسے کا مطلب۔

ویسے آپس کی بات ہے۔ سادہ لوحی کی غذا۔ خواب' خواہش' اعتبار' سادہ لوحی کی قیمت؟ پھر اجتماعی طور پر جب قوموں کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ تب اس سادہ لوحی کی سزا بھی ملتی ہے!

کس نے کہا تھا اپنی عقل' جذبات' اعتبار' گروی رکھنے کو؟

ممکن ہے کہ یہ کہانی جس دور میں لکھی گئی۔ محض مشاہداتی واقعات اور سماجیات پر طنز ہو۔ مگر آج۔ اتنی دہائیاں گزر جانے کے بعد۔ اس کہانی کا حلقہ خود بخود وسیع ہوتا جاتا ہے۔ لکھنے والے لکھ جاتے ہیں۔ آنے والے وقت اور لوگ۔ اپنی اپنی تشریحات کے لیے آزاد رہتے ہیں اور کہانی کی اہمیت اور بھی مسلم ہوجاتی ہے!

"ہوا کیا؟"

وہی جو اندھا اعتماد کرنے والوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے!

"وقت گزرتا گیا۔ مگر جہاں تک عبدالعزیز کے گنجے پن کا سوال تھا کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس کی کھوپڑی بدستور چمکتی ہوئی کھوپڑی تھی۔ پتا نہیں تھنگر اکبر کے سر پر کچھ بال نکلے یا نہیں؟ ہوسکتا ہے کہ تعویذ بے اثر ہوں۔ خان عورتوں کو اب بھی کاٹ رہا ہے۔"

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نئے نکلنے والے بالوں کو جن نوچ لیتے ہوں' مگر انہیں انسان کے بالوں کی کیا ضرورت ہوگی؟ ان جنوں کو دور رکھنے کے لیے بھی تعویذ ہوں گے۔ تھنگل کے تعویذوں سے زیادہ

طاقت ور تعویذ بھی ہوں گے۔ کیا بازار میں بہت سے دوسرے تعویذ بھی آگئے ہیں؟

ایک گورکھ دھندہ تھا جس میں عبدالعزیز الجھ گیا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے "ترک تعویذ" کا فیصلہ کرلیا۔ اور تعویذ کو کاٹ کر جلادیا۔

مگر کہانی کے اس اہم اور اختتامی موڑ پر ایک ایسی خبر جو کہ خط کے ذریعے موصول ہوئی جس نے کہانی کو پھر سے بہتے دھارے میں شامل کردیا۔ ایک ایسا اختتام جو اگلے اور جاری رہنے والے مرحلے کی نشاندہی کرتا ہے۔

"تعویذ کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے جس دن تعویذ کو اپنی کمر میں باندھا تھا' اسی دن ایک روپے کا لاٹری ٹکٹ بھی خریدا تھا۔ اس ٹکٹ پر ایک ہزار روپے کا انعام نکلا۔ یہ تعویذ بعد کو سرسوتی کی کمر میں باندھا گیا۔ نتیجہ جانتے ہو کیا نکلا؟ بغیر کسی تکلیف کے بچے کی پیدائش اور بچہ بھی لڑکا۔ یہ سب کچھ تم جانو اسی تعویذ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں تو روپے تمہیں بھیج رہا ہوں اس میں جتنے تعویذ آسکیں۔ میرے والدین کے لیے۔ میرے بچے کے لیے۔ اگر یہ روپے کافی نہ ہوں گے تو میں اور روپے۔"

"اور کہانی کا آخری جملہ خط میں گنجے سرپر بال اگنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔"

"تمہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔۔۔!"

یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ خان نے بعد میں مسلمان عورتوں کو بھی کاٹنا شروع کردیا تھا۔

کیا اس کہانی کے دریچے سے ہم اپنے "راہ نماؤں" کو دیکھ لیں؟ یا پھر منتظر کرم۔۔۔ ایفائے عہد کے قول پر بھروسا کرنے والے اپنے جیسے تمام پاکستانیوں کو؟ آپ کی مرضی ہے!

اس کتاب میں کل سترہ کہانیاں ہیں جن میں سے زیادہ تر مختصر اور چند طویل ہیں کوئی بھی کہانی زندگی کے رنگ اس سے خالی نہیں۔۔۔ دل موہ لینے والا انداز بیان عام فہم ہے۔

ہم۔۔۔ جو نئے زمانے کی "بریکنگ نیوز" سے دہلے ہوئے دل رکھتے ہیں۔۔۔ ہر شام کہ نئے نئے سانحے برپا دیکھتے ہیں۔۔۔ ہمیں پر لوگوں کا اور ہمیں اعتبار کا قتل عام دیکھتے ہیں۔۔۔ ہم جو سہم سہم کر بے خبری کا لبادہ اوڑھے رکھتے ہیں۔۔۔ ہم۔۔۔ جو ہردم بدگمان رہتے ہیں۔۔۔ ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے' ہر قدم پر کسی ناکامی' نارسائی اور رسوائی کے منتظر رہتے ہیں۔۔۔ غیر متوقع برے انجام کا خدشہ' ان ہونی کا شک لیے آگے بڑھتے ہیں مگر کوئی بھی انجام دل کو بوجھل نہیں کرتا۔۔۔ کچھ ہو جانے کے منتظر بدگمان اور اک کو جب کچھ بھی نہیں ہوا کی خبر ملتی ہے تو اک عجیب سی سرخوشی۔۔۔ اندازوں' واہموں کے غلط ہونے کی بالکل معصوم سی خوشی۔۔۔ اسی طرز سخن کی بدولت۔۔۔ جس نے تخی سے تولی۔۔۔ مگر گھولی نہیں!

شکریہ۔۔۔ اے تحریر۔۔۔ تیرا شکریہ!

آئینہ خانے میں

واصفہ سہیل

ایوارڈ

فواد خان کو ممبئی فلم نگری میں ایک بار پھر بہترین اداکار کا ایوارڈ ملا ہے۔ فواد کو یہ اعزاز ناظروں کے سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہونے پر دیا گیا ہے۔ اس ایوارڈ کے لیے نئے بھارتی اداکار "ٹائیگر شروف" انعام الحق اور طاہر راج بھوشن بھی نامزد تھے۔ اس سے قبل فواد خان اپنی پہلی بھارتی فلم "خوب صورت" کے لیے بھارت میں فلم فیئر ایوارڈ جیت چکے ہیں۔

عالمی معیار

اب ہم کریں تو کیا کریں کہ میرا کو خبروں میں رہنے کا فن "اداکاری" سے بھی زیادہ آتا ہے۔ جب ہی تو ہم بھی مجبور ہو جاتے ہیں میرا کی خبر دینے پر۔ اب یہی دیکھ لیں کہ میرا اب اپنی ہوم پروڈکشن میں بننے والی فلم "آسکر" (بھئی نام بھی ۔۔۔؟) کے لیے لندن میں موجود ہیں۔ بقول میرا انہوں نے اپنا پروڈکشن ہاؤس رجسٹرڈ کروالیا ہے۔ (کہاں ۔۔۔؟) اور وہ بہت جلد اپنی فلم مکمل کرنے

حق

ریحام خان اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں بتاتی ہیں کہ "ہم گھر میں بالکل عام سے میاں بیوی والے انداز میں رہتے ہیں (یعنی بے زار ۔۔۔؟) میں کھانا پکاتی ہوں، عمران جب گھر آتے ہیں تو اپنا فون دور رکھ دیتے ہیں، شام سات بجے کے بعد وہ مجھے بھی کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔ میں نے عمران کو بتایا تھا کہ میرے والد جاگنگ کے لیے جاتے تھے تو ہر روز میری والدہ کے لیے پھول لاتے تھے۔ عمران بھی ہر روز صبح جب جاگنگ کے لیے جاتے ہیں تو میرے لیے پھول لاتے ہیں (واہ بھئی ۔۔۔ ہمارے لیڈر قوم سے کتنے مخلص ہیں ۔۔۔؟) مجھے زیورات کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ عمران میرے لیے ہمارے باغ سے بہترین گلاب منتخب کر کے لاتے ہیں۔ (عمران خان تھوڑے سے گلاب ان لوگوں کے لیے بھی جنہوں نے آپ کو ووٹ دیے ہیں)

کا ارادہ رکھتی ہیں (ارادہ...؟) میرا کا دعویٰ ہے کہ ان کی یہ فلم عالمی معیار کی ہوگی۔ (مگر میرا کا عالمی معیار کیا ہوگا' یہ سوچنے کی بات ہے...؟) جس میں پاکستانی فنکاروں کے ساتھ ساتھ بھارتی اداکار بھی موجود ہوں گے (پاکستانی فنکاروں کے ہی نام بتادیں...؟ اپنے علاوہ میرا جی...!)

اہتمام

کہتے ہیں کہ رونے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے اور ذہنی دباؤ میں کمی آجاتی ہے۔ (لیکن بیویوں کے رونے سے شوہر پر ذہنی دباؤ بڑھ جاتا ہے نا...؟) جاپان کے شہر ٹوکیو میں واقع ایک ہوٹل نے خواتین کو اس مقصد کے لیے اسپیشل آفر دی ہے۔ خواتین کے رونے کے لیے مخصوص کمروں میں غمگین کردینے والی چیزوں کے (کیا ساس نندوں...؟) کے ساتھ ساتھ ایسی فلمیں بھی رکھی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر دل بھر آئے اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہہ نکلیں۔ اس کے علاوہ ان کمروں میں ایسی کہانیوں کے مجموعے بھی رکھے گئے ہیں جو خاص طور پر خواتین کو رلانے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ سب سے اہم بات وہاں آنسو پونچھنے کے لیے انتہائی اعلا معیار کے ٹشو پیپرز اور آئی ماسک بھی رکھے گئے ہیں۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ ایان علی پیشی کے موقع پر جس سج دھج کے ساتھ جدید لباس میں پوری آرائش و زیبائش، قیمتی پرفیوم سے مہکتی ہوئی انٹرنیشنل برانڈز کے شوز اور بیگز کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں تو گمان یہی ہوتا ہے کہ گویا وہ کسی اشتہاری فلم میں کام کرنے آئی ہیں۔ جیل میں انھیں یہ تمام سہولتیں کون فراہم کر رہا ہے؟ کس کے کہنے پر فراہم کی جارہی ہیں؟

اس کا نہ تو کوئی نوٹس لے رہا ہے نہ ہی از خود نوٹس۔

(اخبار جہاں۔ رپورٹ)

☆ روشنیوں کے شہر میں جہاں کہیں مسافر گیا اس

نے دیکھا ہے۔ اندیشوں کے سنپولیے اسی طرح رینگتے ہیں۔ شہر ابھی تک کشمکش و پیچ میں ہے اگرچہ رہائی کی آرزو میں پھڑپھڑاتا ہے۔

(ہارون الرشید۔ ناتمام)

☆ پرویز مشرف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کراچی کے فریئر ہال پارک میں کوئی شریف آدمی بیٹھا تھا کہ ان کے انگلی پیچھے سے بار بار ان صاحب کے سر پر زور سے چپت رسید کرتے تھے اور پھر معافی مانگنے لگ جاتے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے انھوں نے کس قوم میں ہونی اخلاقیات کا تصور کیا ہے۔ (محمد اظہار الحق۔ تلخ نوائی)

☆ تاریخ کا ماجرا یہ ہے کہ اپنے سینے میں وہ کوئی راز چھپا کر نہیں رکھتی۔ آخرکار سب کچھ اگل دیتی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ کہا تھا کھوٹے کو تو وہ کھرا تسلیم ہی نہیں کرتی، کھرے کو بھی بہت تامل کے بعد کھرا مانتی ہے۔ (ہارون الرشید۔ ناتمام)

☆ کراچی میں اصل مجرموں کو پکڑنا اب ناممکنات میں سے ہے۔ پکڑے کون؟ ہر کوئی تو حصہ دار ہے؟ جو شخص ایمان داری سے کاروبار کر کے رزق حلال کمانے کا خواہش مند ہے اسے کراچی میں اپنا کاروبار چھوڑنا پڑے گا۔

(نذر ناجی۔ سویرے سویرے)

رمضان کے پکوان

خالدہ جیلانی

کچے قیمے ہرے مسالے والے کباب

اجزا

باریک قیمہ	آدھا کلو
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا ہوا لہسن	ایک چائے کا چمچہ
زیرا	ایک چائے کا چمچہ
بھون کر پسی ہوئی	
لیمن جوس	دو کھانے کے چمچے
پسا ہوا گرم مسالا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پپیتا یا گوشت گلانے کا پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
بھنے چنے، پسے ہوئے	تین کھانے کے چمچے

ہرے مسالے کے لیے

ہرا دھنیا	ایک گٹھی
ادرک	دو انچ کا ٹکڑا
پیاز	ایک عدد بڑی
گھی	تلنے کے لیے
پودینہ	آدھی گٹھی
لیموں کا رس	چار کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

سب سے پہلے قیمے میں اوپر دیے گئے مسالے ملا کر ایک گھنٹہ چھوڑ دیں۔ اب ایک ڈونگے میں تمام ہرا مسالا باریک کاٹ لیں اور اس میں اوپر سے لیموں کا رس اور نمک چھڑک کر ملا لیں۔ اب مسالا ملا ہوا قیمہ تھوڑا سا ہاتھ میں لیں اور پیالہ سا بنائیں اور اس کے اندر ہرا مسالا ایک کھانے کا چمچہ ڈالیں اور اوپر سے ویسا ہی دوسرا پیالہ بنائیں اور اوپر ڈھک کر خوب اچھی طرح دبا کر کباب کی طرح بنالیں۔ کباب تیار ہونے پر انہیں توے پر گھی گرم کر کے تل لیں اور سرخ ہونے پر اتار لیں۔ تمام کباب فرائی ہونے پر دہی اور آلو کے رائتے یا پودینے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔ لذت میں اضافہ کے لیے قیمے میں کوئلے کا دھواں بھی لگا سکتی ہیں۔

قیمہ اور انڈے کے پراٹھے

اجزا

قیمہ	ایک پاؤ
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ کٹی ہوئی
نمک	حسب ذائقہ
انڈے	چار عدد ابلے ہوئے
میدہ	دو پیالی
ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	چار عدد باریک کٹی ہوئی
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	چٹکی بھر
گھی	تقریباً" آدھی پیالی

ترکیب :

میدے میں ایک کھانے کا چمچہ گھی اور چٹکی بھر نمک ڈال کر پانی سے گوندھ لیں۔ (نہ زیادہ سخت اور نہ زیادہ نرم) اسے ایک گھنٹہ ململ کے کپڑے سے ڈھک کر رکھ دیں۔ اب ایک پتیلی میں ایک چائے کا چمچہ گھی ڈال کر قیمہ، ادرک، لہسن، ہری مرچ کا پیسٹ ڈال کر پانچ منٹ بھون لیں۔ پھر ایک گلاس پانی ڈال کر

درمیانی آنچ پر پکائیں۔ نمک اور ہلدی بھی شامل کردیں' پانی خشک ہوجائے تو اس میں گرم مسالا اور کٹی ہوئی لال مرچ ڈال کر مزید پانچ منٹ بھونیں۔ انڈوں کے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ قیمہ ٹھنڈا ہونے پر انڈے بھی اس میں شامل کرلیں اور ہلکے ہاتھ سے مکس کرلیں۔ میدے کے پیڑے بنا کر پتلی پتلی آٹھ روٹیاں بیل لیں۔ اب ایک روٹی پر قیمہ پھیلا کر (ساتھ میں انڈے کے ٹکڑے بھی شامل ہوں) دوسری روٹی اوپر سے رکھ کر کنارے کو بہت خوب صورتی سے دبا ئیں توے پر ایک چمچہ گھی ڈال کر پراٹھا ل یں۔ درمیانی آنچ پر۔ اسی طرح باقی روٹیاں بھی پکائیں اور گرم گرم پراٹھے کھجور کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

کھجور کی چٹنی

اجزا

کچی کھجوریں	ایک کلو
چینی	ایک پاؤ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
سرخ مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سوکھا دھنیا	دو چائے کے چمچے

ترکیب :

کھجوروں کی گٹھلیاں نکال کر انہیں ایک گلاس گرم پانی میں کالی مرچ پاؤڈر' سرخ مرچ پاؤڈر' نمک اور سوکھا دھنیا پاؤڈر ڈال کر بہت ہلکی آنچ پر کم از کم تین گھنٹے کے لیے پکائیے۔ جب کھجوروں کا پانی خشک ہوجائے اور یہ ٹھنڈا ہوجائے تو انہیں چوپر یا گرائنڈر جس میں آپ بہتر سمجھتی ہوں پیس لیں اور شیشے کی بوتل میں محفوظ کرلیں۔ اگر آپ یہ چٹنی Deep Freezer میں رکھیں گی تو مہینوں خراب نہیں ہوگی۔ قیمہ کے پراٹھے کے ساتھ اس کا لطف دوبالا ہوجائے گا۔

چاولوں کے پکوڑے

اجزا

بیسن	1/2 کپ
پیاز	1/2 کپ
(چینیز کی طرح کاٹ لیں)	
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ڈیپ فرائی کے لیے
چاول (ابلے ہوئے)	دو کپ
چاٹ مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا' سفید زیرا	دو کھانے کے چمچے
(توے پر بھون کے کوٹ لیں)	
ہری مرچ	دو عدد (باریک کاٹ لیں)
بیکنگ پاؤڈر	1/4 چائے کے چمچے

ترکیب :

چاولوں کو ہاتھ سے اچھی طرح مسل لیں۔ اب اس میں تیل کے علاوہ سب چیزیں مکس کرلیں۔ دس منٹ کے بعد ڈیپ فرائی کرلیں۔ آپ کے چاول کے بنائے ہوئے پکوڑے تیار ہیں۔

املی کی چٹنی

اجزا

املی	1/2 کلو
نمک	حسب منشا
چینی	ایک کپ
پسی سرخ مرچ	چھ چائے کے چمچے

ترکیب :

املی دھولیں اور ایک کلو پانی میں ڈال کر خوب اچھی طرح پکائیں۔ جب پانی آدھا رہ جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا کرکے چھان لیں۔ اب اس میں نمک' سرخ مرچ اور چینی ڈال کر پھر پکائیں۔ جب چینی اچھی طرح مکس ہوجائے تو اتار لیں۔ چٹنی تیار ہے۔

رمضان میں صحت مند کیسے رہا جائے؟

سحری

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ کاہلی اور نیند کے باعث سحری نہیں کرتے۔ سحری ضرور کریں اور سحری میں ایسے کھانوں کا انتخاب کریں جن میں کاربوہائیڈریٹس کی بھاری مقدار موجود ہو جیسے کہ روٹی اور دالیں وغیرہ۔

افطار

افطار میں اعتدال سے کام لینا چاہیے۔ چینی اور چربی سے بنائی جانے والی اشیا سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ سر میں درد، تھکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔ ماہرین کے مطابق بہتر یہ ہے کہ روزہ کھجور اور دودھ، پانی اور تازہ پھلوں کے رس کے ساتھ کھولیں اور دس منٹ بعد ایسی خوراک کھائیں جس میں معدنیات زیادہ ہوں۔

اس سال ماہ رمضان کی آمد گرمیوں کے موسم میں ہوئی ہے، اس لیے سبزیوں اور پھلوں کا استعمال زیادہ کریں۔

- سحری اور افطار کے اوقات میں زیادہ سے زیادہ پانی پئیں تاکہ اس سے پورا دن آپ کے جسم میں پانی کی کمی نہ ہو۔
- تیز سحری کے ٹائم اور خاص طور پر افطار کے وقت تیل والی چیزیں اور مرغن کھانوں کا استعمال نہ کریں۔

رمضان کے لیے بہترین مشروب

بعض افراد افطار کے اوقات میں بھی کولڈ ڈرنکس کا استعمال کرتے ہیں جبکہ یہ کسی حد تک غلط ہے۔

ملک شیکس

یوں تو ملک شیکس کا تعلق ہمیشہ سے آم کے ساتھ جوڑا جاتا ہے لیکن یاد رہے کہ اسے ایک حد سے زیادہ کھانا آپ کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں۔ زیادہ کھانے سے یہ جسم میں گرمی پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے گرمی دانے نکل آتے ہیں۔ آم کے علاوہ دوسرے بھی کئی پھل موجود ہیں جن کے شیکس کا استعمال آپ افطار اور سحری میں کر سکتے ہیں جیسے سیب، کیلا اور سب سے خاص کھجور۔ رمضان میں اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہ آپ کھجور کا استعمال کریں نا صرف کھانے کے طور پہ بلکہ شیک کے طور پر بھی۔

دودھ

سحری کے اوقات میں خاص طور پہ دودھ سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو آپ کو نا صرف کیلوریز فراہم کرتا ہے بلکہ آپ کے جسم میں موجود کیلشیم کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ تاہم بعض افراد خالی دودھ پینے سے گھبراتے ہیں ان کے لیے بھی ہمارے پاس بہترین حل ہے اور وہ یہ کہ آپ دودھ میں اوولٹین ڈال لیں جو اپنے وزن کے حوالے سے بے حد حساس ہوں۔ اس کے علاوہ آپ دودھ کا شیک بھی بنا سکتے ہیں اور دودھ میں روح افزا کا استعمال بھی کر سکتے ہیں۔

چائے اور کافی

گرمیوں میں چائے یا کافی کے استعمال سے جتنا ہو سکے اجتناب کریں تو بہتر ہوگا۔ اس قسم کی ڈرنکس آپ کی پیاس کو مزید بڑھا دیتی ہیں۔

تربوز کا جوس

گرمیوں میں آم کے ساتھ جو دوسرا پھل سب سے زیادہ نظر آتا ہے وہ تربوز ہے اور جتنی غذائیت اس کے اندر موجود ہوتی ہے اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ تربوز جسم میں خون بنانے کے حوالے سے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ جوس بنانے کے لیے تربوز کے بیج نکال لیں اس کے بعد اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بلینڈر میں ڈالیں اور پھر آئس کیوبز کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا لیموں کا جوس اور کالا نمک شامل کریں۔ اس کے بعد اسے اچھی طرح بلینڈ کر لیں۔ لیجیے آپ کا صحت سے بھرپور جوس تیار ہے۔

تازہ پودینے اور لیموں کا شربت بھی گرمیوں کے لیے بہترین ڈرنک ہے۔